
للکار
2
طاہر جاوید مغل
Ali Mian
Publications

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تیز رفتار ایکشن اور تہلکہ خیز کہانی

للکار

دوسرا حصہ

طاہر جاوید مغل

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔فون: 37247414

باراشاعت ——— 2012ء
مطبع ——— یوایند ڈی پرنٹرز لاہور
کمپوزنگ ——— عاطف رحمٰن۔ لاہور
قیمت ——— 400 روپے
Price ——— 20 / Pond (U.K)

ISBN 978-969-517-319-0

Stokist:(U.K)
Azhar Enterprises
315, Dickenson Road
Longsight, Manchester, M13 ONR
Tel: 0044 (0) 161 224 6331

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میوہسپتال، لاہور

اچانک ہی ایک گلی میں سے وہی منحوس جیپ برآمد ہوگئی۔ جس نے ہمارا تعاقب کیا تھا۔اس مرتبہ اس کے پیچھے ایک اور گاڑی بھی تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ گاڑی بھی جیپ کے ساتھ ہے۔

''لو جگر! تمہارے سسرالی پھر آ گئے۔'' عمران نے کہا اور انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی کو ایک جھٹکے سے آگے بڑھایا۔ایک بغلی سڑک پر مڑتے ہوئے گاڑی کے ٹائروں نے تارکول سے رگڑ کھا کر زبردست شور مچایا۔ اردگرد کے لوگوں نے مڑ کر دیکھا۔شہر کے بیچوں بیچ ایک اندھا دھند ریس پھر شروع ہوگئی۔ عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے عمران کی آنکھوں میں عقابی چمک اُبھر آتی تھی۔ مینار پاکستان سے آگے نکل کر جب ہم راوی کے پل کی طرف بڑھ رہے تھے، یکا یک سائیڈ سے ایک اٹھانوے ماڈل مرسڈیز برآمد ہوئی۔ مرسڈیز والے نے بڑے خطرناک طریقے سے ہمارا راستہ روکنا چاہا۔ دونوں گاڑیاں لہراتی ہوئی کچے میں اُتر گئیں۔ ہر طرف دھول پھیل گئی۔ عمران نے مشاقی سے اپنی گاڑی کو نشیب میں لڑھکنے سے بچایا اور مرسڈیز کو چکما دے کر پھر پختہ سڑک پر آ گیا۔ یہی وقت تھا جب میرے کانوں میں فائر کی آواز گونجی۔ یہ فائر مرسڈیز سے کیا گیا تھا اور یقیناً ہمیں نشانہ بنایا گیا تھا۔ یہ گولی گاڑی کی باڈی میں کہیں لگی۔ پھر ایک اور فائر ہوا لیکن یہ بالکل خطا گیا۔ بغیر ٹول ٹیکس ادا کیے ہماری گاڑی طوفانی رفتار سے راوی کے پل سے گزری اور جی ٹی روڈ پر پہنچ گئی۔ تب ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ جیپ سمیت کم از کم چار گاڑیاں ہمارے پیچھے آ رہی ہیں۔ شاید تعاقب کرنے والوں نے سیلولر رابطے کے ذریعے شہر میں موجود اپنے مزید ساتھیوں کو تعاقب میں شامل کر لیا تھا۔ صورت حال ایک دم ہی نہایت خطرناک ہوگئی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے عمران کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر بدستور بے فکری رقصاں تھی۔

''معاملہ خراب ہوتا جارہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔'' اس نے کہا اور ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا۔

نغمہ گونجنے لگا۔ جیون چلنے کا نام، چلتے رہو صبح شام۔

''اگر انہوں نے فائرنگ شروع کردی تو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم انہیں پھول ماریں گے۔ دیکھنا وہ بڑے سخت پھول ہوں گے۔'' اس نے اپنی سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈالا اور کپڑے میں لپٹا ہوا ماؤزر نکال کر گود میں رکھ لیا۔ ماؤزر کی جھلک نے مجھے مزید تشویش میں مبتلا کر دیا۔ میرا دل کہنے لگا کہ یہ ابر آلود رات بڑی سنگین ثابت ہونے والی ہے۔

میرا حلق بالکل خشک ہوگیا۔ گردن اور سر کے پچھلے حصے سے شدید ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ تاہم ان ٹیسوں کی تکلیف، حالات کی سنگینی میں دب سی گئی۔

عقب والی گاڑیاں قریب آتی جا رہی تھیں۔ ان میں سے ایک ہنڈا سب سے آگے تھی۔ یہ سرخ ہنڈا تھی۔ میں نے پہچان لیا، یہ وہی گاڑی تھی جس میں نادیہ ہمارے راوی روڈ والے گھر پر آتی رہی تھی۔ اب شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ ہمارے عقب میں میڈم کے لوگ ہی تھے۔ تب اچانک عمران کے موبائل کی بیل ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ اقبال نے ''کال بیک'' کیا ہے مگر دوسری طرف سے جو آواز اُبھری وہ سیٹھ سراج کی تھی۔ اس نے آتشیں لہجے میں کہا۔ ''عمران! گڈی روک دے بچے۔ نئیں تے نقصان ہووے گا تیرا۔ شاباش روک دے گڈی۔''

''گڈی نہیں رُکے گی چور چاچو! اگر تم نے واقعی اپنی ای کا دودھ پیا ہے تو کوشش کر کے دیکھ لو۔''

سرخ ہنڈا کار تیزی سے قریب آ رہی تھی۔ لگتا تھا کہ سراج اسی گاڑی سے بول رہا ہے۔ عمران نے اچانک گاڑی کو بائیں طرف ایک چھوٹی سڑک پر اُتار دیا۔ عقب میں آنے والی دو گاڑیاں اپنی جھونک میں کچھ آگے نکل گئیں تاہم دو گاڑیوں کے بریک بروقت چرچرائے اور وہ لہراتی ہوئی ہمارے پیچھے آئیں۔ اس کے ساتھ ہی رائفل کا ایک فائر ہوا اور گولی چھنا کے سے ہماری گاڑی کی پچھلی اسکرین کو توڑ کر ایک دروازے میں گھس گئی۔

''اپنا سر نیچے رکھو تابی۔'' عمران نے کہا اور خود بھی جھک گیا۔

اس کے بعد ایک ہاتھ سے ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے ماؤزر کھڑکی سے باہر نکالا اور

سائیڈ کے عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے جیپ پر یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ یہ بے مثال نشانہ تھا اور بڑے اعتماد سے لگایا گیا تھا۔ میں دنگ رہ گیا۔ جیپ کا اگلا ٹائر دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس بُری طرح ڈگمگائیں پھر میں نے اسے کھیتوں میں اُترتے اور ایک سائیڈ پر اُلٹتے ہوئے دیکھا۔

اگلے دس پندرہ منٹ میری زندگی کے ناقابلِ فراموش واقعے کی حیثیت رکھتے تھے۔ کھیتوں کھلیانوں اور درختوں کے درمیان نیم پختہ راستوں پر ہماری گاڑی برق رفتاری سے دوڑ رہی تھی اور اس کے عقب میں چار گاڑیاں تھیں۔ ان گاڑیوں میں ہمارے اندازے کے مطابق کم و بیش بیس بائیس مسلح افراد بھرے ہوئے تھے۔ راستے میں گاہے بگاہے فائرنگ بھی ہوتی رہی تھی۔ یہ سب کچھ کسی خوفناک ایکشن فلم جیسا تھا۔ تعاقب کرنے والوں کا غیظ و غضب دیکھتے ہوئے نہ جانے کیوں مجھے لگنے لگا تھا کہ ہسپتال میں نادیہ دم توڑ چکی ہے۔ راستے میں ہونے والی فائرنگ سے ہماری گاڑی کی دو کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور ہو چکے تھے، پچھلی اسکرین بھی ناپید ہوگئی تھی۔ باڈی میں ڈیڑھ دو درجن سوراخ ہو چکے تھے۔ خوش قسمتی سے ابھی تک کوئی ٹائر برسٹ نہیں ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ عمران اپنے پیچھے آنے والی گاڑیوں کو ایک خاص سمت میں لے کر جارہا ہے۔ اس کے ذہن میں جیسے کوئی پلان تھا۔ اس نے راستے میں ایک بار اپنے کسی ساتھی کو مختصر فون بھی کیا تھا۔

ہم اینٹوں سے بنی ہوئی ایک نیم پختہ سڑک سے گزر رہے تھے۔ گندم اور چارے کے کھیتوں کے درمیان ایک چھوٹے سے موڑ پر عمران کا ایک اور نشانہ کارگر ثابت ہوا۔ آگے آنے والی سفید گاڑی کا ٹائر برسٹ ہوگیا۔ اس کے رُکنے سے پیچھے آنے والی گاڑیوں کو بھی رُکنا پڑا۔ یوں ہمیں ایک سنہری موقع ملا کہ ہم پیچھے آنے والی گاڑیوں سے اپنا درمیانی فاصلہ بڑھا سکیں۔ عمران نے مہران کی رفتار کو حتیٰ الامکان حد تک پہنچا دیا۔ گاڑی ایک ایک فٹ اُچھل رہی تھی۔ میں نے خود کو مضبوطی سے نشست کے ساتھ چپکا رکھا تھا۔ ایک مرتبہ گاڑی اُچھلی تو ڈیش بورڈ کھل گیا اور اس میں سے کچھ کاغذ نیچے گرے۔ ان میں ایک ڈائری نما چیز بھی تھی۔ مجھے لگا کہ شاید یہ کوئی ''پنج سورہ'' ہے۔ میں نے اسے اُٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ آنے والے دنوں میں یہ ڈائری میرے لیے کتنی اہم ثابت ہونے والی تھی، مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ ہم نے کھیتوں کے درمیان قریباً چار کلو میٹر کا فاصلہ بڑی سرعت سے طے کیا اور ایک ڈیک نالے کے کنارے پہنچ گئے۔ عمران نے گاڑی کو عین کنارے پر روکا اور میرے ساتھ باہر نکل آیا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ جگہ اس کی جانی پہچانی ہے۔ ہم نے مڑ کر دیکھا۔ صورتِ حال تسلی

بخش تھی۔ ہمارا تعاقب کرنے والی گاڑیاں اب بھی کم وبیش دو کلومیٹر دور تھیں۔ شیشم اور کیکر کے درختوں کے بیچ سے ان کی ڈگمگاتی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ بہت تیز ہوا چل رہی تھی۔ کسی وقت باریک پھوار پڑنے لگتی تھی، سردی محسوس ہو رہی تھی۔ ڈیک نالے میں پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ کوئی پہاڑی نالا ہو۔ میں نے بغور دیکھا۔ نالے کے قریباً 100 میٹر چوڑے پاٹ کے اوپر ڈیڑھ دو فٹ چوڑی پختہ پٹی ایک پل کی طرح نظر آ رہی تھی۔ جیسے ایک لکیر سی اس کنارے سے دوسرے کنارے تک چلی گئی ہو۔ اس کے نیچے قریباً بیس فٹ کی گہرائی میں ڈیک نالے کا پانی تیز رفتاری سے بہہ رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر دھیان سے دیکھا تو یہ پٹی دراصل لوہے کے تین پائپ تھے جو ساتھ ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ گیس یا پانی کی سپلائی ہے یا کوئی اور چیز۔ عمران نے گاڑی میں سے ماؤزر، گولیاں اور دو چار ضروری اشیاء نکالیں پھر کنارے سے اُتر کر اس آہنی پٹی پر پاؤں دھرا اور چند قدم چل کر دیکھا۔ اس کے بعد میرے پاس آیا اور بولا۔ ''چلو شہزادے! ہمارے پاس وقت زیادہ نہیں ہے۔''

''اس پر چل کر دوسری طرف جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل......لوگ یہاں سے اکثر گزر جاتے ہیں۔ یہ بالکل آسان ہے۔''

''مگر اندھیرا ہے یار! اور ہوا بھی......''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے جگر! بس تھوڑی سی ہمت۔ چلو پہلے میں جاتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

اس نے دونوں ہاتھ قدرے دونوں طرف پھیلا لیے اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریباً پون فاصلہ طے کر گیا۔ تب وہ میری طرف مڑا اور پکار کر بولا۔ ''چلو آ جاؤ۔ بس سیدھا دیکھتے رہو۔ نیچے پانی کو نہیں دیکھنا۔ اگر کوئی مسئلہ ہو تو بیٹھ جانا۔ چلو شاباش۔''

دوسرے کنارے پر کسی گاڑی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ عمران ہی کا کوئی ساتھی ہے جو ہمیں ریسیو کرنے کے لیے یہاں موجود ہے۔ عمران نے پھر مجھے پکارا۔ میں نے دل کڑا کر کے پائپوں پر قدم رکھا۔ میرا دل طوفانی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ سردی کے باوجود میں نے اپنی پیشانی پر پسینہ محسوس کیا۔ ایک دم میری چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ میں یہ پل صراط عبور نہیں کر سکوں گا اور میرے ایسا نہ کرنے سے آج یہاں کوئی بڑا سانحہ رُونما ہو جائے گا۔ عقب میں متعاقب گاڑیوں کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ عمران نے ایک بار پھر پکار کر کہا۔ ''کیا کر رہے ہو تابی! جلدی کرو۔ وہ لوگ پہنچ رہے ہیں۔'' میں نے

ایک بار پھر اپنی ذہنی و جسمانی قوتوں کو جمع کیا۔ آگے بڑھنا چاہا مگر کچھ نہیں ہو سکا۔ جسم جیسے پتھرا کر رہ گیا تھا۔ عمران عجیب بیچارگی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ تب وہ واپس پلٹا۔ یہی وقت تھا جب عقب میں آنے والی ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹ ڈیک نالے کے کنارے کو روشن کرنے لگی۔

عمران نے پکار کر کہا۔ ''کیا کر رہے ہو تابی! وہ آ گئے ہیں۔ ہمت کرو۔ یہ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ بس سیدھا دیکھتے رہو۔''

وہ کہہ رہا تھا۔ ''یہ مشکل نہیں ہے۔'' میں اپنے آپ کا کیا کرتا؟ گزرے ہوئے ماہ و سال میں، مَیں نے کہاں کہاں خود سے کہا تھا۔ یہ مشکل نہیں ہے۔ یہ مشکل نہیں ہے تابش! تم یہ کر سکتے ہو۔ تھوڑی سی ہمت کرو۔ قدرت نے تمہیں بھی دو ہاتھ، دو پاؤں دیئے ہیں۔ صحت مند جسم دیا ہے۔ پھر تم وہ کیوں نہیں کر سکتے جو کرنا چاہتے ہو؟ کیوں ہر دشوار گھڑی میں پسپائی تمہارا مقدر ہوتی ہے؟ تم اپنا حق کیوں نہیں مانگ سکتے؟ کسی غاصب کا گریبان کیوں نہیں پکڑ سکتے؟ کسی جابر کا پنجہ کیوں نہیں مروڑ سکتے؟ تم آزمائشوں کے سامنے ہتھیار کیوں ڈال دیتے ہو؟ کتنی بار یہ سوال میں نے خود سے پوچھے تھے اور کتنی بار بیچارگی کے پسینے میں ڈوب گیا تھا۔ آج اس پُرآشوب رات میں اس شور مچاتے پانی کے کنارے میں ایک بار پھر اسی بیچارگی و ناتوانی کا شکار تھا اور اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں تھا ہی ایسا اور میں اکیلا نہیں تھا۔ شاید مجھ جیسے ہزاروں لاکھوں بلکہ لاتعداد لوگ تھے جو غیر معمولی ہمت نہیں رکھتے تھے جو عام تھے اور شاید عام سے بھی کچھ کم۔ اس میں ان سب کا کیا قصور تھا؟ شاید وہ سب میری طرح خود کو بدلنے کی کوشش کرتے تھے مگر بدل نہیں سکتے تھے۔ وہ اپنی فطرت کے اسیر تھے۔

''عمران! میں یہ نہیں کر سکتا۔'' میں کراہا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

گاڑیاں بالکل کنارے پر پہنچ گئی تھیں۔ ان کی ہیڈ لائٹس نالے کے ایک طرف کے کنارے کو روشن کر رہی تھیں۔ یہاں تیز ہوا میں لہلہاتے سرکنڈے بھوتوں کے رقص کا منظر پیش کرتے تھے۔ تعاقب کرنے والوں کی وحشی آوازیں میرے کانوں سے ٹکرانے لگیں۔

عمران ایک جان لیوا دوراہے پر تھا۔ وہ مجھے چھوڑ نہیں سکتا تھا اور اب واپس میری طرف آنا بھی اس کے لیے ازحد خطرناک تھا مگر وہ انوکھا تھا۔ اس کے سینے میں ایک فولادی دل دھڑکتا تھا اور اس فولادی دل میں محبت کا سمندر ہلکورے لیتا تھا۔ وہ واپس میری طرف آیا۔ اسے نہیں آنا چاہیے تھا۔ اسے نہیں آنا چاہیے تھا۔

O......❖......O

سیٹھ سراج کی للکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”وہ دیکھو......وہ ہے......وہ آ رہا ہے۔“ اس نے عمران کو دیکھ لیا تھا۔

میں بھی عمران کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں بازو پھیلا کر حتیٰ الامکان تیزی سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ شاید اب اس کی خواہش یہ تھی کہ وہ مجھ تک پہنچے اور مجھے لے کر کنارے کے سرکنڈوں میں اوجھل ہو جائے۔

یہی وقت تھا جب یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے۔ میں نے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں صاف دیکھا۔ ایک گولی عمران کے دائیں کندھے پر لگی۔ اس کا جسم ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف گیا۔ وہ ایک دم لڑکھڑایا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ماؤزر سیدھا کیا۔ وہ کمال کا نشانے باز تھا مگر یہاں مدِمقابل ایک یا دو نہیں تھے، وہ بہت سے تھے۔ عمران نے ایک فائر کیا اور اس کے جواب میں طاقتور آٹھ ایم ایک رائفل کا پورا ایک برسٹ اس کے سینے پر لگا۔ ہاں......اس رائفل کی ایک گولی بھی شاید انسانی جان لینے کے لیے کافی تھی اور یہ پورا برسٹ تھا۔ کم از کم پانچ چھ گولیاں۔ وہ اُچھلا اور سر کے بل ڈیک نالے کے تند و تیز پانی میں جا گرا۔ یہ اپنے یار کی آخری جھلک تھی جو میں نے دیکھی۔ اس کے بعد میں جیسے کچھ دیکھنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس پُرآشوب رات میں، اس ڈیک نالے کے کنارے، ان سرکنڈوں میں عین اس وقت زمین کی گردش تھم گئی ہے اور کائنات ختم ہو گئی ہے۔ وہ ایسے جائے گا؟ اتنی جلدی......اتنا اچانک......ایسا غیر متوقع؟ میں کچھ دیر کے لیے شاید سکتے میں چلا گیا۔ جیسے دل سینے میں پھٹ جائے، نبضیں تھم جائیں اور آنکھیں پتھرا جائیں۔ پھر اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرے جسم کی ساری توانائی میری ٹانگوں میں منتقل ہو رہی ہے۔ جسم میں موجود خون کا ہر قطرہ میرے پاؤں کی طرف دوڑ رہا تھا۔ یہ شاید زندگی بچانے کی وہ فطری خواہش تھی جو قدرت نے ہر جاندار کی جبلت میں نصب کر رکھی ہے۔

ایک قیامت کا جھٹکا سہنے کے بعد میرے اندر بھی یہ خواہش جاگی اور میں اندھا دھند سرکنڈوں میں بھاگ کھڑا ہوا۔

”وہ دیکھو......وہ جا رہا ہے۔“ ایک بار پھر سیٹھ کی منحوس آواز ہوا میں تیرتی ہوئی میرے کانوں سے ٹکرائی۔ یہ آواز کم و بیش چالیس میٹر دور سے آئی تھی اور اس کا رُخ میری دائیں جانب تھا۔ مجھے لگا کہ کچھ لوگ للکارتے ہوئے میرے پیچھے دوڑے ہیں۔ تب یکے بعد دیگرے تین فائر ہوئے۔ ایک گولی بالکل میرے پاس سے گزری۔ میں نے اس مہلک سیسے کی قاتل سنسناہٹ اپنے سر کے عین اوپر سنی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگلی گولی میری کمر یا سر کے

پچھلے حصے میں کہیں لگے گی۔ گولی لگنے کا احساس کیا ہو گا؟ کیا میں وہ تکلیف سہہ سکوں گا؟ کیا میں فوراً گر پڑوں گا۔ کیا میری موت آناً فاناً ہو جائے گی؟ ایسے کئی سوال سیکنڈ کے مختصر وقفے میں میرے دماغ کے اندر چمکے اور اوجھل ہوئے۔

مجھے بس اتنا یاد ہے، میں اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ میرے راستے میں اونچے سرکنڈے تھے، خودرو جھاڑیاں تھیں اور کیچڑ تھا۔ میں گر رہا تھا، اُٹھ رہا تھا اور پھسل رہا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ میرے پیچھے آنے والے اندازاً سو قدم کی دوری پر ہوں گے۔ دفعتاً مجھے لگا کہ میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے شاخیں ٹوٹنے کی مدھم آواز سنائی دی۔ میں ایک ساعت کے لیے یا شاید اس سے بھی کم وقت تک ہوا میں معلق رہا اور پھر کسی نیم ٹھوس جگہ پر گرا۔ میں کمر کے بل گرا تھا۔ میرے اوپر کچھ چیزیں گریں۔ جھٹکے کے سبب آنکھوں میں تارے سے ناچے اور ریڑھ کی ہڈی میں درد کی ایک بلند لہر اُٹھی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔ میں جہاں گرا تھا، وہیں ساکت پڑا رہا اور یہ محسوس کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ میری ریڑھ کی ہڈی ٹوٹنے سے بچ گئی ہے؟ فی الحال کچھ بھی نتیجہ نکالنا مشکل تھا۔

دس پندرہ سیکنڈ بعد میرے پیچھے آنے والے طوفانی رفتار سے میرے آس پاس سے گزرے۔ میں نے ان کی چنگھاڑتی ہوئی آوازیں سنیں۔ ان میں شاید شیرے کی آواز بھی شامل تھی۔ وہ لوگ پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے اور بھاگتے ہوئے ایک دوسرے سے بات بھی کر رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں کسی گڑھے میں ہوں اور میرے اوپر بہت سا جھاڑ جھنکاڑ گرا ہوا ہے۔ شاید یہی جھاڑ جھنکاڑ تھا جس نے مجھے تعاقب کرنے والوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد آوازیں مجھ سے دور چلی گئیں۔ رائفل کے تین چار فائر سنائی دیئے اور لوگوں کی دور افتادہ چنگھاڑیں کانوں میں پڑیں۔ میں بے حرکت پڑا رہا۔ میری آنکھوں کے سامنے اب عمران کو گولیاں لگنے کا منظر تھا۔ بلندی سے اس کا پانی میں گرتا ہوا جسم۔ میری آنکھوں میں نمی جاگی پھر یہ نمی گرم پانی کے دھاروں میں بدل گئی۔ میرا سینہ ہچکیوں سے دہلنے لگا۔ میں نے اپنے ہونٹوں کو اپنی ہتھیلیوں سے ڈھانپ لیا اور اپنے رونے کی آواز کو اپنے سینے کے اندر ہی روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟ کیسے ہو گیا تھا؟ ایسا تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ...... جو تھوڑے ہی عرصے میں میری رگِ جاں سے قریب ہو گیا تھا، میری زندگی کا لازمی جزو بن گیا تھا، اس طرح اچانک مجھ سے منہ موڑے گا، اس طرح آناً فاناً موت کے اندھیروں کی طرف جست لگا جائے گا؟ میرے دماغ کی رگیں پھٹنے

لگیں۔ کہیں یہ جاگتی آنکھوں کا خواب تو نہیں تھا۔ کہیں میرا تصور مجھے کوئی دحشت ناک دھوکا تو نہیں دے رہا تھا؟

میری کراہیں میرے ہونٹوں کی فصیل توڑنے لگیں۔ میں اوندھا ہو گیا۔ میں نے اپنا منہ گھاس اور کیچڑ میں دھنسا دیا۔ میرا پورا جسم ہچکیوں سے دہلنے لگا۔

''عمران......عمران۔'' میرے دل نے پکار کر کہا۔ ''مجھے یوں اکیلے چھوڑ کر نہ جا یار! یہ تو کوئی بات نہیں ہے۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہے۔ تُو تو مجھے زندگی کی طرف لا رہا تھا اور ابھی تو میں پوری طرح زندہ بھی نہیں ہوا اور تُو مجھے چھوڑ رہا ہے اور کیسے حالات میں چھوڑ رہا ہے۔ مجھ پر رحم کر میری ناتوانیوں کی اتنی کڑی سزا نہ دے یار! میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دو قدم نہیں چل سکتا۔ تُو واپس آ جا یار! نہیں تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے جا......''

میں رو رہا تھا۔ میرے آتشیں آنسو گھاس میں اور کیچڑ میں جذب ہو رہے تھے۔ عمران کے جانکاہ دُکھ کے سوا ہر طرح کی جسمانی و ذہنی تکلیف جیسے پس منظر میں چلی گئی تھی۔

وہ نہیں مرا...... وہ زندہ ہوگا۔ دل کی گہرائیوں سے ایک صدا بلند ہوئی۔ وہ خطروں کا کھلاڑی ہے۔ وہ ہر رات موت کو جُل دیتا ہے، اس نے آج رات بھی جُل دیا ہوگا۔ وہ کسی نہ کسی طرح بچ گیا ہوگا۔ اس کی جادو کی پٹاری سے کوئی نہ کوئی شعبدہ ایسا ضرور نکلا ہوگا جس نے ''وقت'' کو حیران کر دیا ہوگا اور اب وہ کہیں کھڑا وقت کی حیرانی پر مسکرا رہا ہوگا۔ اس کی مسکراہٹ ناقابلِ شکست تھی۔ آج اتنی جلدی یہ مسکراہٹ شکست کھا کر پانی میں کیسے ڈوب گئی؟ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں...... یہ بعید از قیاس ہے۔ میں اپنے پارہ پارہ دل پر تسلیوں کا مرہم رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

O......❖......O

وہ میری زندگی کی دشوار ترین گھڑیاں تھیں۔ اب میری آنکھیں کسی حد تک اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں۔ یہ جگہ ایک رکھ (درختوں کا ذخیرہ) تھی۔ میں قریباً سات فٹ گہرے ایک مستطیل گڑھے میں تھا۔ اس جنگل میں یہ گڑھا انسانی ہاتھوں نے بنایا تھا اور اس کا مقصد غالباً کسی جانور کا شکار تھا۔ گڑھے کی بالائی سطح کو پتلی شاخوں، پتوں اور مٹی کے ساتھ اس طرح ڈھانپا گیا تھا کہ یہ ایک پھندا بن گیا تھا اور آج اس تاریک بارشی رات میں، ان خوفناک گھڑیوں میں، مَیں اس پھندے کا شکار ہوا تھا۔ یہ پھندا جو کسی جانور کے لیے موت بننے والا تھا، میرے لیے زندگی بنا تھا۔ گڑھے میں میرے گرنے کے بعد میرے اوپر شاخیں، پتے اور بھربھری مٹی گری تھی اور میں مکمل کیموفلاج ہو گیا تھا۔

ہاں...... وہ میری زندگی کی دشوار ترین گھڑیاں تھیں۔ ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔ کچی زمین اور پتوں پر اس کے گرنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ مجھے تلاش کرنے والے میرے قریب نہیں تھے تاہم میرے اردگرد موجود تھے۔ گاہے بہ گاہے مجھے فاصلے سے فائر سنائی دے جاتا یا کسی کے بولنے کی دور افتادہ آواز کانوں میں پڑتی۔

مجھے اندازہ ہوا کہ بارش کے باوجود مجھے سردی محسوس نہیں ہو رہی اور میرا منہ بالکل خشک ہے۔ شاید میرا ٹمپریچر پھر شوٹ اپ کر چکا تھا مگر ان حالات میں بخار اور جسمانی چوٹوں وغیرہ کی اہمیت میرے نزدیک ختم ہو چکی تھی۔ کسی جانور یا سانپ بچھو وغیرہ کا خوف بھی دور پس منظر میں چلا گیا تھا۔ میں نیم مردہ کیفیت میں اپنی جگہ پڑا رہا اور میری آنکھوں سے آتشیں آنسو رستے رہے۔

مجھے یاد آیا کہ لاہور کی تکا شاپ سے ہماری گاڑی کا تعاقب شروع ہونے کے بعد عمران نے اقبال سے کئی بار رابطے کی کوشش کی تھی مگر رابطہ نہیں ہو سکا تھا تو کیا اب اقبال بھی میڈم کے ہرکاروں کی گرفت میں آ چکا تھا؟ اگر ایسا ہوا تھا تو پھر یہ میرے اہلِ خانہ کے لیے بھی از حد خطرناک تھا۔ اقبال کو معلوم تھا کہ میرے گھر والے کہاں ہیں۔ اس کے موبائل میں آصف کا فون نمبر بھی موجود تھا اور یہ آصف ہی تھا جو ڈیفنس والی کوٹھی کی سیکورٹی کا ذمے دار تھا۔ کیا سیٹھ سراج اور اس کے مشتعل ساتھی میرے گھر والوں تک بھی پہنچ جائیں گے؟ یہ سوال ایک آتشیں نیزے کی طرح میرے سینے میں دھنس گیا اور مجھے بے حال کرنے لگا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ نادیہ مر چکی ہے اور اس کی موت نے میڈم صفورا اور اس کے ساتھیوں کو شعلہ جوالا بنا دیا ہے۔ وہ سب کچھ خاکستر کر دینا چاہ رہے ہیں۔ خاص طور سے سیٹھ سراج کی آواز میں، مَیں نے جو درندگی محسوس کی وہ بیان سے باہر تھی۔ یہ ایک ایسے شخص کی آواز تھی جس کے سر پر خون سوار ہو چکا تھا۔

اب بھی میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ جونہی میں سراج اور شیرے وغیرہ کو نظر آیا، میری زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ مجھے ایک سیکنڈ کی مہلت دیئے بغیر چھلنی کر دیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ میری لاش کو بھی چند برسٹ مارے جائیں۔ قبر تو میری پہلے ہی کھدی ہوئی تھی، اس پر بس مٹی ڈالنے کی کسر تھی۔

قریباً دو گھنٹے اسی طرح گزر گئے۔ میں یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ میری بہن، میرا بھائی اور والدہ شدید خطرے میں تھے۔ میں ان کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا مگر یہاں سے کیسے نکلتا؟ میرے گرد موت کا پہرا تھا۔ قاتل شکاری ابھی تک مجھے اس ''رکھ'' میں ڈھونڈ رہے تھے۔ میں

ان کی موجودگی کو محسوس کر رہا تھا۔ پچھلے قریباً آدھ گھنٹے سے کوئی آواز مجھ تک نہیں پہنچی تھی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ میرے اردگرد موجود نہیں ہیں۔ یہ عین ممکن تھا کہ یہ بھی ان کی چال ہو۔ وہ اپنے نہ ہونے کا تاثر دے کر مجھے میری پناہ گاہ سے نکالنا چاہتے ہوں۔ ڈیک نالا اور نالے کے کنارے کھڑی گاڑیاں یہاں سے بہت دور رہ گئی تھیں۔ اگر انہیں اسٹارٹ کیا جاتا تو شاید آواز مجھ تک نہ پہنچ سکتی۔

جلد ہی اندھیرے میں اُجالے کی آمیزش ہونے لگی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ بڑھتی چلی گئی۔ میں نے خود کو کچھ اور بھی جھاڑ جھنکاڑ کے اندر چھپالیا۔ رات ختم ہونے کے ساتھ ہی دل میں یہ خوفناک اندیشہ سر اُٹھانے لگا کہ اب مجھے دیکھ لیا جائے گا۔ اردگرد سے آوازیں اب معدوم ہو چکی تھیں مگر کچھ بھی ناممکن نہیں تھا۔ میں وہیں بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ آسمان پر گہرے بادل تھے اور بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ مجھے اُمید تھی کہ رات کو گاہے بہ گاہے ہونے والی تیز بارش نے میرے قدموں کے نشان بہت حد تک ختم کر دیئے ہوں گے۔ یہ گڑھا یقیناً کسی جنگلی بلے، گدبڑ یا سور وغیرہ کو پکڑنے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ گڑھا تیار کرنے والے یہاں پہنچ جائیں اور ان کی وجہ سے میں اپنا تعاقب کرنے والوں کی نگاہوں میں آجاؤں۔

○.....❖.....○

دوپہر بارہ بجے کے لگ بھگ مجھے اندازہ ہونے لگا کہ میرے اردگرد کوئی موجود نہیں اور اگر میں اس گڑھے سے نکلنا چاہوں تو نکل سکتا ہوں۔ مگر ایک بار پھر میرا فطری تذبذب مجھے ہلکان کرنے لگا۔ کیا دن کی روشنی میں میرا یہاں سے نکلنا ٹھیک ہوگا؟ کیا یہاں سے نکل کر میں درست سمت میں سفر کر سکوں گا؟ کیا اس رکھ کے چوکیدار وغیرہ تو مجھے پولیس کے حوالے نہیں کر دیں گے؟

میں نے اس گڑھے میں تقریباً سات گھنٹے مزید گزار دیئے۔ پچھلے بیس گھنٹے سے میں نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ گلوکوز کی ڈرپ کے ذریعے جو توانائی میرے جسم میں پہنچی تھی وہ کب تک ساتھ دیتی۔ میرے کندھے اور گردن کے زخم آگ کی طرح دہک رہے تھے۔ بخار کے سبب پورا جسم پھنک رہا تھا۔ گڑھے میں گرنے سے جو چوٹیں آئی تھیں، وہ اس کے علاوہ تھیں اور سب سے بڑی چوٹ جسمانی نہیں ذہنی تھی۔ کل رات عمران کے شوٹ ہونے کے منظر کو میں ایک لحظے کے لیے...... صرف ایک لحظے کے لیے بھی بھلا نہیں سکا تھا۔ شاید میں اس کو لفظوں میں بیان نہ کر سکوں اور اگر کرنا بھی چاہوں تو ہزاروں لاکھوں لفظ لکھ کر بھی یکسر ناکام

رہوں۔ میں خود کو بس یہی دھوکا دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے جو دیکھا، وہ بعین وہ نہیں تھا جو نظر آیا۔

اندھیرا گہرا ہو گیا تو میں نے خود کو گڑھے کے گدلے پانی اور کیچڑ سے اوپر اُٹھایا، جسم سے شاخیں اور پتے وغیرہ ہٹائے۔ میں بہ مشکل کھڑا ہو سکا۔ یہ بات تو اب تقریباً طے تھی کہ سیٹھ سراج اور اس کے ہرکارے اس جگہ سے جا چکے ہیں۔ اب مسئلہ یہاں سے باہر نکلنے کا تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر ہاتھ اوپر اُٹھائے تو وہ بآسانی گڑھے کے کنارے تک پہنچ گئے۔ تاہم گڑھے سے نکلنا آسان ثابت نہیں ہوا۔ اس کی ایک وجہ میرا زخمی جسم بھی تھا۔ پانچ چھ منٹ کی کوشش اور کئی ایک تازہ خراشوں کے بعد میں باہر نکل سکا۔ یہی وقت تھا جب قریبی درختوں میں تیز آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے خود کو جلدی سے جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں چھپایا۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ شاید یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے گڑھا کھودا ہے۔ میں چند سیکنڈ تک اردگرد کا جائزہ لیتا رہا۔ یہ کوئی جنگلی جانور تھا جو بڑی سرعت سے ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ میں بس اس کی پرچھائیں ہی دیکھ سکا۔ یہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ کوئی بڑا جنگلی بلا، گیدڑ یا چھوٹے قد کا سور۔ عام حالات میں شاید یہ منظر مجھے سرتاپا لرزا دیتا مگر جب انسان جنگلی درندوں سے بڑھ کر ہلاکت خیز ہو جائیں تو پھر جانوروں کی دہشت ماند پڑ جاتی ہے۔

پانچ دس منٹ تک جھاڑیوں میں رُکنے کے بعد میں نے اندازے سے ایک سمت چلنا شروع کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ میں ڈیک نالے کی مخالف سمت میں جا رہا ہوں مگر یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد میں نے ڈیک نالے کا منحوس شور سنا اور دل کے زخموں کے منہ پھر کھل گئے۔ تازہ خون رسنے لگا۔

اچانک انجن کی آواز سنائی دی۔ میں نے خود کو کیکر اور شیشم کے تناور درختوں کے پیچھے چھپایا۔ یہ ایک ٹریکٹر ٹرالی تھی۔ اس پر بہت سی خشک ٹہنیاں اور درختوں کے چھوٹے چھوٹے تنے لدے ہوئے تھے۔ غالباً یہ سب کچھ ایندھن کے لیے استعمال ہونا تھا۔ ایک اکیلا دیہاتی اس ٹریکٹر کو چلا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میری ہمت بندھی اور میں دل کڑا کر کے اس کے سامنے چلا گیا۔ اس نے ٹریکٹر کی ہیڈ لائٹس میں مجھے دیکھا اور بھونچکا رہ گیا۔ میرا حلیہ کسی کو بھی ششدر کر سکتا تھا۔ پورا جسم کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا۔

''کون ہو؟'' اس نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا۔

''مسافر ہوں بھائی! میری جیپ پیچھے درخت سے لگ کر اُلٹ گئی ہے۔ سخت تکلیف میں ہوں۔ مجھے کسی ڈاکٹر تک پہنچا سکتے ہو؟'' میں نے ایک ہی سانس میں سب کہہ دیا۔ وہ

ٹریکٹر سے اُترا اور میرا جائزہ لینے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد میں اس کے ساتھ ٹریکٹر پر بیٹھا تھا۔ اس کا نام رحمت علی تھا اور وہ ایک قریبی دیہہ روہی پور کا رہنے والا تھا۔ میں اس کے ساتھ گاؤں جانے کا رسک ہرگز نہیں لے سکتا تھا۔ اس کی وجہ ظاہر تھی۔ یہ عین ممکن تھا کہ مجھے تلاش کرنے والوں نے اردگرد کے دیہات کو بھی کھنگالا ہو اور وہاں کے لوگ کسی ''مفرور'' شخص کے لیے الرٹ ہو چکے ہوں۔

بہرحال مجھے یہ جان کر تسلی ہوئی کہ رحمت علی اپنے گاؤں جانے کے بجائے اپنے ڈیرے پر جا رہا ہے۔ اس کے بیوی بچے بھی وہیں تھے۔ اس کا ڈیرا اس رکھ کے پاس ہی ایک بارانی رقبے میں تھا۔

رحمت علی کا رویہ دوستانہ ہی لگ رہا تھا۔ ہم قریباً بیس منٹ میں ڈیرے پر پہنچ گئے۔ گندم ابھی چھوٹی اور ہری تھی۔ اس وسیع و عریض ہریالی کے درمیان رحمت علی کا ڈیرا بس تین چار کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک چھوٹا ٹیوب ویل بھی لگا ہوا تھا۔ دبلا پتلا رحمت علی اور اس کی فربہ اندام بیوی بالکل سادہ سے لوگ تھے۔ انہوں نے میری بات پر من و عن یقین کیا تھا۔ کسی طرح کے سوال جواب کیے بغیر انہوں نے پوچھا کہ وہ میری کس طرح مدد کر سکتے ہیں۔ ایک رات پہلے پیش آنے والے واقعات کا انہیں کچھ پتا نہیں تھا۔ فائرنگ کی دور افتادہ آواز انہوں نے ہو سکتا ہے سنی ہو مگر یہاں شکاری بھی گھومتے رہتے تھے۔ اس طرح کی آوازیں آتی ہی رہتی ہوں گی۔

رحمت علی نے میرے لیے نہانے کا انتظام کیا اور ایک شلوار قمیص بھی مجھے پہننے کے لیے دی۔ یہ میرے سائز کی تو نہیں تھی مگر شلوار کو ذرا نیچے باندھ کر اور جسم کے گرد گرم چادر لپیٹ کر گزارہ ہو گیا۔ مجھے شدید نقاہت تھی مگر میں ایک گلاس دودھ کے سوا کچھ نہ لے سکا۔ قریباً اٹھارہ گھنٹے کیچڑ اور جھاڑ جھنکاڑ میں رہنے کے بعد میرے زخموں کا بُرا حال تھا۔ بخار بھی برقرار تھا۔ بہرطور یہ جسمانی تکلیفیں میرے اندرونی کرب میں دب کر رہ گئی تھیں۔

میں نے رحمت علی کو بتایا۔ ''میں فوری طور پر گھر جانا چاہتا ہوں۔ میرے گھر والے میرے لیے بہت پریشان ہوں گے۔ واپسی پر میں کچھ بندے بھی لے کر آؤں گا تاکہ اپنی گاڑی کو لاہور واپس لے جا سکوں۔''

میری جیب میں کچھ بھیگے ہوئے، کیچڑ آلود کرنسی نوٹ موجود تھے۔ میں نے یہ نوٹ رحمت علی کو دے کر اس سے دوسرے نوٹ حاصل کرنا چاہے لیکن وہ مجھ سے پیسے لینے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوا۔ میرے بے حد اصرار کے باوجود اس نے چار پانچ سو روپے میری

جیب میں ڈال دیئے۔ میں اس کا یہ احسان رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا وقت رخصت چند بھیگے نوٹ خاموشی سے بستر کی چادر کے نیچے رکھ دیئے۔ رحمت مجھے اپنے ٹریکٹر پر تقریباً چار کلومیٹر دور پختہ سڑک تک چھوڑنے کے لیے آیا۔ یہاں اس نے اپنے کسی جاننے والے سے درخواست کی اور وہ مجھے اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا کر جی ٹی روڈ تک لے آیا۔ جی روڈ سے مجھے بس پکڑنے اور لاہور پہنچنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔

جب میں یادگار چوک میں اُترا تو رات کے دس بج رہے تھے۔ یہ وہی یادگار چوک تھا جہاں سے میں اور عمران درجنوں بار موٹر سائیکل پر فراٹے بھرتے ہوئے گزرے تھے۔ آج یہ یادگار چوک بلکہ یہ پورا شہر مجھے ایک ویرانہ لگ رہا تھا۔ ایک ایسا ویرانہ جو کسی جوان بیوہ کی طرح بال کھولے آہ و بکا کر رہا ہو۔ آہ...... کہاں تھا وہ شہریار...... کہاں تھا وہ خندہ جبیں؟ کہاں تھے اس کے قہقہے، اس کی باتیں؟ وہ ایک شخص پورے شہر کو کھنڈر کر گیا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ مجھے حالات کی بھی کچھ خبر نہیں تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ عمران کو پیش آنے والے سانحے کی اطلاع اس کے دوستوں اور ساتھیوں کو ہو چکی ہے یا نہیں۔ اگر ہو چکی ہے تو ان کا ردِعمل کیا رہا ہے۔ راوی روڈ والے گھر جانے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرے ذہن میں آیا کہ شاہین کے گھر کا رُخ کروں لیکن یہ بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ پھر میں نے دل کڑا کیا اور براہِ راست ڈیفنس پہنچنے کا تہیہ کر لیا۔ میں پہلے ہی بہت تاخیر کر چکا تھا۔ اب مجھے جلد از جلد گھر والوں تک پہنچنا چاہیے تھا۔ میں جانتا تھا کہ عمران اور اقبال کے سوا میرے اہلِ خانہ کے ٹھکانے کا کسی کو علم نہیں۔ مجھے زیادہ اندیشہ بھی اقبال ہی کی طرف سے تھا۔ اگر عمران کی طرح وہ بھی سیٹھ سراج اور شیرے کے ہتھے چڑھ چکا تھا تو پھر اس کو بھی بدنصیب سلیم کی طرح تشدد کے شکنجے میں کسا جا سکتا تھا۔ وہ ایسا تشدد تھا کہ پتھر کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتا اور اگر اقبال جو پہلے ہی علیل تھا، بول پڑتا تو پھر سیٹھ سراج اور شیرے کی سفاکی میرے گھر والوں تک بھی پہنچ سکتی تھی۔

میں ایک ٹیکسی میں بیٹھا اور اپنی بے پناہ دھڑکنوں پر قابو پاتا ہوا، براستہ جیل روڈ ڈیفنس کی طرف روانہ ہو گیا۔ دیہاتی لباس میں میرا حلیہ ایسا مناسب نہیں تھا۔ راہ گیروں کی طرح ٹیکسی ڈرائیور نے بھی مجھے سرتاپا گھورا۔ مجھے اس چار دیواری کا پتا ذہن نشین تھا جہاں میں اپنی والدہ، بہن اور بھائی سے مل چکا تھا۔ میں نے ٹیکسی کچھ فاصلے پر رکوا دی۔ خوبصورت کوٹھی کے برآمدے میں روشنی تھی، تاہم گیٹ پر نیلی وردی والا ریٹائرڈ فوجی گارڈ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید وہ صحن میں تھا۔

مین گیٹ پر پہنچا تو گارڈ فوراً باہر آ گیا۔ اس نے مجھے بغور دیکھا اور پہچان لیا۔

’’صاحب! آپ اس وقت یہاں؟ آپ خیریت سے تو ہیں؟‘‘

’’ہاں ...... خیریت سے ہوں۔‘‘ میں نے کہا اور اندر چلا گیا۔ اندر عمران کا قریبی ساتھی آصف بھی موجود تھا۔ وہ میرے چھوٹے بھائی عاطف سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ ابھی تک حالات کی سنگین ترین کروٹ سے بے خبر ہیں۔ میرے دیہاتی حلیے کی وجہ سے عاطف کو بھی مجھے پہچاننے میں تین چار سیکنڈ لگ گئے۔ پھر وہ تیزی سے میری طرف آیا اور بھائی جان کہتے ہوئے مجھ سے لپٹ گیا۔ میرے ہونٹوں سے بے ساختہ کراہ نکل گئی۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹا۔ ’’کیا ہوا بھائی جان؟‘‘ اس نے کہا۔

میرے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ میرے جسم پر زخم ہیں۔ ’’اوہ...... سوری بھائی جان!‘‘ وہ ہکلایا۔ ’’آپ کو شاید چوٹ لگی ہوئی ہے...... اوہو...... آپ تو زخمی لگتے ہیں۔ کک...... کیا ہوا ہے بھائی جان! خیریت تو ہے نا اور عمران بھائی! وہ کہاں ہیں؟ کل دو تین بار اقبال صاحب کا فون بھی آیا تھا۔ وہ آپ کا اور عمران بھائی کا پوچھ رہے تھے۔ آپ دونوں کہاں تھے اور...... اور آپ کے یہ کپڑے؟‘‘

اس نے حسبِ عادت ایک ساتھ کئی سوال پوچھ لیے۔ اس کے چہرے پر تشویش کے سائے گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے۔

اب آصف بھی قریب آ گیا۔ اس نے مجھے سرتاپا دھیان سے دیکھا۔ اس کی معاملہ فہم نظر جان چکی تھی کہ کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ اس نے ہولے سے کہا۔ ’’اندر آ جائیں تابش صاحب!‘‘

میں لڑکھڑاتے قدموں سے انٹرنس کی طرف بڑھا۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں عاطف سے کہا۔ ’’امی اور فرح کو میری چوٹوں کے بارے میں نہیں بتانا۔‘‘

ہم اندر پہنچے۔ پہلی منزل پر والدہ سو رہی تھیں تاہم فرح ابھی جاگ رہی تھی۔ وہ ٹی وی آن کیے بیٹھی تھی اور ساتھ ساتھ سلائی مشین پر کچھ بنا رہی تھی۔ اس نے عاطف کے ساتھ مجھے دیکھا اور پھر ایک دم تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بھی ’’بھائی‘‘ کہہ کر میرے گلے لگی اور مجھے ایک بار پھر درد کی شدید ٹیسیں برداشت کرنا پڑیں۔ کچھ دیر بعد والدہ بھی جاگ گئیں۔ ان کے چہرے پر شدید نقاہت تھی۔ پتا چلا کہ پرسوں سے ان کے کندھوں میں سخت درد ہے۔ وہ کافی عرصے سے ’’فریزڈ شولڈرز‘‘ کی تکلیف میں مبتلا تھیں۔ سرد ہوا میں گھومنے پھرنے سے یہ تکلیف فوراً عود کر آتی تھی۔ ان کے سرہانے سائیڈ ٹیبل پر تین چار دوائیں بھی رکھی تھیں۔

بہرحال میری آمد کی خوشی میں وہ اپنی تکلیف بھول گئیں اور تکیے کے سہارے اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے کئی بار میرا ماتھا چوما۔ پھر میرے حلیے کی وجہ پوچھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں کل عمران کے ساتھ ایک دیہاتی علاقے میں تھا۔ وہاں بارش اور کیچڑ کی وجہ سے کپڑے خراب ہو گئے تھے۔ عمران کے ایک مقامی دوست کے کپڑے پہننا پڑے۔ انہوں نے میرے چہرے کی خراشوں کو بھی شک کی نظر سے دیکھا اور ایک دو سوال پوچھے۔

والدہ کی نگاہیں مسلسل عمران کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ انہوں نے پوچھا۔ ’’لیکن وہ ہے کہاں؟‘‘

اس سوال کا جواب دنیا کا مشکل ترین جواب تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور کہا۔ ’’وہ ساتھ نہیں ہے امی جی۔‘‘

فرح مسکرا کر بولی۔ ’’وہ تو کہتے تھے کہ ہم جب آئیں گے، اکٹھے ہی آئیں گے۔ کیونکہ ہم ایک دوسرے کی دُم کی طرح ہیں۔ یہ دیکھیں میں نے ان کی شرٹ بھی ٹھیک کر دی ہے۔‘‘

اس نے پُرانی شرٹ میرے سامنے پھیلائی۔ فرح نے شاید اس کو نئی سلائیاں لگائی تھیں۔

’’یہ کیا ہے؟‘‘ والدہ نے پوچھا۔

’’عمران بھائی کی شرٹ۔ پچھلی دفعہ مجھے دے کر گئے تھے۔ کہتے تھے کہ میں اسے ٹھاک کر دوں۔‘‘

’’ہائے۔‘‘ والدہ نے کہا۔ ’’اتنی پُرانی قمیص مرمت کرانے کی کیا ضرورت تھی؟ اللہ کا کرم ہے، اس کے پاس پیسوں کی کوئی کمی ہے؟‘‘

’’امی جی! کچھ چیزیں پیسوں سے نہیں خریدی جا سکتیں۔‘‘ فرح مسکراتے لہجے میں بولی۔ ’’ہو سکتا ہے کہ اس قمیص سے عمران بھائی کی کچھ بڑی اچھی اچھی یادیں جڑی ہوئی ہوں۔ ہم نے بھی تو ابھی تک ابو جی کی دو شیروانیاں سنبھالی ہوئی ہیں نا۔ ہاں...... شیروانی سے یاد آیا کہ عمران بھائی بھی شیروانی کی بات کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ بچپن میں ان کی والدہ نے انہیں بھی شیروانی پہنائی تھی۔ وہ اتنی لمبی تھی کہ اس کے نیچے کچھ پہننے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی۔ بس ٹخنوں تک بٹن بند کرتے چلے جاؤ۔ دراصل عمران بھائی کی والدہ نے چالاکی دکھائی تھی۔ عمران بھائی ایک سیکنڈ بھی نچلے نہیں بیٹھتے تھے۔ ہر وقت بھاگ دوڑ کرتے تھے انہوں نے ایسی شیروانی پہنا دی کہ وہ بھاگ ہی نہ سکیں۔‘‘ فرح ہنسنے لگی۔

والدہ بڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ''کیا بات ہے تابش! تم...... کچھ چھپا رہے ہو...... تمہیں چوٹیں بھی لگی ہوئی ہیں۔ کیا...... بات...... ہے۔ کہیں کوئی جھگڑا وغیرہ ہوا ہے۔''

میں نے اپنا سر تھام کر جھکا لیا۔ آنسو ایک دم ہی گرم پانی کے آبشار کی طرح آنکھوں سے گرنے لگے۔ ''ہائے میں مرگئی۔'' والدہ نے کہا اور میرا چہرہ اوپر اُٹھانے کی کوشش کرنے لگیں۔

''کیا بات ہے بھائی! عمران بھائی تو خیریت سے ہیں؟'' فرح نے بھی روہانسی آواز میں پوچھا۔

میں نے دل کڑا کر کے کہا۔ ''ہاں...... سب خیریت سے ہیں، کوئی ایسی بات نہیں۔ لل...... لیکن یہاں اب آپ لوگوں کے لیے بہت خطرہ ہے۔ ہمیں فوراً یہاں سے چلنا ہوگا۔ اسی وقت نکلنا ہوگا۔'' میری آواز بے طرح لرز رہی تھی۔

میرے انداز نے سب کو ایک دم ہراساں کر دیا۔

''مگر عمران بھائی آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئے؟'' عاطف نے میرا شانہ تھاما۔ ''کل بھی ان کا کچھ پتا نہیں تھا۔ آج آصف بھی سارا دن فون کرتا رہا ہے، پر ان کی طرف سے یا آپ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔''

''یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں تفصیل آپ لوگوں کو بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال ہمیں فوراً یہاں سے ہے۔''

''ہم...... کہاں جائیں گے تابی! پہلے ایک دم اپنے گھر سے نکلے، اب تم ایک دم یہاں سے نکلنے کے لیے کہہ رہے ہو۔ کیا ہم اس طرح بھاگتے ہی رہیں گے؟''

''بس امی جی! حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے ہیں۔ مم...... مجھے عمران نے ہی بھیجا ہے وہ چاہتا ہے کہ ہم فوراً یہاں سے نکل جائیں۔''

''پر وہ تو کہتا تھا تابی! کہ یہاں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ ہم دس سال بھی یہاں رہیں تو کوئی ڈر خطرہ نہیں۔''

''غیب کا علم تو کسی کو نہیں ہوتا نا امی! آپ بس چلنے کی تیاری کریں۔'' میری آواز میں لرزش بڑھتی جا رہی تھی۔

آصف مجھے ایک طرف لے گیا اور سرگوشی میں بولا۔ ''تابش بھائی! آپ کچھ چھپا تو نہیں رہے؟'' میں نے آنسو چھپا کر ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔ ''لیکن آپ یہاں سے جانے کی بات کیوں کر رہے ہیں؟ آپ اس طرح کیسے جا سکتے ہیں؟''

''کیا مطلب؟''

''ہیرو بھائی نے اس بارے میں ہمیں سختی سے ہدایت کی ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس چار دیواری سے باہر ماں جی، عاطف اور فرح بی بی کے لیے خطرہ ہے۔''

''لیکن اب یہاں خطرہ زیادہ ہے آصف۔''

''گستاخی معاف تابش بھائی! اگر ایسی بات ہے تو پھر ہیرو بھائی کو خود بات کرنی چاہیے۔ ان کے پاس میرے اور گارڈ خادم حسین دونوں کے فون نمبرز ہیں۔''

''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میرے گھر والے یہاں یرغمال ہیں۔ وہ میری مرضی سے بھی کہیں نہیں جا سکتے؟'' میں نے جھڑک کر کہا۔

''نہیں...... نہیں تابش بھائی! آپ کیسی بات کہہ رہے ہیں؟ ہماری اتنی جرأت ہے کہ ایسا سوچ سکیں۔ ہماری حیثیت تو آپ کے نوکروں کی ہے...... مگر......''

''مگر کچھ نہیں آصف!'' میں نے بڑے درد سے اس کا کندھا تھاما۔ ''میں اس وقت تمہیں تفصیل نہیں بتا سکتا لیکن حقیقت یہی ہے کہ عمران اس وقت فون نہیں کر سکتا اور ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکلنا ہے۔ جتنی دیر ہوگی، خطرہ اتنا ہی بڑھتا جائے گا۔''

آصف کے چہرے پر اُلجھن ہی اُلجھن تھی۔ وہ پیشانی کھجاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن تابش صاحب! اقبال بھائی سے بھی رابطہ نہیں ہو پا رہا۔''

''اور یہی زیادہ خطرناک بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ یہ کوٹھی بڑی جلدی سراج وغیرہ کی نظر میں آنے والی ہے۔ اقبال کے سیل فون میں تمہارا نمبر بھی سیو ہے۔ تمہارے نمبر پر کوئی مشکوک کال تو نہیں آئی؟''

اس سے پہلے کہ آصف جواب میں کچھ کہتا، گراؤنڈ فلور سے سابق فوجی گارڈ کی آواز آئی۔ ''آصف بھائی! ذرا نیچے آنا۔'' اس کے لہجے میں عجلت تھی۔

''میں ابھی آیا۔'' آصف نے مجھ سے کہا اور تیزی سے زینے اُتر کر نیچے چلا گیا۔

میں ایک بار پھر والدہ اور فرح وغیرہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ والدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ جسمانی تکلیف کے ساتھ ساتھ اب پریشانیوں نے بھی ان کے چہرے پر ڈیرے جما لیے تھے۔ فرح بھی بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ وہ سب سمجھ گئے تھے کہ یہ رات ایک بار پھر ان کے لیے خانہ بدوشی کا اذن لے کر آئی ہے۔

اگلے پانچ منٹ میں، مَیں نے والدہ سمیت سب کو یہاں سے نکلنے کے لیے تیار کیا۔ فرح میری ہدایت کے مطابق جلدی جلدی سامان سمیٹنے لگی۔ سامان تھا ہی کتنا؟ گھر سے نکلتے ہوئے والدہ نے فرح کے لیے بنایا ہوا کچھ زیور ساتھ لیا تھا، اس کے علاوہ تیس چالیس ہزار روپے نقد اور اتنے کے ہی ڈیفنس سرٹیفکیٹ تھے۔ باقی جو سامان تھا، وہ ہمارے ذاتی گھر میں پڑا ہوا تھا۔

ضروری کپڑے اور دیگر چیزیں فرح نے کانپتے ہاتھوں سے ایک اٹیچی میں بند کرلیں۔ عاطف نے اپنی کتابیں، امی کی دوائیاں اور دیگر چھوٹا موٹا سامان ایک بڑے شولڈر بیگ میں رکھنا شروع کیا۔ میں اس کام میں اس کی مدد کررہا تھا۔ یہ اندیشہ ابھی تک میرے ذہن میں موجود تھا کہ آصف ہمارے یہاں سے نکلنے میں کہیں رکاوٹ نہ ڈالے۔

اچانک مجھے زیریں منزل سے عجیب سی آواز سنائی دی۔ جیسے کوئی تیزی سے بھاگا ہو پھر کوئی وزنی چیز گری ہو۔ میں چونک کر کامن روم کی طرف آیا۔ یہاں میں نے جنگلے سے نیچے جھانکا تو میرا سر لٹو کی طرح گھوم گیا۔ اس کے ساتھ ہی یوں لگا جیسے میرا پورا جسم الیکٹرک شاک کی زد میں ہے۔ شاید شب و روز ہی کچھ ایسے تھے۔ میری آنکھوں کی قسمت میں بدترین مناظر کی دیکھ لکھ دی گئی تھی۔

میں نے آصف کو دیکھا۔ وہ ٹی وی ٹرالی کے قریب گرا ہوا تھا۔ دو بندے اس سے چمٹے ہوئے تھے۔ ایک نے پوری طاقت سے اس کا گلا دبایا ہوا تھا۔ دوسرا اس کے منہ پر اندھا دھند گھونسے رسید کررہا تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ پُرہول منظر ایک اور تھا۔ مجھے داخلی دروازے کے بالکل قریب براؤن فرشی ٹائلز پر گارڈ خادم حسین کی ٹانگیں نظر آئیں۔ وہ گرا پڑا تھا اور بالکل بے حرکت تھا۔ اس کا بالائی دھڑ میری نظر سے اوجھل تھا، تاہم شواہد بتا رہے تھے کہ وہ شدید زخمی ہے یا مر چکا ہے۔ اس کے بالائی دھڑ کی طرف سے خون بہہ کر ٹانگوں کی طرف آرہا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا۔ کامن روم سے گزرنے کے بعد میں نے جو سب سے پہلا کام کیا، وہ یہ تھا کہ درمیانی دروازہ لاک کردیا۔ اب کامن روم اور سیڑھیاں باقی کے پورشن سے علیحدہ ہوگئے تھے۔ کم از کم وقتی طور پر علیحدہ ہوگئے۔

میں چلایا۔ ''عاطف! بھاگو یہاں سے۔ وہ آگئے ہیں۔'' میری آواز دہشت سے بگڑی ہوئی تھی۔

''کون آگئے؟'' عاطف نے بھی بلند آواز میں پوچھا۔

''میڈم کے لوگ۔ انہوں نے خادم حسین کو مار دیا ہے۔ وہ ماردیں گے سب کو...... نکلو

یہاں سے۔''

والدہ کے چہرے کا جیسے سارا خون نچڑ گیا تھا۔ وہ سکتے کے عالم میں بیٹھی میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ اپنی کمر اور کندھوں کی تکلیف کے سبب وہ فوری طور پر اُٹھ بھی نہیں سکتی تھیں۔ عاطف اٹیچی بند کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے اٹیچی کو ٹھوکر ماری۔ ''عاطف! لعنت بھیجو اس پر۔ نکلو فرح کو لے کر نکلو۔''

عاطف، فرح کی طرف لپکا تو میں والدہ کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب کامن روم میں کھلنے والا دروازہ دھڑا دھڑ بجنا شروع ہوگیا۔ فرح کا چہرہ ہلدی ہو چکا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں پھر چلایا۔ ''فرح! نکلو یہاں سے۔''

عاطف نے فرح کا ہاتھ تھاما اور وہ دونوں دوڑتے ہوئے ٹیرس کی طرف چلے گئے۔ وہ ٹیرس کی چار فٹ اونچی ''سائیڈ وال'' کراس کرکے بآسانی ساتھ کی زیرتعمیر کوٹھی میں داخل ہو سکتے تھے۔ میں نے کراہتی ہوئی والدہ کو سہارا دے کر بمشکل بیڈ سے اُتارا۔ ابھی میں ان کے ساتھ بیڈ روم کے دروازے تک ہی پہنچ پایا تھا کہ باہر سے لگنے والے زوردار دھکوں سے دروازہ ٹوٹ گیا۔ میری سمجھ میں اور تو کچھ نہیں آیا، میں والدہ کو لے کر ایک ساتھ والے دروازے میں گھس گیا اور دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ میں کہاں گھسا ہوں۔ چند ہی سیکنڈ بعد یہ دروازہ بھی دھڑا دھڑ بجایا جانے لگا اور پھر میرے کانوں میں چھوٹے سر اور موٹے جسم والے سیٹھ سراج کی منحوس آواز داخل ہوئی۔ ''دروازہ کھول دے کاکے! آج توں بچ نہیں سکدا۔''

اس کے ساتھ ہی دروازے کو زوردار دھکے مارے گئے۔

مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ میں جس کمرے میں داخل ہوا ہوں، یہ چاروں طرف سے بالکل بند ہے۔ کوئی کھڑکی، کوئی روشندان موجود نہیں تھا۔ اس کمرے کا دروازہ بھی لکڑی کے بجائے لوہے کی وزنی چادر کا تھا۔ یہاں شفاف لمبوتری میز پر دو تین کمپیوٹر پڑے تھے۔ اس کے علاوہ کپڑے کی ایک اسکرین تھی اور اس کے سامنے آٹھ دس کرسیاں ترتیب سے رکھی تھیں۔

میں نے والدہ کو ایک کرسی پر بٹھایا اور خود خوفزدہ نظروں سے دروازے کو دیکھنے لگا۔ دروازے پر شاید رائفلوں کے بٹ برسائے جا رہے تھے۔ ساتھ ساتھ سراج، شیرے اور ان کے ساتھیوں کے گرجنے برسنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ میری چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ وہی ہوا ہے جس کا خطرہ تھا۔ اقبال پکڑا جا چکا ہے اور اس کے ذریعے میڈم کے لوگ اس کوٹھی

تک پہنچ گئے ہیں۔

والدہ نے میرا بازو تھاما اور کراہتی ہوئی آواز میں بولیں۔ ''اب کیا ہوگا تابی! یہ کون لوگ ہیں؟ کیا چاہتے ہیں تم سے...... ان کے سروں پر تو خون سوار ہے۔ ہائے ربا! اب کیا ہو گا؟''

میں والدہ کو کیا تسلی دیتا۔ میں تو خود خوف کے ایک عمیق سمندر میں ڈوبتا چلا جارہا تھا۔

''تمہارے پاس موبائل نہیں ہے تابی! تم ون فائیو پر فون کر دیا پھر عمران کو بتاؤ۔''

''نہیں امی! فون نہیں ہے۔'' میری آواز بمشکل ہونٹوں سے نکل پائی۔

یوں لگتا تھا کہ والدہ کو کچھ ہو جائے گا۔ ان کی رنگت نیلی پڑتی جا رہی تھی۔ میں نے انہیں اپنے ساتھ لگا لیا۔ ان کا سر چومنے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ کسی معجزے کا انتظار کرنے لگا۔ کوئی ایسا کرشمہ جس سے میری اور والدہ کی جان بچ جائے۔ ان بدترین حالات میں اگر مجھے تھوڑی سی تسلی تھی تو صرف اس بات کی کہ فرح اور عاطف یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے مگر ابھی اس بارے میں بھی پورے یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ ٹیرس سے نکل کر ساتھ والی زیر تعمیر کوٹھی میں داخل ہوئے تھے۔ اگر سیٹھ سراج کے ساتھی اردگرد نظر رکھے ہوئے تھے تو پھر ان کے پکڑے جانے کا امکان بھی موجود تھا۔

میں کسی پلاننگ کے تحت اس کمرے میں داخل نہیں ہوا تھا۔ تاہم لگتا تھا کہ اس کوٹھی کے اندر شاید محفوظ ترین کمرہ ہے۔ ایک دروازے کے سوا اندر آنے کا کوئی راستہ نہیں تھا اور یہ دیوانہ وار دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے مگر ناکام تھے۔ اب وہ ضربیں نہیں لگا رہے تھے۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ اس طرح کا شور کسی قریبی کوٹھی کے مکینوں کو متوجہ کر سکتا ہے۔ وہ اب دروازے کو دھکیل رہے تھے اور کسی آہنی بار کے زور سے اس کا کھٹکا توڑنے کی سعی کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ سراج کی غضب ناک وارننگ بھی سنائی دے جاتی تھی۔ وہ دھاڑ رہا تھا۔ ''دروازہ کھول دو۔ نہیں تو بڑی بھیڑی طرح پچھتاؤ گے۔ بڑا تڑفا کر ماروں گا تمہیں۔''

''گیس چھوڑ دیں جی کمرے میں۔ مر جائیں گے کتے یا باہر نکل آئیں گے۔''

پتا نہیں کہ وہ کس گیس کی بات کر رہا تھا؟ مگر ایک بات واضح تھی۔ یہ مضبوط دروازہ انہیں راستہ نہیں دے رہا تھا۔

میں نے کمرے میں اندھا دھند ہاتھ چلا کر کوئی فون یا سیل فون ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوا۔ میں جانتا تھا کہ یہ دروازہ کتنا بھی مضبوط ہوا، بہت دیر تک ہمیں محفوظ نہیں رکھ سکے گا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اندر داخل ہو جائیں گے اور اس کے بعد...... اس کے بعد

ایک وحشت ناک تاریکی کے سوا کچھ دکھائی اور سجھائی نہیں دیتا تھا۔ والدہ نے نڈھال ہو کر کرسی کی لمبی نشست سے ٹیک لگائی۔ ان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

''یا اللہ! میرے بچوں کو بچا لے۔ یا اللہ! تُو ہی ان کا حافظ و ناصر ہے۔'' وہ بار بار یہی فقرہ بول رہی تھیں۔ میں نے ان کا لرزاں سر اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ کراہیں۔ ''اب اس دنیا میں کوئی کس پر بھروسہ کرے۔ اب، وہ تیرا یار کہتا تھا کہ ہم پر کوئی آنچ نہ آنے دے گا۔ ہمیں کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی نہ ہوگی۔ اب وہ کہاں ہے؟ اس کے گھر میں ہی ہم پر قیامت ٹوٹ رہی ہے۔'' ان کا اشارہ عمران کی طرف تھا۔

میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''امی جی! اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ یہ سب میرا کیا دھرا ہے۔ میں ہی مجرم ہوں آپ سب کا۔ جو کچھ ہوا ہے، میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں...... آپ سب کو لے ڈوبا ہوں۔''

اچانک سوئی گیس کی تیز بُو محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی کسی پائپ سے گیس کے خارج ہونے کی تیز آواز بھی سنائی دی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ یہ آواز چھت کے قریب لگے چھوٹے سے ایگزاسٹ فین سے آ رہی تھی۔ ان لوگوں نے سوئی گیس کا کوئی پائپ کاٹ کر وہاں تک پہنچایا تھا اور اب کمرے میں گیس داخل کر رہے تھے۔ والدہ بُری طرح کھانسنے لگیں۔ میری سمجھ میں کچھ اور تو نہیں آیا، میں نے ایگزاسٹ فین کا بٹن ڈھونڈ کر آن کر دیا۔ ایگزاسٹ فین بس ذرا سی حرکت کر کے رہ گیا۔ ان لوگوں نے اس میں کوئی چیز پھنسا کر اسے چلنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ فین اتنی بلندی پر تھا کہ وہاں تک پہنچ کر اس کے خلا میں کوئی کپڑا وغیرہ بھی ٹھونسا نہیں جا سکتا تھا۔

دو منٹ کے اندر اندر ہمارے سانس اُکھڑنے لگے۔ میں نے بیتاب ہو کر والدہ کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ ان کی کمر سہلانے لگا۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ سیٹھ سراج، شیرا اور ان کے ساتھی بھرا مار کر اندر گھس آئے۔ ان کے چہرے وحشت سے بگڑے ہوئے تھے۔ سیٹھ سراج نے ایک زناٹے کا تھپڑ میرے منہ پر رسید کیا اور میں لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگا۔ شیرے نے رائفل کی نال میرے سر سے لگا دی۔ کم از کم چار مزید افراد اندر گھس آئے۔ ان میں سے ایک دو کے ہاتھ میں آتشیں اسلحہ تھا۔ میرے دروازہ کھولنے کے فوراً بعد ہی کمرے میں سوئی گیس کی آمد بند ہو گئی تھی۔ تاہم تیز بُو ابھی موجود تھی۔ والدہ بُری طرح کھانس رہی تھیں۔

ہمیں اس کمرے سے نکال کر ساتھ والے کمرے میں پہنچایا گیا۔ والدہ کو کھڑکی کے

پاس ایک صوفے پر پھینک دیا گیا۔ پھر سیٹھ سراج اور شیرے نے مجھے سر کے بالوں سے پکڑا اور کھینچ کر والدہ کے قریب فرش پر پٹخ دیا۔ شیرے نے رائفل کا بٹ میرے سینے پر مارا۔ مجھے لگا کہ میری ایک آدھ پسلی چٹخ گئی ہے۔ جب اس نے دوسرا وار کرنا چاہا تو والدہ تڑپ کر میرے اوپر گر گئیں۔ ''نہیں...... خدا کے لیے نہیں...... میرے بچے کو کچھ نہ کہو۔ میری جان لے لو۔''

سیٹھ سراج نے والدہ کو گھسیٹ کر مجھ سے جدا کیا۔ ''تیری جان بھی ضرور لیں گے۔ پہلے تیرے اس بدمعاش پتر اور اس کے یاروں سے تو حساب کتاب برابر کرلیں۔''

''خدا کے لیے نہیں۔'' والدہ، سیٹھ کے پاؤں سے چمٹ گئیں۔

اس نے ایک ٹھوکر سے انہیں پیچھے کیا۔ یہ میری برداشت سے باہر تھا۔ میں نے سیٹھ سراج پر جھپٹنا چاہا لیکن راستے میں ہی شیرے کی رائفل کی زوردار ضرب میری گردن پر لگی اور میں اُلٹ کر ٹی وی کے اوپر جا گرا۔ ٹی وی نیچے گر کر چکنا چور ہوا اور ہر طرف چنگاریاں بکھر گئیں۔ میری اس جرأت کی سزا دینے کے لیے شیرا اور اس کے کئی ساتھ مجھ پر پل پڑے۔ میرا جسم جیسے ایک دم ہی وزنی ہتھوڑوں کی زد میں آ گیا۔ مجھے کچھ ویسا ہی احساس ہوا جیسا سیٹھ سراج سے پہلی مڈبھیڑ پر ہوا تھا۔ چلڈرن پارک میں، مَیں سیٹھ سراج پر جھپٹا تھا اور اس کے فوراً بعد سیٹھ کے ہرکاروں نے مجھے بیدردی سے زدوکوب کرنا شروع کر دیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ تب والدہ میرے پاس نہیں تھیں۔

آج وہ پاس تھیں اور ایک ماں کے لیے اس سے بڑا امتحان اور کیا ہوسکتا تھا؟ سفاک لوگ آنکھوں میں قاتلانہ چمک لیے اس کے بیٹے کو اس کے سامنے روئی کی طرح دھنک رہے تھے۔ وہ بیٹا جسے انہوں نے خاص ناز و نعم سے پالا تھا۔ جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ بچپن سے کمزور ہے اور اسے زیادہ توجہ و محبت کی ضرورت ہے۔ جس کی چھوٹی سی تکلیف پر وہ غیر معمولی بیتابی کا مظاہرہ کیا کرتی تھیں۔

یکا یک سیٹھ سراج نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے گماشتوں کو روک دیا۔ انہوں نے میرا خون آلود چہرہ فرش کی طرف کیا اور میرے ہاتھ پیچھے موڑ کر کس کر رسّی سے باندھ دیئے۔ تب مجھے گھسیٹ کر دیوار کے سہارے بٹھا دیا گیا۔

والدہ صوفے پر تھیں اور ایک ہٹے کٹے غنڈے نے انہیں سر کے بالوں سے یوں جکڑ رکھا تھا کہ ان کی گردن ایک طرف مڑ گئی تھی اور وہ حرکت بھی نہیں کرسکتی تھیں۔

''میری ماں کو چھوڑ دو۔ ان کا کوئی قصور نہیں۔'' میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اس حرامجادی کا یہ قصور کم ہے کہ اس نے تجھے پیدا کیا ہے۔'' سیٹھ سراج پھنکا دیا۔ اس نے ہم ماں بیٹے پر مشترکہ طور پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

اسی دوران میں اس کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے موبائل آن کیا
آواز میں بولا۔ ''ہاں بختیارے! کیا بنا؟''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جسے سن کر سیٹھ سراج کا طیش بڑھ گیا۔ وہ د
بولا۔ ''اوئے کیا نامردوں جیسی گل کر رہا ہے؟ وہ تو ملوکڑی سی کڑی ہے اور ملوکڑا سا
وہ تو زیادہ بھج (بھاگ) بھی نہیں سکدے۔ اِدھر ہی کہیں آلے دوالے ہوں گے۔ ڈھ
کو۔''

واضح تھا کہ سیٹھ سراج، فرح اور عاطف کی بات کر رہا ہے۔ ان لوگوں نے غالباً انہیں کوٹھے سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا اور ان کے پیچھے لگ گئے تھے مگر شکر کی بات یہ تھی کہ وہ ابھی تک ان کے ہاتھ نہیں لگے تھے۔

پھر سیٹھ سراج کے فون پر ایک اور کال آ گئی۔ وہ بات کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ دو تین منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کی آنکھوں کی سرخی بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''تیرا موبائل کہاں ہے؟''

''موبائل نہیں ہے میرے پاس۔'' میں کراہا۔

اس کے اشارے پر شیرے نے بڑی سختی سے میری جامہ تلاشی لی۔ موبائل نہیں ملا۔ عمران والی ڈائری ابھی تک میری قمیص کی بغلی جیب میں تھی۔ شیرے نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ سیٹھ سراج نے اپنے ایک ساتھی سے موبائل فون لیا اور میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تیری بہین اور بھائی میں سے کسی کے پاس تو موبائل ہوئے گا۔ چل کسی اک کا نمبر بتا۔ چل شاباش جلدی کر۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ وہ فرح یا عاطف کے ساتھ میرے ذریعے رابطہ کر کے ان تک پہنچنا چاہ رہا تھا اور یہ نہایت خطرناک صورتِ حال تھی۔

میں نے خاموشی اختیار کی تو اس نے شیرے کو اشارہ کیا۔ شیرے نے ایک ''بریٹا پسٹل'' اپنی براؤن قمیص کے نیچے سے نکالا اور ماں جی کی گردن پر رکھ دیا۔ اس پسٹل پر آٹھ دس انچ لمبا سائیلنسر چڑھا ہوا تھا۔ شاید نیچے خادم حسین کو اسی پسٹل سے گولی ماری گئی تھی۔ سراج پھنکارا۔ ''میں تجھ کو صرف پندرہ سیکنڈ کی مہلت دیتا ہوں۔ ماں کو بچانا چاہندا ہے تو ان دونوں میں سے کسی کا نمبر بتا دے۔ میں پھر کہندا ہوں۔ پندرہ سیکنڈ ہیں تیرے پاس، گھڑی

پاس آیا۔"
اور کھینچ کے ساتھ ہی اس نے اپنی گھڑی دیکھنی شروع کر دی۔ پانچ سیکنڈ پورے ہوئے تو
لگا کہ میرز "پانچ" دس سیکنڈ پورے ہونے پر کہا۔ "دس"
میرے اوپر مساموں سے پسینہ بہہ نکلا۔ محسوس ہوا کہ دل پسلیوں کو توڑ کر باہر نکل آئے گا۔
لے لو۔" تھا۔ "بارہ...... تیرہ...... چودہ۔"
سیٹھ...... ٹھہرو۔" میں بلکا۔ "ایسا مت کرو۔ میں قسم کھاتا ہوں......"
پہلے تیر س بند کر۔" سیٹھ سراج نے بڑی وحشت سے میری بات کاٹی۔
یرے نے ماں جی کو بازو سے کھینچا اور سیدھا بٹھا دیا۔ وہ چلاّ اُٹھیں۔ "ہائے میرا
رھا۔"

"کیا ہوا ہے تیرے مونڈھے (کندھے) کو؟" سیٹھ سراج نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

"مم...... میرے مونڈھے درد کرتے ہیں۔ ہل نہیں سکتے۔" ماں جی کربناک آواز میں بولیں۔

"ہم بالکل ٹھیک ٹھاک کر دیندے ہیں تیرے مونڈھے کو۔" سیٹھ نے کہا اور اس کے ساتھ ہی شیرے کو آنکھ سے اشارہ کیا۔

شیرے نے بریٹا پسٹل کا سائیلنسر بے رحمی سے ماں کے "فروزن شولڈر" پر رکھ دیا۔ سیٹھ سراج نے مجھ سے مخاطب ہو کر زہر اُگلا۔ "بتا...... اپنی بے بے کے مونڈھے پر ٹیکا لگوانا ہے کہ اپنی بھین اور بھائی کا نمبر دینا ہے؟"

میرا منہ بالکل خشک ہو چکا تھا۔ لگتا تھا کہ بولنے کی سکت ہی نہیں رہ گئی۔ میں نے بے بسی کی انتہا کو چھو کر سیٹھ سراج کی طرف دیکھا۔ اس نے شیرے کو اشارہ کیا۔ بے مثال سفا کی کے ساتھ شیرے نے ٹریگر دبا دیا۔ سائلنسر لگے پسٹل میں سے ٹھک کی مخصوص آواز برآمد ہوئی اور ماں جی کا کندھا ایک جھٹکے سے پیچھے کو گیا۔ انہوں نے ماں جی کے کندھے میں گولی اُتار دی تھی۔

وہ تڑپ کر صوفے پر گریں اور کرب کی انتہا کو چھو کر رونے لگیں۔ وہ بے حس درندے تھے۔ ایسی ہی سفید بالوں اور نم آنکھوں والی مائیں ان کے گھروں میں بھی ہوں گی اور یہ ماں تو پہلے ہی بیمار تھی، درد سے بے حال تھی لیکن وہ سنگ دل ذرا پشیمان نہیں ہوئے۔ ماں جی کے زخمی کندھے سے خون بہہ کر نیلے صوفے پر گلکاریاں کرنے لگا۔

سیٹھ سراج کے اشارے پر شیرے نے پسٹل ماں جی کے دوسرے کندھے سے لگا دیا۔ سراج نے اپنی چھوٹی چھوٹی کینہ پرور آنکھوں سے مجھے گھورا اور بولا۔ "ہاں...... اب بتا کاکا! اپنی بے بے کے دوجے مونڈھے پر بھی ٹیکا لگوانا ہے کہ کچھ بکنا ہے؟"

میرے لیے جیسے زمین آسمان کے قلابے مل چکے تھے۔ ایک طرف تڑپتی ہوئی ماں تھی، دوسری طرف بہن اور بھائی...... لیکن بہن اور بھائی اوجھل تھے۔ ماں سامنے تھی اور جو کچھ آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے، وہ زیادہ عذاب ناک ہوتا ہے۔

میرا منہ اتنا خشک تھا کہ بولنے کے قابل نہیں تھا۔ میں نے پانی مانگا۔ ایک شخص نے گلاس میں پانی دیا۔ میرے ہاتھ عقب میں بندھے ہوئے تھے۔ اس نے خود ہی چند گھونٹ پلائے اور بے رحم مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر چند قدم دور کھڑا ہو گیا۔ سیٹھ سراج نے اپنے جوتے کی نوک سے میری ٹھوڑی اوپر کی اور اپنی زہریلی نگاہیں میری آنکھوں میں گاڑیں۔ اس کی ریچھ جیسی چمکیلی آنکھیں جیسے بہ زبان خاموشی کہہ رہی تھیں۔ تجھے کہا تھا نا مجھ سے متھا نہ لگانا، نئیں تو بات بہت دور تک جائے گی۔ تُو نے میرے منہ پر چپیڑ ماری تھی اور اس چپیڑ کے لیے میں نے تجھے پوری مافی نئیں دی تھی اب تیرے نال نال تیری ماں اور تیری جوان بھین کو بھی تیرے کیے کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

میں سیٹھ سراج کی وحشی آنکھوں میں نہیں دیکھ سکا اور نظریں جھکا لیں۔ وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ "کاکا جی! زیادہ ٹائم نئیں ہے۔ جلدی بکواس کرو۔ نئیں تو دوجے کندھے میں دوجا ٹیکا لگ جائے گا اور پھر شاید تیسرا ٹیکا لگے گا اور یہ لگے گا بے بے جی کے سر کی ہانڈی میں۔ ہانڈی کے دو تین ٹوٹے ضرور ہو جائیں گے۔ چلو شاباش فون نمبر بولو۔"

میں نے دھندلائی نظروں سے دیکھا، ماں جی کی سانس پھنس کر آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ گولی کندھے میں لگ کر پسلیوں کی طرف چلی گئی ہے۔ شیرے کی بے مہر اُنگلی پھر پسٹل کے ٹریگر پر تھی۔ کسی بھی وقت "ٹھک" کی منحوس آواز دوبارہ اُبھر سکتی تھی۔ میں ٹوٹ گیا، ریزہ ریزہ ہو گیا۔ میں نے لڑکھڑاتی آواز میں چھوٹے بھائی عاطف کا سیل نمبر بتایا اور اس کے ساتھ ہی دل کی گہرائیوں سے دعا کی کہ یہ نمبر اٹینڈ نہ ہو سکے۔

سراج نے فون نمبر موبائل سیٹ پر پریس کیا اور کال ملانے سے پہلے بولا۔ "دیکھ کاکے! اپنے بھائی سے وہی بولنا پڑے گا جو تجھ کو بتا رہیا ہوں۔ اک لفظ بھی دائیں بائیں کرے گا نا تو بے بے کے دوجے مونڈھے میں ٹیکا لگ جائے گا۔ بھائی سے پوچھ وہ کتھے ہے۔ وہ جہاں کا بتائے، اس سے بول کہ وہ اوسے جگہ پر ٹھہر جائے۔ تُو وہاں پہنچ رہیا ہے۔ گل سمجھ میں آ گئی

نا۔ میں اک وار فیر کہندا ہوں۔ ایک لفظ بھی سجے کھبے کرے گا نا تے گولی چلے گی۔''

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے کال ملائی۔ میرا دل پھڑ پھڑا کر رہ گیا۔ عاطف کے فون پر بیل جا رہی تھی۔ سراج نے ہاتھ آگے بڑھا کر فون میرے کان سے لگا دیا۔ چوتھی، پانچویں بیل پر کال ریسیو ہو گئی۔ دوسری طرف سے عاطف کی سہمی اور ہانپی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''کون؟''

میں خاموش رہا۔

''کون بول رہا ہے؟'' عاطف نے پھر پوچھا۔

سراج نے مجھے فون کے ساتھ زور سے ٹھوکا دیا کہ میں بولوں۔ میں تو نہیں بولا لیکن سراج کے ٹھوکا دینے سے موبائل کا بٹن دب گیا اور کال ''ڈس کنیکٹ'' ہو گئی۔

سراج نے جھلا کر مجھے ایک غلیظ گالی دی۔ اس کے ساتھ ہی گرانڈیل شیرے کا چہرہ بھی خون کے دباؤ سے سیاہی مائل ہو گیا۔ سراج بولا۔ ''یہ ایسے نہیں مانے گا۔ اس کی بے بے کی ہانڈی پر رکھ نالی اور اگر نہ بتائے تو توڑ دے کتیا کی ہانڈی۔''

یہ بے بسی کی انتہا تھی۔ یہ ذلت کا ''عروج'' تھا، مجھے موت سہل لگ رہی تھی۔ اپنی سسکتی ہوئی خونچکاں ماں کو لاچاری کے ساتھ دیکھنا آنکھوں کا بدترین عذاب تھا۔ وہ درد کی انتہا سے گزر رہی تھیں لیکن پھر بھی وہ ماں تھیں۔ اس حالت میں بھی انہیں اپنے بچوں کی سلامتی عزیز تھی۔ ان کی ممتا آخری ہچکی تک اپنے بچوں کا تحفظ چاہتی تھی اور اس تحفظ کے لیے وہ اس سے دس گنا اذیت بھی جھیلنے کو تیار تھیں۔

سراج نے ایک بار پھر عاطف سے کال ملائی اور فون میرے کان سے لگا دیا۔

ماں جی نے لڑکھڑاتی آواز میں فریاد کی۔ ''نہیں تابی! مجھے مر جانے دینا۔ ان کو کچھ نہ بتانا میرے بچوں کا۔ ان کو کچھ نہ بتانا۔''

''ٹھیک ہے۔ یہ نہ بتائے تو توڑ دو اس بڈھی کا کھوپڑا۔'' سراج نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اسی دوران میں میری بدقسمتی نے پھر زور مارا۔ عاطف سے کال مل گئی۔ اس مرتبہ عاطف کے فون پر فرح کی لرزتی ہوئی آواز اُبھری۔ ''کون ہے؟ کون بول رہا ہے؟''

فرح کی آواز سن کر سیٹھ سراج کی آنکھوں میں شیطانی چمک نمایاں ہو گئی۔ اس نے مجھے سر کے بالوں سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ بہ زبان خاموشی کہہ رہا تھا۔ ''بول نہیں تو تیری ماں جا رہی ہے۔''

میرے دل نے گواہی دی کہ وہ اور اس کے ساتھی ماں جی کو مار دیں گے اور اگلے چند سیکنڈ میں، مَیں اپنی ماں کی بے نور آنکھیں دیکھوں گا۔ ان کے ساکت ہونٹ جو پھر کبھی ہمارے لیے دعا کے لیے نہیں ہلیں گے اور ان کے منجمد ہاتھ جو کبھی ہمارے سر پر نہیں آئیں گے۔ نہیں...... میں اپنی ماں کو یوں نہیں جانے دوں گا۔ کسی قیمت پر نہیں۔ میرے اندر ایک عجیب سی توانائی لہر لینے لگی۔ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''ہیلو...... فرح...... میں تابش۔''

''بھائی! آپ کہاں ہیں آپ...... آپ نکل آئے ہیں نا؟ امی کہاں ہیں؟ آپ ٹھیک ہیں نا...... خدا کے لیے بتائیں آپ ٹھیک ہیں؟ خدا کے لیے......'' وہ بولتی چلی گئی۔

میرے ہونٹ لرزاں تھے لیکن میں کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ سراج نے فون کے ماؤتھ پورشن کو انگلی سے ڈھانپا اور سرسراتی آواز میں بولا۔ ''اس سے پوچھ وہ کہاں ہے۔ کس جگہ پر ہے۔ جلدی پوچھ...... جلدی۔''

میں جانتا تھا کہ سراج اور شیرے کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ اب میں نہ بولا تو وہ ماں جی کو مار دیں گے۔ وہ اگلے چند سیکنڈ میں ان کی جان لے لیں گے۔ شیرے نے اب ایک ہاتھ ماں جی کے ہونٹوں پر بڑی مضبوطی سے جما دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان کی آہ و بکا موبائل فون کے ذریعے فرح اور عاطف تک پہنچ جائے۔ ماں جی کسمسا رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ میں نے کراہتی آواز میں کہا۔ ''ہیلو فرح...... میں ٹھیک ہوں...... تم...... تم......'' میں نے بہت کوشش کی مگر آواز گلے میں رُک رہی تھی۔ میں اتنا جگرا کہاں سے لاتا کہ فرح سے پوچھتا، وہ کہاں ہے؟

ماں جی کی سانس بند ہو رہی تھی۔ وہ بے طرح کھانس رہی تھیں پھر انہیں قے ہوئی۔ وہ کھانستے کھانستے اُٹھیں اور کھڑکی کی طرف مڑیں۔ دو تین سیکنڈ کے لیے یہی لگا کہ وہ شاید قے کرنا چاہ رہی ہیں مگر انہوں نے وہ کیا جو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے خود کو قربان کر دیا۔ ہاں...... مر تو انہوں نے شاید ویسے بھی جانا تھا کہ وہ بُری طرح زخمی ہو چکی تھیں۔ انہوں نے اپنی موت کو بروقت بنا دیا۔ اس سے پہلے کہ میں ان کی جان کے خوف سے سیٹھ سراج کی ہدایت پر عمل کر گزرتا، ماں جی نے اپنی جان...... جانِ آفریں کے حوالے کر دی۔ وہ قریباً سترہ فٹ نیچے پختہ فرش پر گری تھیں۔ سراج، شیرا اور ان کے ساتھی حواس باختہ ہو کر کھڑکی سے نیچے جھانکنے لگے۔ میں نے بھی نیچے دیکھا۔ وہاں ٹیوب لائٹ کی روشنی تھی۔ میری ماں کا سر جسیم کے ایک بڑے گملے سے ٹکرایا تھا۔ شاید سر کی Frontal Bone ٹوٹ گئی تھی۔ خون کا ایک ریلا سا سیاہی مائل فرش پر رینگتا ہوا ایک کیاری کی طرف بڑھ رہا

تھا۔ یہ ماں تھی جو ابھی جینا چاہتی تھی۔ جس نے ابھی اپنے کسی بچے کی کوئی خوشی نہیں دیکھی تھی۔ جو اپنی بیٹی کے بڑے پیار سے بنائے ہوئے زیور ایک اٹیچی میں لیے لیے پھر رہی تھی اور ان زیوروں جیسے سیکڑوں ممتا بھرے ارمان اس کے دل میں موجود تھے۔ ان ارمانوں سمیت کچھ ہی دیر پہلے تو وہ زندہ تھی۔ سانس لے رہی تھی، باتیں کر رہی تھی۔

میں مڑا اور اندھا دھند سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ میں نے اپنی ماں کا ٹوٹا ہوا سر دیکھ لیا تھا پھر بھی جیسے دل میں آس تھی کہ ان میں جان باقی ہوگی۔ میں ان کے سر کے ٹکڑوں کو سمیٹ کر اپنی گود میں رکھوں گا اور ماتھے کو بوسہ دوں گا تو وہ پلکیں جھپکنے لگیں گی۔

"پکڑو...... بھاگ رہا ہے۔" شیرا دھاڑا۔

میں زینوں پر پہنچا۔ کچھ لوگ میرے پیچھے لپکے۔ "ماں جی...... ماں جی۔" میں دودھ پیتے بچے کی طرح بلک رہا تھا۔ میں نے چار پانچ زینے طے کیے تھے کہ کسی نے عقب سے میری گردن پر ضرب لگائی۔ میں لڑکھڑایا۔ ابھی میرے سامنے بارہ تیرہ زینے باقی تھے۔ میں ان زینوں پر سے اُڑتا ہوا سر کے بل سیاہی مائل فرش کی طرف گیا۔ فرش جس میں سفیدی مائل دھاریاں تھیں۔ جو بہت سخت تھا اور ٹیوب لائٹ کی روشنی میں دمک رہا تھا۔ میں اس فرش سے ٹکرانے والا تھا۔ بُری طرح ٹکرانے والا تھا۔ میرے ہاتھ عقب میں بندھے ہوئے تھے پھر میں تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ اپنی ساری کم ہمتی، لاچاری اور بدقسمتی سمیت۔ مجھے ہر طرف سے ایک سرد، سیاہ بے خبری نے ڈھانپ لیا۔

○......❖......○

میری آنکھ کھلی۔ میں چت لیٹا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ پورا جسم پھوڑا بنا ہوا ہے۔ میں نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ کنپٹی کے قریب چپچپاہٹ محسوس ہوئی۔ یقیناً یہ سر کے زخم سے بہنے والا خون تھا۔

میری دھندلائی ہوئی نگاہیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو مجھے اپنے سر پر کسی چھت کے بجائے درخت نظر آئے۔ یہ شاید شام کا وقت تھا۔ درختوں سے اوپر آسمان گہرے بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ پھر زور سے بجلی چمکی۔ گڑگڑاہٹ ہوئی اور بوندیں برسنے لگیں۔ میں یہ سارے مناظر بالکل خالی خالی ذہن کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ پردۂ تصور خالی تھا۔ پھر جیسے دھیرے دھیرے ٹی وی اسکرین پر کوئی منظر "فیڈ اِن" ہوتا ہے، میرے پردۂ تصور پر بھی دھندلے مناظر کی شبیہ بننے لگی۔ یہ شبیہ بہت آہستہ آہستہ بنی لیکن بنتی چلی گئی۔ ٹیڑھی میڑھی لکیروں اور بے ترتیب رنگوں نے موہوم شکلیں اختیار کرنا شروع کیں۔ ہوا کی سائیں سائیں نے

آوازوں کا روپ دھارا۔ یہ آوازیں واضح ہوئیں۔ ان کے آہنگ، ان کے الفاظ ش کرنے اختیار کرنے لگے۔ "پکڑو...... بھاگ رہا ہے۔"

"یہ کس کی آواز تھی؟" لباس

موٹے جسم اور چھوٹے سر والا ایک شخص میری نگاہوں کے سامنے دھیرے دھیرے ایک وجود اختیار کرنے لگا۔ کون تھا یہ؟ سیٹھ سراج۔

ایک دم اپنی والدہ کی صورت دھند کی دبیز چادر کو چاک کر کے میری آنکھوں کے سامنے آئی۔ "نہیں تابی! مجھے مر جانے دینا۔ ان کو کچھ نہ بتانا میرے بچوں کا۔"

مجھے لگا کہ میں نے یہ آواز بہت عرصہ پہلے کہیں سنی تھی۔ پھر اس آواز کے بعد کیا ہوا تھا؟ ایکا ایکی میری شریانوں میں تہلکہ مچ گیا۔ پاؤں کے ناخنوں سے سر کے بالوں تک پورے جسم میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ ماں جی کا سر جیسم کے گملے سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا تھا۔ ان کی بے نور آنکھیں، ٹیوب لائٹ کی روشنی میں شیشے کی طرح چمک رہی تھیں۔

میں تڑپ کر اُٹھ بیٹھا۔ "ماں جی...... ماں جی۔" میں نے سینے کی پوری قوت سے پکارا اور اُٹھ بھاگا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جاؤں۔ یہ بالکل اجنبی جگہ تھی۔ چاروں طرف بلند و بالا درخت تھے اور ان کے درمیان خودرو جھاڑیوں نے راستہ مسدود کر رکھا تھا۔ بارش کی بوچھاڑوں کے سبب زمین پر کیچڑ بننا شروع ہو گیا تھا۔ میں پہلے تو چالیس پچاس قدم تک سیدھا بھاگا، پھر وہاں سے بائیں مڑ گیا پھر بائیں سے دائیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بھاگنے کے ساتھ ساتھ میں پکار رہا تھا۔ "میری ماں کو مار دیا تم نے...... میری ماں کی جان لے لی۔ تم خونی ہو، قاتل ہو۔"

لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں جو میری سنتا اور کسی طرح کا ردِعمل ظاہر کرتا۔ چاروں طرف درخت تھے اور بارش کی بوچھاڑیں تھیں۔ میں ہانپ کر رُک گیا۔ اردگرد دیکھنے لگا۔ یہ بالکل اجنبی جگہ تھی۔ پھر میری نگاہ اپنے لباس پر پڑی۔ لباس بھی اجنبی تھا۔ یہ ایک پاجامہ کرتہ تھا۔ اس کے اوپر سوتی کپڑے کی ہی واسکٹ سی تھی۔ جوتی بھی اجنبی سی تھی۔ یہ مجھے کہاں پھینکا گیا تھا اور کیوں؟ مجھے ہر چیز اجنبی لگ رہی تھی۔ درخت، ہوا، بارش اور خود اپنا آپ بھی۔ میں نے اپنا ہاتھ اُٹھایا۔ یہ سر سے بہنے والے خون کے سبب داغدار تھا۔ مجھے یوں لگا کہ غیر ماحول میں یہ ہاتھ بھی اجنبی سا ہو گیا ہے۔

"کوئی ہے...... کوئی ہے یہاں؟" میں کرب کی انتہا کو چھو کر چلانے لگا۔

میری آواز بارش کی صدا سے بغل گیر ہو کر دور تک گئی مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ میرے

تھا۔ یہ مار نا طوفان تھا۔ لگتا تھا کہ میں کھل کر نہ رویا تو کلیجا پھٹ جائے گا۔ مجھے پُرسا چاہیے تھی۔ ج ایک درخت سے لپٹ گیا۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ ''میں یتیم ہوگیا۔ میری ماں اور ا۔ میرا سب کچھ لٹ گیا۔'' میں رو رہا تھا اور درخت کے تنے سے اپنا چہرہ رگڑ رہا تھا۔ یہ ـحت میرا قریبی عزیز بن گیا۔ میرا غمگسار، میرا دوست، بھائی، سب کچھ۔

ایک دم مجھے عاطف کا خیال آیا۔ عاطف اور فرح کوٹھی سے نکل بھاگے تھے۔ کیا وہ بچنے میں کامیاب ہوئے؟ وہ کہاں تھے؟ کس حال میں؟ ایک دم بہت سے سوالوں نے ذہن پر یلغار کی۔ مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کتنی دیر بعد ہوش میں آیا ہوں۔ چند گھڑیاں چند دن یا ہفتے۔ میری نگاہ کلائی کی گھڑی کی طرف گئی۔ وہاں رسٹ واچ موجود نہیں تھی۔

میں بے دم سا ہو کر اپنے غمگسار درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بارش کا پانی پتوں سے چھن چھن کر میرے سر پر پڑنے لگا۔ یہ کیا ہوا تھا؟ میں کتنی دیر بے ہوش رہا اب کہاں تھا میں؟

ماں کا مرا ہوا چہرہ نگاہوں کے سامنے آیا اور میں ایک بار پھر بے قرار ہو کر اس بھیگے ہوئے جنگل میں بھاگنے لگا۔ آوازیں دینے لگا۔ کبھی اپنی ماں کو، کبھی چھوٹے بھائی کو اور فرح کو کبھی کسی کو مدد کے لیے بلانے لگا۔

میں روتا رہا اور بھاگتا رہا۔ بے دم ہو جاتا تو تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر جاتا اور پھر بھاگنا شروع کر دیتا۔ اب اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اردگرد کے مناظر ہیولوں کی شکل اختیار کرتے جا رہے تھے۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ جیسے یہ ساری دنیا ایک ویرانے کی شکل اختیار کر گئی ہو۔ بس کسی وقت مجھے اپنے اردگرد کسی چھوٹے موٹے جانور، گلہری، بلی، نیولے وغیرہ کی موجودگی کا احساس ہوتا یا گھونسلے میں دبا ہوا کوئی پرندہ مدھم آواز نکالتا اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ میں سمتوں کا تعین کرنے سے بالکل قاصر تھا۔ اگر میری آنکھوں کے سامنے اُجالا...... اندھیرے میں نہ بدلا ہوتا تو شاید میں وقت کا تعین کرنے سے بھی قاصر رہتا۔

نہ جانے میں کب تک اسی طرح بھاگتا رہا۔ میرا جوڑ جوڑ دُکھنے لگا۔ سانس سینے میں سما نہیں رہی تھی۔ بول بول کر گلا بیٹھ گیا اور آنسو خشک ہو گئے۔ میرے اردگرد خاموش نباتات اور مسلسل برستی بارش کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ بالآخر ایک نشیب میں مجھے ایک چھوٹی سی کھوہ نظر آئی، میں اس میں داخل ہوگیا۔ یہ کچی زمین میں ایک پندرہ بیس فٹ لمبا سوراخ سا تھا اور بُو بھی آ رہی تھی۔ شاید کوئی چھوٹا موٹا جانور یہاں مرا تھا۔ بہرحال اس کھوہ میں داخل ہوتے ہی

میں بارش سے محفوظ ہوگیا۔

میں نے ایک دیوار سے ٹیک لگا لی اور اپنے اندرونی ہیجان کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں معروضی انداز میں سوچنا چاہتا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے اپنے لباس پر توجہ دی۔ جیبوں کو ٹٹولا۔ کُرتے کی بغلی جیب میں سے ایک رومال نکلا۔ کپڑے کی ایک چھوٹی سی ملائم تھیلی نکلی۔ میں نے ٹٹول کر دیکھا، اس میں بادام، چھوہارے اور مکھانے وغیرہ تھے۔ شادی بیاہ اور نکاح کے موقع پر ایسی تھیلیاں مہمانوں میں تقسیم کی جاتی ہیں پھر میری جیب سے سگریٹ کا ایک چھوٹا پیکٹ اور لائٹر نکلا۔ یہ دونوں اشیا پتا نہیں کس نے جیب میں رکھی تھیں، ورنہ میں تو سگریٹ پیتا نہیں تھا۔

میں نے لائٹر جلایا تو وہ جل گیا۔ چھوٹے سے زرد شعلے کی روشنی میں، مَیں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ کھوہ کی کچی دیواروں سے کئی جگہ جالے لٹک رہے تھے۔ ایک کونے میں کسی پرندے کے پر پڑے تھے۔ ایک طرف خشک ٹہنیاں بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے ان ٹہنیوں میں سے کچھ کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور تھوڑی سی کوشش سے آگ سلگانے میں کامیاب ہوگیا۔

آگ سے روشنی کے علاوہ حرارت بھی ملی۔ میں قدرے ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے کی کوشش کرنے لگا کہ میں کہاں ہوں اور میرے جسم پر یہ بالکل اجنبی لباس کیوں ہے؟ میں ماں جی کو پکارتا ہوا زینوں کی طرف بھاگا تھا۔ پھر کیا ہوا تھا؟ پھر وہ لوگ میرے پیچھے لپکے تھے۔ میں نے چند زینے ہی طے کیے تھے کہ عقب سے کسی نے مجھے رائفل کا بٹ رسید کیا تھا۔ میں ہوا میں اُڑتا ہوا سیاہی مائل فرش کی طرف گیا تھا۔ اس فرش میں سفید سفید دھاریاں تھیں۔ اس کے بعد یاد نہیں رہا تھا۔ سب کچھ ایک دور افتادہ ''سیاہ دھند'' میں چھپ گیا تھا۔ مجھے سیٹھ سراج، شیرے اور بختیار وغیرہ کے سفاک چہرے یاد آئے۔ بختیار تو فرح اور عاطف کے پیچھے تھا۔ باقی لوگ مجھے زندگی میں موت کا مزہ چکھا رہے تھے۔ دلیل تو یہی کہتی تھی کہ انہیں، مجھے چھوڑنا نہیں چاہیے تھا لیکن اگر میں یہاں اس ویرانے میں موجود تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ انہوں نے مجھے چھوڑا ہے۔ کیا اس کے پیچھے بھی کوئی چال تھی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اب بھی کچھ لوگ میری بے خبری میں میرے اردگرد موجود ہوں۔ وہ میرے ذریعے کسی اور تک پہنچنا چاہتے ہوں۔ مثلاً فرح اور عاطف تک۔

لیکن ایسا ہوتا تو مجھے لاہور ہی میں کہیں چھوڑا جاتا، اس ویرانے میں چھوڑنے کی کیا وجہ تھی؟ میں غور کرنے لگا کہ یہ کون سی جگہ ہو سکتی ہے۔ شیشم کے علاوہ دھریک اور تھوہر وغیرہ کے پودے بھی نظر آ رہے تھے۔ اس کے علاوہ خودرو جھاڑیاں تھیں۔ لاہور کے اردگرد تو چھانگا مانگا

ہی ایسی جگہ تھی جہاں اس قسم کے مناظر دیکھے جا سکتے تھے۔ مگر مجھے یہ چھانگا مانگا نہیں لگ رہا تھا۔ پھر میرا دھیان اس ڈیک نالے اور اس ''رکھ'' کی طرف چلا گیا جہاں میں نے اپنی زندگی کا ایک دل دوز ترین منظر دیکھا تھا۔ جہاں میرا یار، سینے پر برسٹ کھا کر میری آنکھوں کے سامنے قاتل پانی میں گرا تھا۔ دل میں ناقابلِ برداشت ٹیسیں اُٹھیں اور سر چکرانے لگا۔ کیا یہ وہی گردوپیش تھے جہاں یہ سب کچھ ہوا تھا؟ ذہن نے اس بات کو بھی ماننے سے انکار کر دیا۔

بارش کچھ ہلکی ہوگئی تھی۔ میں کھوہ سے باہر نکلا اور کسی راہ گم کردہ بدحال مسافر کی طرح اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ آنسو خشک ہو چکے تھے مگر سینے میں ناقابلِ بیان دُکھ کا الاؤ تو موجود تھا۔ میں پھر دل دوز انداز میں پکارنے لگا۔ ''کوئی ہے...... کوئی ہے...... میری مدد کرو۔''

جواب میں جنگل کے مہیب سناٹے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ پکار پکار کر میرا گلا بیٹھ چکا تھا۔ اب تو آواز بھی ٹھیک سے نہیں نکل رہی تھی۔ میں بے دم ہو کر پھر کھوہ میں آ گیا اور بجھتی ہوئی آگ میں کچھ اور خشک ٹہنیاں ڈال کر قریب ہی لیٹ گیا۔ سر کے زخم سے شدید ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ میں نے انگلیوں سے چھو کر دیکھا۔ زخم کی حالت سے لگتا تھا کہ وہ زیادہ پرانا نہیں ہے۔ تو کیا ڈیفنس کی کوٹھی میں پیش آنے والے واقعات کو زیادہ دیر نہیں گزری؟ یہ ایک دو روز پہلے کی بات ہی ہے؟ مگر ایسا لگ نہیں رہا تھا۔ میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا، چہرے پر چھ سات روز کی شیو تھی۔ مجھے یاد آیا کہ رشید اور گلزار وغیرہ کے ہتھے چڑھنے کے بعد میں نے دو تین روز تو لالہ زار سکیم کے گھر میں ہی گزارے تھے۔ وہاں میری شیو بڑھتی رہی تھی، اس کا مطلب تھا کہ سیڑھیوں سے گر کر بے ہوش ہونے کے بعد مجھے چار پانچ دن مزید گزر گئے تھے۔

دماغ ایک بار پھر بُری طرح چکرانے لگا۔ خیالات آپس میں گڈمڈ ہونے لگے۔ کسی وقت لگتا تھا کہ اپنی ماں جی کا مُردہ چہرہ دیکھے مجھے بس ایک دو دن ہی ہوئے ہیں۔ کسی وقت لگتا تھا کہ اس واقعے کو صدیاں بیت چکی ہیں۔ میں کروٹ کے بل لیٹا تھا۔ والدہ اور عمران کے لیے آنکھوں سے تازہ آنسو اُبلنے لگے۔ میرے رُخسار پر رینگنے لگے اور میری ناک کے بانسے سے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ میں دل ہی دل میں پکارا۔ ''میں زندہ رہنے کے قابل نہیں ہوں۔ میں اپنے چاہنے والوں کے لیے ایک مجسم بدنصیبی کے سوا اور کچھ نہیں۔ میرا پیارا دوست، میری بزدلی اور حماقت کی وجہ سے گولیوں سے چھلنی ہوا۔ میری ماں کی جان میری آنکھوں کے سامنے گئی۔ میں ان کی موت کا ذمے دار ہوں اور جو ابھی زندہ ہیں۔ ان پر میری وجہ سے ابھی نہ جانے کیا قیامت گزرنی ہے۔'' میں بہ زبانِ خاموشی بلکنے لگا۔ ''اے خدا! تُو

نے مجھے ایسا کیوں بنایا؟ اور اگر ایسا بنایا تھا تو پھر اس طرح کے حالات سے کیوں دوچار کیا؟ میرا کیا قصور ہے میرے مالک! میں ہوں ہی ایسا۔ میں نے خود کو بدلنے کی ہزار کوششیں کیں مالک! جو کچھ میری سمجھ میں آیا، خلوصِ دل سے کیا اور کرتا رہا۔ خود کو ذہنی اور جسمانی طور پر مضبوط بنانے کے بے شمار جتن کیے۔ ہر طرح کی بداخلاقیوں سے دور رہا۔ اپنے اندر چھپی ہوئی توانائیوں کو ڈھونڈنے کی سعی کرتا رہا۔ مگر جو کچھ میرے اندر تھا ہی نہیں جو تُو نے میرے اندر رکھا ہی نہیں تھا، میں اسے کیسے ڈھونڈ پاتا۔''

دُکھ کی انتہا کو چھو کر میں اپنے رب سے شکوہ کناں ہو گیا۔ میری آنکھوں سے آتشیں آنسو، طوفانی دھاروں کی طرح اُبلنے لگے۔ ''اے میرے رب! ہم نے تو یہی سنا تھا، تُو اپنے بندے کو پیار کرتا ہے۔ ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ اے مالک! ماں تو اپنے ہر بچے کی کمزوریوں، خامیوں کو سمجھتی ہے۔ جو بچہ زیادہ کمزور ہوتا ہے، وہ اس کا اتنا ہی دھیان رکھتی ہے۔ اس کو کوئی کسر نہ لگ جائے، اس کی کوئی کمزوری اسے نقصان نہ پہنچائے، وہ ہر گھڑی اسی فکر میں رہتی ہے۔ تو اے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والے مالک! تُو نے مجھے کمزور و ناتواں پیدا کیا اور پھر میری طرف سے دھیان بھی ہٹا لیا۔ میں کہاں جاؤں مالک؟ میں کیا کروں؟ ماں کی ممتا تو اپنے بچوں میں سے کسی کو کوئی کمی نہیں ہونے دیتی۔ اگر کمی ہوئی بھی ہے تو اس کا ازالہ کر دیتی ہے۔ اے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والے ربّ العزت! تُو نے مجھے کم ہمتی و ناتوانی دی اور اس کے بدلے میں بھی کچھ نہ دیا۔ کوئی تو صلاحیت رکھی ہوتی میرے اندر کوئی ہنر کوئی گُن جس سے میں اپنی لاچاریوں کا ازالہ کر سکتا۔

میں بہت رو چکا مالک! بہت دُکھ سہہ چکا۔ اب تو ماں بھی نہیں رہی۔ اب اور ہمت نہیں ہے۔ اب یہ کھیل ختم کر دے۔ اب اپنی زندگی واپس لے لے۔'' میں نے اپنا چہرہ کچھ زمین میں دھنسا دیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ روتے روتے نہ جانے کس وقت جسم و جاں پر نقاہت طاری ہوئی اور میں غنودگی میں جانے کے بعد سو گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو میں بدستور اُسی کھوہ میں تھا۔ آگ مدھم ہو چکی تھی مگر مکمل طور پر بجھی نہیں تھی۔ باہر تاریک فضا میں درختوں کے پتوں پر بارش تواتر سے برس رہی تھی۔ یکایک میں نے محسوس کیا کہ میرا سر کسی نرم گداز چیز پر ہے۔ یہ شاید کسی زانو پر تھا۔ پھر مجھے اپنے ہونٹوں پر بھی کسی نرمی اور گرمی کا احساس ہوا۔ کسی کی سانس میرے رُخسار سے ٹکرائی۔ کسی کے ہونٹ مجھے بڑی نرمی سے بوسہ دے رہے تھے۔

میں تڑپ کر اُٹھ بیٹھا۔ سر میں شدید ٹیس اُٹھی۔ میں نے گھوم کر دیکھا اور سکتے میں رہ

گیا۔ میرے بالکل قریب ایک لڑکی موجود تھی۔ آگ کی مدھم سرخ روشنی میں اس کے خدوخال دکھائی دے رہے تھے۔ وہ درمیانی شکل وصورت کی تھی، تاہم اس کے چوڑے رُخسار قندھاری اناروں کی طرح دہک رہے تھے۔ اس کے بال بے حد گھنے اور لمبے تھے۔ چوڑی پیشانی پر ایک طرف زخم کا چھوٹا سا نشان تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ دوپٹا بھی موجود تھا مگر وہ اس کے گلے میں لٹک رہا تھا۔ وہ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''تم نے ایسا کیوں کیا؟'' وہ دُکھی انداز میں بولی۔ ''میں دیوانوں کی طرح ڈھونڈتی رہی ہوں تم کو۔ دیکھو میرے پاؤں بھی زخمی ہو گئے ہیں۔ مجھے تو لگتا تھا کہ کہیں......'' اس کی آواز بھرا گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

''کک......کون ہو تم؟'' میں نے کہا۔

لڑکی کی آنکھوں میں نظر آنے والی حیرت اور پریشانی کچھ اور بڑھ گئی۔ پھر وہ ذرا سنبھل کر بولی۔ ''مذاخ (مذاق) کے لیے یہ وخت (وقت) اچھا نہیں ہے مہروج۔''

''مہروز......کون مہروز؟''

اس کی آنکھوں کی پریشانی فزوں تر ہوئی لیکن اس نے ایک بار پھر خود کو سنبھالا اور ذرا مسکرا کر اور مجھے نیم باز آنکھوں سے دیکھ کر ادا سے بولی۔ ''مہروج! میرا شوہر، میرا شریکِ حیات، میری زندگی کا واحد سہارا۔ جو کج ادا ہے۔ ستاتا ہے۔ رلاتا ہے پھر بھی اچھا لگتا ہے۔'' اس کے لب و لہجے میں حیدر آبادی آہنگ تھا۔

میں سمجھ گیا کہ اس لڑکی کی ذہنی صحت ٹھیک نہیں۔ وہ اپنے ہوش وحواس سے بہت دور نظر آتی تھی۔ اس ویران جنگل میں اس مسلسل برستی بارش میں اس کا یہاں پایا جانا اتنا ہی حیرت ناک و ناقابلِ فہم تھا جتنی وہ خود تھی۔ اس کے لباس سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کافی دنوں سے اس ویرانے میں بھٹک رہی ہے۔ اس کی پھول دار قمیص دو تین جگہ سے پھٹی ہوئی تھی، کپڑوں پر سرخی مائل کیچڑ کے داغ بھی جا بجا تھے۔ سب سے عجیب چیز اس کا لب ولہجہ تھا۔ اس قسم کی زبان میں نے ایک دفعہ انڈین حیدر آباد میں سنی تھی۔ وہاں میں، فرح اور عاطف ایک شادی میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ یہ کئی برس پہلے کی بات تھی۔

وہ میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر لگاوٹ سے بولی۔ ''دیکھو...... میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ تم کو نیند آ رہی ہے، تم خود کو کسی کپڑے کے ساتھ درخت سے باندھ لو تو اچھا ہوئیں گا۔ مگر تم نے میری بات اِچ نہیں مانی۔ یہ تو شکر ہے درخت زیادہ اونچا نہیں تھا، ورنہ بہت چوٹ

آتی۔''

پتا نہیں وہ کیا کہہ رہی تھی اور اسے مجھ پر کس شخص کا شبہ ہو رہا تھا۔ بہرحال میں خاموش رہا۔ اس نے میری کنپٹی پر بڑی ملائمت سے اُنگلیاں چلائیں اور بولی۔ ''میں نے پٹی کر دی ہے، خون بھی بند ہو گیا ہے۔ مگر لگتا ہے کہ ٹانکے لگنے کی ضرورت ہوئیں گا۔ اللہ کرے ہم کل کسی طرح اپنے ٹھکانے پر پہنچنے کے خابل (قابل) ہو جائیں۔''

وہ گہری سنجیدگی سے بول رہی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ وہ جو کہہ رہی ہے، وہی درست ہے۔ اس کے قریب ہی ایک جھولا سا رکھا تھا۔ لگتا تھا کہ کپڑے کے اس جھولے میں اس کا سفری سامان ہے۔ اس نے جھولے میں ہاتھ ڈال کر اِدھر اُدھر گھمایا اور کسی پودے کی دو تین شاخیں باہر نکال لیں۔ ان شاخوں کے ساتھ لمبوترے پتے بھی لگے ہوئے تھے۔ اس نے پتے شاخوں سے علیحدہ کیے اور بولی۔ ''یہ ہے وہ بوٹا جسے ڈھونڈنے گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ یہ کہیں آس پاس اِچ ہوئیں گا لیکن کافی دور سے ملا۔ سینے کی جلن اور پیٹ درد کے لیے ایک دم اچھی چیز ہے۔ تم دیکھنا کتنی جلدی ٹھیک ہوتے ہو۔''

میں اب بھی خاموش رہا۔ اس نے جھولے کے اندر سے ہی چھوٹی سی سل اور وٹا نکالا۔ ساتھ میں پلاسٹک کی بوتل بھی تھی جس میں پانی تھا۔ اس نے پتوں کو مروڑ کر سل پر رکھا اور وٹے سے انہیں پیسنے لگی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا سارا جسم ہلکورے لینے لگا۔ بھیگے ہوئے لمبے بال آگے کو ڈھلک آئے اور زمین کو چھونے لگے۔ اس کی عمر تیئس چوبیس سال رہی ہو گی۔ وہ مضبوط ہاتھ پیر کی صحت مند لڑکی تھی۔ نقوش ذرا موٹے تھے تاہم ان میں جاذبیت موجود تھی۔ لگتا تھا کہ ذرا سی مشقت سے اس کے عارض، انار کی طرح سرخ ہو جاتے ہیں۔

سِل پر چند رگڑے لگانے کے بعد وہ ایک دم چونکی۔ اس نے اپنا ہاتھ روک کر ناک سکوڑی اور کچھ سونگھنے لگی۔ یقیناً کھوہ میں سے اُٹھنے والی ہلکی بُو اُسے بھی تنگ کر رہی تھی۔ اس نے آگ میں سے ایک جلتی ہوئی لکڑی اُٹھائی اور اس کی روشنی میں احتیاط سے کھوہ کا جائزہ لینے لگی۔ جلد ہی وہ بُو کا ماخذ ڈھونڈنے میں کامیاب رہی۔ یہ بلی کا مُردہ بچہ تھا جسے شاید کسی نر نے ہی مار ڈالا تھا۔ اس کی انتڑیاں نکلی ہوئی تھیں۔ لڑکی نے اس منظر پر افسوس کا اظہار کیا۔ بہرحال مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس نے کسی طرح کی کراہت کھائے بغیر بلونگڑے کی لاش کو دُم سے پکڑا اور کھوہ سے باہر نکال کر جھاڑ جھنکاڑ میں پھینک دیا۔ اس کے بعد اس نے متاثرہ جگہ کو ایک گیلے کپڑے سے صاف کیا اور جھولے میں سے کوئی عطر قسم کی شے نکال کر کھوہ میں تین چار جگہ لگا دی۔ اس سے بھینی سی خوشبو پھیل گئی۔

میں نے اسے پہلی بار چلتے پھرتے دیکھا تھا۔ اس نے پاؤں میں کیچڑ آلود جوگرز ٹائپ جوتے پہن رکھے تھے۔ جب وہ بلونگڑے کو باہر جھاڑ جھنکاڑ میں پھینکنے گئی تو بارش کی بوچھاڑوں سے اس کا لباس پھر بھیگ گیا۔ اس کی پھولدار قمیص اس کے جسمانی خدوخال کو نمایاں کرنے لگی۔ اس کا جسم غیر معمولی طور پر منہ زور تھا۔ جیسے ہر حرکت پر لباس سے برسرِ پیکار ہو رہا ہو۔ وہ ایک بار پھر دوزانو بیٹھ کر سل پر پتوں کو رگڑنے لگی۔ ”دیکھو...... تم نے کیا کیا؟“ وہ اپنی روانی میں بولی۔ ”میں تمہارے پیٹ درد کے لیے پریشان تھی اور تم نے اتنی بڑی چوٹ لگوا لی اور چلو اگر چوٹ لگ اچ گئی تھی پھر وہیں تو رہتے۔ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ تمہاری یہی باتاں پریشان کر دیتی ہیں۔ میرا دل تو رونے کو چاہ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ بس اب گم ہو گئے تم۔ وہ تو شکر ہے کہ جنگل خراب ہوتی یہاں پہنچی تو تھوڑی روشنی نظر آ گئی۔“

وہ بولتی چلی جا رہی تھی۔ یہ جنگل، یہ بارش اور یہ تاریک کھوہ جس میں آگ کی طلسماتی روشنی تھی، کسی داستان کا منظر لگتا تھا۔ دل میں واہمہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ لڑکی واقعی وجود رکھتی ہے یا پھر کوئی بصری دھوکا ہے، آسیب ہے۔

میں جو کچھ بھی ہوں لیکن ٹھوس حقائق پر یقین رکھنے والا شخص ہوں۔ ہر چیز کو سائنسی بنیادوں پر پرکھنے والا اور مافوق الفطرت تصورات سے دور رہنے والا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ گوشت پوست کی لڑکی ہے اور میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں، جاگتی آنکھوں سے اور پورے ہوش وحواس میں دیکھ رہا ہوں۔ اگر کوئی اُلجھن تھی تو وہ یہی تھی کہ میں کتنی دیر بعد ہوش میں آیا ہوں اور یہ کون سی جگہ ہے جہاں میں موجود ہوں۔

لڑکی نے پتوں کو پیس کر بالکل باریک کر دیا پھر اسے ایک پیالے میں ڈالا۔ پلاسٹک کی بوتل سے اس میں تھوڑا سا پانی ملایا اور میری طرف بڑھایا تاکہ میں چند گھونٹ پی لوں۔ اس میں سے عجیب سی نباتاتی بُو اُٹھ رہی تھی۔ میں نے پینے سے منع کر دیا۔ نہ جانے یہ مخبوط الحواس لڑکی کیا پلا رہی تھی۔

اس نے میرے انکار کو حتمی انداز دیکھا اور گہری سانس لے کر پیالا ایک طرف رکھ دیا۔ ”اچھا...... کوئی باتاں نہیں۔ ٹھہر کر پی لینا۔“ وہ بولی۔ پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔ ”میرا خیال ہے کہ تمہیں بھوک لگی ہوگی، کچھ کھالو۔“

میں نے ایک بار پھر انکار کیا۔ وہ اُلجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ تب اس نے آگے بڑھ کر میرے سر کی چوٹ کا معائنہ کیا اور قدرے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ ”میں تو تمہاری یہ چوٹ دیکھ کر ڈر اچ گئی تھی۔“ اس نے کہا اور اچانک میرے گال کا بوسہ

لے کر پیچھے ہٹ گئی۔

میں اس کی اس حرکت پر سٹپٹا کر رہ گیا۔ وہ آگ کے پاس ایک چٹائی بچھا کر نیم دراز ہو گئی۔ انداز وہی تھا جو تنہائی میں ایک بیوی کا اپنے شوہر کے سامنے یا پھر محبوبہ کا اپنے چاہنے والے کے سامنے ہوتا ہے۔ بادل مسلسل پانی برسا رہے تھے۔ گاہے بہ گاہے گرج چمک بھی ہوتی تھی۔ یہ عجیب سا رومان انگیز افسانوی ماحول تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید دل میں کھد بد محسوس کرتا لیکن میرے لیے تو اس سے سوگنا زیادہ رومانیت بھی بے معنی تھی۔ میرے سینے میں دُکھ کا جو دریا بہہ رہا تھا، اس کی اذیت ناقابلِ بیان تھی۔ لگتا تھا کہ میری شریانیں ٹوٹ جائیں گی اور جسم کا ریشہ ریشہ جدا ہو جائے گا۔

میں نے ایک بار پھر اس لڑکی سے پوچھنا چاہا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ مگر تب مجھے احساس ہوا کہ وہ پھر وہی جواب دے گی جو پہلے دیا تھا۔ میں نے گفتگو کا انداز بدلا اور ٹوہ لینے والے انداز میں پوچھا۔ ”تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ہم کہاں ہیں؟“

وہ میرے بولنے پر خوش ہوئی اور دیوار کے سہارے بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ اب ہم ٹھیک راستے پر آ گئے ہیں۔ تمہیں پتا ہے نا پچھلے برس گرمیوں میں ”کچے“ کے پاس بہت سے درختوں میں آگ لگ گئی تھی۔ تین دن تک پیڑ جلتے رہے تھے۔ یاد ہے نا۔“

”ہاں...... ہاں۔“ میں نے کہا۔

”یہ جگہ ”نل پانی“ جانے والے راستے کی بالکل سیدھ میں ہے۔ ابھی شام سے پہلے مجھے نالے کے پار کچھ جلے ہوئے پیڑ نجر آئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اب ہمیں ناک کی سیدھ میں جانا ہے۔“

”کتنی دیر میں پہنچیں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”بارش رُک گئی تو بالکل سویرے اچ نکل جائیں گے۔ مجھے نہیں لگتا کہ سات آٹھ میل سے جیادہ کا سفر ہوئیں گا۔“ وہ اچ کو ”ہی“ کے معنوں میں استعمال کرتی تھی۔

میں نے سر کی چوٹ کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ”کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھانا پڑے گا۔ آس پاس کوئی ہسپتال ہوتا تو اچھا تھا۔“

میرا خیال تھا کہ شاید اس کے جواب سے علاقے کے محلِ وقوع کا اندازہ ہو سکے لیکن وہ مسکرائی اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ ”حکم جی کا بس چلے تو یہاں کوئی حکیم وید بھی دکھائی نہ دے۔ سب کچھ جنتر منتر سے کیا جائے۔ ہاں...... بس ایک ڈاکٹر ہو، اس کو ہمارے حکم جی نے اپنی تجوری میں بند رکھا ہو۔ اس کو بس اس وخت نکالا جائے جب حکم جی صاحب خود بیمار

ہوئیں یا ان کے خاندان کے کسی بندے کو جرورت پڑے۔''

پتا نہیں، وہ کہاں کہاں کی باتیں کر رہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بس اس کی اوٹ پٹانگ گفتگو سے اتنا پتا چلا کہ وہ میرے ساتھ (یعنی اپنے شوہر کے ساتھ) کسی ''نل پانی'' نامی جگہ پر جانا چاہ رہی ہے اور اس کا خیال ہے کہ وہاں پہنچ کر وہ اور اس کا شوہر محفوظ ہو جائیں گے۔ حکم جی نام کا شخص ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ وہ جہاں سے آئی تھی، اس جگہ کا نام زرگاں تھا اور وہ وہاں سے بھاگ کر آئی تھی۔

اس کی گفتگو کے دوران میں ہی کچھ آہٹیں ہوئیں۔ وہ ایک دم چوکنا ہو گئی۔ اس کے انداز میں خوف کے بجائے ایک عجیب طرح کی حرارت اور چوکسی تھی۔ آہٹیں میں نے بھی سنی تھیں۔ بالکل یہی لگا تھا جیسے کئی افراد ہمارے بالکل آس پاس موجود ہوں۔ کھانسی سے ملتی جلتی صدا بھی کانوں میں پڑی تھی۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ لڑکی نے اپنے جھولے میں سے ایک چھوٹے دستے کی کلہاڑی نکال لی۔ اپنے دستے اور پھل کی بناوٹ کے سبب کلہاڑی خوبصورت نظر آتی تھی۔ اس نے کلہاڑی میری طرف بڑھائی اور پھر ایسی ہی ایک اور کلہاڑی اپنے ہاتھوں میں سونت لی۔ اس کی عقابی نگاہیں کھوہ کے باہر کی تاریکی میں پیوست تھیں اور سینہ پھول پچک رہا تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ سے پلاسٹک کی بوتل اُٹھائی اور اس کا پانی ادھ بجھی آگ پر ڈال کر اسے بالکل بجھا دیا۔ اس دوران میں اس کے کان باہر کی سن گن لیتے رہے۔ باہر اب بارش کی مدھم صدا کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ ''کون ہو سکتا ہے؟'' اس نے سرگوشی کی۔

''کھانسی کی آواز تو آئی تھی۔'' میں نے کہا۔

''پر ہم تخین (یقین) سے تو نہیں کہہ سکتے نا کہ وہ کھانسی اچ کی آواج تھی۔ کبھی کبھی جناور کی آواج بھی تو ایسی ہوئے ہے۔''

کافی دیر گزرنے کے بعد بھی جب کوئی مزید آہٹ، آواز سنائی نہیں دی تو وہ ہولے سے باہر نکلی اور کھوہ کے دہانے کے ارد گرد کا جائزہ لینے لگی۔ بارش اب بوندا باندی کی شکل میں ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آ گئی اور اس نے سردی سے بچنے کے لیے خشک لکڑیوں کو ایک جگہ جمع کر کے آگ دوبارہ جلا لی۔

وہ میری طرف بڑی محبت سے دیکھ کر بولی۔ ''تم بہت جیادہ تھک گئے ہو۔ چوٹ میں درد بھی ہو رہا ہوئیں گا۔ تم یہاں آگ کے پاس لیٹ کر آرام کر لو۔ میں جاگتی ہوں۔ بعد میں، مَیں تھوڑی دیر کے لیے سو لوں گی۔''

''نہیں...... میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔

لیکن وہ اصرار کرتی رہی۔ میں آگ کے قریب لیٹ گیا۔ وہ کھوہ کی دوسری دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھی رہی۔ چھوٹے دستے کی کلہاڑی اس کے قریب رکھی تھی۔ میری والی کلہاڑی وہ واپس جھولے میں ڈال چکی تھی۔ میں لیٹ تو گیا تھا لیکن سو نہیں سکتا تھا۔ یہ مخبوط الحواس لڑکی کلہاڑی بدست میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ یہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ پھر میرے ذہن میں ایک اور اندیشہ بھی سر اُٹھا رہا تھا۔ عین ممکن ہے کہ اس لڑکی کے پیچھے واقعی کچھ خطرناک لوگ ہوں۔ وہ اس کے پیچھے یہاں تک آ سکتے تھے اور نتیجے میں، مَیں بھی کسی غیر متعلقہ مصیبت کا شکار ہو سکتا تھا۔ میرے سر پر پہلے ہی مصائب کے پہاڑ ٹوٹے ہوئے تھے، اگر میں یہ کہوں کہ زندوں میں تھا نہ مُردوں میں تو بے جا نہ ہو گا۔

میں آگ کے قریب لیٹا رہا۔ میرے سینے میں آنسوؤں کا آبشار گرتا رہا۔ کھوہ سے باہر بارش ایک بار پھر شدت اختیار کر گئی تھی۔ میں عجیب مخمصے میں تھا۔ مجھے یہ رات...... یہ کھوہ...... یہ لڑکی...... یہاں تک کہ اپنا وجود...... سب کچھ جاگتی آنکھوں کا خواب لگ رہا تھا۔ بہت زور سے بجلی کڑکی۔ قرب و جوار لرز کر رہ گئے۔ لڑکی نے کچھ اور لکڑیاں آگ میں جھونک دیں اور میری طرف مسکراتی نظروں سے دیکھا۔

آگ کی حرارت اور مسلسل خاموشی نے میری آنکھوں میں ڈھیرے ڈھیرے غنودگی بھر دی۔ اپنے بے پناہ کرب سے لڑتے لڑتے میری آنکھ لگ گئی۔ اندازاً میں ایک ڈیڑھ گھنٹے تک سویا رہا۔ آنکھ کھلی تو سینے پر بھاری بوجھ سا محسوس ہوا۔ کھوہ میں گہری تاریکی تھی۔ آگ کی راکھ میں بس چھوٹی موٹی چنگاریاں چمک رہی تھیں۔ میں نے اپنے سینے کو ٹٹولا تو وہاں لڑکی کا سر رکھا ہوا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے لائٹر جلایا۔ نیلگوں شعلے کی روشنی میں ارد گرد کا منظر دکھائی دیا۔ وہ میرے سینے پر سر رکھے سو رہی تھی۔ اس کا پورا جسم میرے جسم سے چھو رہا تھا۔ اس کے نہایت گھنے بال میری گردن اور کندھوں پر بکھرے تھے۔

میں جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ وہ بھی بیدار ہو گئی۔ وہ چند سیکنڈ تک خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ تب اس نے اپنے سینے پر دوپٹا درست کیا اور بال سمیٹنے لگی۔ ''شاید میں بھی سو گئی تھی۔'' وہ ہولے سے بولی۔

اس نے آگ دوبارہ جلائی۔ آگ روشن ہوئی تو وہ بڑے دھیان سے میرے سر کی چوٹ کا جائزہ لینے لگی۔ اس نے سر کی پٹی کو چھوا اور بولی۔ ''خدا کا شکر ہے خون رسنا بند ہو گیا ہے۔ کیا پتا کہ ٹانکوں کی جرورت اچ نہ پڑے۔''

کھوہ سے باہر ابھی گہری تاریکی تھی۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ بس کسی وقت بجلی چمک جاتی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ رات کا آخری پہر تھا۔ اچانک وہی آہٹ سنائی دی۔ جو میرے سونے سے پہلے سنائی دی تھی۔ اس مرتبہ یہ آہٹ دہانے کے بالکل پاس سے اُبھری تھی اور خاصی واضح تھی۔ یہ انسانی قدموں کی آواز لگتی تھی۔

لڑکی نے اپنی کلہاڑی کی تلاش میں تیزی سے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ تھوڑی دور اس کے جھولے کے پاس ہی پڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اُٹھ کر کلہاڑی تک جاتی، یکا یک ایک شخص کھوہ کے دہانے پر نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ یہ منظر اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ چند سیکنڈ کے لیے لڑکی بھی سکتہ زدہ رہ گئی۔ رائفل بردار کے سر پر بڑا سا پگڑا تھا۔ اس نے تہ بند، کُرتہ پہن رکھا تھا۔ وہ بڑی بڑی مونچھوں والا ایک کڑیل دیہاتی دکھائی دیتا تھا۔ اس کا رائفل پکڑنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اسلحہ شناس ہے اور غالباً اسے چلانے کی ہمت بھی رکھتا ہے۔ اس نے دانت نکوسے اور لڑکی کو مخاطب کر کے زہریلے لہجے میں بولا۔ ''حکم جی کی حد سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہے سلطانہ! اتنی ہمت اور چالاکی دکھانے کے لیے تجھے دوسری، تیسری بار جنم لینا پڑے گا، پھر بھی جروری نہیں کہ تُو کامیاب اِچ ہو جائے۔''

لڑکی جسے سلطانہ کہا گیا تھا، اپنی جگہ پتھرائی ہوئی بیٹھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ رائفل کا رُخ اس کی طرف ہے اور اس کی کوئی بھی غلط حرکت اسے نقصان پہنچا سکتی ہے۔

''کیا چاہتے ہو تم؟'' وہ بولی۔

''میں چاہنے یا نہ چاہنے والا کون ہوتا ہوں۔ چاہنے والا تو وہی تمہارا عاشخ (عاشق) گورا صاحب ہے اور وہ تم کو اپنی جورو بنا کر اِچ رہے گا۔ چلو شاباش، اُٹھو۔ اب تم کو واپس جانا ہوئیں گا۔''

''نہیں...... میں ہرگج نہیں جاؤں گی۔'' وہ سینہ تان کر بولی۔ ''ہر کسی کو پتا ہے کہ میں بیاہتا ہوں۔ بیاہتا پر حکم جی کا ادھکار ہے اور نہ ان کے کسی یار دوست کا۔''

''لیکن وہ تمہیں بیاہتا نہیں مانتے۔ پنڈت جی نے فیصلہ دے دیا ہے اور تم بھی اس فیصلے کو اچھی طرح جانتی ہو۔''

''میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتی کہ پنڈت نے اپنے دھرم کو موم کی ناک بنایا ہوا ہے۔ حکم جی کے اشارے پر وہ اس ناک کو جدھر چاہے موڑ لیتا ہے۔''

''بکواس بند کر۔ وہ تیری یہ گوری چمڑی ادھیڑ کر اس میں بھس بھر دیں گے۔ ایسی سجا دیں گے کہ مر کر بھی چین نہ پائے گی۔ اب بھی وخت ہے، جا کر حکم جی کے پاؤں میں گر جا

اور گڑگڑا کر مافی مانگ لے۔''

''ہارون! تُو جانتا ہے کہ میں کس ماں کی بیٹی ہوں۔ مر جاؤں گی پر عجت کے لٹیروں کے آگے سر نہ جھکاؤں گی۔ مجھے شرم آ رہی ہے تیرے کرتوتوں پر۔ کہنے کو تُو مسلمان ہے پر حکم جی کے پھینکے ہوئے، بے غیرتی کے ٹکڑے کھا کھا کر تیرا جمیر مر گیا ہے۔ جو بندوخ تُو نے میری طرف اُٹھائی ہوئی ہے، یہ ان لوگاں کی طرف اُٹھا جو تیری آنکھوں کے سامنے دن رات سکینہ اور اس جیسی دوسری لڑکیوں کی عجت کے جنازے نکال رہے ہیں۔''

''بکواس بند کر حرام جادی...... جبان کھینچ لوں گا۔''

یہی وقت تھا جب میری آنکھوں کے سامنے برق سی کوندگئی۔ اشتعال میں آ کر بندوق بردار تھوڑا سا آگے آیا تھا۔ لڑکی نے اس صورتِ حال کا فائدہ اُٹھایا۔ وہ تیزی سے جھپٹی اور اس پر جا پڑی۔ بندوق بردار جس کا نام لڑکی نے ہارون لیا، اس حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ دونوں اوپر نیچے گرے۔ لڑکی نے بندوق کی نال پکڑ کر اوپر اُٹھا دی تھی۔ ہارون نامی وہ شخص فائر کرتا بھی تو گولی کھوہ کی چھت میں کہیں لگتی۔ بہر حال اس نے فائر نہیں کیا۔ شاید اسے موقع نہیں ملا یا پھر ہمت ہی نہیں ہو سکی۔ جلد ہی بندوق بردار سنبھل گیا۔ اس نے پلٹا کھا کر لڑکی کو اپنے نیچے کر لیا اور بندوق کو کسی لاٹھی کی طرح لڑکی کی گردن پر آڑھا رکھ کر اس کی گردن دبانے لگا۔ وہ بھرپور مزاحمت کر رہی تھی۔ میں مزید اپنی جگہ پر بیٹھا نہیں رہ سکا۔ میں نے بندوق بردار کے کُرتے کا کالر عقب سے پکڑ لیا اور اُسے لڑکی پر سے کھینچنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ خاصا زور آور تھا، ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اس کا پگڑ کھل گیا تھا اور گلے میں پڑا تھا۔ میں نے ایک لکڑی سے اس کے سر پر چوٹ لگائی اور پھر اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر پوری طاقت سے پیچھے کی طرف کھینچا۔

یک دم اس نے لڑکی کو چھوڑ دیا اور وحشیانہ انداز میں مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس نے بندوق کے چوبی دستے سے مجھے ضرب لگائی۔ یہ ضرب میرے چہرے پر لگتی مگر میرے پیچھے ہٹنے سے میرے کندھے پر لگی۔ میں لڑکھڑا کر پشت کے بل گر گیا۔ وہ مجھ پر پل پڑا اور بندوق کے دستے سے مجھے اندھا دھند مارنے لگا۔ میں نے کچھ ضربیں اپنی کلائیوں پر روکیں، کچھ میری پسلیوں اور سر پر لگیں۔ سلطانہ نامی لڑکی نے جب یہ منظر دیکھا تو بپھری ہوئی شیرنی کی طرح بندوق بردار کی طرف آئی۔ وہ عقب سے اس سے چمٹ گئی۔ چلّانے لگی۔ ''چھوڑ دو اس کو۔ میں کہتی ہوں چھوڑ دو۔ میں تمہاری جان لے لوں گی۔ کتے، حرام جادے۔'' وہ جیسے دیوانی ہو گئی تھی۔ اس کے لمبے بال دائیں بائیں لہرا رہے تھے، اس کا توانا جسم ایک دم سرکش نظر آ رہا

تھا۔

بندوق بردار ہارون نے اس کی طرف مڑے بغیر اسے کہنی سے شدید ضرب لگائی۔ وہ اپنا منہ پکڑ کر کئی فٹ پیچھے جا گری۔ جہاں وہ گری، وہیں پر چھوٹے دستے کی کلہاڑی پڑی تھی۔ ایک لمحے میں لڑکی نے کلہاڑی پکڑی اور واپس بندوق بردار پر جھپٹی۔ اس مرتبہ اس نے بے دریغ بندوق بردار کے سر کو نشانہ بنایا۔ کلہاڑی اس کے سر کے پچھلے حصے پر لگی۔ ہڈی اور لوہے کے تصادم کی آواز صاف سنائی دی۔ یکایک بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھاما اور میرے پہلو میں گرا۔ لڑکی دیوانہ وار اسے کلہاڑی سے ضربیں لگانے لگی۔ تاہم اب وہ کلہاڑی کو اُلٹی طرف سے استعمال کر رہی تھی۔ کند لوہے کی چوٹوں نے دیکھتے ہی دیکھتے ہارون نامی اس حملہ آور کا چہرہ لہولہان کر دیا۔ وہ ایک دم نیم مُردہ دکھائی دینے لگا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر لڑکی کا ہاتھ روکا۔ وہ اب بھی بپھری ہوئی تھی۔ میں اسے پیچھے لے گیا۔ اسے کھوہ کی دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ وہ شعلہ فشاں نظروں سے بے سدھ پڑے بندوق بردار کو دیکھتی رہی۔ اس کی سانس چل رہی تھی لیکن وہ گہری بے ہوشی میں دکھائی دیتا تھا۔

وہ کچھ دیر تک خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی پھر اس نے کلہاڑی ایک طرف پھینکی اور کھوہ کی دیوار کے ساتھ پھسلتی ہوئی نیچے بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپایا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ ''جو تمہیں نخصان (نقصان) پہنچائے گا، میں اسے نخصان پہنچاؤں گی۔ میں...... اس کی جان لے لوں گی۔ میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ اگر تمہیں کچھ ہوئیں گا تو اس وخت ہوئیں گا۔ جب میری لاش گر چکی ہوئیں گی۔''

وہ اپنے مخصوص انداز میں بول رہی تھی اور ہچکیوں سے روتی جا رہی تھی۔

میں دم بخود کھڑا تھا۔ میں نے اس کا عجیب روپ دیکھا تھا۔ پھر میں جیسے چونک کر بندوق بردار کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اوندھا پڑا تھا۔ اس کے ایک دو دانت ٹوٹ گئے تھے۔ کاری زخم کلہاڑی کے بلیڈ سے آیا تھا جو سر کے پچھلے حصے پر تھا۔ وہاں سے کٹی ہوئی جربی کے اندر سے مسلسل خون رس رہا تھا۔ اس شخص نے دیسی ساخت کی جوتی پہن رکھی تھی۔ اس کا لباس بھی مجھے نامانوس سا لگا۔ لڑکی سلطانہ کی طرح ہارون نے بھی نامانوس حیدری آبادی لہجے میں بات کی تھی۔ ایک دو لفظ ہندی کے بھی بولے تھے۔ پھر کسی پنڈت جی کا ذکر بھی کیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ سندھ کے اندرونی علاقوں میں ہندو آباد ہیں۔ کئی جگہ ان کی پوری پوری بستیاں ہیں مگر میں سندھ میں تو نہیں تھا، پنجاب میں تھا۔ بلکہ مجھے لاہور کے گرد و نواح میں

کہیں ہونا چاہیے تھا۔ شروع میں، مَیں نے جب اپنے اردگرد گھنے درخت دیکھے تو سوچا تھا کہ شاید میں چھانگا مانگا یا شیخوپورہ کے علاقے میں کہیں ہوں۔ مگر اب یہ خیال باطل محسوس ہو رہا تھا۔ یہ ویسا علاقہ ہرگز نہیں تھا۔ تو پھر کیا میں اندرون سندھ میں کہیں تھا؟

ہارون نامی شخص بالکل بے سدھ تھا۔ اس کی گھنی مونچھوں کی حرکت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ باقاعدگی سے سانس لے رہا ہے۔ اس کی کمر سے گولیوں والی پیٹی بندھی تھی اور چھوٹی نال والی چینی ساخت کی رائفل پاس ہی پڑی تھی۔

سلطانہ اپنی جگہ سے اُٹھی۔ اس نے اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو ایک بار پھر سمیٹا۔ ہارون کے ساتھ دھینگا مشتی میں اس کی سوتی قمیص سامنے سے پھٹ گئی تھی اور دودھیا جسم جھانک رہا تھا۔ اس نے اس پھٹے ہوئے حصے کو گرہ لگا لی۔ ہارون پر ایک نفرت آمیز نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔

''مہرو! ہمیں یہاں سے جلدی نکلنا ہوئیں گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس خبیث کے ساتھی بھی آس پاس موجود ہوں۔''

''یہ ہوش میں بھی آ سکتا ہے۔'' میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

سلطانہ نے جلدی جلدی ہارون کی کمر سے گولیوں والی بیلٹ کھولی۔ پھر اس کی چھوٹی نال والی رائفل اُٹھائی اور اسے جھولے میں ڈال لیا لیکن یہ پہلے والا جھولا نہیں تھا۔ یہ دوسرا تھا۔ اس پر پہلے میری نگاہ نہیں پڑی تھی۔ یہ کھوہ کی پچھلی دیوار کے ساتھ پڑا تھا۔

''اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

اس کی پیشانی پُرسوچ کی سلوٹ اُبھری۔ ''نہیں...... میرا خیال ہے کہ صرف ہاتھ باندھ دیتے ہیں۔'' وہ بولی۔ ''تمہیں پتا ہے نا وہاں چھوٹے گاؤں میں سریتا کے پتی راجندر کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ راجو نے اس کے پاؤں بھی بندھوا دیئے تھے، وہ تمہارے دوست مختار کی کوٹھڑی میں بھوکا پیاسا مر گیا تھا۔''

پتا نہیں وہ کن لوگوں کی باتیں کر رہی تھی اور مجھے کیوں ان میں شامل کرتی جا رہی تھی۔ ایسی باتیں کرتے ہوئے وہ بالکل مخبوط الحواس دکھائی دیتی تھی۔ شاید اسے کوئی شدید صدمہ پہنچا تھا جس کے سبب اس نے ہوش و حواس کھو دیئے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ اس صدمے کا تعلق اس کے مہروز نامی شوہر سے ہی ہوا۔ اپنے دیوانے پن میں شوہر کو تلاش کرتی ہوئی وہ دور نکل آئی ہو اور ہارون وغیرہ اسے ڈھونڈ رہے ہوں۔ وہ اپنے خیالات میں اس قدر پختہ دکھائی دیتی تھی کہ اس موقع پر اس کی باتوں کی تردید کرنا یا اس سے بحث میں اُلجھنا خطرناک ثابت ہو

سکتا تھا۔ میں نے خاموشی مناسب سمجھی۔

اس نے میرے ساتھ مل کر ہارون کے ہاتھ پشت پر موڑے اور انہیں اچھی طرح ایک ازار بند سے باندھا۔ یہ ازار بند اس کے جھولے سے ہی نکلا تھا۔ اس کے بعد اس نے ہارون کے لباس کی تلاشی لی۔ اس کے کُرتے کی بغلی جیب سے ایک رومال، ایک چھوٹا جیبی چاقو اور تھوڑی سی کرنسی نکلی۔ کرنسی دیکھ کر میں پھر چونکا۔ مجھے لگا کہ ان نوٹوں میں کچھ اجنبی نوٹ بھی شامل تھے۔ غالباً وہ انڈین تھے۔ انڈین کرنسی اس شخص کی جیب میں؟ یہ خاصا اہم سوال تھا۔

نہ جانے کیوں مجھے لگنے لگا کہ میں انڈین بارڈر کے آس پاس کہیں ہوں۔ سرحدی علاقوں میں اس قسم کے جنگلی رقبے بھی عام پائے جاتے ہیں۔ وہاں اسمگلنگ وغیرہ کا دھندا بھی ہوتا ہے۔ ہارون نامی اس شخص کی جیب سے غیر ملکی کرنسی کا نکلنا کئی امکانات کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ ان میں اسمگلنگ کا امکان بھی شامل تھا۔ ان لمحوں میں ایک دم عمران کی شبیہہ میری نگاہوں میں اُبھری اور سینے میں درد کی ایک شدید ٹیس، بے کراں کرب بن کر پھیل گئی۔ وہ اس وقت یہاں میرے ساتھ ہوتا تو اس کی متجسس فطرت یکا یک انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتی۔ وہ خدائی فوجدار بن جاتا اور فوراً اس امر کی سراغ رسانی شروع کر دیتا ہے کہ اس موچھیل دیہاتی کی جیب میں انڈین کرنسی کیسے آئی ہے۔ عمران کے خیال کے ساتھ ہی میرے سینے میں موجزن دُکھ کا سمندر کچھ اور بھی بپھر گیا۔ آنسو آنکھوں کے بند توڑ کر بہہ نکلنے کو بیتاب ہو گئے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم یہ تاریک کھوہ چھوڑنے کے لیے تیار تھے۔ بارش تھمی ہوئی تھی، بس کسی وقت باریک پھوار پڑنے لگتی تھی۔ اندھیرے میں آہستہ آہستہ اُجالے کی آمیزش ہو رہی تھی۔ سلطانہ نے چھوٹا جھولا میری طرف بڑھایا اور بڑا خود اپنے کندھے سے لٹکا لیا۔ وہ جلد از جلد یہ جگہ چھوڑنے کی خواہاں تھی۔

ہم کھوہ سے نکلے اور نم زمین پر احتیاط سے پاؤں رکھتے ہوئے درختوں میں آگے بڑھنے لگے۔ ہوا چلتی تو شاخوں سے بہت سا پانی جھڑ کر ہمارے اوپر گرتا اور لگتا کہ بارش پھر شروع ہو گئی ہے۔ بھیگے ہوئے گھونسلوں میں پرندوں نے ہولے ہولے بولنا شروع کر دیا تھا۔ میں سلطانہ سے ایک قدم پیچھے چل رہا تھا۔ وہ کسی شکاری جانور کی طرح چوکس نظر آتی تھی۔ اس نے اپنے کپڑے کے جھولے میں کلہاڑی اس طرح رکھی ہوئی تھی کہ ضرورت پڑنے پر وہ اسے فوراً باہر نکال سکتی تھی۔ میرے والے جھولے میں بھی کلہاڑی اسی انداز سے رکھی گئی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد اُجالا پھیل گیا۔ بادلوں کے اندر سے کہیں کہیں نیلا آسمان نظر آ رہا تھا۔

رات بھر کی بارش سے سب کچھ اُجلا اور نکھرا ہوا نظر آتا تھا۔ یہ دیوانی لڑکی نہ جانے مجھے کہاں لے جا رہی تھی؟ ''وہ دیکھو مہرو! وہاں سے جلے ہوئے درخت شروع ہو جاتے ہیں۔'' اس نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

مجھے جلے ہوئے خشک درختوں کے آثار نظر آئے۔ سلطانہ نے ایک چھوٹے سے کچے ٹیلے پر کھڑے ہو کر اطراف کا اچھی طرح جائزہ لیا اور پھر ایک سمت کا تعین کر کے بااعتماد طریقے سے آگے بڑھنے لگی۔ میں خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ اس سے کہنا کچھ بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہوگا۔ اگر میں اس سے کچھ کہوں گا تو وہ اُلٹا مجھے مخبوط الحواس سمجھنے لگے گی اور عین ممکن ہے، یہ گمان کرنے لگے کہ سر پر چوٹ آنے کی وجہ سے میں ہوش و حواس کھو بیٹھا ہوں۔ میں چاہتا تھا کہ وہ جن لوگوں کے پاس جانا چاہ رہی ہے، ان تک پہنچ جائے۔ ممکن تھا کہ وہ لوگ دوستانہ رویہ ظاہر کرتے اور میری مدد کو آمادہ ہو جاتے۔ ان کے ذریعے میں کسی معروف راستے پر پختہ سڑک تک پہنچ سکتا تھا۔ ایک بار میں اس ویرانے سے نکل جاتا پھر سوچا جا سکتا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ پولیس تک پہنچنا ہے؟ کسی عزیز رشتے دار کی مدد حاصل کرنی ہے یا خاموشی سے فرح اور عاطف کی کھوج لگانا ہے؟

دوسری سوچ یہ تھی کہ میں راستے میں ہی کسی مناسب جگہ پر اس لڑکی سے علیحدہ ہو جاؤں۔ اس بات کا اندیشہ موجود تھا کہ اس کے ساتھ ''نل پانی'' نامی بستی میں جا کر میں کسی اور چکر میں پھنس جاتا۔ انہی سوچوں میں غلطاں میں مسلسل چلتا جا رہا تھا۔ اب ہلکی دھوپ نکل آئی تھی۔

''میرا خیال ہے کچھ کھا لینا چاہیے۔ تمہیں بھی بھوک لگ رہی ہوگی۔'' لڑکی نے ایک سایہ دار درخت کے نیچے خشک جگہ دیکھ کر کہا۔

وہ بھوک کی بات کر رہی تھی اور میرے اندر صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے دو میتیں تھیں۔ ایک عمران کی دوسری والدہ کی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں شاید ہفتوں تک کوئی نوالہ گلے سے نیچے نہ اُتار سکوں۔ سلطانہ نامی وہ لڑکی درخت کے ایک گرے ہوئے تنے پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا جھولا کھولا۔ پلاسٹک کے ایک سبز برتن کے اندر گوشت کے تلے ہوئے ٹکڑے تھے۔ خشک چنے اور میٹھی پھلیاں وغیرہ بھی تھیں۔ دو بوتلوں میں صاف پانی تھا۔ جھولے کے سامان سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جہاں سے بھی نکلی ہے، پوری تیاری سے نکلی ہے۔ اس کے بے حد اصرار پر میں نے تھوڑے سے چنے کھائے اور پانی پیا۔ پانی کا ذائقہ بھی کچھ عجیب لگا۔ سلطانہ بڑی جلدی میں نظر آتی تھی۔ وہ جلدی جلدی لقمے لے رہی تھی۔ گاہے

بہ گاہے اس کی نگاہ بے ساختہ اپنے عقب میں اُٹھ جاتی تھی۔ اسے جیسے ڈر تھا کہ کوئی اس کے پیچھے آ سکتا ہے۔

دن کی روشنی میں، مَیں اسے زیادہ وضاحت سے دیکھ سکتا تھا۔ اس کی رنگت تانبے جیسی تھی۔ رُخسار چوڑے تھے اور ان کی ہڈیاں کچھ اُبھری ہوئی تھیں۔ بالکل سفید دانت ذرا سے اندر کی طرف مڑے ہوئے تھے اور اس کی سخت جانی کو ظاہر کرتے تھے۔

وہ جلدی جلدی لقمہ چباتے ہوئے بولی۔ ''پتا نہیں بالو کہاں ہوئیں گا۔ کیا کر رہا ہوئیں گا؟ اس نے کچھ کھایا بھی ہوئیں گا کہ نہیں۔''

اس نے دوسری تیسری دفعہ کسی ''بالو'' کا ذکر کیا تھا۔ رات کو بھی جب ہم کھوہ میں تھے، زور دار بارش ہو رہی تھی اور بجلی کڑک رہی تھی تو اس نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا تھا۔

''بڑی ٹھنڈ ہو گئی ہے۔ پتا نہیں بالو کہاں ہوئیں گا؟''

وہ جھولا سمیٹ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے میرے سر کی چوٹ کا معائنہ کیا۔ مطمئن انداز میں سر ہلایا اور ہم پھر چل دیئے۔ وہ مجھے گفتگو میں شریک کرتے ہوئے بولی۔ ''تمہارا کیا خیال ہے ہاشم، بالو کو لے کر ڈیرے پر پہنچ گیا ہوئیں گا نا؟''

''ہو سکتا ہے۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

''ویسے وہ جے دار تو بہت ہے۔ اسے پتا ہے کہ میرے بغیر بالو کو سنبھالنا مشکل ہو جائیں گا۔ وہ ایک دم سب کو مصیبت میں ڈال دیں گا۔''

میں نے ایک بار پھر سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس نے کلہاڑی نکال لی تھی۔ جہاں کہیں جھاڑ جھنکاڑ زیادہ ہوتا، وہ اسے کاٹ کر آگے بڑھ جاتی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اسی ویرانے میں پل بڑھ کر جوان ہوئی ہے اور اس جنگل کے نشیب و فراز اس کے لیے ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح ہیں۔ اس کے انداز میں بلا کی چستی تھی۔ اسے چلتے پھرتے دیکھ کر میں نے ایک اور بات محسوس کی۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ وہ واقعی شادی شدہ ہے اور اس کا سڈول جسم ''دودھ پلانے والی ماؤں'' جیسا ہے۔ مجھے اس کی سوتی قمیص پر سامنے کی طرف گیلاہٹ نظر آئی۔ ایسی گیلاہٹ کبھی کبھی ان ماؤں کے کپڑوں پر نظر آتی ہے، جن کے جسم میں قدرت نے بچے کی ''خوراک'' کی فراوانی رکھی ہوتی ہے۔ ہم جونہی ایک جھنڈ سے نکلے، سلطانہ کے چہرے پر خوشی کی چمک نظر آئی۔ اس نے ایک دم اپنی انگلی سے دور کہیں اشارہ کیا اور چہکی۔ ''وہ دیکھو مہرو! وہ ہے ڈیرا۔''

میں نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ قریباً ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر قدرے نشیب میں

کسی گھر کی چھت نظر آ رہی تھی۔ اس کچے گھر کو چاروں طرف سے سبز درختوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ گھر سے تھوڑے فاصلے پر ایک کھلا احاطہ بھی نظر آتا تھا۔ اس کے گرد مٹی کی چار دیواری تھی۔

''میرا خیال ہے کہ تم یہیں ٹھہرو۔ میں اکیلی اچ جاتی ہوں۔'' سلطانہ نے کہا اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''ٹھ...... ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

اس نے اپنا جھولا اُتار کر ایک درخت کی موٹی شاخ سے لٹکا دیا اور تیزی سے درختوں میں اوجھل ہو گئی۔

میں اپنی جگہ کھڑا سوچتا رہا۔ کچھ دیر کے لیے ذہن میں آیا کہ اکیلا ہی آگے بڑھ جاؤں۔ جس طرح اس ویران جنگل میں یہ چھوٹا سا ڈیرا نظر آیا تھا، عین ممکن تھا کہ آگے بھی کوئی گھر یا متنفس نظر آ جاتا اور میں اس کی مدد حاصل کر سکتا لیکن اس میں رسک بھی تھا۔ میں راستہ کھو کر بھٹک سکتا تھا۔ کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے سلطانہ کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ کسی ہاشم نام کے بندے کی بات بھی کر رہی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ اسے لینے ہی گئی ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ تو سلطانہ کی طرح ذہنی بیمار نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ مجھے کچھ ٹھکانے کی باتیں بتا سکتا تھا اور یہ بھی بتا سکتا تھا کہ یہ لڑکی اصل میں کون ہے اور اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔

میں وہیں درخت کے پاس بیٹھ گیا۔ اپنا جھولا کھول کر دیکھا۔ اس میں دو تین مردانہ جوڑے تھے۔ پانی سے بھری ہوئی ایک چھوٹی بوتل تھی۔ دو چار سیب، اچار کا ڈبہ اور خشک چنے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ایک طرف کلہاڑی رکھی تھی۔ جو سب سے عجیب شے دکھائی دی، وہ ایک سرخ عروسی جوڑا تھا۔ گوٹے کناری والے اس جوڑے کو بڑی احتیاط سے تہ کر کے ایک دوسرے کپڑے میں رکھا گیا تھا۔ اس کے بعد میں اُٹھا۔ ارد گرد دور تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے سلطانہ کے شاخ سے لٹکے ہوئے جھولے میں تاکا جھانکی کی۔ زخمی ہارون کی تلاشی میں ملنے والے کرنسی نوٹ واقعی انڈین تھے۔ یہ کل ملا کر کوئی دو ڈھائی سو روپے بنتے تھے۔ ان میں پاکستانی نوٹ کوئی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ سلطانہ کے جھولے میں کچھ ایسا سامان بھی نظر آیا جو چھوٹے بچوں کے استعمال کے لیے ہوتا ہے۔ دو چار بالکل چھوٹے فراک، جانگیے اور بنیان وغیرہ۔ اس کے علاوہ پلاسٹک کے ایک دو کھلونے بھی تھے۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ وہ بار بار جس ''بالو'' کا ذکر کر رہی تھی، وہ اس کا شیر خوار بچہ ہی ہے۔

بہت سے دوسرے سوالوں کی طرح یہ سوال بھی ذہن میں سر اُٹھا رہا تھا کہ وہ بچہ سلطانہ کے ساتھ سفر کیوں نہیں کر رہا اور یہاں ڈیرے پر کیوں موجود ہے؟

میں وہیں بیٹھا خیالوں کے تانے بانے بُنتا رہا۔ سورج اب کافی اوپر آ گیا تھا، ہلکی تمازت محسوس ہونے لگی تھی۔ میں اپنے اردگرد سے چوکس تھا۔ کسی نامعلوم شخص یا اشخاص کے علاوہ مجھے کسی جنگلی جانور کی آمد سے بھی خطرہ تھا۔ یہ کوئی ''رکھ'' نہیں تھی، خالص جنگلی علاقہ تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے دور نشیب میں کچھ حرکت محسوس ہوئی۔ وہ واپس آ رہی تھی۔ غالباً اس کے ساتھ کوئی اور شخص بھی تھا۔ دھیرے دھیرے وہ دونوں قریب آ گئے۔ تب میں نے دیکھا کہ سلطانہ کے بازوؤں میں ایک بچہ بھی ہے۔

گھنی جھاڑیوں سے نکل کر سلطانہ جب میرے سامنے آئی تو اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ رُخسار بالکل سرخ ہو رہے تھے۔ اس نے چٹا چٹ بچے کے کئی بوسے لیے اور اس کا چہرہ میری طرف کرتے ہوئے بولی۔ ''دیکھو...... تین چار روز میں ہی کیا حال ہو گیا ہے۔ ایک دم آدھا رہ گیا ہے۔ میں جب وہاں پہنچی، اس وقت بھی رو رو کر آسمان سر پر اُٹھائے ہوئے تھا''

بچے کی عمر مشکل سے پانچ چھ ماہ ہو گی۔ وہ خوش شکل تھا۔ مسلسل رونے سے اس کی آنکھیں پنچھی ہو رہی تھیں۔

میں نے ساتھ آنے والے شخص کو دیکھا۔ وہ بھی دیہاتی لباس میں تھا۔ اس کے سر پر بڑا سا پگڑ تھا۔ ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ اس کی عمر پینتیس چالیس سال ہو گی۔ اس نے ہاتھ کو ماتھے پر لے جا کر مجھے سلام کیا اور خاموش کھڑا رہا۔

سلطانہ نے ایک بار پھر گول مٹول بچے کا منہ چوما، اسے سینے سے لگا کر بھینچا اور پھر اسے میری بانہوں میں دیتے ہوئے بولی۔ ''چلو...... اب جاؤ اپنے ابا کے پاس۔''

میں بھنا کر رہ گیا۔ ویسے مجھے اس سے کسی ایسی ہی حماقت کی توقع تھی۔

میں نے سلطانہ کے ساتھ آنے والے شخص کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل لاتعلق کھڑا تھا جیسے اس نے کچھ دیکھا، سنا ہی نہ ہو۔ وہ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔

سلطانہ نے بڑا جھولا خود اُٹھا لیا اور چھوٹے جھولے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''ہاشو! یہ تم اُٹھا لو۔'' زبان سے یہ الفاظ کہنے کے ساتھ ساتھ سلطانہ نے ہاتھوں سے بھی اشارے کیے تھے اور تب مجھے پتا چلا کہ سلطانہ کے ہمراہ آنے والا یہ ہاشم نامی شخص گونگا بہرا ہے۔ اس نے فرمانبرداری سے جھولا اُٹھایا اور ہمارے ساتھ چل دیا۔

بچہ میری گود میں تھا اور ماں کی طرف دیکھ کر ہمک رہا تھا۔ میں ٹپٹا گیا۔ زورازوری کی بیوی کے ساتھ اب یہ زبردستی کا بچہ بھی گلے پڑ رہا تھا۔ میں نے سلطانہ کی نگاہ بچا کر سوالیہ نظروں سے ہاشم عرف ہاشو کو دیکھا اور اشارے سے پوچھا کہ یہ لڑکی کیا شے ہے؟

وہ جیسے کچھ بھی سمجھ نہیں سکا اور بے ڈھنگے طریقے سے مسکرا کر رہ گیا۔ ہم ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ ہاشو کے آنے کے بعد اب ہاشو کی حیثیت راہبر کی ہو گئی تھی۔ میں اور سلطانہ اس کے عقب میں چل رہے تھے۔ میں اب جلد از جلد ''نل پانی'' نامی آبادی تک پہنچنا چاہتا تھا۔ فرح، عاطف، والدہ، عمران اور ثروت کے چہرے مسلسل میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ وہ سب میرے دل سے قریب ترین تھے۔ میرے اپنے تھے لیکن فی الوقت کوئی بھی میرے پاس نہیں تھا۔ کچھ مستقل طور پر بچھڑ گئے تھے، کچھ عارضی طور پر۔ جو عارضی طور پر بچھڑے ہوئے تھے، میں جلد از جلد ان کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔

بچہ میرے گلے سے لگا ہوا تھا۔ اس کی مستانی ماں میرے پہلو میں چل رہی تھی۔ جھولے میں پڑی کلہاڑی کا رنگین دستہ اس کے ہاتھ سے بہت قریب تھا۔ اس کی تیز نگاہیں اردگرد کا جائزہ لیتی جا رہی تھیں۔ یقیناً کھوہ میں اس ہارون نامی شخص کی اچانک آمد اور وہاں ہونے والی سنگین مار کٹائی کے مناظر سلطانہ کے ذہن میں تازہ تھے۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں پھر کوئی ایسا واقعہ رُونما نہ ہو جائے۔

چلتے چلتے بچہ کسمسایا اور اس کا ہاتھ میری گردن کے پچھلے حصے پر لگا۔ مجھے لگا جیسے یہ جگہ سُن ہے۔ مجھے یاد آیا کہ لاہور میں بتی والے چوک کے قریب گاڑی اُلٹنے کے بعد میں زخمی ہوا تھا اور میرے سر کے علاوہ گردن پر بھی زخم آئے تھے لیکن اب بچے کا ہاتھ لگنے کے باوجود مجھے گردن کے پچھلے حصے پر تکلیف نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے ہاتھ سے گردن کو ٹٹول کر دیکھا۔ محسوس ہوا کہ زخم مندمل ہو چکا ہے یا پھر...... اس پر کوئی ایسی چیز لیپ کر دی گئی ہے جس نے درد کا احساس ختم کر دیا ہے۔ آٹھ دس روز میں زخم کا اس طرح ٹھیک ہونا تو ممکن نہیں تھا، غالباً اس پر کوئی ایسی چیز لگا دی گئی تھی جس نے جلد کی سی شکل اختیار کر کے درد کا احساس ختم کر دیا تھا۔

ایک دم سلطانہ خوشی سے چلّا اُٹھی۔ اس نے انگلی سے دور درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ گھنے جنگل کے درمیان میں سے نیلے پانی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ یہ ایک خوبصورت قدرتی جھیل کی طرح تھی۔ اس جھیل کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی بستی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

''ہم پہنچ گئے۔ آخر ہم پہنچ اچ گئے۔'' وہ مسرور ہو کر بولی۔

ہم تیزی سے آگے بڑھتے رہے۔ آخر بستی اور جھیل کے خدوخال واضح ہونے لگے۔ نہایت گھنے جنگل کے درمیان یہ ایک قابلِ دید نظارہ تھا۔ جھیل کا ایک کنارہ پوری طرح آباد تھا اور یہ کوئی چھوٹی بستی نہیں تھی۔ یہ ایک بڑا قصبہ تھا۔ اس قصبے میں کم از کم تین مندروں کے کلس اور دو مسجدوں کے مینار دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے علاوہ ایک بہت بڑی حویلی ٹائپ عمارت تھی۔ اس سے ذرا کم بلند اور بھی کئی حویلیاں تھیں اور اس بستی کے درمیان بڑی شان سے سر اُٹھائے کھڑی تھیں۔ کل رات کی بارش نے ہر شے کو بڑی اچھی طرح نکھار دیا تھا۔ جھیل کے کنارے سبز ڈھلوانوں پر کہیں کہیں گائے بھینسیں اور بکریاں وغیرہ چرتی نظر آ رہی تھیں۔ جھیل کے دوسرے کنارے پر بڑی بڑی پگڑیوں والے گھڑ سواروں کا ایک دستہ تیزی سے جاتا دکھائی دیا۔

میں اس بستی کے خدوخال دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ میرا تو خیال تھا کہ ہم کسی دیہاتی بستی یا چھوٹے سے دیہہ میں پہنچیں گے۔ یہاں کا تو منظر ہی کچھ اور تھا۔

سلطانہ خوش تھی۔ وہ مجھے مخاطب کر کے بولی۔ ''کتنی پیاری جگہ ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ پہلے اسے ''نیلا پانی'' کہتے تھے لیکن پھر یہ نام بدلتے بدلتے ''نل پانی'' بن گیا۔ یہ پُرانے وختوں کی بات ہے۔ شاید حکم جی کے پڑدادا کے وخت کی یا پھر اس سے بھی پہلے کی۔''

میں نے اثبات میں سر ہلانے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ میں بس صورتِ حال کو جوں کا توں رکھ کر اس بستی میں پہنچنا چاہتا تھا اور سب سے پہلے یہ جاننا چاہتا تھا کہ میں آخر ہوں کس جگہ پر؟ کیا یہ واقعی اندرون سندھ کا کوئی علاقہ تھا؟ سانگھڑ، دادو وغیرہ...... لیکن یہ شاندار جھیل؟

خوشی کے عالم میں سلطانہ نے بچہ میرے ہاتھوں سے لیا اور تیزی سے قدم اُٹھانے لگی۔ جلد ہی ہم درختوں سے نکل کر جھیل کے کنارے پہنچ گئے۔ یہاں مجھے کئی دیہاتی عورتیں اور مرد نظر آئے۔ عورتوں نے گھاگرے چولے پہن رکھے تھے۔ مردوں کا لباس دھوتی کرتے اور بڑے پگڑ پر مشتمل تھا۔ کچھ جوان عورتیں سروں پر مٹکے رکھے ایک قطار میں جا رہی تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے دو بیل گاڑیوں کے بیل جھومتے اور گھنٹیاں بجاتے چلے جا رہے تھے۔ کسی نے ہماری طرف کوئی خصوصی توجہ نہیں دی۔

اگر ہم خشکی کے راستے بستی تک پہنچنا چاہتے تو کافی چکر پڑتا۔ اس کام کے لیے جھیل میں چھوٹی چھوٹی تین چار کشتیاں چل رہی تھیں۔ انہیں طویل بانسوں کے ذریعے دھکیلا جا رہا تھا۔ ہم بھی بچے سمیت ایک کشتی پر سوار ہو گئے۔ پندرہ سواریاں پوری ہو گئیں تو کشتی بان نے کشتی کھینی شروع کی۔ ساتھ ساتھ وہ سواریوں سے کرایہ بھی وصول کرتا جا رہا تھا۔ وہ نوجوان

لڑکا تھا۔

''کتنے پیسے بھائی؟'' سلطانہ نے کشتی بان سے پوچھا۔

''کتنی سواریں ہیں دیدی۔''

''تین......''

''تین روپے دے دو جی۔''

سلطانہ نے دوپٹے کی گرہ سے پیسے کھولے اور ایک نوٹ کشتی بان کو دیا۔ یہ پانچ کا نوٹ تھا اور انڈین تھا۔ کشتی بان نے جو دو روپے بقایا دیئے، وہ بھی انڈین تھے۔ کشتی میں تین چار عورتیں ایسی موجود تھیں جن کی مانگوں میں سیندور بھرا تھا۔ ایک دو لڑکیوں کے ماتھے پر بندیا نظر آ رہی تھی۔ مجھے یہ سارا ماحول ہی کچھ عجیب لگ رہا تھا۔ اس ساری صورتِ حال میں کوئی خلا محسوس ہو رہا تھا۔ کوئی بہت بڑا خلا۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کئی گنا بڑھی کہ باقی سواریوں نے بھی جو کرایہ دیا، وہ بھارتی کرنسی میں تھا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ یوں لگا کہ جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔ تو کیا...... تو کیا میں اپنے ملک میں نہیں تھا؟ میں پاکستان میں نہیں تھا؟

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ اپنے اردگرد کی ہر شے گھومتی محسوس ہو رہی تھی۔ ''کیا ہوا مہرو! خیریت تو ہے؟'' سلطانہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''ہم...... کہاں...... ہیں؟'' میں نے ٹوٹی ہوئی آواز استفسار کیا۔

''نل پانی میں مہرو! اور کہاں؟''

''یہ نل پانی کہاں ہے؟'' میری آواز لرز رہی تھی۔

''نل پانی کہاں ہوئیں گا۔ وہیں ہوئیں گا جہاں پر ہمیشہ سے ہے۔'' سلطانہ نے ایک بار پھر مجھے پُرتشویش نظروں سے دیکھا۔

میرا جی چاہا کہ اسے تھپڑ دے ماروں مگر میں یہاں کوئی ہنگامہ کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں اپنا سر پکڑے خاموش بیٹھا رہا۔

اسی دوران میں کشتی کے اندر بیٹھی سواریوں میں سے ایک بڑھیا کے ہاتھ سے اس کا مرغا چھوٹ گیا اور کشتی میں اِدھر اُدھر پھدکنے لگا۔ لوگ اسے پکڑنے کی کوشش میں دائیں بائیں ہوئے تو کشتی بُری طرح ڈولنے لگی۔ چند سیکنڈ کے لیے تو یوں لگا کہ وہ اُلٹ ہی جائے گی۔ پھر کشتی بان اور اس کے معاون کی ڈانٹ ڈپٹ سے لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے اور یہ خطرہ ٹلا۔

ہم دوسرے کنارے پر پہنچے۔ میرے دماغ میں مسلسل تند و تیز آندھیاں چل رہی

تھیں۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ میں جس مقام پر ہوں، یہ پاکستان میں نہیں ہے۔ ہر گز نہیں ہے۔ تو کیا میں انڈیا کے کسی سرحدی علاقے میں تھا؟ اگر ایسا ہی تھا تو پھر مجھے بارڈر کیسے کراس کرایا گیا تھا؟ اور بارڈر کراس کرانے والوں نے مجھے اس نامعلوم علاقے میں کیوں چھوڑ دیا تھا؟ مجھے یہ بھی لگ رہا تھا کہ میں اپنے اندازوں سے زیادہ دیر تک بے ہوش رہا ہوں۔ جلد ہی ہم ایک گھر کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ سلطانہ نے اب اپنا چہرہ چھوٹے سے گھونگھٹ میں چھپا لیا تھا۔ وہ کچھ ہراساں بھی نظر آتی تھی۔ اس نے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ چند سیکنڈ بعد ایک درمیانی عمر کے مقامی شخص نے دروازہ کھولا۔ وہ بھی دیہاتی لباس میں تھا۔ تاہم اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی اور ماتھے پر محراب کا نشان ظاہر کرتا تھا کہ وہ مسلمان ہے۔

اس نے دروازہ کھولنے کے بعد سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ سلطانہ جلدی سے بولی۔ ''آپ چاچا غنی ہیں نا؟''

ادھیڑ عمر شخص نے اثبات میں سر ہلایا۔

سلطانہ نے کہا۔ ''میں سلطانہ ہوں جی۔ زرگاں سے......''

ادھیڑ عمر غنی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے ایک بار پھر ہم تینوں کا جائزہ لیا اور ہمیں اندر آنے کے لیے کہا۔

یہ ایک درمیانے سائز کا دیہاتی گھر تھا۔ چھت لکڑی کی تھی۔ دیواریں اور فرش کچا تھا۔ تاہم بڑی اچھی طرح لیپا پوتی کی گئی تھی اور نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ غنی نامی اس شخص نے سلطانہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''آج میں اکیلا ہی ہوں، بچے کل سے اپنے ماموں کی طرف گئے ہوئے ہیں۔۔ ویسے میرا خیال تھا کہ تم لوگ ایک دو روز بعد آؤ گے۔ رمجان نے تو مجھ سے یہی کہا تھا۔''

''بس جلدی آنا پڑ گیا جی! حالات اچ کچھ ایسے ہو گئے تھے۔'' سلطانہ منمنائی۔ وہ اب بھی گھبرائی ہوئی لگتی تھی۔

''یہ ہے تمہارا شوہر؟'' ادھیڑ عمر غنی نے میری طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''جی ہاں......'' وہ ذرا سا شرمائی۔

''یہ چوٹ کیسے لگی بیٹا؟'' غنی نے مجھ سے پوچھا۔

میرے بولنے سے پہلے ہی سلطانہ بولی۔ ''کل شام کے وخت پیڑ سے گرے ہیں۔ کافی جیادہ چوٹ آئی ہے۔ میں نے پٹی تو کر دی ہے، پر ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر کے پاس لے

جانے کی جرورت پڑ جائے۔''

میں نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''غنی صاحب! آپ میری ایک بات سنیے۔''

ادھیڑ عمر غنی ایک لمحے کے لیے تذبذب میں نظر آیا۔ پھر اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولا۔

''خیریت تو ہے؟''

''ہاں جی......بس ذرا اکیلے میں آپ سے کچھ کہنا ہے۔''

سلطانہ ایک دم پریشان نظر آنے لگی۔ وہ کچھ بولنا چاہ رہی تھی مگر اس سے پہلے ہی ہم کمرے سے باہر آ گئے۔ گونگا بہرا ہاشم دروازے کے پاس لاتعلق سا بیٹھا تھا۔ ایک قریبی کمرے میں جا کر میں نے غنی صاحب سے کہا۔ ''میں سخت پریشان ہوں جی! سب سے پہلے مجھے یہ بتائیں کہ یہ لڑکی کون ہے؟''

غنی صاحب حیرت سے میرا چہرہ تکنے لگے۔ ''کیا کہہ رہے ہو تم؟ یہ تمہاری بیوی نہیں ہے؟''

''نہیں جی! یہ میری بیوی نہیں ہے اور نہ میں اسے جانتا ہوں۔ یہ کل شام پہلی بار مجھ سے ملی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کی دماغی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ کل سے مسلسل اول فول بک رہی ہے۔''

''اور یہ بچہ جو ساتھ ہے؟''

''وہ بھی میرا نہیں۔ ان دونوں کے پیچھے کچھ لوگ لگے ہوئے ہیں۔ کل رات تیز بارش میں ہم نے ایک جگہ پناہ لی تھی۔ وہاں بھی ایک بندوق والا آ پہنچا تھا۔ وہ اسے اور مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ پھر وہاں ہمارے درمیان لڑائی ہوئی اور وہ ہارون نام کا بندہ زخمی ہو کر گر گیا۔ اب وہ بندہ بھی وہیں جنگل میں بندھا پڑا ہے۔''

ادھیڑ عمر عبدالغنی کے چہرے پر اُلجھن آمیز تشویش نظر آنے لگی۔ انہوں نے مجھے سرتاپا گھور کر کہا۔ ''تو......تم کون ہو؟''

''میں دراصل......'' میں کہتے کہتے رُک گیا۔ میں انہیں کیسے بتاتا کہ میں کہاں بے ہوش ہوا تھا اور کہاں ہوش میں آیا ہوں اور ممکن تھا کہ وہ میری بات پر یقین ہی نہ کرتے۔

میں گہری سانس لیتے ہوئے چٹائی پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی میرے سامنے بیٹھ گئے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے کہا۔ ''غنی صاحب! میں بڑے مشکل حالات سے دوچار ہوں۔ میں ان حالات کے بارے میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ پہلے آپ مجھے یہ بتائیے کہ میں کہاں ہوں؟ میرا مطلب ہے کہ یہ کون سی جگہ ہے؟''

غنی صاحب کی آنکھوں میں حیرت بڑھتی جارہی تھی۔ انہوں نے کہا۔ ''بھئی...... یہ نل پانی ہے۔ زرگاں کے بعد علاقے (علاقے) کی سب سے بڑی آبادی تو یہی ہے۔ اسے کون نہیں جانتا؟''

''اچھا...... یہاں کا سب سے قریبی شہر کون سا ہے؟'' میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''بیٹا! تم کیسی باتاں کر رہے ہو؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تم بھی کچھ چکرائے ہوئے ہو۔''

''غنی صاحب! آپ بس میرے ایک دو سوالوں کے جواب دے دیں۔ پھر آپ جو پوچھیں گے میں بتاؤں گا۔'' میرے لہجے میں عاجزی تھی۔

''بھئی...... یہاں کا سب سے قریبی شہر تو جھانسی ہے۔ وہاں جانے میں بھی چار دن لگ جاتے ہیں۔''

''جھانسی...... جھانسی۔'' میں نے اپنے ذہن میں دو تین بار دہرایا۔ یقیناً یہ کوئی انڈین نام تھا۔ میرے ذہن میں تاریخ کے حوالے سے ''جھانسی کی رانی'' کے الفاظ چمکنے لگے۔ مگر ضروری بھی نہیں تھا کہ یہ وہی جھانسی ہو۔ کہاں لاہور میں ڈیفنس کا علاقہ اور کہاں یہ جھانسی۔

میں نے مزید وضاحت کے لیے پوچھا۔ ''جھانسی کے بعد کون سی جگہ آتی ہے؟''

غنی صاحب کے چہرے پر اُلجھن بڑھتی جارہی تھی۔ انہوں نے بیزار انداز میں کہا۔ ''جھانسی کے بعد الٰہ آباد ہے پھر لکھنؤ ہے۔''

میرے ذہن میں جیسے کئی دھماکے ہوئے۔ میرا حیرت ناک اندیشہ درست تھا۔ میں پاکستان میں نہیں انڈیا میں تھا اور انڈیا کا بھی یہ کوئی سرحدی علاقہ نہیں تھا۔ یہ ''ڈیپ'' انڈیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر سر تھام لیا۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ میرا رنگ ہلدی ہو رہا ہے۔ ''غنی صاحب! مجھے یہ بتائیں، یہ لڑکی کون ہے؟ آپ سے اس کا تعلق کیسے ہوا ہے؟''

میرے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے غنی صاحب شروع میں تو ہچکچائے پھر انہوں نے جواب دیا لیکن صرف اتنا بتایا کہ سلطانہ اس علاقے کی دوسری بڑی بستی زرگاں کی رہنے والی ہے۔ وہاں اس کے ساتھ کچھ مسئلہ تھا جس کی وجہ سے یہ فوری طور پر زرگاں سے یہاں نل پانی میں آنا چاہتی تھی۔ زرگاں میں غنی صاحب کا کوئی دوست رمضان علی تھا۔ اس نے ایک پیغامبر کے ساتھ غنی صاحب کو یہ پیغام پہنچایا تھا کہ وہ چند روز تک ایک لڑکی کو ان کے پاس بھیج رہا ہے۔ لڑکی کے ساتھ اس کا شوہر اور بچہ بھی ہیں۔ یہ لوگ صرف دو تین دن ان کے پاس رہیں گے، پھر خود اپنے رہنے کا کوئی انتظام کر لیں گے۔ اس کے سوا عبدالغنی صاحب کو

کچھ معلوم نہیں تھا۔ یا شاید وہ ابھی بتانا نہیں چاہتے تھے۔

میں نے کہا۔ ''غنی صاحب! آپ جن رمضان صاحب کا ذکر کر رہے ہیں، اگر وہ واقعی آپ کے دوست ہیں تو پھر انہیں بتانا چاہیے تھا کہ وہ جس لڑکی کو آپ کے پاس بھیج رہے ہیں، وہ ذہنی طور پر ٹھیک نہیں ہے۔''

''میں خود اس بات پر حیران ہوں۔ اگر لڑکی کا کوئی ایسا مسئلہ ہوتا تو رمضان نے مجھے جرور بتانا تھا۔ پر اس نے تو کوئی بات نہیں کی۔''

''یہ جو اس کے ساتھ گونگا بندہ آیا ہے، یہ کون ہے؟''

''مجھے لگتا ہے کہ یہ لڑکی سلطانہ کا کوئی رشتے دار ہے۔ رمضان نے مجھے بتایا تھا کہ ہوسکتا ہے لڑکی پہلے اچ زرگاں سے نکل پڑے، اس کا بچہ بعد میں کسی دوسرے کے ساتھ نکلے۔ اس طرح لڑکی کو زرگاں سے نکلنے میں آسانی ہوئیں گا۔ بعد میں کہیں راستے میں لڑکی اور بچہ آپس میں مل جائیں گے۔ میرے خیال میں ایسا ہی ہوا ہے۔ یہ گونگا بچے کے ساتھ نکلا ہوئیں گا۔''

''میں آپ کو پھر بتا رہا ہوں، یہ لڑکی اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ جو بندہ پیغام لے کر آیا تھا، وہ کہاں ہے؟''

''وہ تو شاید واپس چلا گیا تھا۔ ویسے زرگاں کے ایک دو بندے ہور یہاں ہیں لیکن سب سے پہلے میں اس گونگے سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔''

غنی صاحب اُٹھے اور اپنے چہرے پر اُلجھن لیے کمرے سے باہر نکل گئے۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ جلد ہی انہیں بھی سلطانہ کی مخبوط الحواسی کا علم ہو جائے گا۔ میرے سر میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ پٹی بدلے جانے کی ضرورت تھی۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور یہ یقین کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ میں اپنے ملک میں نہیں، غیر ملک میں ہوں۔ فرح، عاطف اور اپنی ماں کی قبر سے سیکڑوں میل دور۔ پتا نہیں کہ میری ماں کو باقاعدہ قبر بھی نصیب ہوئی تھی یا نہیں۔ ان کی موت کو چھپا لینا سیٹھ سراج اور شیرے وغیرہ کے لیے بہت آسان تھا۔ وہ اس چار دیواری میں پوری طرح حاوی ہو گئے تھے۔ انہوں نے گارڈ خادم حسین کو مار دیا تھا۔ عمران کا دوست آصف بھی غالباً ان کے ہاتھوں سے جان گنوا بیٹھا تھا۔ سیٹھ سراج وغیرہ کے لیے عین ممکن تھا کہ وہ ماں جی کی موت کو کوئی اور رنگ دے دیتے یا پھر ان کے جسدِ خاکی کو ویسے ہی کہیں غائب کر دیتے۔

میں جب ان سارے خونی مناظر کے بارے میں سوچتا تو مجھے لگتا تھا کہ یہ کوئی سات آٹھ یا دس پندرہ روز پہلے کی باتیں نہیں ہیں بلکہ ان کو زمانہ گزر چکا ہے۔ اچانک مجھے قدموں

کی آہٹ سنائی دی۔غنی صاحب واپس آ گئے۔ان کے چہرے پر پہلے سے زیادہ اُلجھن تھی۔

انہوں نے کمرے کا دروازہ ہولے سے بند کیا اور مدھم آواز میں بولے۔''بچے نے پوٹی کی ہے۔لڑکی اس کی ٹانگیں وغیرہ دھو رہی ہے۔ میں نے گونگے سے علیحدہ میں بات کرنے کی کوشش کی ہے۔وہ پتا نہیں کیا کیا اشارے کر رہا ہے۔صحیح طرح میرے پلے تو کچھ نہیں پڑا۔ کسی وخت تو لگتا ہے کہ وہ لڑکی کی طرف کی بات اچ کر رہا ہے۔''

''آپ اسے یہاں لائیں میرے پاس۔''

''نہیں......اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوئیں گا۔ میں چوہان کو لے کر آتا ہوں۔وہ بھی زرگاں سے آیا ہے۔رمجان کے محلے میں ہی رہتا تھا۔ پکی بات ہے کہ اس لڑکی کو بھی جانتا ہوئیں گا۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، عبدالغنی صاحب تیزی سے باہر نکل گئے۔ان کے جانے کے چند سیکنڈ بعد سلطانہ آ دھمکی۔وہ خوش نظر آ رہی تھی۔اس نے میرے قریب بیٹھ کر جوشیلے انداز میں میرا ہاتھ دبایا اور بولی۔''مہرو! بالکل بےفکر ہو جاؤ۔اب کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گا۔ہم کل اچ چھوٹے سرکار سے ملیں گے۔وہ سب کچھ سنبھال لیں گے۔وہ ہم پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔''اس نے بڑی محبت سے اپنا سر میرے کندھے سے ٹکا دیا۔

پھر جیسے اسے ایک دم یاد آیا۔''ہائے میں مری...... میں نے تمہاری چوٹ تو دیکھی اچ نہیں۔اب کیا حال ہے درد کا؟''

میرے جواب دینے سے پہلے ہی وہ جلدی جلدی پٹی کھولنے لگی۔وہ اپنے جھولے میں سے صاف روئی اور مرہم لے کر آئی۔ ہاشو سے اس نے نیم گرم پانی منگوایا اور بڑی توجہ سے میرے سر کے زخم کو صاف کرنے میں مصروف ہو گئی۔اس کی انگلیوں کے لمس میں انتہا درجے کی محبت آمیز ملائمت تھی۔اس کے ساتھ ساتھ وہ خاص قسم کی جرأت بھی اس کے انداز میں موجود تھی جو سنگین چوٹوں کی مرہم پٹی کے لیے درکار ہوتی ہے۔ایسی جرأت عام طور پر لڑکیوں میں نہیں پائی جاتی۔ یوں لگ رہا تھا کہ مہروز نام کا کوئی شخص واقعی موجود تھا اور وہ سلطانہ کا شوہر تھا۔اب اس شخص کے ساتھ پتا نہیں کیا ہوا تھا کہ وہ یہاں اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ موجود نہیں تھا۔شاید کوئی المناک حادثہ......کوئی سنگین جرم......کوئی خونی واردات۔عین ممکن تھا کہ جو کچھ پیش آیا، وہ زرگاں سے نل پانی تک کے راستے میں ہی پیش آیا ہو اور اس واقعے کے بعد سلطانہ نے ہوش و حواس کھو دیئے ہوں۔ غالب امکان یہی تھا کہ ایسا ہی ہوا ہے کیونکہ غنی صاحب کو سات آٹھ دن پہلے اپنے دوست رمضان کا پیغام ملا تھا اور اس نے کہا تھا

کہ لڑکی اپنے شوہر اور بچے کے ساتھ ان کے پاس آ رہی ہے۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو میری طرف؟''وہ میری پٹی کرتے کرتے ذرا شرمیلے انداز میں بولی۔

''کچھ نہیں۔''

''جب تم کہتے ہو کہ کچھ نہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ کچھ ہے۔''وہ پٹی کو آخری گرہ لگا کر میرے بازو سے لگ گئی اور میری بڑھی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیرنے لگی۔''داڑھی بنا دوں؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا؟''

''اتنا حیران کیوں ہو رہے ہو؟ پہلے کبھی نہیں بنائی میں نے۔شاید تم بھول گئے۔شروع شروع میں تو میں تمہیں نہلا بھی دیا کرتی تھی۔''وہ کہہ کر شرما گئی۔

یکایک گھر کے بیرونی دروازے پر آہٹ سنائی دی۔سلطانہ جلدی سے الگ ہو کر بیٹھ گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ غنی صاحب واپس آ گئے ہیں۔ان کے ساتھ بھاری آواز والا کوئی اور شخص بھی تھا۔یہ وہی چوہان نام کا بندہ تھا جس کا ابھی تھوڑی دیر پہلے انہوں نے ذکر کیا تھا۔سلطانہ جلدی سے ان کے دونوں کے پاس باہر چلی گئی۔ میں وہیں نیم تاریک کمرے میں بیٹھا رہا اور ادھ کھلے دروازے سے دوسرے کمرے کا منظر دیکھتا رہا۔چوہان سفید رنگت اور مسکراتے چہرے کا ایک چوبیس پچیس سالہ نوجوان تھا۔وہ بھی مقامی لباس میں تھا۔اس نے سلطانہ کو پہچان لیا۔سلطانہ نے اسے ''چوہان بھائی'' کہہ کر مخاطب کیا۔چوہان نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا اور بچے کے گال گدگدائے۔

ان کو وہیں چھوڑ کر عبدالغنی صاحب میرے پاس کمرے میں آ گئے۔انہوں نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ان کے چہرے پر اب پہلے سے زیادہ اُلجھنیں موجود تھیں۔سفیدی مائل بالوں کی ایک لٹ ان کی شکن شکن پیشانی پر جھول رہی تھی۔ میں غنی صاحب کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا لیکن وہ ان لوگوں میں سے تھے جو پہلی ملاقات میں ہی آپ سے اپنا احترام کرانے لگتے ہیں۔اپنے چہرے مہرے سے وہ ایک دانا بینا اور ہمدرد انسان دکھائی دیتے تھے۔

وہ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھتے چلے جا رہے تھے۔ان کے دیکھنے کے انداز نے مجھے گڑبڑا دیا۔''کیا بات ہے غنی صاحب! آپ ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

انہوں نے ایک گہری سانس لی اور اُلجھے لہجے میں بولے۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟''

''ک ک......کیا مطلب......غنی صاحب؟''

''تمہیں غلط بیانی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''غلط بیانی......میں کون سی غلط بیانی کر رہا ہوں؟'' میں ششدر تھا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو۔'' وہ گمبھیر آواز میں بولے۔

''آپ کھل کر بات کریں۔''

''سلطانہ تمہاری بیوی ہے اور تم اس سے انکار کر رہے ہو۔ بالو بھی تمہارا اچ بچہ ہے۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔'' غنی صاحب کا لہجہ حتمی تھا۔

میں نے ایک بار پھر ماتھا پکڑ لیا۔ مجھے لگا جیسے میں دیوانوں کے کسی گروہ میں گھِر گیا ہوں اور اپنی شناخت کھو بیٹھا ہوں۔

غنی صاحب نے نرمی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولے۔ ''دیکھو برخوردار! اگر تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں ہر طرح تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس طرح......''

''خدا کے لیے چپ ہو جائیں۔ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔'' میں نے اپنا سر گھٹنوں پر جھکا لیا اور اپنے آپ میں سمٹتا چلا گیا۔

''یہ دیکھو......یہ کیا ہے؟ کیا تم اس سے بھی انکار کرو گے؟'' غنی صاحب کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں ایک تصویر تھی۔ میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے تصویر دیکھی۔ یہ ایک گروپ فوٹو تھا۔ اس میں کئی مرد و زن تھے۔ دو چار بچے بھی نظر آ رہے تھے۔ یہ سب لوگ مقامی دیہاتی لباس میں تھے۔ ایک سات آٹھ سالہ بچہ دلہے کے لباس میں تھا۔ اس نے سہرے میں سے اپنا چہرہ نکالا ہوا تھا۔ مجھے لگا کہ میرے اردگرد کی ہر شے گھومنے لگی ہو۔ غنی صاحب کا چہرہ، ان کی کالی چھتری، رنگین نقش و نگار والی دیواریں، چٹائی کے پھول بوٹے۔ سب کچھ میری نظروں میں گھومنے لگا تھا۔ میں حیرت کے سمندر میں غرق تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ اس گروپ فوٹو میں ایک طرف میں خود بھی موجود تھا۔ میرے ہاتھوں میں ایک نومولود بچہ تھا۔ شاید چند ہفتے کا ہوگا۔ غالباً یہ بالو تھا۔ سلطانہ نے میرا بازو تھام رکھا تھا اور میرے کندھے سے چپکی ہوئی تھی۔ ہم دونوں کے چہرے پر ہلکی مسکراہٹ تھی۔

مجھے لگا کہ میں بے ہوش ہو جاؤں گا۔ میں نے تصویر پھینک دی۔ اپنا سر عقب سے ہاتھوں میں جکڑ لیا اور اپنے چہرے کو اپنے اوپر اُٹھے ہوئے گھٹنوں میں دھنساتا چلا گیا۔ یہ کیا ہو رہا تھا میرے ساتھ؟ میں کہاں پھنس گیا تھا؟ کیا میں ڈیفنس والی کوٹھی میں بارہ تیرہ زینوں کے اوپر سے پرواز کر کے پختہ فرش پر گرنے کے بعد ابھی تک بے ہوش تھا؟ اور یہ جو کچھ دیکھ رہا تھا، بے ہوشی کے عالم میں دیکھ رہا تھا؟ میں کیسے یقین کر سکتا تھا۔ میں ایسی باتوں پر کیسے یقین کر سکتا تھا؟ میں نے زندگی میں ٹھوس حقیقتوں کے سوا کسی چیز کو قبول نہیں کیا تھا۔ یہ میری فطرت میں ہی نہیں تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھ میری گردن کے پچھلے حصے پر رکھے ہیں اور وہاں مطلق درد نہیں ہو رہا۔ لگتا تھا کہ وہ زخم بالکل مندمل ہو چکا ہے جو بتی والے چوک میں گاڑی کے اُلٹنے سے میری گردن پر آیا تھا اور جس نے رشید اور تابندہ کے گھر میں بھی مجھے سخت تکلیف میں رکھا تھا۔ ایک بار پھر میرے جسم میں سرد پھریریاں سی دوڑ گئیں۔ کیا واقعی یہ زخم مندمل ہو چکا تھا؟ میں نے دیوانوں کی طرح اس زخم پر ہاتھ چلایا۔ کوئی تکلیف نہیں تھی، کوئی کھرنڈ نہیں تھا۔ بالکل ملائم جلد تھی۔ پھر اچانک مجھے یاد آیا کہ اسی ایکسیڈنٹ میں میری داہنی کہنی بھی تو زخمی ہوئی تھی۔ گاڑی کی کوئی نکیلی شے لگنے سے دو تین انچ لمبا زخم بن گیا تھا۔ میں نے تڑپ کر اپنا بازو موڑا اور سر گھما کر کہنی کو دیکھا۔ مجھے لگا کہ رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے ہیں۔ کہنی پر زخم کا بس بالکل مدھم سا نشان موجود تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ چوٹ عرصہ پہلے ٹھیک ہو چکی ہے۔

''اوہ خدا......اوہ خدایا......یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟'' میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

غنی صاحب نے ایک بار پھر ملائم لہجے میں کہا۔ ''سنو مہروج! اگر کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ لیکن اس طرح کی باتاں نہ کرو۔ ان سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میرا کوئی مسئلہ نہیں۔'' میں نے اپنا سر بدستور ہاتھوں میں دبائے رکھا۔ ''میرا دماغ درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ میں تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ہو سکے تو مجھے ایک آدھ گھنٹے کے لیے اکیلا چھوڑ دیں۔''

''میرا اپنا خیال بھی یہی ہے کہ تمہیں آرام کی جرورت ہے۔ چلو میں دروا جا بند کر دیتا ہوں، تم کچھ دیر کے لیے لیٹ جاؤ۔'' غنی صاحب نے کہا۔ ان کا متین چہرہ بدستور اُلجھنوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

وہ مجھے ہمدردی سے دیکھتے ہوئے باہر نکل گئے۔ شاید وہ اب میری ذہنی صحت پر شک کرنے لگے تھے۔ عین ممکن تھا کہ ان کا دھیان میرے سر کی شدید چوٹ کی طرف جا رہا ہو اور وہ خیال کر رہے ہوں کہ اس چوٹ کی وجہ سے میرے حواس وقتی طور پر مختل ہو گئے ہیں۔ دروازہ بند ہوا تو کمرے میں نیم تاریکی چھا گئی۔ میں بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ میری نگاہ بار بار اپنی کہنی کی چوٹ پر پڑ رہی تھی۔ ہاں...... یہی چوٹ تھی۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی اور یہ چوٹ بالکل مندمل ہو چکی تھی۔ شاید ایک ڈیڑھ سال پہلے...... یا اس سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔

اچانک میری نظر کمرے میں لگے ایک چھوٹے سے گول آئینے پر پڑی۔ یہ آئینہ کھڑکی کے پاس ہی دیوار پر آویزاں تھا۔ میں نے روشنی کے لیے کھڑکی ذرا سی کھولی اور آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ یہ ایک اور ذہنی جھٹکا تھا جو مجھے برداشت کرنا پڑا۔ مجھے اپنی شکل اجنبی لگ رہی تھی۔ بے شک یہ میرا ہی چہرہ تھا تاہم مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اس چہرے کو مدتوں بعد دیکھ رہا ہوں۔ رنگ کچھ سنولایا ہوا تھا۔ رُخساروں کی ہڈیاں قدرے اُبھری ہوئی، آنکھوں کے نیچے ہلکے سے اُبھار۔ کچھ ضرور ہوا تھا، میرے ساتھ۔ کچھ انوکھا اور غیر معمولی۔ میرا دل و دماغ اب پوری طاقت سے گواہی دے رہا تھا کہ ڈیفنس لاہور میں پیش آنے والے خونی واقعات کو دو تین ہفتے نہیں گزرے، نہ ہی دو تین مہینے گزرے ہیں۔ انہیں ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ ان واقعات میں اور یہاں اس جنگل میں پیش آنے والے واقعات کے درمیان ایک ہے۔ ایک ایسا خلا جس کی طوالت اور گہرائی نامعلوم ہے۔ وہ خلا کیسے پیدا ہوا؟ اس خلا نے مجھے کیسے متاثر کیا؟ متاثر ہونے کے بعد میں کیا کرتا رہا، مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔

یکایکی میرے دل پر ایک زوردار گھونسہ لگا۔ اگر واقعی یہ خلا موجود تھا تو پھر میرے پیارے کہاں تھے؟ ان پر کیا بیتی تھی؟ فرح، عاطف اور...... ثروت...... ثروت کی شبیہ نگاہوں میں گھومی اور سینے میں دھاکے سے ایک بہت بڑا الاؤ دہک گیا۔ میں تو ثروت کے پاس جانا چاہ رہا تھا۔ اس کو حالات کی زنجیروں سے آزاد کرانا چاہ رہا تھا۔ مجھے جرمنی جانا تھا۔ میرا پاسپورٹ بن چکا تھا۔ ویزا لگنے والا تھا۔ میں دن نہیں، گھڑیاں گن رہا تھا، گھنٹے شمار کر رہا تھا۔

اوہ خدایا...... یہ کیا ہو گیا؟ کہیں میں جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ ایک دم میرے اندر کی بے قراری انتہا کو پہنچ گئی۔ میں نے بے پناہ کرب کے ساتھ سوچا۔ ''کیا واقعی بہت تاخیر ہو چکی ہے؟ کیا واقعی میں اپنی ثروت کو ہمیشہ کے لیے کھو چکا ہوں؟'' میں نے

ایک بار پھر دیوانوں کی طرح اپنی کہنی پر زخم کے پرانے نشان کو ٹٹولا۔ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کمرے میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میں مرنے والا ہوں۔ میری نگاہوں میں ثروت، فرح اور عاطف کی صورتیں گھومنے لگیں۔ میں نے کمرے کا عقبی دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ میں گلی میں کھڑا تھا۔ میں بھاگنے لگا۔ بھاگتا چلا گیا۔ لوگ مڑ مڑ کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں جنہوں نے ساڑھیوں کے علاوہ چولیاں گھاگرے پہن رکھے تھے اور سانولے رنگ کے مرد بھی اور ننگ دھڑنگ بچے بھی۔

میں اس مسافر کی طرح بھاگ رہا تھا جو پلیٹ فارم پر اُتر کر ذرا دیر کے لیے غافل ہوا ہو اور اس کی گاڑی اس کے سارے مال اسباب سمیت آگے نکل گئی ہو۔

میں یوں تو بے سمت جا رہا تھا مگر اپنے تئیں ثروت کی طرف بھاگ رہا تھا۔ جیسے وہ ابھی تک کسی اور کی نہ ہوئی ہو۔ جیسے ابھی تک میری محبت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی جانی باقی ہو۔ وہ سرخ عروسی جوڑا پہنے بیٹھی ہو۔ ابھی قبول و ایجاب کے مراحل طے ہونا باقی ہوں۔ مجھے لگتا تھا کہ میں بھاگتا ہوا اس تک پہنچ جاؤں گا۔ پکار کر کہوں گا۔ میں آ گیا ہوں ثروت اب اپنے اقرار کو اپنے ہونٹوں کے اندر روک لو۔ یہ اقرار صرف میرے لیے ہے۔ لہٰذا یہ شادی انجام نہیں پا سکتی۔ یہ محفل برخاست کرنا ہو گی۔ ایک نئی محفل سجانا ہو گی۔ جہاں سچا اقرار ہو گا جہاں سچی محبت کے سدا بہار پھول کھلیں گے۔

میں بھاگ رہا تھا۔ میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اردگرد کے مناظر میری نگاہ میں دھندلائے ہوئے تھے۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں نے درجنوں سکون بخش گولیاں ایک ساتھ نگل لی ہیں اور اب میں دوڑنے کے بجائے ہوا کے سمندر میں تیر رہا ہوں۔

اب میرے اردگرد سرسبز ڈھلوان تھی۔ یہاں گھنے درخت تھے۔ ان درختوں میں کہیں کہیں بکریاں چرتی نظر آ رہی تھیں۔ میں ایک جگہ بے دم ہو کر بیٹھ گیا۔

میں ضعیف العقیدہ نہیں تھا۔ مجھ میں بے شمار خامیاں تھیں مگر توہم پرستی اور فطرت سے اغماض کرنے جیسی کمزوریاں نہیں تھیں۔ میں نے ہمیشہ ٹھوس حقائق پر یقین رکھا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اب میرا دماغ شدید ترین تناؤ کے سبب پھٹ رہا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ان حالات کے ڈانڈے فوراً ماوراء سے جوڑنے لگ جاتا۔ جادو ٹونا سحر، جن، بھوت، آسیب، ہمزاد اور اس طرح کے نہ جانے کون کون سے تصورات اس کی سوچوں کو جکڑ لیتے اور شاید اس وجہ سے وہ کسی حد تک ''ریلیکسڈ'' بھی ہو جاتا مگر میں وجہ تلاش کر رہا تھا۔ منطق ڈھونڈ رہا تھا۔ مجھے کوئی ''واہمہ'' مطمئن نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اپنی صورتِ حال کے لیے ٹھوس وضاحت چاہیے

تھی۔

اچانک مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ بھاگتے قدموں کی چاپ تھی۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ سلطانہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے گال قندھاری انار کی طرح سرخ تھے اور سینہ پھول پچک رہا تھا۔ عیاں تھا کہ وہ بھاگتی ہوئی میرے پیچھے آئی ہے۔ پھر مجھے اس کے عقب میں کچھ فاصلے پر غنی صاحب اور وہ دوسرا شخص بھی دکھائی دیئے جس کا نام چوہان بتایا گیا تھا۔ سلطانہ نے آتے ساتھ ہی میرے دونوں کندھے تھام کر مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ سسک کر بولی۔ ''تمہیں کیا ہو گیا ہے مہرو! ایسا کیوں کر رہے ہو تم؟ کیا میری جان لینا چاہتے ہو؟ تمہیں پتا اچ ہے، تمہاری تکلیف دیکھ کر مجھ پر کیا گجرتی ہے؟''

اسی دوران میں غنی صاحب اور چوہان بھی میرے پاس آ گئے۔ چوہان نے بھی بڑی ہمدردی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''تمہیں کیا ہو گیا ہے مہرو! ہوش کرو یار! نہیں تو بڑا نقصان ہو جائے گا۔''

''مجھے اکیلا چھوڑ دو تم لوگ۔ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔'' میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

سلطانہ نے ایک بار پھر مجھے اپنے ساتھ لگایا۔ میں نے اسے جھٹک کر پیچھے ہٹا دیا۔ غنی صاحب اور چوہان آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو میں سے کچھ الفاظ میرے کانوں تک پہنچے۔ جیسے...... سر...... چوٹ...... پریشانی وغیرہ۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ میرے سر پر لگنے والی چوٹ کے بارے میں بات کر رہے ہیں اور غالباً یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس چوٹ کی وجہ سے میرے حواس گڑبڑا گئے ہیں۔

اسی دوران میں تین گھڑسوار نظر آئے۔ وہ گہری سبز وردیوں میں تھے۔ ان کے سروں پر ہلکی سبز دھاری دار پگڑیاں تھیں۔ کندھوں پر رائفلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ان پر خاکی غلاف چڑھے تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے بارعب لہجے میں پوچھا۔ ''کیا بات ہے۔ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟''

سلطانہ کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا، غنی صاحب نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''کوئی خاص بات نہیں جی! یہ گھر کا معاملہ ہے۔''

''گھر کا معاملہ ہے تو گھر میں بیٹھ کر نمٹاؤ اور اس بندے کو چوٹ کیسے لگی ہے؟'' میری طرف اشارہ کر کے پوچھا گیا۔

''پیڑ سے گر گیا ہے جناب! کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہے۔'' غنی صاحب نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے لیکن یہاں سے اُٹھ جاؤ۔'' اور تینوں گھوڑے آگے بڑھ

گئے۔

غنی صاحب مجھ سے مخاطب ہو کر التجا آمیز لہجے میں بولے۔ ''چلو اُٹھ جاؤ مہرو۔''

''میرا نام مہرو نہیں ہے۔ میں تابش ہوں۔ میں پاکستانی ہوں۔'' میری آواز اتنی بلند تھی کہ آگے جاتے ہوئے گھڑسواروں تک پہنچ سکتی تھی۔

غنی اور چوہان بُری طرح گھبرا گئے۔ سلطانہ نے مجھے خاموش رکھنے کے لیے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''خدا کے لیے مہرو! ہوش کرو۔'' وہ کراہی۔

گھڑسواروں تک میری آواز نہیں پہنچ سکی تھی۔ وہ آگے نکل گئے تو غنی صاحب نے دوبارہ ملتجی آواز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم جو کہو گے ہم سنیں گے لیکن گھر جا کر۔ یہاں سے اُٹھ جاؤ۔ اگر کوئی اور یہاں آ گیا تو ہم سب کے لیے بہت خطرناک ہوئیں گا۔''

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں دوبارہ غنی صاحب کے گھر میں تھا۔ سلطانہ سمیت کوئی بھی مجھ سے کسی طرح کی متنازع بات نہیں کر رہا تھا۔ کسی نے مجھے مہرو کہہ کر بھی نہیں پکارا تھا۔ بہرحال وہ لوگ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

میں اون کی چٹائی پر دراز ہو گیا اور کچی دیوار سے ٹیک لگا لی۔ سامنے والی دیوار پر دو تین جانوروں کی کھالیں آویزاں تھیں۔ میں ان میں سے بس ایک کھال پہچان سکا۔ یہ کسی چھوٹے چیتے کی تھی۔ گھر سے باہر گلی سے ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ کچھ بچے شور مچا رہے تھے۔ کہیں قریب ہی شاید بھجن گایا جا رہا تھا۔ میرے دماغ میں دھند سی بھری ہوئی تھی۔ میں جیسے ہوش اور بے ہوشی کے درمیان بھٹک رہا تھا۔ دل گواہی دے رہا تھا کہ میں تابش ولد اشفاق سکنہ لاہور، ایک انوکھی و حیران کن صورتِ حال کا شکار ہو چکا ہوں۔ میری زندگی کے تسلسل میں شب و روز کا ایک طویل ٹکڑا غائب ہو چکا ہے۔ یہ بڑی فلمی اور داستانی سی صورتِ حال تھی۔ بچپن سے فلموں، ڈراموں میں اس طرح کے مناظر دیکھے تھے۔ کوئی شخص کسی حادثے کا شکار ہو کر اپنی یادداشت کھو بیٹھا۔ پھر کسی اور حادثے کے سبب اس کی یادداشت بحال ہو گئی۔ کیا میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے؟ لاہور ڈیفنس کی کوٹھی میں حادثے کا شکار ہونے کے بعد میں ایک نامعلوم وقت تک کسی اور حیثیت سے زندہ رہا ہوں۔ اس نامعلوم عرصۂ حیات میں، مَیں نے کیا کیا ہے؟ کن لوگوں سے ملا ہوں؟ کن لوگوں سے بچھڑا ہوں؟ کیا ٹھوکریں کھائی ہیں؟ کیا کامیابیاں حاصل کی ہیں؟ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں۔

یہ لوگ غالباً سمجھ رہے تھے کہ سر کی چوٹ کی وجہ سے میرے حواس مختل ہو گئے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں تھا۔ چوٹ کی وجہ سے میرے حواس مختل نہیں، بحال ہوئے تھے۔ میرے زخم

نے مجھے مخبوط الحواس نہیں بنایا تھا، صحیح الدماغ کیا تھا۔ مگر حافظے کی یہ واپسی میرے لیے ایک ایسا عذاب بنی تھی جس کی شدت کو میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ دل و دماغ میں یہ احساس ایک نہایت کرب ناک لہر کی طرح موجزن تھا کہ میں نے دیر کر دی ہے۔ میں نے جہاں اور بہت کچھ کھویا ہے، وہاں ثروت کے معاملے میں بھی بہت دیر کر دی ہے۔

اسی دوران میں گھر کے بیرونی دروازے پر زور دار دستک ہوئی۔ کسی نے دروازہ کھولا۔ کچھ ملی جلی آوازیں آئیں۔ ان میں ایک بھاری اور پُرحکم آواز سب سے نمایاں تھی۔ گاہے بہ گاہے غنی صاحب بھی احتجاجی انداز میں کچھ کہہ رہے تھے۔

میں نے گھر کے صحن میں جھانکنے کی کوشش کی۔ اپنی اس کوشش میں، مَیں پوری طرح کامیاب تو نہیں ہو سکا تاہم چند افراد کی ٹانگیں نظر آئیں۔ یہ وہی باوردی افراد تھے جو اس سے پہلے بستی سے باہر درختوں میں دکھائی دیئے تھے۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ سلطانہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہ رہے ہیں۔ ان کا رویہ سخت تھا۔ بہرحال وہ کسی طرح کی بدتمیزی نہیں کر رہے تھے۔ غنی صاحب کی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''دیکھو جناب! ہم تو خود ابھی تھوڑی دیر میں آپ کے پاس حاجر ہونے والے تھے۔ اس لڑکی نے کوئی جرم نہیں کیا۔ یہ تو خود سائل بن کر آئی ہے۔''

جواب میں بھاری آواز والے نے کہا۔ ''ٹھیک ہے بزرگوار! ہم ابھی کسی کو اپرادھی تو نہیں کہہ رہے۔ بس اوپر کے حکم پر عمل کر رہے ہیں۔ جو کچھ بولنا چاہتی ہے، وہاں جا کر بول لے۔''

وردی والے ایک دوسرے شخص نے کہا۔ ''اور اس کا پتی کدھر ہے؟''

''وہ بیمار ہے جی! دوسرے کمرے میں لیٹا ہوا ہے۔'' غنی صاحب کی آواز سنائی دی۔

چند سیکنڈ بعد دو تین افراد میرے والے کمرے میں گھس آئے۔ ان میں سے بھاری آواز والا شخص وہی تھا جس سے کچھ دیر پہلے بستی سے باہر ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے مجھے سرتاپا دیکھا اور بولا۔ ''تم ہی سلطانہ کے پتی ہو؟''

ایک دم ہی میرے اندر کی گھٹن اور بے قراری آواز بن گئی۔ میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''میں نہیں ہوں اس کا پتی! میرا اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ یہ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔''

''تو کون ہو تم؟'' بھاری آواز والے نے کہا۔

''میرا نام تابش ہے۔ میں پاکستان سے آیا ہوں۔ میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ یہ لوگ

مجھے زبردستی روک رہے ہیں۔''

سلطانہ تیزی سے اندر آئی۔ بھاری آواز والے سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''آپ کو بتایا ہے نا یہ بیمار ہیں۔ ان کو چوٹ لگی ہے سر میں...... اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔ اُلٹی سیدھی باتاں کر رہے ہیں۔''

''یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے نہیں پتا یہ کیا چاہتی ہے۔ اس کے ساتھی کیا چاہتے ہیں؟'' میں نے چلا کر کہا۔

''خدا کے لیے مہروج! ایسی باتاں نہ کرو۔'' سلطانہ نے بے قرار ہو کر میرا بازو تھاما۔

میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور ایک دم دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ لگتا تھا میں پھر بے ہوش ہو جاؤں گا۔ میں نے اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ چکر بڑھتے جا رہے تھے۔ دم گھٹ رہا تھا۔ میں گہری سانسیں لینے لگا۔ اردگرد کی آوازیں اب جیسے مجھے فاصلے سے سنائی دے رہی تھیں۔ بھاری آواز والا مقامی لب و لہجے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ سلطانہ اور غنی صاحب بھی بول رہے تھے۔ آوازیں آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ پلیز...... چلے جاؤ یہاں سے۔ میرا سر پھٹ رہا ہے۔''

میں اپنا سر گھٹنوں میں جھکاتا چلا جا رہا تھا۔

وہ لوگ باہر چلے گئے۔ اب ان کی گفتگو کی آواز دوسرے کمرے سے آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا۔ باوردی افراد سلطانہ کو اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔ سلطانہ نے بچہ گود میں اُٹھا لیا تھا اور اوڑھنی سر پر لے لی تھی۔ وہ پریشان اور دُکھی ضرور تھی مگر ہراساں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ لوگ سلطانہ کے ساتھ بیرونی دروازے سے باہر نکل گئے۔ گونگا ہاشم بھی ان کے ساتھ ہی گیا تھا۔

تین چار منٹ بعد غنی صاحب اندر آئے۔ میں چٹائی پر لیٹا گہرے سانس لے رہا تھا۔ غنی صاحب کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''وہ لوگ سلطانہ کو لے گئے ہیں۔ اسے تمہاری مدد کی بہت جیادہ جرورت تھی مگر تم نے سب کچھ اُلٹ دیا ہے۔''

''میں نے کیا اُلٹا ہے اور میں کسی کی مدد کیا کروں گا؟ مجھے خود مدد کی ضرورت ہے۔ مجھے بتائیں، میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

''تمہارے ساتھ کچھ نہیں ہوا مہروج! تم بالکل ٹھیک ہو۔ تمہارے سر پر چوٹ لگی ہے جس کی وجہ سے تم وقتی طور پر باتوں کو بھول رہے ہو۔ بہت جلد سب اچھا ہو جائے گا۔''

''آپ سمجھتے ہیں کہ چوٹ لگنے سے میرا حافظہ چلا گیا ہے لیکن حقیقت اس کے بالکل اُلٹ ہے...... بالکل اُلٹ ہے۔ میں اپنے آپ کو پہچان رہا ہوں۔ اپنے حالات کو پہچان رہا ہوں۔ میرا نام تابش ہے۔ میں پاکستانی ہوں۔ وہاں کچھ لوگوں کے ساتھ میری دشمنی تھی۔ میرا ان سے جھگڑا ہوا۔ میں سیڑھیوں سے گرا......بس...... مجھے یہاں تک یاد ہے۔ اس کے بعد کچھ یاد نہیں۔ سب کچھ کسی گہری دھند میں لپٹا ہوا ہے۔ اس دھند میں کچھ صاف دکھائی نہیں دیتا۔''

میں نے ایک بار پھر اپنا سر ہاتھوں میں جکڑ لیا اور کرب کی انتہا سے گزرنے لگا۔ ''میری مدد کریں غنی صاحب! مجھے بتائیں میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟ میں کتنی دیر تک اپنے ہوش میں نہیں رہا ہوں اور مجھے یہ بھی بتائیں کہ میں یہاں سے کیسے نکل سکتا ہوں۔ مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ مجھے کہیں جانا تھا۔ کسی سے ملنا تھا۔ اس نے بڑی شدت سے میرا انتظار کیا ہو گا۔ وہ شاید آج بھی میری راہ تک رہی ہو۔ اوہ خدا! یہ کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟''

میں بولتا جا رہا تھا اور غنی صاحب ہمدردانہ نظروں سے میری جانب دیکھ رہے تھے۔ میری اس بات نے انہیں چونکایا تھا کہ میرا حافظہ گیا نہیں، واپس آیا ہے۔

میری بڑھتی ہوئی بے قراری دیکھ کر انہوں نے وہ بات ادھوری چھوڑ دی جو وہ کرنا چاہ رہے تھے۔ انہوں نے سلطانہ کا ذکر دوبارہ نہیں کیا۔ مجھے روغنی مٹی کے گلاس میں پینے کے لیے پانی دیا۔ پھر بولے۔ ''چلو تم کچھ دیر کے لیے آرام کر لو۔ اتنے میں چوہان بھی آ جاتا ہے پھر تفصیل سے بات کرتے ہیں۔''

میں واقعی چاہ رہا تھا کہ کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤں۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاؤں۔ شاید میرے دماغ پر چھائی ہوئی دھند کچھ چھٹ جائے۔ ممکن ہے کہ میں اپنے ماضی اور حال میں کوئی رابطہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاؤں۔

گلی میں سے کبھی کبھی کوئی گھوڑا ڈلکی چال چلتا گزرتا تھا اور اس کی ٹاپوں کی مدھم آواز سنائی دیتی تھی۔ پھر کبھی بھینسوں کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز گونجتی تھی۔ بچے شور مچاتے تھے اور کوئی بھیک منگا صدا لگاتا تھا۔ کہیں کسی قریب کے گھر میں کوئی شخص بانسری جیسا ساز پُر درد آواز میں بجا رہا تھا۔ ہوا بلند و بالا درختوں سے سائیں سائیں کرتی گزرتی تھی۔ میں یہ ساری آوازیں کمرے کے اندر سے سن رہا تھا اور اپنے ذہن میں ماحول کی ایک تصویر بنا رہا تھا۔

یہ بستی، یہاں کے لوگ، یہاں کا رہن سہن آہستہ آہستہ مجھ پر واضح ہو رہا تھا۔ پھر بھی

بے شمار سوال، جواب طلب تھے۔ غنی صاحب نے کہا تھا کہ اس علاقے کے قریبی شہر جھانسی اور الٰہ آباد وغیرہ ہیں لیکن سلطانہ اور غنی صاحب جو بولی بول رہے تھے، اس میں دکنی رنگ تھا۔ ایسا لب و لہجہ میں نے حیدر آباد میں سنا تھا اور جہاں تک مجھے پتا تھا، الٰہ آباد اور حیدر آباد وغیرہ میں بہت فاصلہ تھا۔ کئی سوال مسلسل ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ مجھے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ باوردی افراد مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے ہیں؟ شاید میری حالت دیکھ کر انہوں نے مجھے ساتھ لے جانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

جلد ہی مجھے اس سوال کا جواب بھی مل گیا۔ وہ مجھے چھوڑ ضرور گئے تھے مگر میری طرف سے مکمل غافل نہیں ہوئے تھے۔ میں نے کھڑکی کی درز سے دیکھا تو باہر گلی میں ایک باوردی شخص ایک خوانچہ فروش کے پاس کھڑا نظر آیا۔ وہ خوانچے پر سے کوئی فالسے کی طرح کا پھل اُٹھا اُٹھا کر کھا رہا تھا۔ اس کی رائفل غلاف میں لپٹی ہوئی تھی۔ یہ عین ممکن تھا کہ یہ شخص یہاں میری نگرانی کے لیے موجود ہو۔

میں لیٹ گیا اور تھوڑی دیر بعد میری غنودگی، نیند میں بدل گئی۔ جب ذہن بہت تھک جائے اور اعصاب نڈھال ہو جائیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب میں سویا تو میرے اندازے کے مطابق سہ پہر تین چار بجے کا وقت تھا۔ آنکھ کھلی تو چاروں طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ کمرے میں ایک بڑی لالٹین روشن تھی۔ میں چٹائی پر لیٹا تھا اور میرے سر کے نیچے غالباً غنی صاحب نے ایک نرم سرہانہ رکھ دیا تھا۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کھڑکی سے باہر جھانکا۔ منظر حیران کن تھا۔ جھیل کے خم کھاتے ہوئے کنارے کے ساتھ دور دور تک آبادی کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ان روشنیوں کا عکس جھیل کے ساکت پانی میں چمکتا تھا اور لگتا تھا کہ ہر طرف ستارے روشن ہیں۔

کوئی اور وقت ہوتا تو شاید یہ منظر مجھے کشش کرتا مگر اس وقت تو دل و دماغ میں طوفان برپا تھا۔ جاگتے ساتھ ہی سارے کرب زیادہ شدت کے ساتھ اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگے۔ ان میں سے سب سے جان لیوا کرب کا تعلق ثروت کے تصور سے تھا۔ یقینی بات تھی کہ میں اسے کھو چکا ہوں۔ وقت کا ایک طویل ٹکڑا جو میرے دل و دماغ سے اوجھل ہو گیا تھا، اسی ٹکڑے کے دورانیے میں ثروت کہیں گم ہو چکی تھی۔ میرا دل غم سے بھر گیا۔ میں کچھ دیر تو برداشت کرتا رہا پھر کھڑکی کے پاس ہی بیٹھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ میرے یہ آنسو ثروت کے لیے تھے۔ یہ اس جدائی کا ماتم تھا جو میری زندگی کا سب سے بڑا داغ بننے والی تھی۔ میں روتا رہا اور بڑبڑاتا رہا۔ میں نے کیا کیا سوچا تھا۔ اپنی اور ثروت کی جدائی کو ختم

کرنے کے لیے کیا کیا منصوبے بنائے تھے۔ وہ سارا عزم، سارا جوش وخروش، انہونی کو ہونی کرنے کے وہ سارے حوصلے کیا ہوئے تھے؟ کسی بھی جدوجہد کے بغیر میں کس طرح ہار گیا تھا؟ یہ کیسی شکست تھی جس میں لڑنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے ان آنسوؤں میں فرح اور عاطف کے حصے کے آنسو بھی شامل ہونے لگے۔ میں ان کے لیے رویا اور بہت دیر تک رویا۔ ابھی مجھے اپنے حالات کا ٹھیک سے ادراک نہیں تھا مگر میرا دل اندر سے گواہی دے رہا تھا کہ مجھے کچھ کاموں کے لیے بہت دیر ہو چکی ہے۔

کسی نے بہت ہولے سے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے جاگتے دیکھ کر اندر آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ غنی صاحب ہوں گے مگر وہ چوہان تھا۔ چوہان بے شک مقامی لباس میں ہی تھا مگر وہ اپنی بول چال سے پڑھا لکھا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے خدوخال بھی ظاہر کرتے تھے کہ وہ کہیں باہر سے یہاں آیا ہے۔ وہ متناسب جسم کا مالک تھا۔ آنکھیں روشن اور ماتھا چوڑا تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھ گیا اور ملائمت سے بولا۔ ''بھوک لگی ہے تو کچھ تھوڑا بہت کھالو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے کہا۔ ''شاید تمہیں یہ جان کر حیرانی ہو کہ میں ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہوں۔ کچھ عرصہ الٰہ آباد میں پریکٹس بھی کر چکا ہوں۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

وہ بولا۔ ''میں تم سے جو کچھ کہوں گا، اپنی جانکاری کے مطابق سچ کہوں گا کیونکہ اس میں میرا کوئی مفاد نہیں ہے اور نہ ہی کچھ لینا دینا ہے۔ میں آشا کرتا ہوں کہ تم بھی مجھے اپنا ہمدرد سمجھو گے۔''

''مجھے یہ بتاؤ، میں کس جگہ ہوں؟ کیسے پہنچا ہوں یہاں؟''

''کیسے پہنچے ہو، اس کے بارے میں تو میں زیادہ نہیں جانتا کیونکہ تم میرے یہاں اس اسٹیٹ میں آنے سے پہلے ہی موجود تھے لیکن......''

''اسٹیٹ؟ کیا یہ کوئی اسٹیٹ ہے؟'' میں نے حیرت سے اس کی بات کاٹی۔

''ہاں...... یہ بھانڈیل اسٹیٹ ہے۔ اتر پردیش کی دور دراز اسٹیٹس میں سے ایک۔ قانونی طور پر تو انڈیا میں راجواڑے، ریاستیں اور جاگیریں ختم ہو چکی ہیں مگر دور افتادہ علاقوں میں کسی نہ کسی طور ان کی حیثیت برقرار ہے۔''

''تم...... کب...... یہاں پہنچے تھے؟''

''آج سے کوئی ڈیڑھ سال پہلے۔ بس میری کوئی مجبوری تھی جس کے سبب مجھے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں آنا پڑا۔''

میرا دماغ سنسنا اُٹھا۔ یہ چوہان نامی شخص ڈیڑھ سال پہلے یہاں پہنچا تھا اور تب بھی میں یہاں اس جگہ موجود تھا؟

''کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ میں یہاں کن حالات میں آیا؟''

''تم آئے نہیں لائے گئے تھے اور جہاں تک میری جانکاری ہے، تم کو بڑے پنڈت مہاراج جی کی تحویل میں دیا گیا تھا۔ تم سے کوئی جرم سرزد ہوا تھا جس کی سزا تمہیں یہاں بدھ مندر میں بھگتنا تھی اور مقامی لوگوں کے عقیدے کے مطابق خود کو پوتر کرنا تھا۔''

''بڑا جرم؟ میں نے کیا کیا تھا؟ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا۔''

''میرے خیال میں یہ کوئی چوری کا معاملہ تھا۔ بدھا کی ایک خاص مورتی کی چوری کا۔ تمہارے علاوہ بھی یہاں دو لوگوں کو سزا بھگتنا تھی۔ ان میں سے ایک عورت تھی۔ اس عورت کا نام کورتی ہے۔ مقامی زبان میں کورتی، نیچ عورت کو کہا جاتا ہے۔ میرے خیال میں تم کورتی سے مل بھی چکے ہو۔ تم اسے جانتے ہو۔''

میں نے آنکھیں بند کر کے اپنا سر دیوار سے ٹکا دیا۔ ''جب تم لوگ ایسی باتیں کرتے ہو تو میرے سر کی نسیں پھٹنے لگتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم غلط کہہ رہے ہو مگر مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں قسم کھاتا ہوں۔''

چوہان نے بڑی نرمی سے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور اسے ہولے ہولے سہلانے لگا۔ اس کے لمس میں ایک ہمدرد دوست کا خلوص تھا۔ ''تمہیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری اس کیفیت کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ تم میرے لیے اجنبی نہیں ہو۔ میں تمہیں کئی ماہ تک وہاں زرگاں میں دیکھتا رہا ہوں۔ تمہارے مزاج کے اُتار چڑھاؤ میری نگاہ میں رہے ہیں۔ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

''کیا ہوا ہے؟ مجھے بتاؤ...... پلیز۔''

''اچھا...... تم میری طرف دیکھو۔ خوب غور سے۔'' چوہان نے اپنے ہاتھ سے میری ٹھوڑی اوپر اُٹھائی۔ میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ''میں ڈاکٹر چوہان ہوں۔ جب بدھ مندر میں آگ لگی تو دو بھکشو آگ میں گھر گئے تھے۔ تم بھی ان کے ساتھ تھے۔ پھر میں اور سلطانہ اندر آ گئے تھے۔ ہم نے تمہیں آگ سے نکالا تھا۔ یہ دیکھو اس وقت میرا بازو تھوڑا سا جل گیا تھا۔'' چوہان نے قمیص کی آستین اُٹھا کر کلائی سے اوپر جلنے کا نشان دکھایا۔

میں خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ وہ بولا۔ ''اس بات پر وشواس کرو کہ یہ سب سچ ہے۔ اب یاد کرنے کی کوشش کرو۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ادھوری آدھی بات تمہیں یاد آ

جائے۔"

میں نے چوہان کے کہنے پر کوشش کی مگر ایک سفید دھند کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ محسوس ہوا کہ دم گھٹ رہا ہے۔ میری کیفیت دیکھ کر چوہان نے فوراً موضوع بدل دیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ میں ذرا نارمل ہوا تو وہ دوستانہ لہجے میں بولا۔ "تم سمجھ دار اور روشن خیال ہو۔ اپنی تکلیف کو کوئی آسیبی رنگ نہیں دے رہے۔ اسے معروضی طور پر سمجھنے کی کوشش کر رہے ہو اور ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میں جانتا ہوں کہ جب بندہ اپنی تکلیف کو سمجھ لیتا ہے تو پھر اس پر غلبہ پانے میں آسانی رہتی ہے۔"

"تم کیا سمجھتے ہو...... میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟"

وہ اپنے گھنگریالے بالوں میں انگلیاں چلا کر بولا۔ "جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں، ڈیڑھ دو سال پہلے تم کہیں سے بُری طرح گرے ہو۔ کورتی بھی یہی بتاتی ہے کہ تم گرے ہو۔ تمہارے سر پر چوٹ لگی ہے۔ اس چوٹ کے بعد "اے پیس آف ٹائم" یعنی وقت کا ایک ٹکڑا تمہاری یادداشت سے اوجھل ہو گیا ہے۔ ایسا اکثر ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اسے ہم میڈیکل کی زبان میں Retrograde Amnesia کہتے ہیں۔ یہ Amnesia کی وہ قسم ہے جس میں کسی حادثے کی وجہ سے حادثے سے پہلے کے واقعات ذہن سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ یہ بیماری جزوی بھی ہوتی ہے اور کلی بھی۔ جزوی بیماری میں کچھ باتیں یاد رہ جاتی ہیں، کچھ بھول جاتی ہیں۔ تمہارا معاملہ جزوی نہیں ہے۔ تمہاری یادداشت مکمل طور پر گئی تھی اور اب واپس آگئی ہے۔ تاہم یہ سو فیصد واپسی نہیں ہے۔ تم غور کرو گے تو اب بھی ماضی کی کچھ باتیں تمہارے ذہن سے محو ہوں گی۔ بہرحال آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بلکہ مجھے وشواس ہے کہ اب اس نئی صورتِ حال میں تم جو پچھلے ڈیڑھ دو سال کی باتیں بھول رہے ہو، وہ بھی جلد ہی تمہارے ذہن میں تازہ ہونے لگیں گی۔"

اس نے چند لمحے توقف کر کے میری آنکھوں کی پتلیاں دیکھیں۔ میرے سر کی چوٹوں کا بغور معائنہ کیا پھر بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ "کورپس کلوزم۔"

غالباً وہ میری تکلیف کا طبی نام لے رہا تھا۔

اس نے میرا کندھا تھپکا اور حوصلہ افزا انداز میں بولا۔ "پریشانی کی بات نہیں ہے۔ بُرا وقت گزر چکا ہے۔ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے مہروز۔"

میں جھنجھلا گیا۔ "تم بار بار مجھے اس نام سے کیوں پکار رہے ہو؟ یہ میرا نام نہیں ہے۔"

"سوری...... سوری...... مجھ سے غلطی ہوئی۔ تم نے اپنا نام تابش بتایا ہے۔ میں آئندہ

تمہیں اسی نام سے مخاطب کروں گا۔ ویری سوری۔"

"اوکے۔" میں نے کہا۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر بات جاری رکھی۔ "یہاں صورتِ حال یہ ہے مہروز...... میرا مطلب ہے تابش کہ سلطانہ کو تمہاری مدد کی شدید ضرورت ہے۔ اگر تم نے اس کی مدد نہ کی تو وہ بُری طرح پھنس جائے گی۔ اس کی عزت اور جان دونوں شدید خطرے میں پڑ جائیں گی۔"

"میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"سب سے پہلے تو تمہیں اپنا بیان تبدیل کرنا ہوگا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تم نے چھوٹے سرکار کے اہلکاروں کے سامنے جو کچھ کہا ہے، وہ بہت خطرناک ہے۔ تم نے سلطانہ کو اپنی بیوی ماننے سے انکار کیا ہے اور یہی وہ انکار ہے جو جارج اور حکم جی وغیرہ کو ایک دم "اپر ہینڈ" دے دے گا۔ وہ اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ حکم جی اور جارج کا تو پہلے ہی یہ کہنا ہے کہ سلطانہ تمہاری بیوی نہیں ہے۔ اس نے بس ڈھونگ رچایا ہوا ہے۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ یہ حکم جی! چھوٹے سرکار، یہ سب لوگ کون ہیں۔ ان سے میرا کیا تعلق ہے؟"

ایک دم چوہان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ مجھے سلجھانے کے بجائے مزید اُلجھا رہا تھا۔ اس نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "معافی چاہتا ہوں۔ مجھے چاہیے کہ تمہیں آغاز سے بتاؤں۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے کچھ باتیں تمہارے ذہن میں بھی تازہ ہو جائیں۔"

میں سوالیہ نظروں سے اس کی شکل دیکھتا رہا۔

وہ بولا۔ "جو کچھ میرے علم میں ہے، میں تم تک پہنچا رہا ہوں۔ میری کسی بات پر شک کرو گے تو اپنی اُلجھنوں میں اضافہ کرو گے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ کہنے لگا۔ "یہ بھانڈیل اسٹیٹ دو بھائیوں کی ہے۔ دونوں کا تعلق ہندو دھرم سے ہے۔ یہاں ہندو زیادہ ہیں لیکن مسلمانوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ بڑے بھائی کا نام رائے وشوا ناتھ ہے لیکن انہیں یہاں "حکم جی" کہا جاتا ہے۔ ان کے حصے میں زرگاں کا علاقہ ہے۔ اس علاقے میں چھ سات بڑے گاؤں ہیں جو اس جنگل میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر آباد ہیں۔ چھوٹے بھائی کا نام اجیت رائے ہے اور وہ "چھوٹے سرکار" کہلاتے ہیں۔ وہ یہاں نل پانی کا نظام سنبھالے ہوئے ہیں۔ نل پانی دراصل "نیلے پانی" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہ

ایک ہی بڑی بستی ہے جو تم اس جھیل کے کنارے آباد دیکھ رہے ہو۔ اس کے علاوہ جنگل میں کہیں کہیں کسانوں اور خانہ بدوشوں کے چھوٹے چھوٹے ڈیرے ہیں جو ایسے قابلِ ذکر نہیں۔ میں جب اس بھانڈیل اسٹیٹ میں پہنچا تھا تو زرگاں میں اُترا تھا۔ مجھے پناہ کی ضرورت تھی اور زرگاں کے حکم جی نے مجھے پناہ دی تھی۔ وہاں پتا ہے میں نے سب سے پہلے تمہیں کہاں دیکھا تھا؟

ایک بار پھر کہوں گا کہ وشواس کرنا۔ میں تمہیں حقیقت بتانے کے سوا اور کچھ نہیں کر رہا۔ میں نے تمہیں سب سے پہلے زرگاں کے بودھ مندر میں دیکھا تھا۔ یہاں اسے پگوڈا بھی کہتے ہیں۔ تم نے گیروا رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ تمہارا سر منڈا ہوا تھا اور تم مندر کے صحن میں جھاڑو دے رہے تھے۔ کورتی بھی وہیں تھی۔ وہ بھی اسی حال میں تھی۔ تمہارا ایک تیسرا ساتھی بھی تھا مگر میں نے اسے نہیں دیکھا۔

پھر ایک روز میں نے تمہیں بھیک مانگتے دیکھا تھا۔ تم دوپہر کے وقت ایک پیالہ لیے گھروں کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے۔ تمہارے گلے میں زرد رنگ کی مالا تھی اور پاؤں میں لکڑی کی کھڑانویں۔ مجھے لگا کہ تم وہ نہیں جو نظر آتے ہو۔ شاید تمہیں ایسا بنایا گیا ہے، تمہیں ایک نیا روپ دیا گیا ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں اپنے دوست رمضان سے پوچھا تھا۔ رمضان زرگاں کا مقامی ہے۔ اس نے بتایا کہ تم بڑے پنڈت مہاراج کے اپرادھی ہو اور یہاں اس بودھ مندر میں جیون قید کاٹ رہے ہو۔ رمضان نے مجھے وہی چوری والی بات بتائی اور کہا کہ تم نے کوئی مقدس مورتی چوری کی تھی۔ تمہارے ساتھ جو دو اور افراد شریک تھے، وہ بھی اسی بودھ مندر میں سزا بھگت رہے تھے۔ تم سارا دن بے تکان کام کرتے تھے۔ تمہیں فقط ایک وقت کا بھوجن ملتا تھا اور روزانہ شام کو مخصوص تعداد میں بید مارے جاتے تھے تاکہ تم مرنے سے پہلے پوتر ہو جاؤ۔ اگر تم دیکھنا چاہو تو ان بیدوں کے نشان شاید تمہاری کمر پر اب بھی موجود ہوں۔''

چوہان اُٹھا اور اس نے میری قمیص ہولے سے اوپر اُٹھائی۔ پہلے خود میری پشت پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر میری پشت پر پھیرا۔ مجھے ہلکے ہلکے کئی اُبھار محسوس ہوئے۔ بہرحال ان میں کسی طرح کا درد نہیں تھا اور یہ پُرانی بات لگتی تھی۔

''ایک روز میں نے تمہیں اور بھی بُری حالت میں دیکھا۔ میں اس کی تفصیل بیان کر کے خواہ مخواہ تمہارا امن خراب کرنا نہیں چاہتا۔ سمجھو کہ تمہیں مارا پیٹا جا رہا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حکم جی کی ایک بیوی اور اس کی سہیلیوں نے تمہارے ساتھ کوئی شرارت کی تھی۔ تم پر چھیڑ

چھاڑ کرنے کا الزام لگایا تھا۔ ان میں سے ایک لڑکی کا نام رتنا تھا۔ تم ذہن پر زور دو، شاید تمہیں کچھ یاد آئے۔''

''مجھے کچھ یاد نہیں اور نہ ہی تم بار بار مجھ سے یاد کرنے کو کہو۔ مجھے بس بتاتے جاؤ، میں سن رہا ہوں۔'' میں نے سخت مضطرب لہجے میں کہا۔

''انہی دنوں میں زرگاں سے ہجرت کر کے یہاں نل پانی میں آ گیا۔ مجھے وہاں زرگاں کے حالات کی زیادہ جانکاری نہیں رہی۔ پھر ایک روز اچانک مجھے پتا چلا کہ راجپوت مسلم گھرانے کی لڑکی سلطانہ نے تم سے شادی کر لی ہے اور اب تم اس کے گھر میں اس کے بوڑھے والد کے ساتھ ہی رہتے ہو۔ اس خبر نے جہاں اور لوگوں کو حیران کیا ہوگا، وہاں میں بھی ششدر رہ گیا۔ تم تو پنڈت مہاراج کے قیدی اور معتوب تھے پھر تمہاری شادی سلطانہ سے کیسے ہو گئی؟ اس کی ٹھیک جانکاری مجھے آج تک نہیں ہو سکی ہے۔ ہاں...... یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ یہ شادی آناً فاناً ہوئی۔ شاید تم سلطانہ کو پسند آ گئے تھے یا پھر کوئی اور بات تھی۔ ہو سکتا ہے کہ تم دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا ہو۔ بہرحال سلطانہ ایک دلیر لڑکی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ کسی سے دبتی نہیں۔ حتیٰ کہ جارج جیسے شخص کو بھی وہ کبھی خاطر میں نہیں لائی۔ میرا خیال ہے کہ آگے بتانے سے پہلے میں تمہیں حکم جی، اس کے خاص دوست سر جاج اور سلطانہ کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل بتا دوں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

چوہان بولا۔ ''جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا ہے، حکم جی اس اسٹیٹ کے ایک بڑے علاقے زرگاں کا مالک و مختار ہے۔ حکم جی اور چھوٹے سرکار دونوں بھائی ہیں لیکن دونوں کے مزاج میں بہت فرق ہے۔ حکم جی شروع سے رنگین طبیعت کا مالک ہے۔ اس کی محل سرا میں جسے عرفِ عام میں دیوان کہا جاتا ہے، دنیا کی بیشتر خرافات موجود ہیں۔ حکم جی کی پانچ باقاعدہ پتنیاں ہیں جن میں رتنا بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی لونڈیاں، رکھیلیں وغیرہ بھی حکم جی اور ان کے دوستوں کی تفریحِ طبع کے لیے دیوان میں موجود رہتی ہیں۔ جارج جس کو یہاں سر جارج بھی کہا جاتا ہے، حکم جی کا سب سے قریبی دوست ہے۔ دونوں کی مشترکہ دلچسپیوں میں شراب، شکار اور شباب سرِفہرست ہیں۔ جارج درحقیقت آج سے دس بارہ سال پہلے انڈیا آیا تھا اور کوگر شیروں پر ریسرچ کرنے کے لیے ہی ان دشوار گزار جنگلات میں داخل ہوا تھا۔ اس نے یہاں بہت سی دستاویزی فلمیں بنائیں اور ڈیٹا وغیرہ اکٹھا کیا۔ پھر اس کا من ان جنگلوں میں ایسا لگا کہ وہ یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ ان دنوں حکم جی اور چھوٹے سرکار کے

پتا جی رائے پرتاب بہادر بھی زندہ تھے۔ وہ بھی کوگر نسل کے شیروں میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے بہت سے کوگرز پال رکھے تھے۔ انہی کوگرز کی وجہ سے ہی کچھ عرصے بعد ان کی موت بھی ہوئی۔ بہر حال رائے پرتاب بہادر کے جیون میں ہی حکم جی اور جارج میں گہری دوستی ہو چکی تھی۔ دونوں کی طبیعت ملتی تھی اور دونوں کے لیے اس دور دراز اسٹیٹ میں ہر طرح کا "شکار" بھی موجود تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے بعد جارج کا دل کہیں اور نہیں لگ سکا۔ وہ ایک دو بار چند مہینوں کے لیے انگلینڈ گیا بھی لیکن پھر واپس آ گیا۔ اب وہ یہیں پر ہے۔ اس کے دو تین انگریز دوست بھی یہیں کے ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک برنگھم کا سرجن ہے۔ اب میں تمہیں سلطانہ کے بارے میں کچھ بتا دوں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

پتا نہیں کیوں مجھے کسی وقت لگتا تھا کہ میں نے اس کہانی کے کچھ حصے کہیں سنے ہوئے ہیں۔ کہاں سنے ہیں؟ کس نے سنائے ہیں؟ واقعات کے یہ ٹکڑے کچھ شناسا سے کیوں لگتے ہیں؟ ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو اس کے گرد ایک ناقابلِ عبور تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

چوہان نے حسبِ عادت اپنے گھنگریالے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "سلطانہ کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے۔ زرگاں میں اس کے والد مختار احمد کی تھوڑی سی زمین ہے۔ اس زمین سے ان کی گزر بسر ہوتی ہے۔ سلطانہ کا صرف ایک بھائی ہے۔ وہ کمر میں چوٹ لگنے سے معذور ہو گیا ہے اور کئی سال سے بستر پر ہی ہے۔ سلطانہ کی والدہ بڑی دلیر عورت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تلوار چلانا جانتی تھی اور باقاعدہ مردوں سے مقابلہ کر سکتی تھی۔ اس کی موت بھی ایک بہادر راجپوت کی طرح ہوئی۔ یہ کوئی پندرہ سولہ سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت سلطانہ بمشکل آٹھ نو سال کی تھی۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ جنگل میں لکڑیاں اکٹھی کر رہی تھی۔ اچانک ماں بیٹی کو درختوں میں ہلچل محسوس ہوئی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر دیکھا تو دل دہلا دینے والا منظر نظر آیا۔ حکم جی جو اس وقت نوجوان تھا، زمین پر گرا ہوا تھا اور تین بھیڑیئے اس سے چمٹے ہوئے تھے۔ حکم جی کا خاص محافظ ایک طرف پڑا تھا۔ اس کا پیٹ پھٹ گیا تھا اور وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ بجائے اس کے کہ سلطانہ کی والدہ اپنی بچی کو لے کر وہاں سے بھاگ جاتی یا شور مچا کر کسی کو مدد کے لیے بلانے کی کوشش کرتی، وہ ایک موٹی لکڑی کے ساتھ خود بھیڑیوں پر حملہ آور ہو گئی۔ اس نے انہیں زوردار چوٹیں لگائیں۔ پھر اس کی نظر محافظ کی رائفل پر پڑ گئی۔ اس نے رائفل کھینچی اور یکے بعد

دیگرے کئی فائر کر کے تینوں بھیڑیوں کو وہیں ڈھیر کر دیا۔ تاہم اس شدید کشمکش میں وہ خود بھی زخمی ہو گئی اور قریباً ایک ماہ بعد ان زخموں کی وجہ سے ہی چل بسی۔ سلطانہ کی والدہ نے بھانڈیل اسٹیٹ کے ولی عہد کا جیون بچایا تھا، یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔ سورگ باشی رائے پرتاب بہادر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے صلے میں سلطانہ کے والد مختار کو کچھ زمین دینا چاہی جس میں ایک بڑا باغ بھی تھا مگر وہ بھی بہت خوددار تھے۔ انہوں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت رائے پرتاب بہادر نے انہیں اپنی خاص مہر دی تھی اور کہا تھا کہ یہ مہر دکھا کر وہ جب چاہے ان سے یا ان کی اولاد سے کچھ مانگ سکتے ہیں۔ اب پتا نہیں اس میں کتنی حقیقت ہے لیکن بات ایسے ہی بیان کی جاتی ہے۔"

چوہان نے چند لمحے توقف کیا اور بولا۔ "اب میں دوبارہ سر جارج کی طرف آتا ہوں۔ جہاں تک مجھے علم ہے، جارج مقامی عورتوں کا رسیا ہے۔ چونکہ وہ حکم جی کا گہرا دوست ہے اس لیے حکم جی کسی نہ کسی طریقے سے اس کے لیے تفریحِ طبع کا سامان فراہم کرتا ہے۔ میری ناقص معلومات کے مطابق سر جارج کچھ عرصے سے سلطانہ کے چکر میں ہے۔ سلطانہ کوئی ایسی خوبصورت لڑکی نہیں ہے لیکن تمہیں پتا ہی ہوگا، جارج کی فطرت کے لوگ اس شے کو حاصل کر کے زیادہ خوشی محسوس کرتے ہیں جسے حاصل کرنا زیادہ مشکل ہو۔ ممکن ہے کہ ماضی قریب میں کسی وقت جارج نے سلطانہ کی طرف پیش قدمی کی ہو مگر اسے ناکامی ہوئی ہو اور اس کے بعد اس نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہو۔ بہر حال اس طرح کی کوئی بھی صورت ہو سکتی ہے۔ حالانکہ سلطانہ کا بیاہ ہو چکا ہے مگر جارج پھر بھی اس کے پیچھے ہے کیونکہ حکم جی پر جارج کا ہولڈ ہے، اس لیے میرے اندازے کے مطابق سلطانہ کے لیے کوئی نہ کوئی مشکل کھڑی ہوتی رہتی ہے۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ جارج کے اثر کی وجہ سے حکم جی اور پنڈت مہاراج، سلطانہ کی شادی کو شادی ہی تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ صرف نام کی شادی ہے۔ وہ تم کو ایک سنکی شخص سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ سلطانہ نے تمہیں صرف دکھاوے کا پتی بنایا ہوا ہے۔ اصل میں اس کے بچے کا باپ کوئی اور ہے وغیرہ وغیرہ۔"

"کیا...... تم بھی...... یہی کہہ رہے ہو کہ...... میں سلطانہ کا شوہر ہوں؟" میری آواز خوف آمیز حیرت کی شدت سے لرز رہی تھی۔

"کم از کم اس میں تو کوئی شک نہیں ہے مہروز! مم...... میرا مطلب ہے تابش! میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں ایک شوہر کی حیثیت سے سلطانہ کے گھر میں رہتے دیکھا ہے۔"

"لیکن تم تو کہتے ہو کہ تم سلطانہ کی شادی سے پہلے ہی یہاں نل پانی میں آ گئے تھے؟"

''میں کچھ دن کے لیے عارضی طور پر وہاں گیا تھا۔ حکم جی کی ایک پتنی بیمار تھی۔ وہ اس سلسلے میں مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ ایک طرح سے یہ بھی حکم جی کی منافقت ہی کہلائے گی۔ وہ عام لوگوں کو تو جڑی بوٹیوں اور جھاڑ پھونک سے علاج کی تلقین کرتا ہے مگر جب اپنے گھر کا کوئی فرد بیمار ہوتا ہے تو پھر اسے انگریزی طریقہ علاج کی ضرورت پڑتی ہے۔ بہرطور یہ حکم جی کی مجبوری تھی جس کی وجہ سے میں دوبارہ زرگاں جا سکا۔ یہ گروپ فوٹو جو ابھی چاچے غنی نے تمہیں دکھائی ہے، یہ میری موجودگی میں ہی اُتری تھی۔ ٹھاکر برادری کے ایک لڑکے کی شادی تھی۔ میں اور میری منہ بولی بہن بھی اس تصویر میں موجود ہیں۔ یہ دیکھو...... یہ اس طرف دلہے کے پیچھے ہم دونوں کھڑے ہیں۔

چوہان نے ایک بار پھر مجھے تصویر دکھائی۔ وہ واقعی تصویر میں نظر آ رہا تھا۔ اس کے گلے میں پھولوں کا ہار تھا۔ چوہان نے کہا۔ ''ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے تابش! ورنہ میں تمہیں تفصیل سے بتاتا کہ ایک بیوی کی حیثیت سے سلطانہ نے تمہاری خاطر کیا کیا مصیبتیں جھیلی ہیں۔ اپنی ماں کی طرح وہ بھی ایک باہمت لڑکی ہے تابش! تمہاری شریکِ حیات بننے کے بعد اس نے واقعی شریکِ حیات بن کر دکھایا ہے لیکن اب اس کی مصیبتوں میں ایک دم اضافہ ہو گیا ہے اور یہ اضافہ...... میری بات کا بُرا نہ ماننا...... یہ اضافہ تمہاری ہی وجہ سے ہوا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے اہلکاروں کے سامنے تم نے جو کچھ اپنے اور سلطانہ کے بارے میں کہا ہے، وہ اس بیچاری کو سخت آفت میں ڈال دے گا۔ میری طرح وہ بھی یہاں چھوٹے سرکار کی پناہ میں آنے کے لیے آئی تھی مگر مجھے نہیں لگتا کہ اب اسے پناہ مل سکے گی۔ مجھے تو یہ لگتا ہے کہ......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ ''ہو سکتا ہے کہ اس مقدمے کا فیصلہ ایک دو دن میں ہی ہو جائے۔ حکم جی کے لوگ تمہیں اور سلطانہ کو یہاں سے گھسیٹ کر واپس لے جائیں گے۔ اس کے بعد وہاں جو کچھ سلطانہ کے ساتھ ہو سکتا ہے، اس کا تصور کرنا بھی سخت تکلیف دہ ہے۔ تمہیں کچھ کرنا پڑے گا مہروز! میرا مطلب ہے تابش! ورنہ تمہاری بیوی، تمہارا بچہ بلکہ پورا گھر سخت مشکل میں پڑ جائے گا۔''

میرا دم پھر گھٹنے لگا۔ میں نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔ ''تم اگر میرے دوست ہو تو پھر سمجھ لو مجھے ان لوگوں سے کچھ بھی لینا دینا نہیں۔ میں صرف یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے لوگوں میں جانا چاہتا ہوں۔''

چوہان کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ ''کیا تم اس لڑکی کو بے یار و مددگار چھوڑ دو گے جو تمہاری خاطر زخم پر زخم کھاتی رہی ہے اور جواب صرف تمہارے کارن ایک بڑی مصیبت میں پھنسی ہوئی ہے؟''

''میں نے کسی کو مصیبت میں نہیں پھنسایا۔ میں خود مصیبت میں ہوں۔ مجھے یہاں سے جانا ہے۔''

''تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے تابش! تمہیں شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ تم یہاں سے نہیں جا سکتے۔ تمہارے لیے جانا ممکن ہی نہیں ہے۔''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''میں تمہیں تفصیل نہیں بتا سکتا اور میرا خیال ہے کہ میں بتاؤں گا بھی تو تم وشواس نہیں کرو گے۔ یہ جگہ تمہارے لیے ایک جزیرے کی طرح ہے۔ تم اس سے باہر نہیں نکل سکتے۔''

''تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔ کیا ہم کسی جزیرے میں ہیں؟''

''نہیں...... میں صرف ایک مثال دے رہا ہوں۔ میں نے کہا ہے نا کہ تمہیں میری بہت سی باتوں پر وشواس نہیں ہوگا۔ جہاں تک میری جانکاری ہے۔ تم اس سے پہلے بھی دو تین مرتبہ یہاں سے نکلنے کی کوشش کر چکے ہو لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔''

''میں کوشش کر چکا ہوں؟''

''ہاں تم...... ایک مرتبہ کا تو میں گواہ بھی ہوں۔ جب تمہیں تیواری لال اور ڈیوڈ وغیرہ پکڑ کر لائے تھے۔ تمہیں گھوڑے کے پیچھے باندھا گیا تھا۔''

تیواری لال؟ ڈیوڈ؟ وہ پتا نہیں کن لوگوں کے نام لے رہا تھا اور کن واقعات کا ذکر کر رہا تھا۔ اس کی ایسی باتوں سے میری کنپٹیاں پھٹنے لگی تھیں۔ اچانک جنگل کی طرف سے آنے والی ایک ہولناک آواز نے مجھے بُری طرح چونکا دیا۔

یہ چلاتی ہوئی آواز چار پانچ سو میٹر کی دوری سے آئی ہو گی۔ یقیناً یہ کوئی جنگلی جانور تھا۔ آواز ایک بار پھر سنائی دی، اس کے ساتھ ہی رائفل کے دو تین فائر ہوئے۔ لوگوں کے واویلا کرنے کی دور افتادہ آوازیں بھی کانوں میں پڑیں۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے چوہان سے پوچھا۔

''یہ ہاتھی ہے۔ میرے خیال میں یہ کنور بابو کا پالتو ہاتھی ہے۔ کنور بابو چھوٹے سرکار جی کا چھوٹا بھائی ہے۔''

یقیناً یہ ہاتھی ہی تھا۔ ایک بار پھر اس کی زوردار چنگھاڑ سنائی دی۔ وہ اب غالباً بستی کی

طرف آرہا تھا۔

چوہان مجھے وہیں چھوڑ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ شاید یہ پالتو ہاتھی آؤٹ آف کنٹرول ہو گیا تھا۔

میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ راہگیروں میں کھلبلی نظر آرہی تھی۔ وہ آواز کی طرف جا رہے تھے۔ کچھ وہیں کونے کھدروں میں کھڑے ڈری ہوئی نظروں سے ہلچل کے مرکز کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تب تین چار سبز وردیوں والے گھڑسوار تیزی سے گھوڑے دوڑاتے آواز کی سمت چلے گئے۔ ان میں سفید کپڑوں والا ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکا تھا۔ اپنے گھوڑے اور لباس کے اعتبار سے وہ ان میں ممتاز دکھائی دیتا تھا۔ اس کے کندھے سے ایک سنہری ہولسٹر جھول رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہی چھوٹے سرکار کا چھوٹا بھائی کنور بابو ہے۔

دو تین منٹ بعد میں نے کھڑکی میں سے ایک اور چونکا دینے والا منظر دیکھا۔ پانچ چھ افراد نے ایک چارپائی اُٹھا رکھی تھی اور ایک طرف بھاگے جا رہے تھے۔ چارپائی پر سانولی رنگت والا ایک غریب صورت نوجوان تھا۔ وہ دھوتی اور بنیان میں تھا۔ اس کی دھوتی خون سے سرخ نظر آئی۔ باقی جسم سے بھی خون رِس رہا تھا۔ دو تین مشعل بردار بھی چارپائی کے ساتھ ساتھ دوڑے جا رہے تھے۔

دس پندرہ منٹ بعد سکون ہو گیا۔ ہاتھی کی آواز کافی فاصلے سے سنائی دینے لگی۔ اسی دوران میں چوہان بھی واپس آ گیا۔ اس نے بس اتنا بتایا کہ کنور بابو کا پالتو ہاتھی ''بادل'' اپنے مہاوت کی غلطی سے باہر نکل آیا تھا۔ اس کی وجہ سے ایک بندہ زخمی ہو گیا ہے۔ بہرحال اب ''بادل'' کو پکڑ لیا گیا ہے۔ جو فائر کیے گئے وہ صرف ہاتھی کو ڈرانے کے لیے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد ہماری گفتگو پھر وہیں سے شروع ہو گئی جہاں سے سلسلہ ٹوٹا تھا۔ چوہان نے مجھے بتایا کہ اس کی معلومات اور عینی مشاہدے کے مطابق میں متعدد بار یہاں سے بھاگنے کی کوشش کر چکا ہوں۔ اس کی ایسی باتوں سے میرا دماغ سنسنا اُٹھتا۔ دل کی دھڑکن بڑھ جاتی اور میرے اردگرد پھیلی دھند گہری ہوتی چلی جاتی۔ اس کے ساتھ ہی کہیں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے یہ آواز اُبھرتی کہ شاید ڈاکٹر چوہان ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ ماضی میں کہیں کچھ ایسا ہو چکا ہے۔

چوہان میرے تاثرات بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ ''نل پانی کے چھوٹے سرکار اجیت رائے حالانکہ حکم جی کے سگے بھائی ہیں لیکن جیسا کہ میں نے بتایا ہے، دونوں بھائیوں کے مزاج میں بہت فرق ہے۔ چھوٹے سرکار عیش وعشرت کے اس طرح دلدادہ نہیں جس طرح حکم جی ہیں۔ چھوٹے سرکار انصاف پسند بھی ہیں، خاص طور سے مسلمانوں کے لیے وہ اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے اور ان کے ساتھ اپنی عملداری میں کوئی ناانصافی نہیں ہونے دیتے۔ بلکہ کئی لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ وہ ہندو ہونے کے باوجود ہندوانہ رسم ورواج کو خرافات سمجھتے ہیں اور دھرم کے کٹرپن کو برداشت نہیں کرتے۔

''کبھی کبھی کچھ لوگ حکم جی کی عملداری میں ناانصافی کا شکار ہوتے ہیں تو وہ چھوٹے سرکار کی عملداری کا رُخ کرتے ہیں اور نل پانی آ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو چھوٹے سرکار بڑی دلیری اور فراخ دلی سے پناہ دیتے ہیں لیکن شرط یہی ہوتی ہے کہ پناہ لینے والا اپرادھی نہ ہو اور اس نے کوئی بڑا جرم نہ کیا ہو۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ میں خود بھی شروع میں زرگاں ہی آیا تھا مگر پھر یہاں نل پانی آ گیا۔ اسی طرح یہ لڑکی سلطانہ بھی اپنے بچے کو اور تمہیں لے کر یہاں پناہ لینے آئی ہے۔ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ وہ جارج اور حکم جی کی دستبرد سے بچنا چاہ

رہی ہے۔ اسے یہاں بآسانی پناہ مل جاتی تھی مگر......" وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا پھر ذرا توقف سے بولا۔ "اب بیچاری سلطانہ کے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔ حکم جی کی طرف سے تو اس پر پہلے ہی الزام لگایا جا رہا ہے کہ وہ آوارہ ہے اور اس کی گود میں جو بچہ ہے وہ بھی تمہارا نہیں ہے۔ اب جبکہ تم نے اہلکاروں کے سامنے صاف کہہ دیا ہے کہ وہ تمہاری بیوی نہیں ہے تو اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا۔ جو لوگ اس کا پیچھا کر رہے ہیں وہ یہاں تل پانی پہنچنے میں اب زیادہ دیر نہیں لگائیں گے۔ عین ممکن ہے کہ چھوٹے سرکار اسے اور تمہیں گونگے ہاشو سمیت فوراً ہی حکم جی کے اہلکاروں کے حوالے کر دیں۔"

چوہان جو کچھ بھی بتا رہا تھا، وہ سب کافی حیرت ناک تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میں اس سے پہلے بھی یہاں سے بھاگنے کی کوشش کر چکا ہوں اور ناکام رہا ہوں۔ تو کیا یہ سارا علاقہ کسی سخت حفاظتی حصار میں تھا جہاں سے میں نکل نہیں پایا تھا؟ اتنے وسیع و عریض علاقے کو کسی سخت حصار میں رکھا جانا کیسے ممکن تھا؟ کیا وہ مجھے صرف ڈرانے کے لیے ایسی باتیں کر رہا تھا تاکہ میں یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کروں؟

وہ کہہ رہا تھا کہ سلطانہ نامی یہ لڑکی میری محسنہ کی حیثیت رکھتی ہے اور میری خاطر بہت تکلیفیں سہہ چکی ہے۔ ممکن تھا کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔ سلطانہ کے رویے کی کچھ جھلکیاں تو میں پچھلے دو تین روز میں دیکھ چکا تھا لیکن جو کچھ بھی تھا، ماضی کا وہ حصہ جس میں بقول چوہان یہ لڑکی میری محسنہ کی حیثیت رکھتی تھی، میرے حافظے میں سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ وقت کے اس گمشدہ ٹکڑے میں جو کچھ ہوا تھا۔ میں کسی بھی طرح اس کا ذمے دار نہیں تھا۔ اپنے جسم کے مندمل زخم دیکھنے کے بعد میں اس حیرت ناک نتیجے پر تو بہرحال پہنچ گیا تھا کہ میرے ساتھ کچھ انوکھا ہو چکا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں چوہان کی باتوں کو مکمل طور پر رد نہیں کر سکتا تھا لیکن کچھ بھی تھا، سلطانہ کے ساتھ میری شناسائی صرف دو دن پرانی تھی۔ میں اس کے ساتھ کسی طرح کی وابستگی محسوس نہیں کر سکتا تھا اور یہی سبب تھا کہ اس کی مصیبت سے مجھے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میرے ذہن میں تو صرف ثروت کا نام گونج رہا تھا اور دل میں اس کے غم کا سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔ میں جلد سے جلد اپنوں تک پہنچنا چاہتا تھا اور جاننا چاہتا تھا کہ میرے زندہ رہنے کا کوئی جواز باقی بچا ہے یا نہیں۔

وہ رات بڑی مشکل سے کٹی تھی۔ میں رات آخری پہر تک جاگتا رہا۔ غنودگی کی سی کیفیت تھی۔ ذہن گھڑدوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ یہ بات اب میری سمجھ میں آنا شروع ہو گئی تھی کہ لاہور ڈیفنس کی کوٹھی میں سیڑھیوں سے گر کر ہوش و حواس سے بیگانہ ہوا تھا۔ اب میں اپنے

ہوش و حواس میں واپس آیا ہوں لیکن اس دوران میں ناقابلِ یقین طور پر ڈیڑھ دو سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے اور اب وہ عرصہ میری یادداشت میں موجود نہیں ہے۔

آخری پہر مجھے نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ نیلی جھیل کے کنارے اس وسیع و عریض بستی میں زندگی رواں دواں تھی۔ جھیل میں کشتیاں ڈول رہی تھیں۔ ایک بڑا بجرا جو یقیناً بستی کے کسی متمول شخص کا رہا ہوگا، بادبانوں کی مدد سے ہولے ہولے جنگل کی سمت بہہ رہا تھا۔ اس میں دو تین پالکیاں دھری تھیں جن میں یقیناً پردہ پوش خواتین تھیں۔ کہیں کہیں جھیل کے کنارے سبز وردیوں والے گھڑسوار بھی گھوڑے دوڑاتے دکھائی دیتے تھے۔ دور فاصلے پر ایک عظیم الشان حویلی کے کلس اور گنبد سنہری دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ان سے اوپر نیلگوں فلک پر پرندوں کی اُڑانیں تھیں۔ بقول چوہان اس عمارت کو دیوان کہا جاتا تھا۔

میں کسی داستانی بستی میں آ گیا۔ اسی دوران میں غنی صاحب اندر داخل ہوئے۔ ان کے بیوی بچے تا حال لوٹے نہیں تھے۔ میں نے ان کے ساتھ مل کر بے دلی سے ناشتہ کیا۔ وہ افسردہ نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ سلطانہ واپس نہیں آ سکی۔ اس کا بچہ اور ہاشو بھی وہیں ہیں۔ میرے سر سے مسلسل ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ پٹی بدلے جانے کی ضرورت تھی لیکن فی الوقت ڈاکٹر چوہان یہاں تھا اور نہ سلطانہ موجود تھی۔

ابھی بمشکل ہم فارغ ہوئے ہی تھے کہ وردیوں والے گھڑسوار غنی صاحب کے دروازے پر نظر آئے۔ ان کی آمد متوقع تھی۔ غنی صاحب نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔ "میرا خیال ہے کہ وہ ہم کو لینے آئے ہیں۔ شاید آج سلطانہ کا مقدمہ چھوٹے سرکار کے سامنے پیش ہوگا۔"

غنی صاحب کا اندازہ بالکل درست تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ایک مقامی طرز کی گھوڑا گاڑی پر سوار چھوٹے سرکار کی عظیم الشان حویلی کی طرف جا رہے تھے۔ یہ دو گھوڑوں والی گاڑی تھی اور اس کے دونوں پائدانوں پر دو مسلح باوردی اہلکار کھڑے تھے۔ چھوٹے سرکار کے اہلکار سلطانہ کے دونوں تھیلے نما جھولے کل ہی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ آج انہوں نے گونگے ہاشو کا مختصر سامان بھی گھوڑا گاڑی میں دھر لیا تھا۔

راستے میں مجھے حیران کن مناظر دیکھنے کو ملے۔ کاروبارِ زندگی جاری تھا۔ ہم ایک سبزی منڈی کے پاس سے گزرے پھر ایک زیرِ تعمیر مسجد میں بہت سے لوگوں کو مچانوں کے اوپر کام کرتے دیکھا۔ گھوڑا گاڑیوں کے علاوہ یہاں بیل گاڑیاں اور کہیں کہیں اونٹ گاڑیاں بھی نظر آئیں۔ پختہ سڑک کہیں نہیں تھی، ہاں نیم پختہ راستے موجود تھے جن کے کنارے کثرت سے

درخت لگائے گئے تھے۔ ایک جگہ درختوں تلے دو خستہ حال جیپیں کھڑی دکھائی دیں۔ یہ جیپیں شاید استعمال کے قابل نہیں تھیں۔ مقامی لوگوں کا لباس زیادہ تر پاجامے اور لنگی پر مشتمل تھا۔ کہیں کہیں انگرکھے بھی نظر آتے تھے۔ عورتوں میں سے کچھ نے گھاگرے چولیاں پہن رکھی تھیں۔ عورتوں کے جسم پر چاندی کے زیور عام دکھائی دیتے تھے، خاص طور سے چوڑیاں۔ ہندو مسلم دونوں طرح کے لوگ یہاں نظر آرہے تھے بلکہ مسلمان شاید کچھ زیادہ ہی تھے۔ جلد ہی ہم جھیل کے کنارے اس عظیم الشان عمارت کے سامنے پہنچ گئے جو دور سے تو شاندار نظر آتی ہی تھی، قریب سے اور بھی پُرشکوہ تھی۔ ایک دیوہیکل چمکیلے گیٹ کے اندر سے گزر کر ہم ایک طویل روش پر آگئے۔ یہ دیوان کا بیرونی حصہ تھا۔ بڑی خوبصورت جگہ تھی۔ دونوں طرف سبز گراسی میدان نظر آتے تھے اور پھول پودے کثرت سے تھے۔ جگہ جگہ مستعد گھڑسوار بالکل ساکت کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں پر کہنیوں تک سفید دستانے تھے اور ان کی نگاہیں اپنے سامنے غیر مرئی نکتوں پر جمی ہوئی تھیں۔ یہاں ہمیں چند شاندار گاڑیاں اور جیپیں بھی نظر آئیں جن میں ایک قیمتی رولز رائس بھی تھی۔

سفید ہاتھی کے بارے میں، مَیں نے اس سے پہلے فقط سنا تھا یہاں دیکھا بھی۔ وہ بڑے اچھے طریقے سے سجا ہوا تھا۔ اس کے اوپر ہودہ رکھا تھا اور چوکس مہاوت، ہاتھی کے اوپر ہی تھا۔ غالباً یہ کسی ایسے رئیس یا امیر کی سواری تھی جو یہاں چھوٹے سرکار سے ملنے آیا ہوا تھا۔

باوردی افراد نے مجھے اور غنی صاحب کو گاڑی سے اُتارا اور ایک جگہ عام لوگوں کے درمیان بٹھا دیا۔ یہاں مجھے دو چار ایسے افراد بھی نظر آئے جن کی مشکیں خاص قسم کی رسیوں سے کسی ہوئی تھیں۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ لوگ مختلف مقدمات میں پیش ہونے کے لیے یہاں پہنچے ہیں۔

کچھ ہی دیر بعد اس ہجوم میں چھ افراد کی ایک ٹولی کو اُٹھنے کا حکم دیا گیا اور دیوان کے اندرونی حصے کی طرف لے جایا گیا۔ اس ٹولی میں میرے اور غنی صاحب کے علاوہ ایک جواں سال عورت بھی شامل تھی وہ مسلسل رو رہی تھی۔ اس کی گود میں اسی کی طرح کا ایک سانولا سلونا شیر خوار بچہ تھا۔ ہم مختلف راہداریوں سے گزر کر ایک شاندار ہال میں پہنچے۔ یہاں مخمل و زربفت کے طویل پردے تھے۔ فانوس، غالیچے، خوبصورت نقش و نگار والے جھروکے جن میں زرنگار کرسیوں پر اس راجواڑے کے معزز افراد قیمتی پوشاکیں پہنے براجمان تھے۔ ان میں ہندو اور مسلم دونوں طرح کے لوگ شامل تھے۔ یہ جگہ پُرانے زمانے کے کسی دربار سے مشابہ نظر آتی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ کہیں کہیں انگریزی لباس والے افراد بھی دکھائی دیتے

تھے۔ اس مقام پر دکھائی دینے والا اہم ترین شخص وہ جواں سال شخص تھا جو ایک دو ڈھائی فٹ اونچے چبوترے پر موجود تھا۔ اس نے بند گلے کا کوٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ گلے میں قیمتی مالائیں اور سر پر ایک زرنگار پگڑی تھی۔ وہ وکٹورین طرز کی شاندار کرسی پر براجمان تھا۔ اس کے اردگرد درجنوں محافظ پتھروں کی طرح ساکت کھڑے تھے۔ چبوترے سے نیچے چھوٹی کرسیوں پر اس عدالت کے اہلکار یعنی کاتب، محرر، وکیل وغیرہ موجود تھے۔

مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ زرنگار وکٹورین کرسی پر بیٹھا ہوا بارعب شخص کون ہے۔ یقیناً یہی ''چھوٹے سرکار'' تھا جو اس نل پانی نامی جگہ کا کرتا دھرتا مختار کہلاتا تھا۔ غالباً کسی مقدمے کی سماعت اختتام پذیر ہوئی تھی۔ درمیانی عمر کے دو افراد جو اپنی صورتوں اور حلیے سے تاجر پیشہ نظر آتے تھے، جھک کر سلام کرتے ہوئے اُلٹے قدموں پیچھے ہٹتے گئے اور پھر ایک بغلی دروازے سے باہر نکل گئے۔ ایک اٹھائیس تیس سالہ شخص جس کا آدھا سر، آدھی داڑھی، آدھی مونچھ اور ایک بھوں مونڈ دی گئی تھی، رو رو کر گڑگڑا رہا تھا۔ وہ چھوٹے سرکار سے اپنی سزا میں کمی کی درخواست کر رہا تھا۔ باوردی افراد نے اسے دبوچ لیا اور دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے۔

اس کے بعد چھوٹے سرکار کی عدالت میں جو معاملہ پیش ہوا، وہ اسی روتی دھوتی عورت کا تھا جو ہمارے ساتھ اندر آئی تھی۔ اہلکاروں نے اسے چھوٹے سرکار کے عین سامنے چبوترے کے پاس کھڑا کر دیا۔ وہ اپنی فریاد پیش کرنے لگی۔ اس نے اپنے ہاتھ جوڑ رکھے تھے اور گڑگڑا رہی تھی۔ ''چھوٹے سرکار! ہمرے ساتھ بڑا اجلم ہوا ہے جی۔ ہم کیا کریں۔ ہمرے بچے بھوکے مر جاویں گے جی، وہی تو کمانے والا تھا۔ وہ مہینوں کے لیے بستر پر پڑ گیا ہے۔ پتا ناہیں کہ اُٹھتا بھی ہے یا ناہیں۔ ہمری کھیتی اُجڑ جاوے گی۔ جو کچھ بویا ہے وہ بھی برباد ہو جاوے گا۔''

''حوصلہ رکھو۔ تمہارے ساتھ انصاف ہوگا۔'' چھوٹے سرکار کی بارعب آواز ہال میں گونجی۔ پھر وہ سرگوشیوں میں اپنے اردگرد کھڑے افراد سے باتیں کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے بلند آواز سے اپنے اہلکاروں کو مخاطب کیا اور بولا۔ ''کنور بابو کو یہاں لایا جاوے۔''

جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ وہی ہاتھی والا معاملہ ہے جس کی کچھ جھلکیاں میں نے کمرے کے اندر سے دیکھی تھیں۔ یہ فریاد کناں عورت اس کھیت مزدور کی بیوی تھی جو بپھرے ہوئے ہاتھی کی زد میں آکر زخمی ہوا تھا۔ وہ ہاتھی چھوٹے سرکار جیت رائے کے چھوٹے بھائی کنور بابو کا پالتو تھا۔

چند منٹ بعد ایک اور چونکا دینے والا منظر میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکے کو ہال کمرے میں لایا گیا۔ اس نے بھی بند گلے کا کوٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ تاہم اس کے بال بکھرے بکھرے اور آنکھیں سرخ تھیں۔ اس کی ناک کا بانسہ بھی چھوٹے سرکار کی طرح کافی اونچا تھا۔ چہرے کے باقی خدوخال بھی گواہی دے رہے تھے کہ وہ چھوٹے سرکار کا چھوٹا بھائی کنور بابو ہے۔ اس کی ایک کلائی میں ایک ریشمی رسی بندھی ہوئی تھی۔ یہ کوئی بہت مضبوط بندش نہ تھی۔ یوں لگتا تھا کہ بس علامتی طور پر اسے یہ رسی باندھی گئی ہے۔

چھوٹے سرکار نے اسے غصیلی نظروں سے دیکھا اور کہا۔ ''اس عورت کو پہچانو۔ یہ اس بندے کی گھر والی ہے جس کو تمہارے بادل نے روندا ہے۔ یہ ہم سے اور تم سے اپنے پتی کا قصور پوچھت ہے۔ کیا تم اسے بتا سکتے ہو کہ کھیت میں کام کرتا ہوا اس کا پتی جو پورے پریوار کی روٹی چلاوت تھا، کیوں مہینوں کے لیے بستر پر جا گرا ہے؟''

کنور کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔

چھوٹے سرکار کی آواز دوبارہ گونجی۔ ''تم ناہیں بتا سکتے لیکن ہم بتاتے ہیں۔ اس کا پتی اس لیے زخمی اور اپاہج ہوا ہے کہ ایک صاحب بہادر اپنے بدمست جانور کو سنبھال نہیں سکے۔ انہوں نے اپنے لاڈلے ہاتھی کو ہوا خوری کے لیے باغ میں نکالا۔ پھر اس کی طرف سے غافل ہو کر اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کی بازی لگانے میں مصروف ہو گئے اور تو اور مہاوت کو بھی کسی کام سے بھیج دیا اور...... صاحب بہادر نے اس طرح کی حرکت پہلی دفعہ ناہیں کی ہے۔ اس سے پہلے بھی ان کی وجہ سے اسی انداز میں عام لوگن کا نقصان ہو چکا ہے۔ صاحب بہادر کا یہ ہاتھی ایک چھوٹے بچے کی جان لے چکا ہے۔ ایک بوڑھی عورت کی ٹانگ توڑ چکا ہے۔ گلاب محلے کی کئی جھونپڑیاں بھی اس کے کارن مسمار ہوئی تھیں۔ ہوئی تھیں یا ناہیں؟'' چھوٹے سرکار کی بارعب آواز گونجی۔

کنور بدستور سر جھکائے کھڑا تھا۔ ایک فربہ اندام شخص اپنی جگہ سے اُٹھا اور اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''کنور بابو! آپ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہت ہیں؟''

''ناہیں۔'' کنور نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہم سے غلطی ہوئی ہے۔ ہم مانتے ہیں۔''

''آپ بہت عقلمند ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ اپنی سزا بھی خود ہی تجویز کر لیں۔'' چھوٹے سرکار نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''آپ جو سزا دیں گے، مجھے قبول ہے۔''

چھوٹے سرکار اور مصاحبین کے درمیان دھیمے لہجے میں کچھ گفتگو ہوئی پھر چھوٹے سرکار کی طرف سے اعلان کیا گیا۔ ''گھائل ہونے والے کسان کی پتنی کو اپرادھی کی طرف سے دس ہزار روپیہ اور بیلوں کی جوڑی دی جائے گی۔ گھائل کے علاج معالجے کا سارا خرچہ بھی اپرادھی ہی برداشت کرے گا۔ اس کے علاوہ اپرادھی کو تین مہینے جیل کے اندر قیدِ تنہائی میں کاٹنا ہوں گے۔ بالکل عام قیدی کی حیثیت سے۔''

کنور کا چہرہ اُتر گیا۔ اس کا فربہ اندام وکیل بھی پریشان نظر آنے لگا۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹے سرکار! میں معافی چاہت ہوں۔ ایک عام اپرادھی کے لیے تو شاید یہ سزا مناسب ہو مگر کنور بابو آسائش میں رہن سہن کے عادی ہیں۔ اس لیے ان کے لیے یہ سزا بہت کڑی ثابت ہووے گی۔ آپ جانت ہیں، وہ کافی دیر بعد میعادی بخار سے صحت یاب ہوئے ہیں۔ ان کے دوبارہ بیمار پڑنے کا خدشہ ہوگا۔''

چھوٹے سرکار نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''تمہاری یہ دلیل بالکل بے کار ہے۔ اپنے رہن سہن کی وجہ سے کنور کو یہ سزا زیادہ کڑی محسوس ہووے گی تو ہونی بھی چاہیے۔ کیونکہ اسی رہن سہن اور مرتبے کی وجہ سے کنور پر زیادہ ذمے داری بھی لاگو ہوتی تھی۔ ایک عام بندہ چوری کرتا ہے تو اس کے اپرادھ کی حیثیت اور ہے لیکن ایک پنڈت، پادری یا امام مسجد کے اپرادھ کی حیثیت اور ہے۔''

اس موقع پر کسان کی اشک بار بیوی دو قدم آگے آئی۔ اس کے مفلس چہرے پر اب قدرے اطمینان دکھائی دیتا تھا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''ہم آپ کے چاکر ہیں۔ آپ کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں۔ ہمری ہر شے پر آپ کا ادھکار ہے۔ کنور بابو نے جان بوجھ کر تو کچھ نہیں کیا۔ جو ہوا وہی اللہ کو منظور تھا۔ میں آپ کے انصاپھ سے بہت کھس (خوش) ہوں جی۔ اس کے ساتھ ہی آپ سے بنتی کرتی ہوں کہ کنور بابو کی جیل والی سجا معاپھ کر دی جائے۔ میں اور عبداللہ آپ کو دعائیں دیں گے جی۔''

عبداللہ اس عورت کے گھر والے کا نام تھا۔ عورت کی بات سن کر چھوٹے سرکار کے سرخی مائل چہرے پر ناگواری کا سایہ لہرا گیا۔ بہر حال جب وہ بولا تو اس کی آواز نارمل ہی تھی۔ اس نے عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم یہ سمجھت ہو کہ دس ہزار روپیہ اور بیلوں کی جوڑی دینا کنور بہادر کے لیے ایک بڑی سزا ہے تو تم غلطی پر ہو۔ اس سے پانچ دس گنا کا خسارہ بھی وہ آسانی سے برداشت کر سکت ہے۔ اس کی اصل سزا وہی ہے جسے تم معاف کرنے کا کہہ رہی ہو۔ یہ سزا اس کو ہر صورت جھیلنا پڑے گی۔''

عورت نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر اظہارِ خیال کی جرأت نہ کر سکی۔

بہرطور سائلہ عورت کا دل رکھنے کے لیے چھوٹے سرکار نے کنور کی سزا میں دو ہفتے کی تخفیف کر دی۔ کنور کو باوردی اہلکار باہر لے گئے۔ عورت بھی اپنے بچے سمیت باہر چلی گئی۔ چند سیکنڈ بعد میں نے سلطانہ کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے عقب میں گونگا ہاشو تھا۔ دونوں کے رنگ اُڑے ہوئے تھے۔ جلد ہی سلطانہ کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں التجا کا رنگ اُبھرا۔ وہ جیسے بےزبان خاموشی مجھ سے التجا کر رہی تھی کہ میں اس کے حوالے سے اپنا بیان بدل لوں۔ سلطانہ کے ساتھ ہی تین افراد مزید اندر داخل ہوئے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ حکم جی کے لوگ تھے اور زرگاں سے سلطانہ کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ ان میں سے ایک شخص کی ٹھوڑی غیر معمولی طور پر چوڑی تھی اور وہ کافی غصے میں بھی نظر آتا تھا۔ جب اس کی نظر مجھ سے ملی تو اس نے مجھے گھورا اور بڑبڑانے والے انداز میں کچھ کہا۔ باقی دونوں افراد کے تاثرات بھی ایسے ہی تھے لیکن میرے حافظے میں ان تینوں کے لیے کوئی شناخت موجود نہیں تھی۔

اہلکار میری طرف بڑھے اور انہوں نے مجھے بھی چھوٹے سرکار کے عین سامنے چبوترے کے پاس کھڑا کر دیا۔ مقدمے کی سماعت شروع ہوئی تو موقع پر موجود لوگوں نے زبردست دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ چھوٹے سرکار کی گہری سیاہ آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ اس نے بڑے غور سے پہلے میری طرف اور پھر سلطانہ کی طرف دیکھا۔ اپنے سامنے تپائی پر رکھے ہوئے کاغذات کا مطالعہ کیا۔ یقیناً یہ کاغذات ہمارے اس مقدمے کے حوالے سے ہی تھے۔

کچھ دیر بعد اس نے کاغذات سے سر اُٹھایا اور چوڑی ٹھوڑی والے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''موہن کمار! تم اس معاملے کے بارے میں کیا کہنا چاہت ہو؟''

موہن کمار نے کہا۔ ''چھوٹے سرکار! میں کوئی لمبی چوڑی بات کرنا نا ہیں چاہت ہوں۔ یہ بالکل صاف سیدھا معاملہ ہے۔ سلطانہ نام کی یہ لڑکی اپرادھن ہے۔ اس نے آپ کے بڑے بھائی حکم جی کی پتنی اور آپ کی بھاوج رتنا دیوی کو گھائل کیا ہے۔ اس نے ان سے سخت بدتمیزی کی پھر جھگڑا کیا اور ہاتھ چلا کر ان کا جبڑا توڑ دیا۔ اب وہ کچھ بول سکت ہیں، نہ کھا پی سکت ہیں۔ شاید ان کو جان سے ہی مار ڈالتی مگر رتنا دیوی کی سکھیوں نے اسے روک لیا۔ اس واقعے کے فوراً بعد یہ غائب ہو گئی۔ دو دن تک پتا نا ہیں کہاں اور کس کے پاس رہی۔ پھر اپنے اس چھوٹے پتی کو لے کر یہاں نل پانی آ گئی ہے اور بات صرف اتنی ہی نا ہیں ہے چھوٹے سرکار! وہاں زرگاں میں ہر کوئی جانت ہے کہ سلطانہ کا چال چلن ٹھیک نا ہیں ہے۔ یہ مہروز کو

اپنا پتی کہتی ہے لیکن سب جانت ہیں کہ مہروز ایک مخبوط الحواس بندہ ہے۔ سلطانہ کے لیے بس یہ نام کا پتی ہے۔ اس نے یارانے پالے ہوئے ہیں۔ اس کے بچے کا پتا بھی نہ جانے کون ہے اور اگر......''

''چھوٹے سرکار! یہ مجھ پر جھوٹے الجام لگا رہے ہیں جی۔'' سلطانہ دلیری سے بات کاٹ کر بولی۔ اس کی سرخ آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے کہا۔ ''یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے کہ جارج گورا صاحب مجھ پر گندی نجر ڈالتا ہے۔ اس کی نیت میرے بارے میں ٹھیک نا ہیں ہے۔ شروع سے ٹھیک نا ہیں ہے اور حکم جی صاحب! گورا صاحب کی ہر بات مانتا ہے۔ پنڈت مہاراج بھی ان کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ان لوگاں نے ہماری جندگی حرام کی ہوئی ہے۔ میں سچ کہتی ہوں جی کہ میں کل گورا صاحب کی بات مان لوں تو کل اچ سب کچھ ٹھیک ہو جائیں گا۔ مجھ پر برا الجام ختم ہو جائیں گا۔ ساری مصیبتیں دور ہو جائیں گا۔''

چھوٹے سرکار نے سلطانہ کی آہ و بکا کا کچھ زیادہ اثر نہیں لیا۔ وہ دھیان سے اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے چوڑے جبڑے والے موہن کمار نامی شخص سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''موہن کمار! ہم جانت ہیں کہ پندرہ سولہ برس پہلے اس لڑکی کی ماتا نے بڑی دلیری دکھاتے ہوئے، جنگل میں بڑے بھائی جی کی جیون رکھشا کی تھی۔ اس طرح سے اس پریوار کا ہمارے اوپر ایک احسان بھی ہے۔ ہمیں بہت نراشا ہو رہی ہے کہ اسی پریوار کی ایک لڑکی کے اوپر اتنے کٹھور الزامات لگ رہے ہیں۔''

موہن کمار بولا۔ ''چھوٹے سرکار! آپ بالکل ٹھیک کہوت ہیں لیکن یہ چھوری اپنی ماتا پر نا ہیں گئی، اس کے بالکل اُلٹ گئی ہے۔ اس کو بہت برداشت کیا گیا، پر اب پانی سر سے گزر گیا ہے۔ یہ اسٹیٹ کی باغی بن چکی ہے۔ خود قانون توڑت ہے اور چاہت ہے کہ دوسرے بھی ایسا کریں۔ اس کو جو ڈھیل دی جاتی رہی، اس کا اس نے ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ یہاں تک کہ حکم جی کی پتنی رتنا دیوی سے بھی ورودھ کرنے لگی بلکہ ان سے یدھ چھیڑ دیا۔''

چھوٹے سرکار اچانک میری طرف گھوما اور بارعب آواز میں بولا۔ ''تمہارے بارے میں کہا جاوت ہے کہ تم سلطانہ کے پتی ہو؟ کیا تم یہ بات مانت ہو؟''

میرا سر چکرا گیا۔ ایک بار پھر آنکھوں کے سامنے لال پیلی چنگاریاں اُڑنے لگیں۔ میں سیڑھیوں پر سے اُترتا ہوا سیاہی مائل فرش کی طرف جا رہا تھا۔ اس سے آگے کچھ یاد نہیں تھا۔ چند ہی لمحوں میں میرے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس عدالت میں موجود ہر فرد میری طرف دیکھ رہا ہے۔ ان میں سلطانہ اور غنی صاحب بھی شامل تھے۔ غنی صاحب کی

آنکھوں میں بھی وہی ڈری ڈری التجا تھی جو کچھ دیر پہلے سلطانہ کی آنکھوں میں نظر آئی تھی۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ میں سلطانہ کو اپنی بیوی اور اس کے بچے کو اپنا بچہ مان لوں۔ میرا گلا خشک ہو گیا اور زبان کو تالا سا لگ گیا۔ میں نے بے بسی سے چھوٹے سرکار کے بارعب چہرے کی طرف دیکھا۔ میری آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ نہ جانے کیوں ان لمحوں میں مجھے پھر عمران یاد آ گیا۔ کاش وہ اس وقت یہاں موجود ہوتا۔ وہ میری طرف سے بولتا۔ اس کے پاس تو ہر سوال کا بے مثال جواب موجود رہتا تھا۔ اس کے پاس تو ہر دلیل کا توڑ ہوتا تھا۔ وہ سچ بول کر تو قائل کرتا ہی تھا، جھوٹ بول کر بھی لاجواب کر دیتا تھا۔

موہن کمار نے بلند آواز سے کہا۔ ''یہ کچھ ناہیں بولے گا چھوٹے سرکار! یہ کچھ بولنے کے قابل ہوتا تو سلطانہ اس کو پتی ہی کیوں بناتی؟''

کچھ لوگ مسکرائے اور سرگوشیاں اُبھریں۔ چھوٹے سرکار نے ایک کاغذ پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

''یہ میڈم صفورا کون ہے؟ جسے بعدازاں یہاں اسٹیٹ میں کورتی کا نام دیا گیا؟''

''جناب! اس کا جواب میرے یہ ساتھی گرو راکیش اور حافظ خدا بخش صاحب زیادہ اچھے طریقے سے دے سکت ہیں۔'' موہن نے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

گیروا لباس والے گرو راکیش نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور مؤدب انداز میں بولا۔

''چھوٹے سرکار! یہ صفورا نام کی ناری بھی اسی اپرادھ میں ملوث تھی جس میں یہ مہروز تھا۔ اس کے علاوہ ان کا ایک تیسرا ساتھی ابرار احمد بھی تھا۔ میرا خیال ہے کہ آپ تھوڑا بہت تو جانت ہی ہوں گے۔ یہ...... مہاتما بدھ کی مقدس مورتی کی چوری کا معاملہ تھا۔ کچھ لوگن نے بڑی بے دردی سے مورتی کو پُرانے پگوڈا کے تہہ خانے سے اُکھاڑا اور یہاں سے نکال کر جھانسی پہنچایا۔ جھانسی سے یہ مورتی الٰہ آباد پہنچی اور پھر وہاں سے حیرت انگیز طور پر پاکستان پہنچا دی گئی۔ اس مورتی کو واپس لانے کے لیے ہمارے لوگن کو جو جو کچھ کرنا پڑا، وہ ایک لمبی کتھا ہے۔ اس میں ہمارے کئی لوگن کا جیون گیا۔ وروِدھیوں میں سے بھی کئی مارے گئے۔ بڑے گرو کے حکم کے مطابق کچھ اپرادھیوں کو بندی بنا کر یہاں اسٹیٹ میں لایا جانا ضروری تھا۔ سو ہمارے لوگن نے سرتوڑ کوشش کی اور پانچ چھ کو لے آئے۔ یہ صفورا، ابرار احمد اور مہروز بھی ان میں شامل ہیں۔''

''مگر اس لڑکی سلطانہ اور تمہارے اس اپرادھی مہروز کا ملاپ کیسے ہوا؟'' چھوٹے سرکار کی طرف سے پوچھا گیا۔

''جناب! دستور کے مطابق مہروز کو بھی دوسرے قیدیوں کی طرح بڑے پگوڈا میں قید کی سزا کاٹنی تھی۔ یہ وہاں سزا کاٹ رہا تھا۔ اس لڑکی سلطانہ کے چوبارے سے پگوڈا کا صحن نظر آوت تھا۔ یہ وہاں سے مہروز کو پگوڈا کا کام کاج کرتے دیکھتی رہوت تھی۔ پھر ایک روز پگوڈا کے ایک حصے میں آگ لگ گئی تھی۔ یہ مہروز اور دو تین بندے اس آگ میں پھنس گئے۔ سلطانہ نے مہروز کو آگ سے نکالا تھا اور بعد میں اس کی مرہم پٹی بھی کرتی رہی تھی۔ پھر ایک دن بالکل اچانک زرگاں کے لوگن کو پتا چلا کہ مختار کی بیٹی سلطانہ نے پگوڈا کے جا کر مہروز سے بیاہ کر لیا ہے اور خود کو اس کی پتنی کہہ رہی ہے۔ میں نے سرکار کو بتایا ہے نا کہ اس چھوری نے ہمیشہ وہ کام کیا ہے جس کی وجہ سے کھلبلی مچی ہے اور لوگن نے دانتوں میں انگلیاں دابی ہیں۔ دراصل یہ اپنی اس حیثیت کا فائدہ اُٹھاتی رہی ہے جو سورگ باشی رائے پرتاب بہادر جی نے اسے اور اس کے خاندان کو دی تھی۔ کچھ لوگن کو عزت راس ناہیں آتی، اس کو بھی ناہیں آئی ہے چھوٹے سرکار۔''

اس موقع پر سلطانہ نے آگے بڑھ کر کچھ کہنا چاہا مگر چھوٹے سرکار نے اُنگلی اُٹھا کر اسے فی الحال خاموش رہنے کا حکم دیا۔ وہ موہن کمار اور گرو راکیش سے ایک ساتھ مخاطب ہو کر بولا۔ ''لیکن ہماری بدھی میں یہ بات ناہیں آئی کہ پگوڈا کے اپرادھی کی شادی کو بڑے بھائی صاحب اور دوسرے لوگن نے مان کیسے لیا؟''

موہن کمار بولا۔ ''چھوٹے سرکار! بھگوان ہزاروں ورش آپ کی رکھشا کرے۔ گرو راکیش نے آپ کو بتایا ہے نا کہ اس چھوری نے ہمیشہ اس حیثیت کا فائدہ اُٹھایا ہے جو آپ کے پُرکھوں نے اس پریوار کو دی تھی۔ اس بیاہ کے موقع پر بھی اس چھوری نے ایسا ہی کیا۔ یہ جانت تھی کہ اس کے پاس ایک ٹرپ کا پتا موجود ہے۔ اس ۔ نے وہ پتا پھینکا اور بازی اپنے نام کر لی۔''

''موہن کمار کھل کر بات کرو۔'' چھوٹے سرکار نے کہا۔

''چھوٹے سرکار! سب لوگ جانت ہیں کہ پندرہ سولہ سال پہلے ترائی کے جنگل میں سلطانہ کی ماتا نے حکم جی کا جیون بچایا تھا اور اس کے لیے اپنا بلیدان دے دیا تھا۔ ہمارے سورگ باشی مہاراج پرتاپ بہادر نے اس کے بدلے اس پریوار کو بہت کچھ دیا تھا پھر بھی شاید ان کے من میں تھا کہ ان کی طرف سے کوئی کسر نہ رہ جائے۔ ان جیسا دیالو کسی کے احسان کا بوجھ اپنے سر پر کاہے کو اور کیسے رکھ سکتا تھا۔ شاید آپ بھی جانت ہوں کہ اس سمے مہاراج نے سلطانہ کے پتا مختار کو اپنی خاص مہر دی تھی اور کہا تھا کہ کبھی ضرورت پڑے تو یہ مہر دکھا کر جو

چاہے لے لینا۔"

چھوٹے سرکار نے قدرے چونک کر کہا۔"ہاں...... یہ بات ہم نے بھی سنی ہے۔"

موہن کمار تاسف سے بولا۔"اس چھوری سلطانہ نے مہاراج کی اس مہر کا استعمال کیا اور حکم جی سے اپنی اور مہروز کی جان بخشی کروانے میں کامیاب رہی۔ اس کے لیے حکم جی کو بہت کٹھنائی بھی اُٹھانا پڑی۔ بدھ مت کے ماننے والے بہت سے لوگن حکم جی کے خلاف ہو گئے۔ وہ ہرگز ناہیں چاہت تھے کہ ان کے اپرادھی کو اس طرح معاف کر دیا جائے اور ایک مسلم لڑکی ڈنکے کی چوٹ پر اس کو اپنا پتی بنا لے۔ ایسے لوگن کو رام کرنے کے لیے حکم جی کو بہت کوشش کرنا پڑی۔ بہرحال انہوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے پتا کا دیا ہوا وچن نبھا دیا۔"

اس موقع پر سلطانہ نے پھر بولنا چاہا مگر چھوٹے سرکار کی طرف سے اسے خاموش کر دیا گیا۔ میں ہکا بکا کھڑا تھا۔ میرے بارے میں جو تفصیلی بات چیت ہو رہی تھی، اس کا کوئی سرا میرے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ بس کسی کسی وقت ذہن میں جھما کا سا ہوتا تھا اور لگتا تھا کہ کوئی ٹوٹا پھوٹا منظر یا بکھری ہوئی سی کوئی آواز یاد آ رہی ہے۔ صفورا کے نام نے بھی میرے دماغ میں کھلبلی مچائی تھی اور میرا یہ شک درست ثابت ہوا تھا کہ جس قیدی عورت کا نام کورتی لیا جا رہا ہے، وہ میڈم صفورا ہو سکتی ہے۔

چھوٹے سرکار نے موہن کمار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔"تم اپنی بات جاری رکھو۔"

موہن کمار کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ وہ بولا۔"چھوٹے سرکار! میں پھر وہی بات کہوں گا۔ کچھ لوگن کو عزت راس ناہیں آئی۔ حکم جی اور ہم سب نے بہت کوشش کی کہ یہ لڑکی کسی طرح سنبھل جاوے۔ مگر یہ سنبھلنے کے بجائے اور بھی بگڑتی چلی گئی ہے۔ رتنا دیوی سے اس نے اپنا ورودھ اتنا بڑھا لیا ہے کہ ان کی ہوا پر بھی تلواریں چلاتی ہے۔ حکم جی کے سامنے اب اس کے سوا کوئی چارہ ناہیں کہ وہ اسے قانون کے مطابق سزا دیں۔ ہم آپ سے درخواست کرت ہیں کہ اسے ہمارے حوالے کیا جاوے اور اس کے نمائشی پتی کو بھی تا کہ ہم انہیں حکم جی کے سامنے پیش کر سکیں۔"

میں نے دیکھا کہ سلطانہ کا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔ تاہم وہ چھوٹے سرکار کے حکم کی وجہ سے چپ تھی۔

چھوٹے سرکار اور ان کے ایک مصاحب نے ایک بار پھر اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کو دیکھا۔ تب چھوٹے سرکار نے گہری سانس لیتے ہوئے سلطانہ کو مخاطب کیا۔"کیا یہ بات درست ہے کہ تم اپنے گھر کے چوبارے سے پگوڈا کے صحن میں تا کا جھانکی کرتی رہتی

تھیں اور تم نے وہاں سزا کاٹتے ہوئے مہروز سے آنکھ لڑا رکھی تھی۔"

"یہ بالکل غلط ہے چھوٹے سرکار! ان لوگاں نے جو کچھ کہا ہے وہ سب جھوٹ کا پلندا ہے۔ اس میں کچھ بھی سچ ناہیں۔" وہ بے حد جوش سے بولی۔

چھوٹے سرکار نے اسے ٹوکا۔"ہم جو کچھ تم سے پوچھ رہے ہیں بس اس کا جواب دو۔ کیا بیاہ سے پہلے مہروز سے تمہارا کوئی ناتا تھا؟"

"ناہیں سرکار! میں بالکل سچ کہتی ہوں۔ میں اس کو اپنے گھر کی چھت پر سے دیکھتی جرور تھی اور میں کوئی اکیلی اچ ناہیں دیکھتی تھی اور بھی اڑوس پڑوس کے لوگاں دیکھتے تھے۔ اس کی اور دوسرے دو قیدیوں کی حالت بہت پتلی تھی۔ ان کے پاؤں میں رسّی کی بیڑیاں رہتی تھیں۔ یہ سارا دن پگوڈا کے کام کرتے تھے۔ جھاڑ پونچھ کرتے تھے، فرش دھوتے تھے، نالیاں صاف کرتے تھے۔ بڑے بھکشوؤں کی مٹھی چاپی اور خدمت بھی ان کا اچ کام تھا۔ ان کو بس دوپہر کے وخت کھانا ملتا تھا اور وہ بھی یہ مانگ کر لاتے تھے۔ شام سے جرا پہلے ان کو پگوڈا کی سیڑھیوں کے سامنے جہاں لوگاں کی کھڑانویں اور جوتیاں پڑی رہتی تھیں اوندھا لٹایا جاتا اور بید مارے جاتے تھے۔ دونوں مردوں کو دس دس، عورت کو چھ۔ چھوٹے سرکار! دوسروں کی طرح مجھے بھی ان تین لوگاں پر ترس آیا تھا۔ اس وخت مہروج مجھے اپنے ایک مسلمان بھائی کی طرح لگتا تھا۔ ایک ایسا بھائی جو اپنے وطن سے دور ایک سخت مصیبت میں پھنسا ہوا تھا۔"

"لیکن پھر ایک دن تم نے اچانک اس سے شادی کر لی اور اس شادی کو بچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور بھی لگایا؟" چھوٹے سرکار نے سوال کیا۔

وہ اشک بار لہجے میں بولی۔"چھوٹے سرکار! مجھے آپ کے انصاف پر پورا اعتبار ہے۔ لیکن سرکار! ابھی تک آپ کے سامنے اس تصویر کا بس ایک اچ رُخ ہے اور یہ بالکل غلط رُخ ہے۔ زرگاں میں جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرے والد نے اچانک میری شادی مہروج سے کیوں کی؟ اس کے پیچھے کیا وجہ تھی؟ اس کے پیچھے بس ایک اچ وجہ تھی چھوٹے سرکار! میرے گھر والے میری عجت بچانا چاہتے تھے۔"

موہن کمار بھڑک کر بولا۔"یہ معاملے کو اُلجھانے کی کوشش کرت ہے چھوٹے سرکار......"

"دیکھو موہن کمار! تمہاری پوری بات سنی گئی ہے۔ اب مجھے اس سے اپنے سوالوں کا جواب لینے دو۔" چھوٹے سرکار نے موہن کمار کو ٹوکا۔ پھر اس نے اشک بار سلطانہ کو بات جاری رکھنے کا کہا۔

سلطانہ بولی۔ ''یہ بات کوئی ڈھکی چھپی ناہیں ہے جی! جارج گورا اس راجواڑے کی عورتوں پر گندی نجر ڈالتا ہے۔ اس نے تین چار برس پہلے مجھ پر بھی گندی نجر ڈالی اور اس کی یہ نجراب بھی جوں کی توں ہے۔ آپ جانتے ہیں، وہ ہندی بول لیتا ہے۔ ایک بار اس نے مجھ سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر میں اس کی پتنی بننے پر راجی ہو جاؤں تو وہ ہر طرح کے غلط کام ایک دم چھوڑ دے گا۔ میں جانتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس طرح کی بات اس نے اس سے پہلے بھی کئی عورتوں سے کہی ہوئے گی اور وہ عورتیں میری طرح عام نہیں ہوئیں گی، بڑی بڑی خوبصورت ہوئیں گی۔ یہ عورت باج (عورت باز) بندے تو ایسے اچ ہوتے ہیں۔''

''یہ ہزمیجسٹی کی شان میں گستاخی کر رہی ہے چھوٹے سرکار!'' خدا بخش نے بھڑک کر کہا۔ ''یہ ثبوت کے بغیر الزام لگاوت ہے۔''

چھوٹے سرکار نے سلطانہ کو تنبیہہ کی۔ ''تم غلط لفظ استعمال ناہیں کرو اور اپنے جواب کو صرف اس تک رکھو کہ تمہارا بیاہ اچانک مہروز سے کیوں ہوا؟''

سلطانہ نے اوڑھنی سے آنسو پونچھے اور بچے کو کندھے سے لگاتے ہوئے بولی۔

''چھوٹے سرکار! میں نے گورا صاحب کو صاف انکار کر دیا تھا، پر اس نے کبھی بھی میرا پیچھا ناہین چھوڑا۔ وہ حکم جی کو میرے خلاف بھڑکاتا رہا اور مجھے پانے کی تدبیریں سوچتا رہا۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حکم جی بھی اس کی باتوں میں آ گئے۔ بلکہ پوری طرح اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ یہ دو سال پہلے کی بات ہے۔ ساتویں کا جشن آنے والا تھا۔ آپ جانتے اچ ہیں، ساتویں کے جشن میں راج بھون کے اندر خاص انتجام کیے جاتے ہیں۔ پُرانے رواج کے مطابخ سات رنگوں کے لیے سات لڑکیاں چنی جاتی ہیں۔ ان کو فیریوں یا پریوں کا خطاب دیا جاتا ہے۔ ایک وخت تھا جی کہ جب کسی بھی لڑکی کے لیے پری بننا اور راج بھون میں جگہ حاصل کرنا بڑی عجت کی بات ہوتی تھی۔ اس کا جیون سنور جاتا تھا مگر اب وہ پہلے والی بات کہاں رہی ہے جی۔ سب جانتے ہیں کہ وہاں کیا ہونے لگا ہے۔ پھر بھی بے شمار لڑکیاں ہیں جو ''پری'' بن کر راج بھون میں جانے کے سپنے دیکھتی ہیں۔''

''تم اپنی بات کو صرف اپنے جواب کی حد تک رکھو۔'' چھوٹے سرکار نے اسے ٹوکا۔

''معافی چاہتی ہوں سرکار! میں ساتویں کے جشن کی بات کر رہی تھی۔ راج بھون کی کچھ عورتیں مجھے یہ خوشخبری سنانے آئیں کہ میرا نام اس سال چنی جانے والی سات لڑکیوں میں لیا جا رہا ہے۔ بہت آشا ہے کہ میں چن لی جاؤں گی۔ چھوٹے سرکار! میں جان گئی کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میں دُکھ کے سمندر میں ڈوب گئی۔ مجھے پتا چلا کہ مجھے صرف

اور صرف گورا صاحب کے لیے راج بھون میں لے جایا جا رہا ہے۔ میں وہاں صرف گورا صاحب کی رکھیل بن کر رہ جاؤں گی۔ میں نے اور میرے گھر والوں نے فیصلہ کیا کہ ہم ایسا ناہیں ہونے دیں گے۔ مجھے سات لڑکیوں میں چن لیا گیا۔ میرا رنگ ''لال'' تھا مگر جس رات حکم جی کے آدمیوں نے میرے ماتا پتا سے چناؤ کی رسمی اجاجت لینے کے لیے آنا تھا، دوپہر کے وخت میرے پتا نے مہروج سے میرا بیاہ کر دیا۔ یہ پہلے سے پتا جی کا منصوبہ ناہیں تھا، اس وخت کوئی بھی مسلمان لڑکا مل جاتا اور راجی ہو جاتا تو میرے پتا نے اس سے میرا نکاح پڑھوا دینا تھا۔ آپ جانتے اچ ہیں کہ بیاہتا لڑکی راج بھون کی پری ناہیں بن سکتی۔ میں بھی پری بننے سے بچ گئی لیکن اس کے بدلے میں حکم جی کا غصہ جھیلنا کوئی آسان کام ناہیں تھا۔ ہم سب جانتے تھے کہ ہمارے ساتھ بہت مشکل ہوئیں گا۔ تب پتا جی نے فیصلہ کیا کہ وہ اس مشکل وخت سے گجرنے کے لیے مہاراج پرتاپ بہادر جی کی دی ہوئی مہر سے کام لیں گے۔''

موہن کمار نے بے حد بے چینی سے اپنی چوڑی ٹھوڑی کو کھجایا اور بولا۔ ''گستاخی معاف چھوٹے سرکار! یہ چھوری اپنی چرب زبانی سے معاملے کو اُلجھانا چاہت ہے۔ یہ ہماری توجہ اصل صورتِ حال سے ہٹا رہی ہے۔ کوے کو سفید کہنے سے وہ سفید ناہیں ہو جاتا۔ سارا زرگاں جانت ہے کہ یہ ٹھیک عورت ناہیں ہے۔ اپنے کالے کرتوت چھپانے کے لیے یہ دوسروں پر گھناؤنے الزام لگاتی ہے اور جب اس کا جواب دیا جاوت ہے تو مرنے مارنے پر اُتر آتی ہے۔ رتنا دیوی جی کے ساتھ بھی اس کا جھگڑا ایسے ہی شروع ہوا تھا۔ اس نے ان کے رتبے کا خیال کیے بغیر پہلے منہ ماری کی پھر ہاتھا پائی پر اُتر آئی......''

''یہ بھی بالکل جھوٹ ہے سرکار! میں بڑی سے بڑی خسم کھانے کو تیار ہوں۔ میں نے رتنا دیوی سے کچھ ناہیں کہا۔ میرا اور ان کا بھلا کیا جوڑ؟ میں ایک نصیبوں ماری بے سہارا لڑکی، وہ راج بھون کی رانی۔ میں تو ان سے اپنی جان بچاتی پھرتی تھی۔ پر وہ کسی صورت مجھے شما کرنے کو تیار ناہیں تھیں۔ میں پنگھٹ پر پانی بھر رہی تھی۔ وہ وہاں اپنی سکھیوں کے ساتھ سیر کرنے آئی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے ایک ایسی گندی بات کہی جو ان کی جبان کو ہرگج جیب ناہیں دیتی تھی۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ اتنے بڑے منہ سے اتنی چھوٹی بات مت کہیں۔ بس وہ اسی بات پر بھڑک گئیں اور پالکی چھوڑ کر مجھ پر کود پڑیں۔ انہوں نے مجھ سے ہاتھا پائی کی اور پھر اپنے جور میں خود ہی پھسل کر پنگھٹ کی سیڑھیوں سے گریں۔ ان کو جو چوٹ آئی، وہ اپنی وجہ سے آئی۔ وہاں بہت سوں نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا لیکن میں جانتی ہوں کہ

اب کسی میں اتنی ہمت ناہیں ہوگی کہ وہ اس بات کی گواہی دے۔ آپ جانتے ہیں، یہاں کمزور کا ساتھ کوئی ناہیں دیتا چھوٹے سرکار! وہ سچ بول کر بھی ہارتا ہے۔ جور والا جھوٹ بول کر بھی جیت جاتا ہے......'' آخری الفاظ کہتے کہتے سلطانہ کی آواز بھرا گئی اور وہ اپنے بچے کو کندھے سے لگا کر سسکنے لگی۔ اس کے بالوں کی لمبی لمبی لٹیں اس کی اوڑھنی سے نکل کر اس کے چہرے پر جھول رہی تھیں۔

حافظ خدا بخش نے کہا۔ ''یہ اپنے گناہوں پر پردہ ڈال رہی ہے جی! اصل میں اس نے مہروز جیسے دیوانے سے بیاہ کیا ہی اس لیے تھا کہ یہ اپنے کرتوتوں کو چھپانا چاہت تھی۔ ہم سب جانت ہیں کہ یہ ہرجائی ہے۔ اس کے کئی یارانے ہیں۔ باپ بوڑھا ہو چکا ہے۔ بھائی بہت عرصے سے بیمار پڑا ہے۔ اس کو کسی کا ڈر خوف ناہیں ہے......''

''یہ جھوٹ ہے...... الجام ہے۔'' سلطانہ چلائی۔ ''میں ان سب لوگاں کو جانتی ہوں۔ یہ حکم جی کے خاص بندے ہیں۔ ان کے منہ میں حکم جی کی جبان ہے......''

اس دوران میں غنی صاحب نے بھی دبے لہجے میں سلطانہ کی حمایت میں چند فقرے بولے۔ انہوں نے کہا کہ ایک ایسی لڑکی پر جو ماں بھی ہے، کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر ایسے سنگین الزام نہیں لگائے جانے چاہئیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس لڑکی کے گھرانے کو کسی حد تک جانتے ہیں۔ وہ عزت دار، سچے اور نڈر لوگ ہیں۔ اگر ان کی لڑکی واقعی بدچلن ہوتی تو وہ کبھی چپکے نہ بیٹھے رہتے۔

چھوٹے سرکار نے دونوں طرف کا مؤقف وضاحت سے سنا اور چند مزید سوالات کیے۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ تب تک میں فیصلہ کر چکا تھا۔ جب چھوٹے سرکار نے مجھ سے پوچھا کہ میں سلطانہ کو اپنی بیوی تسلیم کرتا ہوں یا نہیں تو میں نے اس کا جواب اثبات میں دیا اور کہا۔ ''میں اپنی غلط بیانی کی معافی چاہتا ہوں۔ کل میں پوری طرح اپنے حواس میں نہیں تھا۔ سلطانہ کے ساتھ میرا بیاہ ہو چکا ہے۔ اس کی گود میں جو بچہ ہے، وہ میرا ہی ہے۔''

''اس بات کا پتا کیسے چلے گا کہ تم کل اپنے حواس میں ناہیں تھے یا آج حواس میں ناہیں ہو؟'' چھوٹے سرکار نے کہا۔

''میں جو کہہ رہا ہوں، درست ہے چھوٹے سرکار! یہ میری بیوی ہے، یہ میرا بچہ ہے۔ میری بب...... بیوی پر جھوٹے الزام لگائے جا رہے ہیں۔ یہ گھر گرہستن ہے۔ یہ پوری طرح میری وفادار ہے۔ یہ حکم جی اور ان کے دوست کی بدنیتی ہے۔ وہ ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے ظلم سے بچنے کے لیے ہم نے زرگاں چھوڑا ہے لیکن یہ لوگ یہاں

بھی ہمارے پیچھے ہیں۔ اگر...... اگر آپ نے ہمیں ان کے حوالے کر دیا تو ہمیں بے عزت کر کے مار دیا جائے گا چھوٹے سرکار......'' میں بولتا چلا گیا۔ حالانکہ میں کچھ نہیں جانتا تھا کہ زرگاں کہاں ہے؟ حکم جی کون ہے؟ میری شادی کب ہوئی تھی؟ لیکن میں خود کو ذہنی طور پر باور کرا چکا تھا کہ زرگاں موجود ہے۔ حکم جی، گورا صاحب اور ان کی بدنیتی بھی موجود ہے اور سلطانہ سے میری شادی بھی ہو چکی ہے۔ یہ سب کچھ میری یادداشت کے پردے پر موجود نہیں تھا لیکن اس کے بارے میں اب اتنے ثبوت موجود تھے کہ میں اسے جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ میں نے اب اپنی یادداشت کے بجائے ان ثبوتوں پر بھروسہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

''یہ صحیح الدماغ بندہ ناہیں ہے سرکار! اس کی کسی بات پر بھروسہ ناہیں کیا جا سکتا۔'' موہن کمار نے احتجاج کیا۔

چھوٹے سرکار نے اسے خاموش رہنے کا حکم دیا اور مجھے اپنا بیان جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔ میرے بیان کے مثبت اثرات چھوٹے سرکار کے چہرے پر نظر آنے لگے تھے۔ انہیں کم از کم اتنا یقین تو ہو رہا تھا کہ میں سلطانہ کو بیوی مان رہا ہوں اور میرے نزدیک وہ وفادار ہے۔ اب تک کی سماعت کے دوران میں مجھے اندازہ ہوا تھا کہ چھوٹے سرکار کے دل میں سلطانہ اور اس کے بچے کے لیے نرم گوشہ موجود ہے اور وہ انہیں پناہ دینا چاہتا ہے۔ تاہم اس کے لیے وہ قانونی تقاضے بھی پورے کرنا چاہتا تھا۔ میرا بیان سننے کے بعد اس نے بڑی ذہانت سے موہن کمار اور گرورا کیش سے چند ایسے سوال کیے جن سے ان کے بیانوں میں تضاد پیدا ہوا۔ جارج گورا کی ناپسندیدہ مصروفیات کے بارے میں بھی چھوٹے سرکار نے موہن کمار سے چند چبھتے ہوئے سوالات کیے۔ اس موقع پر ایسا نظر آنے لگا کہ اس مقدمے کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا اور ہمیں گونگے باشوسیت نل پانی میں پناہ دے دی جائے گی۔ کم از کم عارضی پناہ تو ضرور مل جائے گی جسے بعد ازاں مستقل کیا جا سکے گا۔

لیکن پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے اچانک سب کچھ اُلٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ ایک فربہ اندام شخص جو اپنے حلیے سے چوب دار نظر آتا تھا، داخل ہوا۔ اس نے چھوٹے سرکار کے قریب جھک کر سرگوشیوں میں کوئی بات کی۔ چھوٹے سرکار کا چہرہ متغیر نظر آیا۔ انہوں نے گہری نظروں سے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ دھیمی آواز میں اپنے مصاحبین کے ساتھ چھوٹے سرکار کا مختصر مکالمہ ہوا۔ اس کے بعد چھوٹے سرکار نے ایک باوردی اہلکار کو کچھ ہدایات دیں۔ وہ باہر چلا گیا۔ وہ کوئی سینئر اہلکار تھا۔ اس کے ساتھ دو تین معزز افراد بھی باہر گئے۔ حاضرین مدھم آوازوں میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ چار پانچ منٹ بعد سینئر اہلکار واپس آیا۔ اس کے ساتھ

عقب میں دو اور افراد بھی تھے۔ ان میں سے ایک بوڑھا تھا، دوسرا نوجوان۔ یہ دونوں رو رہے تھے۔ ان کی پگڑیاں گلے میں پڑی تھیں۔ سینئر اہلکار نے چھوٹے سرکار کے رُوبرو تعظیم پیش کرنے کے بعد کہا۔ ''جناب! میں نے خود ملاحظہ کیا ہے۔ لاش قریباً دو دن پُرانی ہے۔ سر کے پچھلے حصے میں کلہاڑی کا گہرا گھاؤ آیا ہے۔ مقتول کے ہاتھ پیچھے کی طرف موڑ کر ایک پُرانے ازار بند سے باندھے گئے ہیں۔''

''لاش کہاں سے ملی ہے؟'' چھوٹے سرکار نے سوال کیا۔

''کچے کی دوسری طرف...... جہاں پچھلے سال جنگل میں آگ لگی تھی۔ وہاں ایک کھوہ سے نکلی ہے۔ مرنے والے کا نام ہارون بتایا جارہا ہے۔ یہ حکم جی کے ان سپاہیوں میں شامل تھا جو سلطانہ کی تلاش میں اس کے پیچھے آئے تھے۔''

میرے سر میں دھماکا سا ہوا۔ کھوہ میں ہونے والی لڑائی کے مناظر میری نگاہوں میں گھوم گئے۔ میں نے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی زرد ہو رہا تھا۔ شاید وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ ایک بڑی مصیبت میں پھنس گئی ہے۔

جب ہم کھوہ میں ہارون نامی اس رائفل بردار کو باندھ رہے تھے تو وہ بے ہوش تھا۔ لیکن اس کی بے ہوشی ایسی گہری نہیں تھی اور نہ ہی اس کا زخم اتنا سنگین تھا کہ فوری طور پر اس کی موت واقع ہو جاتی۔ لیکن یہ ہو گیا تھا اور اب ہارون کے ساتھی اس کی لاش لے کر دہائی دیتے ہوئے یہاں پہنچ گئے تھے۔

ایک باوردی اہلکار نے سلطانہ کے جھولے میں سے وہ رنگین دستے والی کلہاڑی نکال لی جس سے ہارون کے سر پر وار کیا گیا تھا۔ صفاچٹ چہرے والے سینئر اہلکار نے اس کلہاڑی کو بغور دیکھا اور پھر اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ ''جی چھوٹے سرکار! میرے خیال میں یہی وہ کلہاڑی ہے جس سے مقتول کو چوٹ لگائی گئی ہے۔''

پھر اس سینئر اہلکار نے جھولے میں سے وہ رائفل بھی نکال لی جو لڑائی سے پہلے مقتول ہارون کے ہاتھ میں تھی۔ رائفل کو دیکھتے ہی بوڑھا شخص پکار اُٹھا۔ ''جی ہاں سرکار! یہ میرے بیٹے کی ہی بندوق ہے۔ میں اس کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ یہ قاتلہ ہے۔ یہ ڈائن ہے۔ یہ میرے بیٹے کو کھا گئی ہے۔'' بوڑھا آہ و بکا کرنے لگا۔

سلطانہ نے کہا۔ ''چھوٹے سرکار! میں نے کسی کو نہیں مارا۔ میں نے تو صرف خود کو اور اپنے شوہر کو بچانا چاہا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی سرکار! اگر میں اس کو کلہاڑی سے چوٹ نہ لگاتی تو وہ مجھے اور مہرو ج کو بھون کر رکھ دیتا۔''

چھوٹے سرکار نے اس مرتبہ سلطان کی سنی اَن سنی کر دی۔ اس نے صفاچٹ سر والے اہلکار سے پوچھا۔ ''منوج! اس رائفل کے بارے میں سلطانہ نے اس سے پہلے کیا بیان دیا تھا؟''

اہلکار بولا۔ ''سرکار! یہ کہوت تھی کہ یہ اس کے پتاجی کی رائفل ہے۔ یہ اپنی رکھشا کے لیے ساتھ لائی ہے۔''

موہن کمار پکار کر بولا۔ ''میں نے کہا ہے نا سرکار! کہ یہ پرلے درجے کی جھوٹی اور مکار ہے۔ یہ اپنی ڈگر پر اتنا آگے چلی گئی ہے کہ اس کے لیے واپس آنا ممکن نا ہیں ہے۔ یہ بہت خطرناک ہو چکی ہے۔ سرکار۔'' موہن کمار کے لہجے میں نئی توانائی آ گئی تھی اور بات صرف موہن کمار ہی کی نہیں تھی۔ ان سب لوگوں کے چہرے دمکنے لگے تھے جو سلطانہ کے پیچھے یہاں آئے تھے۔

اس واقعے کے بعد صرف پانچ دس منٹ کے اندر اندر اس کیس کا فیصلہ ہو گیا۔ چھوٹے سرکار نے سلطانہ اور اس کے بچے کو ان لوگوں کے حوالے کر دیا جو اسے لینے کے لیے یہاں آئے تھے۔ سلطانہ کے ساتھ ساتھ مجھے اور ہاشو کو بھی ان لوگوں کی تحویل میں دے دیا گیا۔ یہ فیصلہ سناتے ہوئے چھوٹے سرکار راجیت رائے کے لہجے میں افسردگی کی جھلک موجود تھی۔ اس جگہ موجود بیشتر مقامی لوگ بھی اس صورتِ حال سے مایوس تھے۔ اس فیصلے میں غنی صاحب اور ڈاکٹر چوہان کو سرزنش بھی کی گئی اور ان سے کہا گیا کہ وہ باہر سے آنے والے کسی بھی شخص کو پناہ دینے سے پہلے اس کے بارے میں چھان بین کریں۔

اب ہم واپس جارہے تھے۔ انہی راستوں پر سفر کرتے ہوئے جن پر سفر کر کے یہاں نیلے پانی کی خوبصورت جھیل پر پہنچے تھے۔ ہمارا قافلہ قریباً بارہ افراد پر مشتمل تھا ان میں موہن کمار، گرو راکیش مودان اور حافظ خدا بخش بھی شامل تھے۔ سب لوگ گھوڑوں پر سوار تھے۔ میں، سلطانہ اور ہاشو بھی گھوڑوں پر تھے۔ ہم تینوں کے گھوڑوں کی لگامیں آپس میں باندھ دی گئی تھیں اور پھر انہیں ایک چوتھے گھوڑے سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ یہ موہن کمار کا گھوڑا تھا۔

ہارون کی لاش لکڑی کے ایک سیل بند تابوت میں رکھی گئی تھی۔ اس تابوت کو ایک توانا خچر کے پہلو سے باندھا گیا تھا۔ وزن برابر رکھنے کے لیے خچر کے دوسرے پہلو سے کچھ سامان وغیرہ باندھ دیا گیا تھا۔ ایک اور خچر پر بھی سامان لدا ہوا تھا۔ یہ کینوس کی تین چار چھولداریاں اور ان کے بانس وغیرہ تھے۔ گھنے درختوں میں ہمارا قافلہ سُست روی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ہمارے ہاتھ وغیرہ نہیں باندھے گئے مگر ہم پر کڑی نظر رکھی جارہی تھی،

خاص طور سے سلطانہ پر۔ ایک رائفل بردار گھڑ سوار مسلسل اس کے پہلو میں چل رہا تھا۔ گاہے بہ گاہے وہ اسے خونخوار نظروں سے گھور بھی لیتا تھا۔ یہ ہلاک ہونے والے ہارون کا بھائی صادق لاکھی تھا۔

موسم خوشگوار تھا۔ نہ زیادہ گرمی نہ سردی مگر سفر تو پھر سفر ہوتا ہے۔ ہم تھک کر شام تک چُور ہو گئے۔ خاص طور سے میرا بُرا حال تھا۔ میں نے کبھی گھوڑے پر سفر نہیں کیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جسم پھوڑا ہو گیا ہے۔ رکابوں میں پاؤں سوج گئے تھے۔ شام سے ذرا پہلے گھنے جنگل میں ایک ہموار جگہ دیکھ کر پڑاؤ ڈالا گیا۔ چار چھولداریاں لگا دی گئیں۔ ان میں ایک کافی بڑی تھی۔ اس میں موہن کمار، گرو راکیش اور خدا بخش نے قیام کرنا تھا۔ ہارون کی لاش والا تابوت بھی اسی چھولداری میں رکھ دیا گیا۔

ابھی چھولداریاں پوری طرح لگی نہیں تھیں، سلطانہ کا بچہ بالو مسلسل رو رہا تھا۔ وہ اسے دودھ پلانا چاہ رہی تھی۔ شاید اتنے مردوں کے سامنے اسے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ چند جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو گئی مگر اس کا یوں جھاڑیوں کی طرف جانا موہن کمار وغیرہ کو پسند نہیں آیا۔ متوفی ہارون کا بھائی صادق بھڑک کر اپنی جگہ سے اُٹھا اور زور سے بولا ''ادھر کہاں جا رہی ہو؟''

''بچے کو دودھ پلانا ہے۔''

''تو ہم تیری ''دودھ پلائی'' کی ویڈیو فلم بنا لیویں گے؟ حرام زادی، نخرے باز، چل واپس آ ادھر۔''

''دیکھو تم فضول میں گالی نکال رہے ہو۔ میں نے تم سے کچھ ناہیں کہا۔''

وہ ایک دم شعلہ جوالا بن گیا۔ ''کتیا...... بدمعاش عورت...... ابھی تُو نے کچھ کہا ہی ناہیں۔ میرے بھائی کی جان لے لی۔ اسے قتل کر دیا اور کچھ کہا ہی ناہیں تُو نے۔ میں تو ہے مار ڈالوں گا۔ مار کے یہیں گاڑ دوں گا۔''

وہ دیوانہ وار سلطانہ پر جھپٹا۔ اس نے رائفل کا کندہ اس کے سینے پر مارا۔ وہ بالو سمیت اُچھل کر کئی فٹ پیچھے گری۔ وہ اس پر بے دریغ ٹھوکریں برسانے لگا۔ وہ لوٹ پوٹ ہونے لگی مگر اپنے بچے کو اس نے اس طرح بانہوں میں چھپایا کہ اپنے جسم کو ڈھال بنا لیا۔

میں نے بیتاب ہو کر اپنی جگہ سے اُٹھنا چاہا مگر ایک رائفل بردار میرے سر پر کھڑا تھا۔

''خبردار...... اپنی جگہ پر بیٹھا رہ...... ورنہ بھیجا اُڑ جاوے گا۔'' وہ پھنکارا۔

اسی دوران میں حافظ خدا بخش آگے بڑھا اور اس نے بپھرے ہوئے صادق لاکھی سے

سلطانہ کی جان چھڑائی۔ وہ مٹی میں لتھڑ گئی تھی اور اس کے ہونٹوں سے خون رسنے لگا تھا۔ دو تین دن پہلے کھوہ کے اندر مقتول ہارون سے ہونے والی لڑائی میں سلطانہ کی قمیص پھٹ گئی تھی اور اس نے کندھے پر گرہ لگا رکھی تھی۔ موجودہ مار پیٹ میں یہ قمیص پھر پھٹ گئی۔ سلطانہ بمشکل اپنی برہنگی چھپانے میں کامیاب ہوئی۔ اس کا چہرہ سرخ انگارہ تھا۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی نظر آتی تھی مگر یہ شیرنی فی الوقت مسلح افراد کے گھیرے میں تھی اور دھاڑنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے صادق کو بے نقط سنائیں۔ اسے شرابی، بدمعاش قرار دیا اور کہا کہ اسے کسی پتھر نے جنم دیا ہے۔ اگر اسے جنم دینے والی گوشت پوست کی ماں ہوتی تو آج وہ ایسی کمینگی کا مظاہرہ نہ کرتا۔

صادق جواب میں گرجا۔ ''کتیا! میں تیری موت کو آسان بنانا ناہیں چاہت ہوں۔ ورنہ ابھی تجھے چیر کر چیل کووں کے لیے پھینک دیتا۔''

چھولداریاں لگ چکی تھیں۔ موہن کمار اور مسلح افراد نے سلطانہ کو دھکیل دھکال کر ایک چھولداری میں داخل کر دیا۔ بالو رو رو کر آسمان سر پر اُٹھا رہا تھا۔ چھولداری کے اندر سے بھی ایک دو منٹ تک اس کی پکار سنائی دیتی تھی۔ پھر اس کے ہونٹوں اور اس کی آہ و بکا کے درمیان اس کی ماں کا جسم حائل ہونے لگا۔ اس کی روتی بلکتی آواز مدھم پڑنے لگی اور پھر معدوم ہو گئی۔

اندھیرا ہوا تو مجھے اور ہاشو کو بھی سلطانہ والے خیمے میں پہنچا دیا گیا اور خیمے کے گرد چار افراد کا کڑا پہرا لگا دیا گیا۔ یہ ایک خالص جنگلی علاقہ تھا۔ جانوروں کا خطرہ بھی ہو سکتا تھا۔ موہن کمار اور اس کے ساتھیوں نے چھولداریوں کے گرد پانچ چھوٹے الاؤ روشن کیے۔ یہ ایک طرح سے اس پڑاؤ کا حفاظتی دائرہ تھا۔

چھولداریوں کے اندر موم بتیوں کی مدھم روشنی تھی۔ اس روشنی میں سلطانہ کے چہرے پر دو گہرے نیل نظر آ رہے تھے۔ اس کے جسم پر بھی یقیناً ایسے ہی نیل ہوں گے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بری طرح پھنس چکی ہے۔ زرگاں پہنچنے کے بعد وہ بدترین حالات کا شکار ہو سکتی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی یا عورت ہوتی تو اس کی حالت پتلی ہو جاتی تھی۔ مگر وہ اب بھی حوصلے میں تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا لیکن یہ طیش آمیز خوف تھا۔

اسے خود چوٹیں لگی ہوئی تھیں لیکن اسے خود سے زیادہ میرے سر کی چوٹ کی فکر تھی۔ میرے منع کرنے کے باوجود اس نے اپنی اوڑھنی سے ایک طویل پٹی پھاڑی۔ پانی سے میرے سر کے زخم کو دھویا اور روئی رکھ کر تازہ پٹی باندھ دی۔

ہم گاہے بہ گاہے، چھولداری کے چھوٹے چھوٹے روشن دانوں سے باہر جھانک لیتے

تھے۔ درختوں پر مشعلیں روشن تھیں اور پہرے دار گشت لگا رہے تھے۔ مشعلوں کا روغن جلنے کی بُو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہماری چھولداری میں بھی آ جاتی تھی۔ وہ لوگ گوشت بھون رہے تھے۔ راستے میں تین بڑے جل مرغ اور چند خرگوش شکار کیے گئے تھے۔ یقیناً یہی شکار پکایا جا رہا تھا۔ ایک چھوٹی نسل کا ہرن زندہ پکڑا گیا تھا۔ وہ بھی ایک الاؤ کے قریب بندھا ہوا تھا۔ غالباً اسے کل کسی وقت استعمال کیا جانا تھا۔ یعنی ہماری طرح وہ ہرن بھی بتدریج راحت سے دور اور اذیت سے قریب ہو رہا تھا۔ اب یہ اذیت کیسی ہوگی، اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ فی الوقت تو ایسا لگتا تھا کہ یہ لوگ مجھے بھی سلطانہ کے ساتھ برابر کا شریکِ جرم سمجھ رہے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہارون کے بھائی صادق نے سلطانہ سے کہا تھا کہ میں تیری موت کو آسان بنانا نہیں چاہتا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے آسانی سے مارا نہیں جائے گا۔ شاید اسے جارج گورا نامی شخص کے حوالے کر دیا جائے یا پھر اسٹیٹ کی جیل میں ڈال دیا جائے۔

ہمیں کھانا دیا گیا لیکن ہم تینوں نے کل ملا کر دس بارہ نوالے ہی لیے ہوں گے۔ سلطانہ نے خود پر جبر کر کے تھوڑا سا زیادہ کھایا۔ اس کے ساتھ اس کے شیر خوار کی خوراک بھی وابستہ تھی۔ چاند درختوں کی اوٹ سے جھلک دکھا رہا تھا۔ گونگا ہاشو کچھ دیر تک گم صم لیٹا رہا پھر سو گیا۔ اب ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ مدھم ہوا چھولداری کی دیواروں کو ہولے ہولے ہلا رہی تھی اور پاس ہی کہیں چکور کی آواز سنائی دیتی تھی۔ سلطانہ نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا اور ہولے سے بولی۔ ''تم پریشان ناہیں ہونا مہروج! ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ کسی کا حق ناہیں مارا۔ اللہ ہمارے ساتھ جرور نرمی والا معاملہ کریں گا۔ تم دیکھنا کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئیں گا اور اگر اللہ کی مرجی نہ ہوئی اور راستہ نہ بھی نکلا تو تم دل چھوٹا نہ کرنا۔ ہم صبر سے اچھے وخت کا انتجار کریں گے۔''

میں خاموش رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ شمع کی روشنی میں سلطانہ کی جلد شفاف اور چمکیلی نظر آتی تھی۔ اس کے بالوں کی طویل لٹیں اس کے چہرے پر جھول رہی تھیں۔ وہ ایک سخت ماحول میں پروان چڑھی تھی۔ اگر یہی لڑکی کسی بڑے شہر میں ہوتی اور اسے زندگی کی آسائشیں حاصل ہوتیں تو وہ ''اچھی صورت'' کی قرار دی جا سکتی تھی۔ اب بھی دھیان سے دیکھنے پر اس میں ایک خاص طرح کی کشش محسوس کی جا سکتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ میں ''بے خبری کے دور میں'' اس لڑکی کے قریب رہا ہوں اور اس کی گود میں میرا بچہ ہے۔ کسی وقت میں سلطانہ کی طرف عجیب طرح کا کھچاؤ محسوس کرتا تھا۔ کیا یہ

وابستگی اسی قربت کا نتیجہ تھی جس کے بارے میں لوگ مجھے بتا رہے تھے اور خود سلطانہ بتا رہی تھی؟

سلطانہ نے ہولے سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''میں نے تمہارے لیے بہت دعائیں مانگی ہیں مہروج! اور ماں جی نے بھی۔ مجھے یقین ہے تمہیں کچھ ناہیں ہوئیں گا۔ تم جندہ رہو گے اور خوش رہو گے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''مہروج! اگر مجھے کچھ ہو گیا تو مجھے بھول تو نہ جاؤ گے۔ مجھے یاد رکھو گے نا۔''

''ایسی باتیں مت کرو۔ تم خود ہی تو کہتی ہو کہ قدرت ہمارے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکال دے گی۔''

''ہاں...... امید پر دنیا قائم ہے لیکن...... یہ گورا صاحب بہت کمینہ بندہ ہے۔ پتا ناہیں کیوں اکثر میرا دل کہتا ہے کہ یہ میرے ہاتھوں مرے گا یا میں اس کے ہاتھوں مروں گی۔''

میں نے پوچھنا چاہا کہ گورا صاحب کی عمر کیا ہوگی مگر پھر ایک دم خاموش ہو گیا۔

اب تک صرف ڈاکٹر چوہان کو معلوم تھا کہ میری یادداشت کے ساتھ کیا معاملہ ہوا ہے۔ اس نے میری تکلیف کو Amnesia کا نام دیا تھا اور اسے یقین تھا کہ میری یادداشت، لاہور میں حادثے کا شکار ہونے کے بعد قریباً دو سال بعد واپس آئی ہے۔ مگر اب میں درمیانی دو سال کے واقعات یاد کرنے میں ناکام ہو رہا ہوں۔ یہ عجیب صورتِ حال تھی۔ شاید عام شخص اس پر یقین نہ کرتا اور ممکن تھا کہ سلطانہ بھی نہ کرتی۔

سلطانہ نے ٹانگیں سمیٹ کر اپنی ٹھوڑی گھٹنوں پر رکھ لی تھی اور مبہوت سی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے گڑبڑا کر کہا۔ ''ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟''

''ایک بات پوچھوں...... سچ بتاؤ گے؟''

''پوچھو۔''

''سوال تو وہی پرانا ہے لیکن موقع نیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''ہو سکتا ہے کہ ہم بچھڑ جائیں۔ پتا ناہیں کتنی دیر بچھڑے رہیں اور کیا پتا مہروج! پھر ملیں بھی یا ناہیں۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ آج تم اس سوال کا صحیح جواب دے دو۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''کوئی ہے نا؟''

''کون؟''

''وہی...... جسے میں جانتی ناہیں۔ جو یہاں سے بہت دور ہے۔ جس کو تم یاد کرتے ہو۔ جس کی طرف کھنچتے ہو۔ بولو ہے نا۔''

''پتا نہیں تم کس کی بات کر رہی ہو؟''

''وہی مہروج وہی۔'' وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ ''میرے بہت خریب ہوتے ہوئے بھی تم جس کے پاس رہتے ہو۔ جس تک پہنچنے کے لیے تمہارے پر پنچھی کی طرح پھڑ پھڑاتے رہتے ہیں۔ تم بار بار اُڑتے ہو اور راجواڑے کی حدوں سے نکلنے کی کوشش کرتے ہو۔ پکڑے جاتے ہو۔ پھر بھاگتے ہو بتاؤ کوئی ہے نا؟'' اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔ ناک سرخ تھی۔ وہ عجیب جذباتی انداز میں بول رہی تھی۔

میں نے گہری سانس لی۔ ''پتا نہیں تم کیا کہہ رہی ہو لیکن اگر کوئی ایسی بات ہے بھی تو پھر تم کیا کر سکتی ہو؟''

''ہاں...... میں کیا کر سکتی ہوں؟ میں تو خود جیدی (قیدی) ہوں۔ لیکن مہروج! تم ایک بار مان تو لو کہ ہاں کوئی ہے۔'' اس کے لہجے میں التجا تھی۔

''ہو سکتا ہے کوئی ہو۔ ہو سکتا ہے نہ ہو۔ مجھے ٹھیک سے کچھ یاد نہیں۔''

وہ بدستور میری طرف کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتی رہی۔ ''تمہیں یاد ہے جب تم پہلی بار بھاگے تھے، تم راجواڑے کی آخری حد تک جا پہنچے تھے۔ تمہیں ڈیوڈ وغیرہ نے پکڑا تھا۔ وہ تمہیں واپس زرگاں لائے تھے۔ تم نے کہا تھا۔ مجھے چھوڑ دو۔ بڑی سخت آندھی ہے۔ وہ آندھی میں اُڑ جائے گی۔ وہ گم ہو جائے گی۔ ڈاکٹر چوہان اور رمجان تم سے بار بار پوچھتے رہے تھے، کون آندھی میں اُڑ جائے گی۔ کون گم ہو جائے گی۔ تم کوئی جواب ناہیں دے سکے تھے۔ بس اپنا ماتھا مسلتے رہے تھے۔ تب ایک بار پھر بیتاب ہو کر اُٹھ گئے تھے اور بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ تمہیں پکڑ کر گوڈا کے چھوٹے کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔''

سلطانہ نے چند لمحے توقف کیا اور بے حد سوالیہ لہجے میں بولی۔ ''کیا تمہیں دو سال کی مدت میں کبھی بھی یاد ناہیں آیا کہ وہ کون تھی؟ تمہارا اس کے ساتھ کیا سمبندھ تھا؟ وہ کیسے بچھڑی تھی تم سے؟''

میں سلطانہ کو اس بات کا بڑا واضح جواب دے سکتا تھا۔ دو سال قبل کی ہر بات میرے حافظے میں روشن تھی۔ اس روشنی میں روشن ترین چہرہ ثروت کا تھا۔ وہ جو میری رگِ جاں سے بھی قریب تھی۔ وہ جو میری دلہن بنتے بنتے مجھ سے بہت دور چلی گئی تھی۔ ایک خبیث باپ

کے خبیث بیٹے کی شیطانیت نے ایک ہنستے بستے گھر کو اُجاڑا تھا اور ملاپ کے انتظار میں ایک ایک گھڑی گننے والے دو بیتاب دل قرنوں کے فاصلے پر چلے گئے تھے۔ میرا دل چاہا کہ میں اس لڑکی کو جو میری بیوی ہونے کا دعویٰ کرتی ہے، بتا دوں کہ میں کسی کی لازوال محبت کا اسیر ہوں۔ اسے بتا دوں کہ وہ کون ہے جو لڑکپن سے میری سانسوں میں چلتی ہے، میرے لہو میں دوڑتی ہے اور میرے دل میں دھڑکتی ہے۔ لیکن کیا یہ سب کچھ بتانے سے کوئی فائدہ تھا؟ شاید نہیں۔

اسی دوران میں اچانک چھولداری کے دروازے پر کھڑے ہو کر کوئی زور سے بولا۔

''پردہ ہٹاؤ۔''

میں نے لرزاں ہاتھوں سے ڈوری کھول کر پردہ ہٹایا۔ ایک کرخت چہرے والے شخص نے اندر جھانکا۔ اس کے ہاتھ میں دودھ تھا۔ پتا نہیں اس نے کہاں سے حاصل کیا تھا یا شاید وہ کسی چھاگل وغیرہ میں اس کے پاس ہی تھا۔ ''یہ تمہارے بچے کے لیے اور موہن جی کا حکم ہے، جرا جلدی سو جاؤ۔ سویرے جلدی نکلنا ہووے گا اور فالتو خرچہ مت کرو۔ یہ موم بتیاں بجھا دو۔''

سلطانہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم نے موم بتیاں بجھا دیں اور ایک دوسرے کے قریب لیٹ گئے۔ ہمارے رُخ ایک دوسرے کی طرف تھے اور درمیان میں بمشکل چند انچ کا فاصلہ ہو گا۔ بچہ ایک طرف سو رہا تھا۔ سلطانہ کی سانس میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔ اس میں جنگلی پھولوں کی سی باس تھی۔ ہم سرگوشیوں میں بات کرنے لگے۔ میں نے کہا۔ ''سلطانہ! کیا ہم یہاں سے بھاگ نہیں سکتے؟''

''بھاگنے کے لیے کل کا دن بہت اچھا ہو سکتا ہے۔ مگر بھاگ کر بچ نکلنے کا امکان اتنا ہی ہے جتنا سوئی کے ناکے میں سے ہاتھی کے گجرنے کا۔'' وہ بھی سرگوشی میں بولی۔

میں نے چونک کر پوچھا۔ ''تم یہ کیوں کہہ رہی ہو کہ کل بھاگنے کا اچھا موقع ہو گا؟''

''ہم اس وقت اسٹیٹ کے بائیں کنارے کی طرف ہیں۔ کل جہاں ہمارا پڑاؤ ہوئیں گا، وہ جگہ کنارے کے اور بھی قریب ہے۔ مشکل سے سات آٹھ میل کا فاصلہ ہوئیں گا۔ ایک بار کوئی اسٹیٹ کی حد سے نکل جائے تو پھر اس کے لیے چھپنا آسان ہو سکتا ہے۔ وہاں جنگل میں کئی چھوٹی چھوٹی آبادیاں ہیں جن کو ''آویاں'' کہتے ہیں۔ لیکن مسئلہ تو یہی ہے کہ ہم اسٹیٹ کی حد سے ناہیں نکل سکتے اور تم تو بالکل ناہیں نکل سکتے۔''

میں چونک گیا۔ یہ بات اس سے پہلے چوہان نے بھی کہی تھی کہ میں اسٹیٹ کی حدود

سے باہر نہیں جا سکتا۔ میں نے سلطانہ سے پوچھا کہ وہ میرے بارے میں ایسا کیوں کہہ رہی ہے؟

وہ بولی۔ ''اتنی بار ناکام ہو کر بھی اگر تمہاری سمجھ میں یہ بات ناہیں آئی تو پھر کب آئے گی؟ اب تم کو بھی یہ بات مان لینی چاہیے کہ تم بے بس ہو۔ تم کو کیل دیا گیا ہے۔''

''کیل دیا گیا ہے؟ اس کا کیا مطلب؟''

''تم پر جادو ہے مہروج۔'' وہ بے حد سنجیدگی سے بولی۔ ''تم اس کے اثر سے باہر ناہیں نکل سکتے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''یہاں یہ ہوتا ہے مہروج! جن لوگاں کے بارے میں یہاں خطرہ ہوتا ہے کہ وہ راجواڑے سے بھاگ جائیں گے، انہیں یہاں کیل دیا جاتا ہے۔ پھر چاہے وہ آجاد بھی پھر رہے ہوں، وہ راجواڑے سے باہر ناہیں جا سکتے۔ وہ پکڑے جاتے ہیں اور ایسا کوئی ایک بار ناہیں ہوا، بے شمار مرتبہ ہوا ہے۔ تمہارے ساتھ بھی دو چار بندے اور پکڑ کر یہاں لائے گئے تھے۔ ان میں سے دو کی موت بھی ایسے اچ ہوئی تھی۔ وہ کچے کی طرف بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ ان کی دوسری کوشش تھی۔ جب وہ پکڑے جانے لگے تو ایک کھوہ میں گھس گئے۔ یہاں تیندوے کا ایک جوڑا تھا۔ یہ تیندوے ان دونوں پر پل پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تکا بوٹی کر ڈالی۔''

میرے ساتھ پکڑے جانے والے لوگ اور کون ہو سکتے تھے؟ میں ذہن پر زور دینے کی کوشش کرنے لگا۔ اس سے پہلے میں چوہان کی زبان سے میڈم صفورا کا نام سن چکا تھا۔ اس نام نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ تو کیا صفورا کے علاوہ کوئی اور بھی میرے ساتھ پکڑ کر یہاں لایا گیا تھا؟ کہیں وہ سیٹھ سراج یا عارف خان وغیرہ تو نہیں تھے یا پھر میرے اور عمران کے دوستوں میں سے کوئی؟ مثلاً اقبال یا جیلانی وغیرہ۔ سوال بے شمار تھے اور جواب نہیں مل رہے تھے۔ اگر کوئی جواب ملتا بھی تو اس کی جگہ دس سوال اور پیدا ہو جاتے تھے۔

میں نے سلطانہ سے پوچھا۔ ''یہ ''کچا'' کیا ہے؟ اس سے پہلے بھی میں دو تین دفعہ یہ لفظ سن چکا ہوں۔ کیا یہ کوئی خاص علاقہ ہے؟''

''تم بھول رہے ہو مہروج! میں تمہیں ایک بار پہلے بھی تفصیل سے بتا چکی ہوں۔ ہمارا یہ راجواڑا تین طرف سے تو ایک بڑی ندی نے گھیر رکھا ہے۔ خشکی کی طرف سے باہر جانے کا بس ایک ہی راستہ ہے۔ اسے ہم کچا کہتے ہیں۔ اس رستے پر کئی جگہ چھوٹی چھوٹی چوکیاں بنی

ہوئی ہیں جہاں پہرے دار موجود ہوتے ہیں۔ کوئی اسٹیٹ سے باہر جا سکتا ہے، نہ باہر سے اسٹیٹ میں آ سکتا ہے۔ پہلے پہل کبھی کبھار پولیس یا فوج کے لوگ یہاں آتے تھے مگر ان کا یہاں کوئی جور ناہیں چلتا تھا۔ ویسے بھی یہ جنگل اتنے گھنے ہیں کہ یہاں گورنمنٹ کے لوگاں کا آنا اور اپنے کسی اپرادھی وغیرہ کو ڈھونڈنا ناممکن ہے۔ اب بہت عرصہ ہو گیا، باہر کے لوگاں اس علاقے کو اس کے حال پر چھوڑ چکے ہیں۔''

ہم سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے، پھر بھی باہر کھڑے پہریدار خبردار ہو گئے۔ ایک پہریدار نے چھولداری کے پاس آ کر زور سے کہا۔ ''اوئے! یہ کیا کھسر پھسر لگا رکھی ہے۔ آرام سے سوتے ہو یا پھر تمہارا کوئی اور علاج کیا جاوے۔''

ہم چپ ہو گئے۔

وہ پھر گرجا۔ ''اب تمہاری آواج ناہیں آنی چاہیے۔ صبح منہ اندھیرے اُٹھ کر نکلنا ہے۔''

سلطانہ غصے میں ہڑبڑا کر رہ گئی۔ پھر اس نے میرا بازو پکڑ کر اپنے سر کے نیچے رکھا اور بڑی محبت سے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر لیٹ گئی۔ اس کے پاؤں میرے پاؤں سے چھو رہے تھے۔ اس کے پاؤں میں پازیب نہیں تھی۔ حالانکہ یہاں کی تمام عورتوں کے پاؤں میں، مَیں نے پازیبیں وغیرہ دیکھی تھیں اور بات صرف پازیب ہی کی نہیں تھی، یہاں کی معمولی سے معمولی عورت کے جسم پر بھی مختلف طرح کے زیورات نظر آتے تھے۔ سلطانہ شاید واحد عورت تھی جس کے جسم پر کسی طرح کی کوئی آرائش نہیں تھی۔ شاید وہ یہ سب پسند ہی نہیں کرتی تھی۔

وہ لیٹی ہوئی تھی اور اس کی قربت میں ایک عجیب سی یاسیت تھی۔ دور کہیں جنگل میں گیدڑ چلا رہے تھے۔ جلد ہی میں سو گیا۔

O.....❖.....O

اگلے روز سفر پھر شروع ہوا۔ صادق لاکھی مسلسل سلطانہ کو گھور رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ شاید وہ اسے کچا چبا جاتا۔ کل والے واقعے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قافلہ سالار موہن کمار نے صادق کو سلطانہ سے دور ہٹا دیا تھا۔ اب صادق کا چتکبرا گھوڑا سب سے پیچھے تھا۔ ایک چھوٹی سی ندی کے ساتھ ساتھ چلتے ہم نے سارا دن سفر کیا۔ میں نے سرگوشی میں سلطانہ سے پوچھا کیا یہی وہ ندی ہے جس کا اس نے رات کو ذکر کیا تھا؟ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ تو بہت بڑی ہے۔ تیج بہاؤ ہے اس کا۔ تم دیکھو گے تو حیران اچ رہ جاؤ گے۔'' اس نے سرگوشی کی۔

رات کو ہمارا پڑاؤ ایک بار پھر گھنے درختوں میں ہوا۔ ہاشو یکسر خاموش تھا۔ اس کے چہرے پر جیسے موت کی زردی نے مستقل ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ سلطانہ نے ہاشو کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ ان کا پُرانا گھریلو ملازم ہے۔ پہلے یہ ٹھیک تھا لیکن پھر بیمار ہوا اور ایک روز اچانک اس کی زبان بند ہوگئی۔ وید نے بتایا ہے کہ اس کے سر کی کوئی نس پھٹ گئی ہے جس کی وجہ سے یہ بولنے سننے سے معذور ہوگیا ہے۔ شروع میں سلطانہ کے والد مختار صاحب کی مالی حالت اچھی تھی مگر جب حالت پتلی ہوگئی تو ہاشو نے کسی اور مسلم گھرانے کی ملازمت کر لی۔ بہرحال سلطانہ اور اس کے گھرانے کے ساتھ اس کی اٹوٹ وفاداری اب بھی برقرار تھی۔ اب یہ شخص سلطانہ ہی کی وجہ سے ایک بدترین مشکل کا شکار ہوگیا تھا۔

رات کو ہاشو پھر جلدی سو گیا۔ میں اور سلطانہ بالکل قریب قریب لیٹے سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔ ندی پار سے جنگلی جانوروں کی آوازیں آتی رہیں۔ سلطانہ نے آج بچے کو اپنے اور میرے درمیان لٹایا تھا۔ وہ بار بار میرا ہاتھ بچے کے سینے پر رکھتی تھی۔ جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہی ہو کہ تم اس بچے کے باپ ہو۔ اگر میں نہ ہوں گی تو تمہیں اس کا دھیان رکھنا ہوگا، اس کے بارے میں سوچنا ہوگا۔

ہماری گفتگو کا رُخ ایک بار پھر ندی اور اس کے قرب و جوار کے علاقے کی طرف ہو گیا۔ سلطانہ نے بتایا کہ یہاں سے بائیں رُخ پر بس سات آٹھ میل کا فاصلہ طے کر لیا جائے تو راجواڑے کی حدود سے نکلا جا سکتا ہے۔ میں نے اس سے دو چار باتیں اور بھی پوچھیں۔

میرے دل کی گہرائی میں کہیں یہ خیال اُبھر رہا تھا کہ میں یہاں سے نکلنے کی ایک کوشش کروں۔ شاید سلطانہ ٹھیک ہی کہتی ہو کہ میں نے پہلے بھی یہاں سے نکلنے کی دو چار کوششیں کی ہوں لیکن مجھے ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ اب میں اپنے پورے ہوش و حواس میں تھا۔ میرے سینے میں ایک آگ تھی اور یہ آگ میری کمزوریوں کو دبا کر مجھے توانا اور قدرے دلیر بنا رہی تھی۔ میں آنکھیں بند کر کے لیٹا رہا اور سوچتا رہا۔ کیا میں کبھی ثروت کو دوبارہ دیکھ سکوں گا؟ کیا میں کبھی سیٹھ سراج کی منحوس گردن پکڑ سکوں گا؟ بس یہ دو سوال تھے جو پچھلے چار پانچ دن میں سیکڑوں بار میرے ذہن میں اُبھرے تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر مجھے ان دو سوالوں کے جواب مل جائیں اور میں یہ دونوں کام کر سکوں تو پھر مجھے مرنے کا بھی کوئی دُکھ نہ ہوگا۔ بس دو جواب...... بس دو خواہشیں۔ ثروت سے ملنا اور اپنی ماں کے قاتل سراج کو گردن سے پکڑنا۔

رات کسی وقت اچانک میری آنکھ کھلی۔ چھولدار کی دیواریں بے طرح ہل رہی تھیں۔

میں نے چھولداری کے روزن میں سے دیکھا۔ چاندنی غائب ہو چکی تھی اور جنگل گہرے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ نہایت تیز ہوا میں درخت دیوانہ وار جھوم رہے تھے۔ سلطانہ دنیا و مافیہا سے بے خبر نظر آتی تھی۔ ننھا بالو اس کے پہلو میں تھا۔ ہاشو ہمارے پاؤں کی طرف سویا ہوا تھا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے بارش شروع ہوگئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ چھولداری کے گرد موجود پہرے دار پناہ کے لیے کسی پاس کی چھولداری میں چلے گئے ہیں۔ درختوں پر لگی مشعلیں بھی بجھ چکی تھیں، صرف ایک روشن تھی اور وہ بھی بے طرح پھڑ پھڑا رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد وہ بھی بجھ گئی۔

اچانک میرے دل میں یہاں سے بھاگنے کی دبی دبی خواہش انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی۔ میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ ہاتھ پاؤں میں سنسناہٹ جاگ گئی۔ میں نے فقط چند سیکنڈ کے لیے سوچا پھر قسمت آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے تاریکی میں بیٹھے بیٹھے چھولداری کی اندرونی ڈوری کھولی۔ بیرونی پردہ واٹر پروٹ تھا۔ اس کی ڈوری کو بھی گرہ لگی ہوئی تھی۔ یہ دوسری ڈوری کھولنے کے بعد میں باہر نکلنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ تب اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ میرے کُرتے کا دامن کسی شے سے اٹکا ہوا ہے۔ میں نے ہاتھوں سے آنکھوں کا کام لیا اور ٹٹول کر دیکھا۔ مجھے پتا چلا کہ سلطانہ نے میرے کُرتے کا دامن اپنی اوڑھنی سے باندھ رکھا ہے۔ شاید اس کے ذہن میں کہیں یہ اندیشہ موجود تھا کہ میں اپنی ذہنی کیفیت کے زیر اثر یہاں سے بھاگنے کی کوشش کروں گا۔ اس کا اندیشہ درست تھا۔ میں نے بڑی آہستگی سے گرہ کھولی اور اس کی اوڑھنی کو اپنے کُرتے سے جدا کیا، تب ہولے ہولے سرکتا دروازے سے باہر آ گیا۔ مجھے لگا کہ قدرت میری مدد پر آمادہ ہے۔ تیز بارش شروع ہوگئی تھی اور چاروں طرف گہری تاریکی تھی۔ مجھے بارش کی بوچھاڑوں میں بھیگتے گھوڑوں کی ہنہناہٹ سنائی دی۔ میں جھک کر چلتا تیزی سے خودرو جھاڑیوں کی طرف بڑھا اور آگے نکل آیا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ یہاں سے نکلنا میرے لیے اتنا آسان ثابت ہوگا۔ میں نکل آیا تھا مگر اب بھی اس صورت حال پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میرے پاؤں میں مقامی طرز کے سینڈل تھے۔ جسم پر وہی پاجامہ کُرتہ تھا جو پچھلے چار پانچ روز سے میرے ساتھ دربدر ہو رہا تھا۔ واسکٹ کا حال دیگر لباس سے ابتر تھا۔

یہ جنگل کی بارش تھی۔ ہر طرف ایک شور برپا تھا۔ دیوہیکل درخت جھوم رہے تھے۔ پانی سے پتوں کے ٹکرانے کی آواز ایک مہیب گونج کی طرح تھی۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ حفاظت کی غرض سے سامنے کی طرف پھیلا رکھے تھے اور حتیٰ

الامکان تیزی سے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میں کئی جگہ گرا اور سنبھلا۔ مجھے چوٹیں اور خراشیں آئیں لیکن میں بڑھتا چلا گیا۔ مجھے کل رات جنگل میں پکارتا ہوا چکور یاد آیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے خود میں اور اس چکور میں مشابہت محسوس ہوئی۔ وہ بھی تو کہیں پہنچنا چاہتا تھا۔ اَن گنت زمانوں سے سفر کر رہا تھا۔ اس کے پر پھڑ پھڑاتے تھے اور اس کا بے قرار دل اسے محوِ پرواز رکھتا تھا۔ مجھے بھی کہیں پہنچنا تھا۔ کسی کے پاس جانا تھا۔ کچھ آنکھیں تھیں جن کا انتظار مجھے ختم کرنا تھا۔ وہ میرے پیاروں کی آنکھیں تھیں۔ وہ پتا نہیں کب سے میری راہوں میں بچھی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں نے مجھے کہاں کہاں ڈھونڈا تھا۔ میرے لیے کس کس طرح روئی تھیں اور یہ کوئی دو چار دن کا واقعہ نہیں تھا، نہ ہی دو چار ہفتوں یا مہینوں کا۔ اسے دو سال گزر چکے تھے۔ پتا نہیں کہ پلوں کے نیچے سے کتنا پانی بہہ چکا تھا۔ خبر نہیں کہ اس بے کراں جنگل سے باہر کیا کچھ وقوع پذیر ہو چکا تھا۔ میں بھاگ رہا تھا۔ میرے دل میں بس ایک ہی خواہش تھی۔ میں جلد سے جلد ان تاریک درختوں کی حد سے گزر جاؤں۔ کسی ایسی جگہ پہنچ جاؤں جہاں مجھے جانے پہچانے منظر نظر آئیں۔ سڑکیں، گاڑیاں، لوگ، بازار……

بھاگتے ہوئے میں عقب سے آنے والی آوازوں پر بھی دھیان رکھے ہوئے تھا۔ عقب میں کوئی آواز نہیں تھی۔ کوئی روشنی نہیں تھی۔ بس شور مچاتے پانی کی نادیدہ چادر تھی جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی تھی اور جنگل دھاڑ رہا تھا۔ تاریک پانیوں میں میرے پاؤں چھپا چھپ چلتے تھے اور بھیگی ہوئی بیلیں میرے جسم سے الجھتی تھیں۔ میرے پاس ہتھیار نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ نہ ہی کوئی روشنی دینے والی چیز۔ سلطانہ کی صرف اتنی بات مجھے یاد تھی کہ ندی سے بائیں طرف سفر کیا جائے تو آٹھ میل کی دوری پر ''کچا'' ختم ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اسٹیٹ کی حد بھی۔ لیکن کیا اس سے آگے بھی ویرانی ہوگی یا کوئی ایسی آبادی نظر آئے گی جہاں مجھے کوئی مددگار مل سکے گا؟ مجھے لگ رہا تھا کہ آج کی رات شاید میرے فرار کے لیے ہی اس قطعہ زمین پر اُتری ہے۔ کسی حصار سے نکلنے کے لیے اس سے بہتر تاریکی اور کون ہو سکتی تھی۔ مجھے بس اپنا رُخ درست رکھنا تھا اور رُخ درست رکھنے کے لیے میں صرف اپنے وجدان پر بھروسہ کر رہا تھا۔

میرا وجدان کہہ رہا تھا کہ تم ٹھیک رُخ پر جا رہے ہو۔ بارش کی بوچھاڑیں اور ہوا اب بھی تمہارے عقب میں ہے اور اس کا عین عقب میں ہونا ہی تمہارے رُخ کو درست قرار دے رہا ہے۔ ایک جگہ میں گرا تو میرے ہاتھ میں ایک لٹھ نما لکڑی آ گئی۔ میں نے یہ لکڑی اُٹھا لی۔ ہاتھ میں کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر تھا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ تیز بارش میں جنگلی

جانوروں سے آمنا سامنا ہوتا ہے یا نہیں۔ ہاں…… یہ احساس ضرور تھا کہ عام رات کی نسبت اس طوفانی رات میں زیادہ محفوظ ہوں۔

میں بے دم ہو جاتا تو تھوڑی دیر کے لیے رُک جاتا۔ سانس ذرا بحال ہوتی تو پھر دوڑنا یا تیز تیز چلنا شروع کر دیتا۔ جنگل گنجان تھا اور دوڑنے کا موقع بس کہیں کہیں دو چار سیکنڈ کے لیے ملتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میری قمیص پھٹ چکی ہے۔ میرا چہرہ شاخوں کے لگنے سے لہولہان ہو چکا ہے اور پاؤں اور پنڈلیوں میں بہت سے کانٹے چبھے ہوئے ہیں لیکن پتا نہیں کیوں، اذیت کا احساس کہیں نہیں تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ میں اب اپنی منزل سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ تاریکی، گھنا جنگل، طوفانی بارش۔ یہاں کون کسی کو ڈھونڈ سکتا تھا۔ کون میرے پیچھے آ سکتا تھا؟ میں تاریکی کے سمندر میں ایک تاریک نقطے کی طرح تھا۔ ناقابلِ شناخت، ناقابلِ گرفت۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں نے اچانک اپنے سامنے ایک شخص کو دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے زمین پاؤں کے نیچے سے نکل گئی ہے اور آسمان لاکھوں ٹن پانی سمیت ٹوٹ کر میرے سر پر آن گرا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ میں سکتہ زدہ کھڑا رہ گیا۔ یہی وقت تھا جب زور سے بجلی چمکی۔ چند سیکنڈ کے لیے قرب و جوار روزِ روشن کی طرح نمایاں ہوئے۔ میری رگوں میں خون منجمد ہو گیا۔ بے شک وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی اور اس کی آنکھوں میں خوفناک چمک…… پھر تاریکی چھا گئی۔ بادل زور سے گرجے۔ وہ دوبارہ ہیولا بن گیا۔ پھر اس کے دائیں بائیں سے دو اور ہیولے نمودار ہوئے۔ ٹارچیں روشن ہوئیں۔ ان کی دودھیا روشنی پانی کی چادر کو چیرتی ہوئی میرے چہرے پر پڑی۔ تب رائفل کاک ہونے کی آواز آئی۔ ایک پھنکارتی ہوئی آواز میرے بائیں جانب سے اُبھری۔ ''ہاتھ اوپر اُٹھاؤ اور زمین پر بیٹھ جاؤ۔''

میری ٹانگوں سے دم تو پہلے ہی نکل چکا تھا۔ میں جھکا اور دو زانو بیٹھ گیا۔ بارش کا پانی میری ٹانگوں کے اوپر سے چل رہا تھا۔

''اس کا تلاشی لو۔ پاکٹ چیک کرو۔'' ایک اور آواز اُبھری۔ یوں لگا جیسے کوئی انگریز گلابی اردو بول رہا ہے۔

ایک کرخت ہاتھ نے میرے بال مٹھی میں جکڑے اور میری واسکٹ اور قمیص کی جیبیں ٹٹولیں۔ ان میں پانی اور مٹی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟

''اس کے ہاتھ پیچھے باندھو۔'' گلابی اردو والے نے پھر کہا۔

میرا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے پھلجڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔

سلطانہ نے کہا تھا یہ ''سحر کاری'' ہے۔ مجھے جادو کے زور پر پابند کیا گیا ہے۔ ایک لمحے کے لیے صرف ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں آیا۔ کیا واقعی ایسا ہے؟ کیا تاریکی کے اس سمندر میں مجھے یوں اچانک ڈھونڈ لیا جانا کسی سحر کاری کا نتیجہ ہے؟ لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اپنے اس خیال کو رد کر دیا۔ میں کسی ایسے خیال کو قبول کر ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ میرے بس میں ہی نہیں تھا۔

جب ایک شخص نے مجھے اوندھا گرا کر میرے ہاتھ پشت پر موڑنے چاہے تو میرا اضطراب انتہا کو پہنچ گیا۔ غم و غصے کی ایک بلند لہر میرے اندر سے اُٹھی اور مجھے اپنے ساتھ بہا لے گئی۔ پتا نہیں کہ میری کمزوری اتنی شدید تلخی اور حدت میں کیسے بدل گئی؟ میں نے تڑپ کر خود کو چھڑایا اور ایک بار پھر اُٹھ کر بھاگنا چاہا۔ میں اسے جرأت نہیں کہوں گا، اسے میری غفلت کہا جا سکتا ہے۔ مجھے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ کم از کم دو رائفلیں میری طرف اُٹھی ہوئی ہیں۔ کوئی گولی میرے جسم میں سوراخ کر سکتی ہے۔ میں نے بمشکل دو تین قدم ہی اُٹھائے تھے کہ ایک گرانڈیل شخص نے مجھے چھاپ لیا۔ میں اس کے نیچے اوندھے منہ گرا اور خود کو چھڑانے کی اندھا دھند کوشش کرنے لگا۔ میں مچھلی کی طرح پھسل کر اس کی گرفت سے نکلا لیکن اُٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک دوسرے شخص نے زیادہ سختی سے دبوچ لیا۔ میں آتشیں لہجے میں چلّانے لگا۔

''چھوڑ دو...... مجھے چھوڑ دو کتو...... مجھے جانے دو...... مجھے میرے گھر والوں کے پاس جانے دو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ مجھے مار دو ظالمو...... یا مجھے جانے دو۔''

میں جسم و جاں کی پوری قوت سے تڑپ رہا تھا اور خود کو چھڑانے کی سعی کر رہا تھا۔ ان لمحوں میں...... ہاں ان لمحوں میں مجھے لگا کہ شاید سلطانہ اور چوہان وغیرہ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ میں اس سے پہلے بھی اسی طرح یہاں سے نکلنے کی متعدد کوششیں کر چکا ہوں۔ کچھ دھندلے دھندلے سے ہیولے میرے ذہن میں بن رہے تھے۔ یہی تڑپ...... یہی بے قراری...... یہی پھڑ پھڑا کر پنجرہ توڑ دینے کی خواہش۔ کوئی اور وقت تھا۔ کوئی اور لوگ تھے لیکن شاید یہی جنگل تھا اور اسی طرح کا واقعہ ہوا تھا۔

مجھے ایک بار پھر زمین پر گرایا گیا اور باندھ دیا گیا۔ میرے پاؤں میں ایک زنجیر ڈالی گئی تھی جس میں عجیب وضع کا تالا لگا ہوا تھا۔ اس تاریک گرجتے برستے اور دھاڑتے جنگل میں، مَیں نے پھر ایک طویل سفر کیا لیکن اس مرتبہ یہ سفر گھوڑے پر تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر مجھے کسی بوری کی طرح گھوڑے کی پشت پر اوندھا لٹایا گیا تھا۔ چار گھڑ سوار میرے ارد گرد تھے۔ ان میں سے ایک کا نام تیواری لال تھا۔ اسے اس کے ساتھی تیواری بھائی یا تیواری جی

کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ ایک دوسرے بندے کا نام ڈیوڈ تھا۔ یہ ایک سفید فام تھا اور گلابی اردو بولتا تھا۔ اس نے انگریزی لباس پہنا ہوا تھا اور برساتی اوڑھ رکھی تھی۔ اس کی رائفل بھی برساتی کے اندر ہی تھی۔ اس کی عمر کوئی تیس پینتیس سال ہوگی۔

مجھے اندازہ ہو کہ مجھے پکڑ کر واپس اسی پڑاؤ میں لے جایا جا رہا ہے جہاں سے میں بھاگا تھا۔ میرے دل و دماغ میں اودھم سا مچا ہوا تھا۔ تیواری لال اور ڈیوڈ کے نام میں نے پہلے بھی سنے تھے۔ چوہان نے بتایا تھا کہ پہلے بھی ایک دفعہ جب میں بھاگا تھا تو مجھے تیواری اور ڈیوڈ پکڑ کر واپس لائے تھے۔ سزا کے طور پر مجھے ایک گھوڑے کے پیچھے باندھا گیا تھا اور طویل فاصلے تک ننگے پاؤں چلایا گیا تھا۔ آج بھی میں یہی دو نام تواتر سے سن رہا تھا۔ تو کیا مجھے پکڑنے کے لیے خاص طور سے یہی دونوں افراد مامور تھے؟ ڈیوڈ کے علاوہ باقی تینوں افراد مقامی لب و لہجے میں بات کر رہے تھے۔ ان کی زیادہ تر گفتگو راستے اور موسم کے بارے میں تھی۔ میرا بھاگنا اور پھر انتہائی حیران کن انداز میں پکڑا جانا۔ ان کے لیے جیسے کوئی غیر معمولی بات ہی نہیں تھی۔

قریباً دو گھنٹے بعد ہم واپس پڑاؤ میں پہنچ گئے۔ بارش اب ہلکی ہو چکی تھی مگر بہت تیز ہوا چل رہی تھی۔ تاریک جنگل ہوا کے شور سے سائیں سائیں کر رہا تھا۔ مجھے گھوڑے سے اُتارا گیا۔ موہن کمار مجھے دیکھ کر مشتعل ہو گیا۔ اس نے میرے منہ پر دو تھپڑ مارے اور پھنکارا۔

''میں حکم جی سے ضرور تیری سفارش کروں گا۔ بہتر یہی ہے کہ تیری دونوں ٹانگیں گھٹنوں پر سے کاٹ دی جاویں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔''

موہن کمار کی شہ پر مشتعل صادق بھی آگے بڑھا۔ اس نے مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کی اور ٹھوکریں رسید کرنے لگا۔ سلطانہ فریاد کرتی ہوئی چھولداری سے نکل آئی۔ ''اس کا کوئی قصور ناہیں۔ یہ اپنے ہوش میں ناہیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔'' وہ تقریباً میرے اوپر گر گئی۔

موہن کمار زہریلے لہجے میں بولا۔ ''بہت پریم ہے تجھے اپنے پتی سے۔ بڑی گھر گرہستن ہے تُو۔ تیرے جیسی دو چار اور جنم لے لیں تو سارا سنسار سورگ بن جائے۔''

اس نے سلطانہ کو اس کے لمبے بالوں سے کھینچ کر پیچھے ہٹایا۔ ایک گھڑ سوار بتیسی نکال کر بولا۔ ''حُسن حاجر ہے محبت کی سجا پانے کو۔ کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو۔''

سلطانہ کو گھسیٹ کر چھولداری میں پہنچایا گیا۔ اس کے بعد مجھے بھی وہاں پھینک دیا گیا۔ میرے ہاتھ پاؤں بدستور بندھے ہوئے تھے۔ میں نے موم بتی کی مدھم روشنی میں دیکھا، ہاشو سہما ہوا ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ میں کیچڑ میں لت پت تھا، پورے جسم پر خراشیں تھیں۔ سلطانہ

نے خود کو سنبھالا اور اپنی اوڑھنی سے میرے چہرے کا لہو پونچھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی لڑیاں تھیں۔ اسی دوران میں ایک شخص لوہے کا ایک چھوٹا سا ڈبہ جھولداری میں پھینک گیا۔ اس میں مرہم پٹی کا مختصر سامان تھا میرے سر کا زخم پھر تازہ ہو گیا تھا۔ سلطانہ نے بڑی احتیاط سے میری پٹی کھولی۔ دوا ملے پانی سے میرے زخم کو صاف کیا اور بڑی ہمت سے مرہم وغیرہ لگا کر پھر پٹی باندھ دی۔ تب ہاشو کے ساتھ مل کر اس نے میرے پاؤں اور پنڈلیوں سے کانٹے نکالے۔ کچھ پورے نکل آئے۔ دو چار ایسے بھی تھے جو اندر ہی ٹوٹ گئے۔ میری قمیص کی دھجیاں سلطانہ نے میرے جسم سے علیحدہ کیں۔ ان سے میرے لت پت جسم کو صاف کیا اور مجھے ایک صاف چادر میں لپیٹ دیا۔ اس نے مجھے جنگلی شہد اور ستو پانی میں گھول کر پلایا۔ میں نیم جان تھا۔ تکلیف اور دُکھ کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ اس نے بڑی محبت سے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور میرے سر کے بالوں کو سہلانے لگی۔ اپنے دوسرے ہاتھ سے وہ بالو کو تھپک رہی تھی۔ شاید سردی کے سبب وہ گاہے بہ گاہے کسمسانے لگتا تھا۔

میں نے نیم وا آنکھوں سے سلطانہ کو دیکھا۔ موم بتی کی مدھم روشنی میں اس کے قندھاری رخسار زرد نظر آتے تھے۔ آنکھوں میں وہی دُکھ تھا جو کسی لڑکی کی آنکھوں میں اس وقت نظر آتا ہے جب وہ اپنے محبوب یا شوہر سے بہت عرصے کے لیے بچھڑ رہی ہو۔

○......❖......○

اگلے روز دوپہر سے ذرا پہلے ہی ہم زرگاں پہنچ گئے۔ چاروں طرف سے نہایت گھنے درختوں میں گھری ہوئی یہ ایک وسیع بستی تھی۔ یہ ایک ڈھلوان پر واقع تھی۔ اس کے دامن سے مٹیالے پانی والی وہی چھوٹی ندی گزرتی تھی جو ہم نے راستے میں بھی دیکھی تھی۔ یہاں ہریالی اتنی گہری تھی کہ سیاہی مائل محسوس ہوتی تھی۔ زرگاں کا پھیلاؤ کسی طرح بھی نل پانی سے کم نہیں تھا۔ یہاں بھی بلند کلسوں اور برجیوں والی کئی ایک شاندار عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک پُرانی طرز کی پُرشکوہ عمارت راج بھون کہلاتی تھی وہ ندی کے عین کنارے پر تھی۔ زرگاں میں مجھے مندروں اور بدھ مندروں کی کثرت نظر آئی۔ مسجدیں شاید دو تین ہی تھیں۔ بارش کے بعد ہلکی دھوپ نکل آئی تھی اور زرگاں میں زندگی رواں دواں تھی۔ بھیڑ بکریاں اور گائے بھینسیں سرسبز ڈھلوانوں پر منہ مار رہی تھیں۔ ان کے پیچھے رنگ برنگی پگڑیوں والے لڑکے تھے۔ مال برداری والے جانور راستوں پر گامزن تھے۔ چھوٹے چھوٹے بازاروں میں پھل، سبزی اور دیگر ضروریات زندگی کی دکانیں تھیں۔ گلیوں میں مرغیاں اور بطخیں دوڑتی تھیں اور سانولے بچے شور مچاتے تھے۔

زرگاں پہنچتے ہی مجھے سلطانہ اور ہاشو سے جدا کر دیا گیا۔ وقتِ رخصت سلطانہ کی بیتابی دیدنی تھی۔ وہ جیسے ساری زنجیریں توڑ کر مجھے اپنی بانہوں میں چھپا لینا چاہتی تھی۔ لگتا تھا کہ ان سنگین ترین لمحوں میں بھی اسے خود سے زیادہ میری فکر ہے۔ وہ مجھے تو نہیں چوم سکتی تھی، لیکن میری طرف دیکھ کر اپنے بچے کو چوم رہی تھی۔ آنسو موتیوں کی طرح اس کی شفاف آنکھوں سے گر رہے تھے۔ مجھے ایک بند گھوڑا گاڑی میں ڈال کر وہاں سے روانہ کر دیا گیا۔

نیم پختہ سڑک پر گھوڑوں کی ٹاپیں گونجتی رہیں اور تقریباً دس منٹ بعد میں زرگاں کے سب سے بڑے پگوڈا میں تھا۔ میرے ہاتھ کھول دیئے گئے تھے لیکن پاؤں بدستور بندھے ہوئے تھے۔ مجھے سہارا دے کر اُتارا گیا۔ یہ ایک وسیع و عریض احاطہ تھا۔ یہاں سنگِ مرمر کثرت سے استعمال ہوا تھا۔ سرخ لباسوں والے بھکشو ننگے پاؤں گھومتے نظر آتے تھے۔ ان کے سر منڈے ہوئے تھے اور گلے میں مالائیں تھیں۔ احاطے کی ایک جانب مخروطی چھت والی ایک دوسری عمارت تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ مٹھ کی عمارت تھی۔ مٹھ میں بدھ مت کی تعلیم دی جاتی تھی اور نوعمر طالب علموں کو عبادات کا طریقہ بتایا جاتا تھا۔ احاطے میں موجود اکثر لوگ مجھے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے اور آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ ان کے انداز ظاہر کر رہے تھے کہ وہ مجھے پہلے سے جانتے ہیں۔ تاہم میں ان میں سے کسی کو پہچان نہیں پا رہا تھا۔

ایک سوجی سوجی آنکھوں والے بھکشو نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”ہم جانتے تھے کہ تم ایک نہ ایک دن واپس ضرور آؤ گے۔ کھس آمدید (خوش آمدید)۔“

ایک دوسرا شخص بولا۔ ”تم کو عجبت راس آ ہی نا ہیں سکتی تھی۔ تم بدھا کے اپرادھی ہو۔ تم پر نحوست کی چھایا ہے۔“

مختلف طنزیہ فقروں کے درمیان چلتا میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں پہنچ گیا۔ یہاں ایک گھڑے، ایک پیالے اور مٹی کے دو برتنوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کچے فرش پر چٹائی بچھی تھی اور تکیے کی جگہ ملائم لکڑی کا ایک ٹکڑا پڑا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہی میرا بسیرا ہے۔ دو فربہ اندام افراد کوٹھڑی میں آئے۔ یہ اس عبادت گاہ کے ملازم معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے لوہے کا ایک چپٹا کڑا میرے گلے میں ڈال دیا۔ ایک کھٹکے کے ذریعے یہ کڑا لاک ہو گیا۔

وہ رات میں نے اس کوٹھڑی میں تکلیف سے کراہتے ہوئے گزاری۔ اگلی صبح صفا چٹ سر اور چہرے والا ایک جواں سال بھکشو میرے پاس آیا۔ اس کا انداز قدرے دوستانہ تھا۔ اس نے رسمی کلمات ادا کیے۔ ”کیسے ہو مہروز! یار حوصلہ رکھو۔ جیون میں اونچ نیچ آتی رہتی ہے۔ یہ

سن کر بہت افسوس ہوا کہ سلطانہ کے ہاتھوں ایک بندہ مارا گیا ہے۔ ویسے اسے یہاں سے بھاگنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ یہاں رہ کر حالات کا سامنا کرتی۔''

میں اسے نہیں پہچان پا رہا تھا تاہم میں نے یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی۔ وہ میری چوٹوں پر اظہار افسوس کرتا رہا۔ میں نے مناسب الفاظ میں اس کی باتوں کا جواب دیا۔ جلد ہی مجھے اس کا نام بھی معلوم ہو گیا۔ وہ ہمیش تھا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ یہاں پگوڈا میں میرے ساتھ کافی وقت گزار چکا ہے۔ اس نے کہا۔ ''تمہاری شکل سے لاگت ہے کہ تم بہت بھوکے ہو۔ ابھی کھانے میں بہت دیر ہے۔ یہ تھوڑے سے بھنے ہوئے چاول ہیں، کھا لو۔'' اس نے اپنی گیروا چادر کے پلو میں سے مٹھی بھر چاول نکالے اور چپکے سے میری طرف بڑھا دیئے۔ ساتھ ساتھ وہ دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ بھکشو دوپہر سے پہلے کچھ نہیں کھاتے اور ابھی دوپہر ہونے میں کافی دیر تھی۔ میں نے بھی نظر بچا کر تھوڑے سے چاول کھائے۔ گلا بند سا ہونے لگا۔ میں نے گھڑے میں سے پانی اُنڈل کر پیا۔

ہمیش نے حیرانی سے کہا۔ ''کیا کرت ہو؟ پیالے پر کپڑا کیوں ناہیں رکھا؟''

ایک دم مجھے یاد آیا۔ چوہان نے بتایا تھا کہ بھکشو پانی کو باریک کپڑے سے چھان کر پیتے ہیں۔

''اوہو...... بھول گیا۔'' میں نے بات بنائی۔

''لگتا ہے کہ تم بہت کچھ بھول رہے ہو۔ تمہاری دماغی صحت ٹھیک ناہیں لگتی۔''

وہ میرے زخموں کے بارے میں پوچھنے لگا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس شخص سے میرے تعلقات کس طرح کے ہیں۔ مجھے کیا بتانا چاہیے اور کیا اس سے چھپانا چاہیے۔ میں گول مول باتیں کرتا رہا۔ اگر میں اسے یہ بتاتا کہ مجھے وہ سب کچھ یاد آ گیا ہے جو یہاں انڈیا آنے سے پہلے مجھ پر بیتا ہے تو شاید وہ یقین کر لیتا لیکن اگر میں یہ بتاتا کہ اس نئی صورتِ حال میں پچھلے دو سال کی باتیں بھول گیا ہوں تو شاید وہ اسے ایک مذاق سمجھتا یا میرا مضحکہ اُڑانا شروع کر دیتا۔ اپنی اس کیفیت پر میں خود بھی ششدر تھا۔ مجھے بعین یہی لگ رہا تھا کہ میرے دماغ میں ایک بند دروازہ کھل گیا ہے اور اس دروازے کے کھلنے سے ایک دوسرا دروازہ بالکل بند ہو گیا ہے۔

اچانک ہمیش چونکا۔ وہ دروازے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ ''اوہ...... وہ آ رہی ہے۔ کہیں پھر کوئی گڑبڑ نہ کر دے۔'' اس نے کہا۔

میں نے دیکھا۔ سامنے مٹھ کی طرف سے ایک عورت پگوڈا کے صحن میں داخل ہو رہی

تھی۔ اس کا رُخ ہماری ہی طرف تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا۔ وہ میلا کچیلا لباس پہنے ہوئے تھی۔ پتا نہیں کہ وہ کون تھی؟ اور مجھے اس سے کیا ڈر تھا؟

ہمیش تیز سرگوشی میں بولا۔ ''میں جاتا ہوں۔ اگر وہ تم سے کوئی بدتمیزی کرے تو خود جواب نہ دینا۔ چھوٹے گرو جی کے استھان کی طرف چلے جانا۔''

اب مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ چھوٹا گرو کون ہے اور اس کا استھان کیا ہے؟

میں نامعلوم حالات میں جکڑا ہوا تھا۔ میرے چاروں طرف شناسا لوگ تھے لیکن وہ میرے لیے اجنبی تھے۔ ان کے مزاج، ان کے رویے اور میرے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت۔ سب کچھ میری نگاہوں سے اوجھل تھا۔ یہ عجب صورتِ حال تھی۔

عورت تیزی سے چلتے ہوئے میری طرف آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک لٹھ تھی۔ وہ غالبًا میری یہاں موجودگی سے آگاہ تھی۔ شاید وہ اس سے پہلے میرے ساتھ کوئی مار پیٹ کر چکی تھی اور ہمیش کو اندیشہ تھا کہ آج پھر اس طرح کا واقعہ ہو گا۔ میرے قریب پہنچ کر اس کی رفتار کچھ سُست ہو گئی۔ وہ مجھے بغور دیکھنے لگی۔ اس کی گردن میں مالا کی جگہ لوہے کا ایک کڑا تھا۔ یہ ویسا ہی کڑا تھا جو کل مجھے پہنایا گیا تھا۔ وہ جواں سال عورت تھی اور مقامی بھی نہیں لگتی تھی۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ اس کی صورت کچھ جانی پہچانی لگی۔ اچانک میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں سکتہ زدہ اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ اگر میری نگاہیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں تو وہ صفورا تھی۔ میڈم صفورا۔ وہی جواں سال دبنگ عورت جو لاہور ائرپورٹ کے قریب واقع لال کوٹھیوں میں مختارِ کل کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کے بوائے کٹ بال اپنی مثال آپ تھے۔ وہ نہایت قیمتی پینٹ شرٹ پہنتی تھی اور اس کی چال میں ایک شاہانہ دبدبہ تھا لیکن آج یہاں پگوڈا کی اس عجیب و غریب عمارت میں وہ ایک بالکل مختلف روپ میں نظر آ رہی تھی۔ میں دنگ رہ گیا۔

مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں طیش کی ہلکی ہلکی سرخی اُبھر آئی تھی۔ میں نے سوچا شاید ہمیش کا اندیشہ ٹھیک ہے۔ یہ مجھ پر حملہ کرنے جا رہی ہے۔ چند سیکنڈ تک صورتِ حال جوں کی توں رہی۔ پھر بتدریج صفورا کی آنکھوں کی سرخی ماند پڑ گئی۔ اس کی جگہ ایک طرح کی نمی نے لے لی۔

وہ خشک لہجے میں بولی۔ ''تو آخر تم واپس آ ہی گئے۔''

میں خاموش رہا۔

وہ اندر کوٹھڑی میں چلی آئی اور چٹائی پر بیٹھ کر کھردری دیوار سے ٹیک لگا لی۔ میں کچھ

دیر تک کھڑا سوچتا رہا پھر میں بھی چٹائی کے ایک کنارے پر بیٹھ گیا۔ وہ مجھ پر نگاہیں جمائے ہوئے بولی۔ ''تمہیں دیکھتی ہوں تو سینہ جل اُٹھتا ہے، خود پر بس نہیں رہتا...... حالانکہ جانتی ہوں تم...... نادیہ کی موت کے براہِ راست قصوروار نہیں ہو۔ اس کا اصل مجرم تو وہی خبیث بازی گر تھا۔''

میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں، تاہم بالکل ساکت بیٹھا رہا۔ میرا یہ اندیشہ بالآخر درست ثابت ہوا تھا کہ نادیہ جانبر نہیں ہو سکی۔ وہ اس رات مرگئی تھی اور اس کی موت ہی تھی جس نے سیٹھ سراج، شیرے اور دیگر لوگوں کو شعلہ جوالا بنا کر ہمارے پیچھے لگا دیا تھا۔ اس خوفناک تعاقب کا انجام بالآخر ڈیک نالے پر ہوا تھا جہاں عمران کو رائفل کا برسٹ لگا تھا اور وہ اپنا ہنستا مسکراتا چہرہ لے کر تاریک پانیوں میں اوجھل ہو گیا تھا۔ کتنی بھیانک تھی وہ رات......

ہاں...... نادیہ مرگئی تھی اور اس کی بہن جو اسے بے پناہ پیار کرتی تھی۔ آج یہاں اس پگوڈے کی کوٹھڑی میں گیروا لباس پہنے میرے سامنے بیٹھی تھی اور اس کی آنکھوں میں گئے دنوں کا بے پناہ غم کروٹیں لے رہا تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو میری طرف؟'' میڈم صفورا نے پوچھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نگاہیں جھکا لیں۔ وہ بولی۔ ''تمہارے یہاں پگوڈا سے جانے کے بعد کافی کچھ تبدیل ہوا ہے اور سچ پوچھتے ہو تو میں بھی اس ایک ڈیڑھ برس میں بہت بدل گئی ہوں۔ میرے اندر تبدیلیاں آئی ہیں۔ میں نے اپنے غم اور غصے سے نباہ کرنا سیکھ لیا ہے۔ پہروں اکیلی بیٹھی گزرے واقعات پر غور کرتی رہتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ مجھ سے کہاں کہاں غلطیاں ہوئی ہیں۔ نادیہ کی موت کے حوالے سے میری بڑی غلطی شاید یہی تھی کہ میں نے سلیم کو نادیہ کے پاس رہنے دیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ نادیہ خطرناک حد تک ضدی ہے اور سلیم کی جان بھی لے سکتی ہے۔ سلیم کی موت کے بدلے میں نادیہ کو اپنی جان دینا پڑی اور نادیہ کے بدلے میں کچھ اور جانیں گئیں۔ ان میں سے مجھے تمہاری والدہ کی موت کا واقعی افسوس ہے۔ یہ سراسر سراج کا ذاتی فعل تھا۔ مجھے سراج کی طرف سے اندیشہ تھا۔ میں نے اسے خاص طور سے ہدایت کی تھی کہ تمہاری بیمار والدہ کے ساتھ کسی طرح کی سختی نہ کی جائے لیکن سراج اکثر اپنی من مانی کرتا تھا۔ کئی دفعہ وہ نادیہ کو بہکانے کا بھی سبب بنتا تھا۔ اس نے وہاں ڈیفنس کی کوٹھی میں بھی اپنی مرضی چلائی۔ بہرحال اب اپنے واقعات کو دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔''

صفورا نے آہ بھر کر چہرہ دروازے کی طرف پھیر لیا۔

کچھ دیر تک ہم دونوں کے درمیان بوجھل خاموشی طاری رہی۔ پگوڈا کے اندر لوبان سلگایا جا رہا تھا۔ اس کی خوشبو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہم تک پہنچنے لگی۔ صفورا نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ ''اس شام میں نے تم سے بہت زیادتی کی۔ مجھے شاید ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تمہیں لگنے والی ان چوٹوں کے لیے مجھے رنج ہے۔''

میں کیا جواب دیتا۔ اس بارے میں میرے ذہن کی سلیٹ بالکل صاف تھی۔ وہ کچھ دیر میرے بولنے کا انتظار کرتی رہی، تب اس کی آواز اُبھری۔ ''تم خاموش کیوں ہو؟ کچھ کہو۔ شاید میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو۔ تم جانتے ہو، ہم اس وقت ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ ہمارے دُکھ سانجھے ہیں۔''

''میڈم! آپ کو یہاں اس حالت میں دیکھ کر میرا دماغ سن ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی، اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تم نے پچھلے دو سال میں پہلی بار میرا نام لیا ہے۔ کیا...... تم مجھے...... ٹھیک سے پہچان رہے ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں میڈم! میں آپ کو پہچان رہا ہوں اور ان سارے حالات کو بھی جو یہاں پہنچنے سے پہلے پیش آئے تھے۔''

میڈم صفورا کے چہرے پر خوشی کی مدھم چمک نمودار ہوئی۔ اس نے لرزتی آواز میں پوچھا۔ ''کیا واقعی ایسا ہے؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بغور میرے سر پر بندھی پٹی کو دیکھنے لگی۔ ''کیا تم کہیں سے گرے ہو؟ مم...... میرا مطلب ہے تمہارے سر پر پھر چوٹ لگی ہے؟''

''ہاں...... کچھ دن پہلے ایسا ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ تفہیمی انداز میں سر ہلانے لگی۔ میں نے اسے بتایا کہ پچھلے چند روز میں کچھ عجیب صورتِ حال ہوئی ہے۔ دو سال 'پہلے' کے سارے حالات مجھے بتدریج یاد آ رہے ہیں۔ میں اب پورے وثوق سے بتا سکتا ہوں کہ میں کن حالات میں یہاں پہنچا۔

میڈم نے تصدیق کے لیے مجھ سے کئی ایک سوالات کیے اور اس کی حیرانی میں اضافہ ہو گیا لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ اس نئی صورتِ حال میں ماضی قریب کی باتیں میرے ذہن سے یکسر نکل گئی ہیں تو وہ مزید حیران ہوئی اور تعجب سے میرا چہرہ تکنے لگی۔ میں نے مناسب الفاظ میں اسے آگاہ کیا کہ مجھے بتایا جا رہا ہے کہ میں پچھلے قریباً دو برس سے یہاں

ہوں لیکن اب یوں لگتا ہے کہ ان دو برسوں پر پردہ پڑ گیا ہے۔ اس پردے کی دوسری طرف مجھے ایک دھندلی حرکت کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

میرا خیال تھا کہ وہ یقین نہیں کرے گی لیکن وہ بڑے دھیان سے میری باتیں سنتی رہی اور میری عجیب ذہنی صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''میرے خیال میں تمہیں چند دن آرام کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد تم خود کو بہتر محسوس کرو گے۔''

''میں اب بھی خود کو بہتر محسوس کرتا ہوں۔ بس کسی وقت سر میں شدید درد ہوتا ہے اور آنکھوں کے سامنے دھندسی چھانے لگتی ہے۔''

میڈم صفورا کو دیکھ کر میرے ذہن میں بے شمار سوالات کلبلانے لگے تھے۔ ان سوالات میں سے کچھ کا تعلق پاکستان میں پیش آنے والے واقعات سے تھا اور کچھ کا یہاں کے حالات سے۔ مجھے ابھی تک صرف یہ معلوم ہوا تھا کہ ہمیں کچھ نامعلوم لوگوں نے بدھا کے مجسمے کی چوری کی پاداش میں پکڑا تھا اور یہاں پہنچایا تھا اور یہ سب کچھ بطور سزا کیا گیا تھا مگر اس بارے میں تفصیلاً کچھ بھی میرے علم میں نہیں تھا۔ میں میڈم صفورا سے یہ سب کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ خاص طور سے پاکستان اور لاہور کے حالات کے بارے میں جاننا چاہتا تھا کہ وہاں میری بے ہوشی کے فوراً بعد کیا کچھ رُونما ہوا تھا۔ میرا بھائی اور بہن کہاں تھے؟ اقبال اور عارف پر کیا گزری تھی اور میرا دوست عمران، وہ یاروں کا یار وہ جاں نثار...... وہ غم خوار کیا ہوا تھا۔ کس تاریکی میں چھپ گیا تھا؟ پتا نہیں کیوں میں جب بھی عمران کے بارے میں سوچتا، میرے دل کے اندر کہیں گہرائی میں یہ انہونی آس ضرور جاگتی تھی کہ وہ ہر مشکل کو شکست دینے والا شاید اس رات موت کو بھی شکست دینے میں کامیاب رہا ہو۔

چھ بھکشو ایک جتھے کی صورت میں پگوڈا سے نکلے۔ ان کے آگے ایک تنومند گرو تھا۔ انہیں دیکھ کر میڈم صفورا ٹھٹکی اور اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''تمہیں آرام کی شدید ضرورت ہے۔ میں چھوٹے گرو سے کہوں گی کہ تمہیں کچھ دن تک خدمت سے چھٹی دی جائے۔ میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتے ہو۔ میرے پاس بھی تمہارے اور سلطانہ کے لیے بہت سے سوال ہیں لیکن اس بات چیت کے لیے ہمیں تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔ اچھا...... میں چلتی ہوں۔''

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے محتاط نظروں سے بھکشوؤں کے جتھے کی طرف دیکھا پھر پگوڈا کے مرمریں احاطے میں بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی مٹھ کی عمارت کی طرف نکل گئی۔

میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہ گیا۔ نادیہ کی صورت نگاہوں میں گھومنے لگی۔ میں کل جب اس کوٹھڑی میں داخل ہوا تھا تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہاں چند گھنٹے بعد میڈم صفورا سے میری ملاقات ہوگی اور اس کی زبانی مجھے نادیہ کی موت کی خبر ملے گی۔ حالات بڑی تیزی سے رُونما ہو رہے تھے۔

نادیہ کو میں نے آخری بار ہسپتال کے آئی سی یو میں دیکھا تھا۔ اسے آکسیجن لگی ہوئی تھی۔ وہ سفید بستر پر سیدھی لیٹی تھی۔ اس وقت وہ کروڑ پتی میڈم صفورا کی لاڈلی بہن نہیں تھی۔ نہ ہی اس کے جسم میں بجلیاں کوندتی تھیں، نہ ہی اس کی آنکھوں میں دعوے کے لشکارے تھے۔ وہ صرف ایک مریضہ تھی۔ دھیرے دھیرے موت کی طرف سرکتی ہوئی، اپنے انجام کی طرف بڑھتی ہوئی اور آج مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنے انجام تک پہنچ گئی ہے۔ وہ مردوں کا شکار کرتی تھی لیکن اس نے جس آخری مرد کو شکار کرنا چاہا تھا، وہ اپنی فطرت میں انوکھا تھا۔ وہ اس کی حریص آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے بجھا گیا تھا اور شاید...... خود بھی بجھ گیا تھا۔

O......❖......O

بھکشو اور ان کا گرو ننگے پاؤں چلتے ہوئے میرے پاس آئے۔ گرو نے اپنی سوجی آنکھوں سے مجھے سرتاپا گھورا پھر بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ ''سیڑھیوں پر چلو۔''

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں اپنی جگہ متحیر کھڑا رہا۔ ایک چیلا کرخت لہجے میں بولا۔ ''سنتے ناہیں، گرو جی کیا کہوت ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے ایک طرف دھکیلا۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے اس خاص سمت میں جانے کو کہا جا رہا ہے۔ میں نے ان لوگوں کے تیور دیکھے اور چل پڑا۔ پاؤں میں زنجیر بدستور موجود تھی۔ مجھے چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ میں بمشکل ڈیڑھ دو فٹ کا قدم ہی اُٹھا پا رہا تھا۔ وہ سب میرے پیچھے پیچھے چلتے گئے۔ جلد ہی ہم پگوڈا کی سفید سیڑھیوں پر پہنچ گئے۔ یہ قریباً چالیس سیڑھیاں تھیں جو پگوڈا کے صحن سے نیچے اُترتی تھیں۔ ان سیڑھیوں پر کئی بھک منگے بیٹھے تھے اور آتے جاتے زائرین سے خیرات وصول کر رہے تھے۔ مالائیں، پھول اور تبرکات بیچنے والے دیگر افراد بھی یہاں موجود تھے۔

مجھے دیکھ کر بہت سے لوگوں کے چہروں پر دلچسپی کے آثار نمودار ہوئے۔ مجھے لگا جیسے میرے ساتھ کوئی تماشہ ہونے والا ہے۔ پھر ایک دم مجھے چوہان کی کہی ہوئی بات یاد آئی۔ اس نے بتایا تھا کہ مجھے اور چوری کے دیگر مجرموں کو سزا کے طور پر بلا ناغہ پگوڈا کی سیڑھیوں پر لٹایا جاتا ہے اور انہیں بید مارے جاتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے گناہوں کو دھونے کا عمل ہے۔

بدھا کے پیروکاروں کا خیال ہے کہ اس عمل سے چوری کا ارتکاب کرنے والوں کو جو جسمانی تکلیف پہنچے گی، وہ انہیں پوتر ہونے میں مدد دے گی۔

مجھے پگوڈا کی سیڑھیوں پر اوندھا لٹا دیا گیا۔ میری پشت سے قمیص اُٹھا دی گئی۔ درجنوں نگاہیں دیکھ رہی تھیں۔ بے عزتی کے احساس سے مجھے پسینہ آ گیا۔ ایک شخص جو بھکشو نہیں تھا، ایک لکڑی تھامے برآمد ہوا۔ یہ بید کی لکڑی نہیں تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ برگد کی شاخ تھی جسے مقدس تیل میں بھگویا جاتا تھا۔

اس لکڑی سے میری کمر پر یکساں وقفوں سے دس ضربیں لگائی گئیں۔ یہ ہلکی ضربیں تھیں اور نہ شدید تھیں۔ ان ضربوں نے مجھے جسمانی تکلیف سے زیادہ ذہنی اذیت دی۔ مجھے اُٹھا کر پھر سے خستہ حال کوٹھڑی میں پہنچا دیا گیا۔ میری کمر پر جلن تھی اور زخمی پنڈلیوں اور پیروں سے پھر خون رسنے لگا تھا۔ سر کے زخم سے بھی لہو کا تھوڑا تھوڑا رساؤ جاری تھا۔ اپنی حالت پر مجھے خود ترس آنے لگا۔ ایک بھکشو نے مجھے مرہم پٹی کا کچھ سامان دیا اور بے اعتنائی سے منہ موڑ کر واپس چلا گیا۔

کچھ دیر بعد ہمیش آ گیا۔ اس شخص کا رویہ قدرے دوستانہ تھا۔ وہ میرے لیے بھی گیروا لباس لے کر آیا تھا۔ یہ دو چادروں پر مشتمل تھا۔ اس نے میرے زخموں کی مرہم پٹی کی اور لباس بدلنے میں بھی میری مدد کی۔ اس نے بتایا کہ بدھ کی دوپہر کو میرا سر بھی مونڈ دیا جائے گا۔

میرا حلیہ عجیب وغریب ہو گیا تھا لیکن پتا نہیں کہ وہ مجھے زیادہ عجیب نہیں لگ رہا تھا۔

شاید میرے ذہن پر چھائی ہوئی دھند آہستہ آہستہ صاف ہو رہی تھی، اور مجھے یہاں کے حالات اور واقعات ڈھیرے ڈھیرے یاد آنا شروع ہو گئے تھے۔ بہرحال ابھی اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ دوپہر کو کھانا کھایا گیا۔ پھر پگوڈا کے وسیع صحن میں مختلف عبادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شام کو بڑے بڑے نقارے بجائے گئے اور سوتر پڑھے گئے۔ وہ رات بھی جیسے تیسے گزر گئی۔ رات کی تاریکی میں پگوڈا کا اندرونی منظر بڑا عجیب تھا۔ مخروطی دروازوں میں سے شمعوں کی روشنی چھلک چھلک کر باہر آتی تھی اور بھکشو پُراسرار سایوں کی طرح حرکت کرتے دکھائی دیتے تھے۔ پگوڈا کے اندرونی دروازے کے سامنے میں نے ایک ننگ دھڑنگ سادھو کو چلہ کشی کی حالت میں دیکھا۔ وہ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے آگ جل رہی تھی اور وہ گاہے بہ گاہے اس میں کچھ پھینکتا تھا جس سے آگ سے بہت سی چنگاریاں نکلتی تھیں۔ گیروا لباس والی ایک لڑکی ہولے ہولے اس آگ کے گرد چکر کاٹتی تھی۔

شاید یہ کوئی سحر کاری تھی۔

میرے ذہن میں ایک بار پھر پرسوں رات کے تہلکہ خیز مناظر تازہ ہو گئے۔ نہایت گھنا اور تاریک جنگل، نہایت تیز بارش اور پھر کچھ لوگوں کا اچانک میرے سامنے آ جانا۔ مجھے ڈھونڈ لینا۔ جیسے بھوسے کے ڈھیر میں سے سوئی تلاش کر لی جائے۔ کیا واقعی وہ کوئی جادو تھا؟ میرا ذہن یہ بات ماننے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔

اگلی صبح پھر صفورا سے ملاقات ہوئی۔ اس دور دراز مقام پر ان اجنبی در و دیوار میں میڈم صفورا کا مجھ سے ملنا جتنا حیرت ناک تھا، اتنا ہی ناقابلِ فہم بھی تھا۔ وہ کیا تھی اور کیا بن کر یہاں پہنچ گئی تھی۔ وہ کیا حالات تھے جنہوں نے اس جیسی دبنگ عورت کو اُٹھا کر یہاں پٹخا تھا۔ ابرار صدیقی کو یہاں پٹخا تھا اور مجھے بھی؟ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا اور شاید اس کی کیفیت بھی یہی تھی۔

صبح کی اولین گھڑیوں میں جب بھکشو اور ان کے گرو حضرات صبح کی مناجات کے بعد پھر سے آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے تھے، ہمیں وہ تنہائی میسر آ گئی جس کی ضرورت تھی۔ میں اور میڈم صفورا کوٹھڑی میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میڈم صفورا کی آنکھوں میں غم واندوہ کے گہرے نشان جیسے نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ لگتا تھا کہ زندگی میں کبھی مسکرائی ہی نہیں ہے۔ وہ ایک دم اپنی اصل عمر سے دو تین سال بڑی لگنے لگی تھی۔ جب میں نے اسے لاہور میں دیکھا تھا، وہ قریباً پچیس کی لگتی تھی۔ اگر یہ انہونی ہو چکی تھی کہ ہمیں یہاں آئے ہوئے ڈیڑھ دو سال ہو چکے تھے تو پھر صفورا کی عمر چھبیس ستائیس لگنی چاہیے تھی مگر وہ ایک دم تیس کی لگ رہی تھی۔ تاہم اس کا جسمانی دم خم اسی طرح موجود تھا اور گہرے سرخ ہونٹوں کی شادابی بھی مکمل اوجھل نہیں ہوئی تھی۔

وہ گمبھیر آواز میں بولی۔ ”تابش! میں نے تم سے جو رویہ رکھا ہے اس کے لیے میں ایک بار پھر تم سے معذرت چاہتی ہوں۔ میرا صدمہ بہت گہرا تھا، مجھے اپنے جذبات پر اختیار نہیں تھا۔“

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میڈم! اگر میں یہ کہوں کہ مجھے آپ کے رویے کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں تو آپ یقین نہیں کریں گی لیکن حقیقت میں ایسا ہی ہے۔ میں آپ سے جھوٹ نہیں بول رہا۔“

”ہاں...... کل تم نے جو کچھ اپنے بارے میں بتایا ہے اس سے مجھے کافی باتوں کی سمجھ آئی ہے۔ میں کوئی ڈاکٹر تو نہیں ہوں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ اگر تمہاری یادداشت واپس آ گئی

ہے تو بہت جلد مکمل طور پر واپس آ جائے گی۔ تم اپنے اردگرد کی چیزوں اور چہروں پر غور کرو۔ انہیں پہچاننے کی کوشش کرتے رہو، بہت جلد تمہیں باتیں یاد آنے لگیں گی۔''

میں نے اپنی پیشانی کو مسلا۔ میں ذہن پر زور دیتا تھا تو کنپٹیوں میں ٹیسیں سی اُٹھنے لگتی تھیں۔

میڈم صفورا نے مجھ سے پوچھا۔ ''تمہیں پتا ہے، تم یہاں کیسے پہنچے تھے؟''

''نہیں...... مجھے معلوم نہیں۔ کچھ معلوم نہیں۔ پلیز میڈم! مجھے شروع سے بتائیں۔ میرے ساتھ کیا ہوا؟ میں لاہور سے یہاں انڈیا کے اس دور دراز علاقے میں کیسے پہنچا؟ کن لوگوں نے پہنچایا؟ اور...... اور آپ کیسے پہنچیں یہاں؟ اور ابرار صدیقی؟ اتنا بڑا واقعہ کیسے ہوا میڈم؟''

وہ ساکت بیٹھی رہی۔ اس کی مخروطی انگلیاں بے خیالی میں اپنے گلے کے آہنی کڑے کو سہلا رہی تھیں۔ اس کڑے پر سنسکرت یا اس سے ملتی جلتی زبان کے کچھ لفظ لکھے تھے۔

وہ گہری دُکھ بھری سانس لے کر بولی۔ ''نادیہ اپنے دوسرے آپریشن کے دوران میں ہی دم توڑ گئی تھی۔ گولی نے اس کی ریڑھ کی ہڈی کو بُری طرح زخمی کیا تھا۔ تم جانتے ہی ہو، اس کا نچلا دھڑ بالکل بے حس ہو گیا تھا۔ تمہارے اس قاتل دوست نے میری زندگی کو جس طرح برباد کیا ہے، میں مرتے دم تک نہیں بھولوں گی۔ وہ خبیث بہت زیادہ سازشی دماغ کا مالک تھا۔ اس نے گہری سازش کی۔ سرکس کے اسپیشل شو میں میری بہن کو اپنے ہاتھ سے گولی ماری اور ظاہر یہ کیا کہ وہ خود اپنی گولی کا شکار ہوئی ہے۔ قدرت نے اس کا بھانڈا پھوڑا اور اس کے لیے تم ذریعہ بن گئے۔ تم نے رشید اور تابندہ وغیرہ کے گھر میں بخار کی حالت میں جو کچھ کہا، اس نے پول کھول دیا۔ کاش میرے بس میں ہوتا کہ اس کی بوٹیاں کر کے چیل کوؤں کے آگے ڈال سکتی۔ کاش میرے بس میں ہوتا۔''

میڈم صفورا کی آنکھوں سے جیسے لہو ٹپکنے لگا۔ اس کے ماتھے کی رگیں اُبھر آئیں۔ یوں لگا کہ ان لمحوں میں وہ میری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہ رہی۔ اس نے میری طرف سے بھی نگاہیں پھیر لیں اور گہرے سانس لینے لگی۔ چند سیکنڈ بعد وہ قدرے نارمل ہوئی تو بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''ہر بُرے سے بُرے کام میں کوئی پہلو اچھائی کا بھی ہوتا ہے۔ میں کچھ لوگوں کے جبر کا شکار ہو کر لاہور سے یہاں پہنچ گئی۔ یہ بہت بُرا ہوا لیکن اس میں شاید ایک نکتہ اچھائی کا بھی ہے۔ میں سچ کہتی ہوں۔ اگر میں نادیہ کی موت کے بعد وہاں لاہور میں رہتی تو پتا نہیں کیا کچھ کر گزرتی۔ عین ممکن تھا کہ اس خونی (عمران) کے بعد اس کے گھر والے، اس کے بہن

بھائی بھی اس آگ کی لپیٹ میں آ جاتے۔ میری ذہنی کیفیت ان دنوں کچھ ایسی ہی تھی۔ میں ان کو بالکل نہیں چھوڑتی۔'' میڈم صفورا کی سرخ آنکھوں میں اشکوں کی نمی چھلکنے لگی۔

اس کا طیش دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اس عبادت گاہ میں میڈم صفورا کا رویہ مجھ سے بہت تلخ رہا ہوگا اور عین ممکن ہے کہ شروع شروع میں اس نے میری جان لینے کی کوشش بھی کی ہو۔

وہ چادر کے پلو میں چہرہ چھپا کر خاموش آنسو بہانے لگی۔ میں چپکا بیٹھا رہا۔ سورج دھیرے دھیرے مٹھ (مدرسے) کی مخروطی چھت کے عقب سے نمودار ہو رہا تھا۔ اس کی سنہری کرنوں میں پگوڈا کے سنہری کلس اور کام دار دروازے چمک رہے تھے۔ کچھ دیر بعد میڈم صفورا کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو اس نے گیروا چادر کا پلو چہرے سے ہٹا لیا۔ میں نے اسے مٹی کے پیالے میں پینے کے لیے پانی دیا۔ اس نے پانی پیا اور ایک بار پھر کھردری سفید دیوار سے ٹیک لگا لی۔ اس کے چہرے پر کرب آمیز تردد کی پرچھائیاں موجود تھیں۔

اس نے ہولے ہولے کہنا شروع کیا۔ ''دراصل ہم ٹھیک سے اندازہ نہیں لگا سکے کہ بدھا کا وہ مجسمہ کچھ لوگوں کے لیے کتنا اہم ہے اور وہ اس کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ یہ اندازے کی بہت بڑی غلطی تھی، بہت بڑی غلطی......''

اس نے ایک آہ بھری اور جیسے کسی سوچ میں کھو گئی۔ میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بولی۔ ''وہ مجسمہ جو ابرار صدیقی کے پاس تھا اور جسے بعد میں، مَیں نے تمہارے اس قاتل دوست کے ذریعے صدیقی کے فلیٹ سے نکلوایا تھا۔ کوئی عام مجسمہ نہیں تھا۔ اس کے پیچھے ایک لمبی کہانی ہے۔ میں تفصیل میں جاؤں گی تو بات طویل ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ یہ شاندار مجسمہ برما سے یہاں پہنچا تھا۔ یہ کئی سو سال سے برما کے ایک شاہی خاندان کے پاس تھا۔ اس مجسمے کی شہرت یہ بھی تھی کہ یہ اپنی حفاظت خود کرتا ہے۔ ماضی میں کئی طرح کے حادثات اس پر گزرے لیکن یہ ہمیشہ محفوظ ہی رہا۔ نہ صرف خود محفوظ رہا بلکہ اس نے اپنے اردگرد موجود لوگوں کو بھی محفوظ رکھا۔ اس کی آخری مثال دوسری جنگِ عظیم میں سامنے آئی۔ برما کا وہ پہاڑی قصبہ بھی شدید جنگ کی زد میں تھا جہاں ایک بدھ مندر کے اندر یہ مجسمہ موجود تھا۔ علاقے کے لوگوں کو اس مجسمے کی کرامات پر اتنا یقین تھا کہ جاپانیوں کے کئی شدید حملوں کے باوجود لوگ قصبہ چھوڑ کر نہیں گئے اور بدھ مندر کے اردگرد پناہ گزیں رہے۔ کہا جاتا ہے کہ جاپانیوں نے جب بھی قصبے پر ہلا بولنے کی کوشش کی، شدید طوفانی بارش یا خراب موسم کی وجہ سے یہ کام مکمل نہ کر سکے اور ناکام واپس لوٹ گئے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ عین حملے کے موقع پر

ان پر برطانوی فوجیوں نے کسی اور طرف سے حملہ کر دیا اور قصبے کی طرف سے ان کی توجہ ہٹ گئی۔ یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلا۔ بعدازاں قصبے کے لوگ خود بھی قصبہ چھوڑ کر کسی محفوظ جگہ چلے گئے۔ جاپانی فوجیوں نے گولہ باری سے پورا قصبہ کھنڈر کر دیا۔ بدھ مندر بھی تہس نہس ہو گیا۔ اس کے اندر چھوٹی سے چھوٹی شے بھی تباہی سے نہیں بچ سکی لیکن یہ مجسمہ جوں کا توں رہا۔ اسے خراش تک نہیں آئی۔ بعد میں اس قصبے پر برطانوی فوج کا قبضہ ہو گیا۔ ایک انگریز میجر اسٹیفن اس نادر روزگار مجسمے کو بڑی احتیاط سے انڈیا لے آیا۔ حکم جی کے دادا رائے سوم آنند بہادر سے مسٹر اسٹیفن کی گہری دوستی تھی۔ لہٰذا اس انوکھے مجسمے کو یہاں بھانڈیل اسٹیٹ کے سب سے بڑے پگوڈا کی زینت بنا دیا گیا۔"

میڈم صفورا نے محتاط نظروں سے کوٹھڑی سے باہر جھانکا کہ کوئی اردگرد تو موجود نہیں پھر اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "آج سے تین سال پہلے یہ مجسمہ یہاں زرگاں کے پگوڈا سے چوری ہوا۔ اس چوری نے بدھ مت کے پیروکاروں میں تہلکہ مچا دیا۔ انہوں نے تہیہ کیا کہ وہ مجسمے کو بہرصورت ڈھونڈیں گے اور واپس لائیں گے۔ انہیں یقین تھا کہ مجسمہ جہاں بھی ہوگا، محفوظ ہوگا کیونکہ وہ بری زبان کے مطابق "آراکوئے" ہے۔ یعنی اپنی حفاظت خود کرتا ہے۔ بدھ مت کے ماننے والوں نے سات ایسے افراد چنے جو اس مجسمے کو واپس لانے کے لیے اپنی جان لٹانے کو تیار تھے۔ ان کے ساتھ بھانڈیل اسٹیٹ کے پانچ نہایت خطرناک اور تربیت یافتہ کمانڈوز بھی شامل ہوئے۔ ان کمانڈوز کا سربراہ انڈین اسپیشل فورسز کا ایک سابقہ افسر رنجیت پانڈے تھا۔ رنجیت پانڈے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے لیے عزرائیل کا دوسرا نام ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس پانڈے کی مطلوبہ رقم موجود ہے تو وہ پانڈے سے دنیا کے کسی بھی محفوظ ترین اور وی آئی پی شخص کو قتل کرا سکتا ہے۔ اسے ایک بلا کہا جاتا ہے۔ ایسی بلا جو بہت جلد خود ختم ہو جائے گی یا پھر اس کے ہاتھوں کئی اہم ترین لوگ ختم ہو جائیں گے۔ پانڈے کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ صرف بڑے کاموں میں ہاتھ ڈالتا ہے۔

ہماری بدقسمتی کہ جو لوگ گندھارا آرٹ کے اس مجسمے کو پاکستان سے واپس لانے کے لیے انڈیا سے پاکستان میں داخل ہوئے، ان کا لیڈر یہی رنجیت پانڈے تھا۔ پانڈے اور اس کے ساتھیوں نے تیزی سے تفتیش کی اور صرف تین چار ہفتے کے اندر مجسمے کے آس پاس پہنچ گئے۔ یہ مجسمہ کم از کم چھ سات ہاتھوں سے ہو کر ابرار صدیقی تک آیا تھا اور حقیقت میں دیکھا جائے تو ان سات آٹھ افراد میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ پیس یعنی مجسمہ کچھ لوگوں کے

لیے کتنا قیمتی ہے اور اسے ڈھونڈنے کے لیے کتنے بڑے پیمانے پر کوششیں کی جا رہی ہیں۔ تمہیں یاد ہوگا، ابرار صدیقی نے پہلے یہ "پیس" لاہور میں رکھا ہوا تھا۔ وہاں اسے شک ہوا کہ کچھ مشکوک لوگ اس کے اردگرد موجود ہیں۔ وہ پیس کو لاہور سے اُٹھا کر جہلم لے گیا اور بڑی راز داری سے اسے اپنے فردوس پلازہ والے فلیٹ میں چھپا دیا۔ اس فلیٹ سے یہ "پیس" تمہارے اس قاتل دوست عمران نے حاصل کر لیا اور میرے پاس لال کوٹھی میں لے آیا۔ ہم اپنی کامیابی پر خوش تھے مگر نہیں جانتے تھے کہ اس کامیابی کے ساتھ ساتھ کتنی بڑی مصیبت ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے کمانڈوز نے ابرار صدیقی کے فلیٹ تک رسائی حاصل کی۔ انہوں نے ابرار کے ایک محافظ کو قتل اور دوسرے کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ ابرار صدیقی لاپتا ہو گیا تھا۔ دراصل وہ پانڈے کے خوفناک شکنجے میں تھا۔

نادیہ کی موت کا پانچواں روز تھا۔ جب رات کے وقت پانڈے اور بھانڈیل اسٹیٹ کے نہایت خطرناک کمانڈوز لال کوٹھی میں گھس آئے۔ ان کے ساتھ بدھ مت کے وہ چند جنونی پیروکار بھی تھے جنہوں نے مقدس مجسمے کے حصول کے لیے اپنی جان واقعی ہتھیلی پر رکھی ہوئی تھی۔ آگے کے حالات کا تم اندازہ لگا سکتے ہو۔ ان لوگوں نے نہ صرف وہ پیس حاصل کیا بلکہ مجھ پر بھی رائفلیں تان لیں۔ اس رات کی شدید خونی کشمکش میں میرے تین باڈی گارڈز میری آنکھوں کے سامنے اپنی جان ہارے۔ عارف خان کو گولی لگی اور تین چار افراد شدید زخمی ہوئے۔ میری چلائی ہوئی ایک گولی ایک کمانڈو کی گردن سے پار ہو گئی لیکن وہ حیران کن طور پر زندہ رہا۔ وہ لوگ مجھے مجسمے سمیت لاہور ہی کی ایک نامعلوم چار دیواری میں لے گئے۔ یہ غالباً ماڈل ٹاؤن کی کوئی بہت پُرانی کوٹھی تھی۔ اس میں کسی انگریز میاں بیوی کی قبریں بھی تھیں۔ مجھے ایک تہہ خانے میں رکھا گیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ وہاں ایڈووکیٹ ابرار صدیقی پہلے سے موجود تھا۔ اس کے جسم پر تشدد کے نشانات تھے۔ اس کے جسم پر ابھی تک کالا کوٹ اور سفید پتلون تھی۔ وہ کوئی معمولی بندہ نہیں لیکن اس وقت بے بسی کی تصویر نظر آتا تھا۔

مجھ پر بھی جسمانی تشدد کیا گیا۔ مجھ سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا گیا جنہوں نے مقدس مجسمہ جہلم کے فلیٹ سے چرا کر میرے پاس پہنچایا تھا۔ میں نے انہیں سچ بتانے میں ہی بہتری سمجھی۔ نہ بھی بتاتی تو انہیں معلوم ہو ہی جانا تھا۔ میں نے انہیں تمہارا، اقبال اور عمران وغیرہ کا نام بتا دیا۔" میڈم بُری طرح کھانسنے لگی۔ مسلسل بولنے سے اس کا گلا خشک ہو گیا تھا۔

"میں ان لوگوں کے ہاتھ کیسے آیا؟" میں نے پوچھا۔

''دراصل تم...... سراج اور شیرے وغیرہ کے پاس تھے۔ تمہیں مجید مٹھو والے خالی مکان میں رکھا گیا تھا۔ چوٹ لگنے کے بعد تم اپنے حواس میں نہیں تھے۔ نہ کسی کو پہچانتے تھے نہ بات کرتے تھے۔ پانڈے کے لوگ اسی حالت میں تمہیں مجید مٹھو کے مکان سے پکڑ لائے اور ہمارے ساتھ ماڈل ٹاؤن کے تہہ خانے میں بند کر دیا۔''

میں نے ذہن پر زور دیا لیکن ایک دبیز دھند کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ کوئی ہلکا سا خیال بھی ذہن میں نہیں اُبھرتا۔''

''ہاں...... تمہاری چوٹ کافی شدید تھی۔ پورے سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ آنکھیں سوج کر نیلی ہو چکی تھیں۔ دیکھ کر خوف آتا تھا۔''

میں نے میڈم صفورا کی طرف دیکھا۔ میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔ میں نے التجائی لہجے میں کہا۔ ''میڈم! آپ نے کہا ہے کہ ہم سب اس وقت ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ کیا میں آپ سے امید رکھوں کہ آپ مجھے شدید ذہنی اذیت سے بچانے کے لیے میرے ایک سوال کا جواب ٹھیک ٹھیک دیں گی؟''

''ہاں...... پوچھو۔''

''میڈم! میری بہن اور بھائی کا کیا ہوا؟''

''میں جانتی تھی، تم یہی پوچھو گے۔ ان دونوں کے بارے میں میرے پاس تمہارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں تو بُری بھی نہیں۔ بلکہ تم اسے تھوڑی سی رعایت کے ساتھ اچھی خبر بھی کہہ سکتے ہو۔ تمہاری والدہ والے واقعے کے چار پانچ روز بعد تک وہ دونوں سراج کے ہتھے نہیں چڑھے تھے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ لاہور میں تھے ہی نہیں۔ شاید کراچی کی طرف نکل گئے تھے۔ پانچویں روز میں خود پانڈے وغیرہ کے ہاتھوں بے بس ہو گئی۔ اس کے بعد مجھے کسی کے حالات کا کچھ پتا نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔''

''اور میری والدہ...... میرا مطلب ہے کہ ان کی میت؟'' میں نے آنسو بہاتے ہوئے پوچھا۔

''انہیں کوٹھی کے احاطے میں ہی دفنایا گیا تھا۔''

''دفنایا گیا تھا یا دبایا گیا تھا؟'' میں نے کربناک لہجے میں پوچھا۔

''مجھے اس بارے میں تفصیل معلوم نہیں۔'' میڈم نے نظریں چرائیں۔

میرا دل دُکھ سے لبریز ہو گیا۔ تو کیا میری ماں کو کفن بھی نہیں مل سکا تھا کیا واقعی ایسا ہوا

تھا؟

میں کتنی ہی دیر گم صم بیٹھا رہا۔ میڈم بھی خاموش رہی۔ گئے وقت کا کرب ایک مہیب لہر کی طرح ہم دونوں کے درمیان موجزن رہا۔ آخر میڈم صفورا نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''اب تمہارے ذہن میں یہ سوال اُبھر رہا ہوگا کہ پانڈے جیسے سفاک شخص نے ہمیں قتل کیوں نہ کیا؟ یا ہڈیاں وغیرہ توڑ کر وہیں کیوں نہ پھینک آیا؟ ہمیں اپنے ساتھ یہاں بھانڈیل اسٹیٹ کیوں لایا؟''

یہ سوال واقعی بڑی شدت سے ذہن میں اُبھر رہا تھا۔ میں نے بھیگی ہوئی سوالیہ نظروں سے میڈم کو دیکھا۔ اس نے بولنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر ایک دم چپ رہ گئی۔ پگوڈا کے مین دروازے سے تین افراد اندر داخل ہو رہے تھے۔ ان میں بھکشو کوئی نہیں تھا۔ دو مقامی تھے۔ ایک انگریز تھا۔ وہ درمیانی عمر اور اچھے مضبوط جسم کا مالک تھا۔ حیرانی کی بات تھی کہ اس نے بھی مقامی لباس پہنا ہوا تھا۔ یہ پاجامے کُرتے اور انگرکھے پر مشتمل تھا۔ پگوڈا کے احترام میں وہ اور اس کے ساتھی ننگے پاؤں چلتے ہوئے آ رہے تھے۔ وہ قریب پہنچے تو مجھے سفید فام شخص کے چہرے پر نقشِ خباثت اور سفاکی دکھائی دی۔ اس کی بڑی بڑی نیلگوں آنکھیں یقیناً ایک جاہ طلب حریص شخص کی آنکھیں تھیں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ جارج گورا ہے۔ اگلے دو چار منٹ میں میرا یہ اندازہ درست ثابت ہو گیا۔

جارج نے مجھے کینہ توز نظروں سے گھورا اور بولا۔ ''کورتی کے ساتھ کیا کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ کیا ایک بار پھر تم یہاں سے بھاگنا مانگتا ہے؟''

وہ حیران کن طور پر صاف اردو بول رہا تھا۔ بس لہجے کا فرق تھا۔

میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ جارج کا ساتھی، مقامی شخص بولا۔ ''صاحب! موہن کمار جی نے شاید ٹھیک ہی مشورہ دیا ہے۔ اس کی ٹانگیں گھٹنوں پر سے کاٹ دینی چاہئیں۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔''

دوسرا شخص جو سانولی رنگت کا تھا، کرخت آواز میں بولا۔ ''اوئے! دیکھتے ناہیں ہو کہ صاحب بہادر آئے ہیں۔ کیسے گنواروں کی طرح پھسکڑ امارے بیٹھے ہو۔ کھڑے ہو جاؤ۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے پاؤں کی ہلکی سی ٹھوکر رسید کی۔

میں کھڑا ہو گیا۔ سانولا شخص پھر گرجا۔ ''دیدے کیوں پھاڑتے ہو؟ نیچے دیکھو۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے تھپڑ رسید کر دیا۔ تھپڑ بہت زوردار تو نہیں تھا لیکن شاید ہاتھ بھاری تھا یا کیا وجہ تھی۔ میرا نچلا ہونٹ پھٹ گیا اور تیزی سے خون کے قطرے گرنے

لگے۔ جارج اور اس کے دونوں ساتھی مجھے مسلسل خشمگیں نظروں سے گھور رہے تھے۔

پہلا شخص جارج کو بھڑکانے والے انداز میں بولا۔ ''یہ اس حرافہ کے کرتوتوں میں برابر کا شریک ہے جی! اوپر سے گھنا بنا رہتا ہے۔ اندر سے سب کچھ جانت ہے۔''

جارج نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں مجھے اپنے لیے رقابت کی جھلک نظر آئی۔ غالباً اس رقابت کا سر چشمہ سلطانہ ہی تھی۔ میری معلومات کے مطابق جارج، سلطانہ کے پیچھے تھا اور سلطانہ نے جارج کی جارحیت سے بچنے کے لیے آناً فاناً مجھے اپنا شوہر بنالیا تھا۔ اب وہ میری بیوی تھی اور میں اس کے بچے کا باپ تھا۔ کہنے والے تو یہی کہہ رہے تھے اور یہی صورتِ حال تھی جس نے جارج کی آنکھوں میں میرے لیے بے پناہ رقابت بھر دی تھی۔

یکا یک جارج اور اس کے ساتھی چونکے۔ ایک فربہ اندام گرو اچانک ہی کوٹھڑی کے دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے صفاچٹ چہرے پر جھریاں اور آنکھیں سرخ تھیں۔ اس کے گلے میں موٹے دانوں والی بڑی مالائیں اس کے اونچے رُتبے کو ظاہر کرتی تھیں۔ وہ ہاتھ میں عصا لیے کھڑا تھا۔ اس کے عقب میں دو بھکشو ادب سے ہاتھ باندھے ہوئے تھے۔

جارج نے گرو کو مقامی انداز میں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔ گرو نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔ تاہم گرو کے چہرے پر برہمی کے آثار موجود تھے۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' اس نے ضعیف آواز میں دریافت کیا۔

''کچھ ناہیں گرو جی! یہ بدتمیزی کر رہا تھا۔'' گہرے سانولے رنگ والے شخص نے کہا۔

''تم نے اسے کیا مارا ہے؟'' گرو کے لہجے میں بدستور تلخی تھی۔

''کچھ ناہیں گرو جی!'' اس مرتبہ جارج نے جواب دیا۔ ''یہ فضول بول رہا تھا۔ تیواری نے تھپڑ مارا ہے۔''

آج میں دن کی روشنی میں پہلی بار دھیان سے تیواری کی شکل دیکھ رہا تھا۔ گہری رنگت والا یہ شخص کسی شکاری کتے کی طرح چوکنا اور خبردار تھا۔ شاید اس کا کام ہی یہاں سے بھاگنے والوں کو پکڑنا تھا۔

گرو کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ جارج کے جواب سے بالکل مطمئن نہیں ہوا۔ وہ ناراض لہجے میں بولا۔ ''میں ہمیشہ سے یہی کہتا آیا ہوں کہ یہ بدھ مندر ہے۔ یہ پریم اور آشتی کا دوارا ہے۔ یہاں پر خون خرابا ہماری سکھشا کے خلاف ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم ہاتھ میں ہتھوڑا لے کر بدھ مندر کی دیواریں گرانا شروع کر دیں۔ چھی چھی..... کتنے افسوس کی بات

ہے۔ ایک جیتے جاگتے بندے کا خون مندر کے فرش پر گرتا ہے اور ہم کھڑے دیکھت ہیں۔''

گرو نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھے۔ ان میں سے ایک نے ایک کپڑے سے فرش پر گرا خون صاف کرنا شروع کیا۔ دوسرے نے اپنا گیروا رومال میرے ہونٹوں پر رکھ دیا تاکہ مزید خون گر کر فرش کو داغ دار نہ کرے۔

گرو نے خشک لہجے میں کہا۔ ''میں آپ لوگوں سے بنتی کرتا ہوں کہ بدھ مندر کی سندرتا کو اس طرح داغ دار نہ کریں۔ اگر یہاں آپ کا کوئی اپرادھی ہے تو پھر اسے یہاں سے لے جائیں۔ اس کے ساتھ جو بھی خون خرابا کرنا چاہت ہیں، باہر جا کر کریں۔''

جارج ذرا ترش انداز میں بولا۔ ''بڑے گرو جی! آپ بار بار خون خرابے کا ورڈ کیوں استعمال کر رہا ہے۔ یہاں کسی نے کسی پر تلوار ناہیں چلایا۔ ایک تھپڑ کو آپ خون خرابا کیوں کہہ رہا ہے۔''

''کیا یہ پہلی بار ہے کہ یہاں ایسا ہوا ہے؟'' بڑے گرو کی آواز میں دبی دبی آگ تھی۔ ''میں نے بہت برداشت کیا لیکن اب مجھ سے برداشت ناہیں ہوتا۔ ہم یہاں اس دوارے میں پریم، آشتی اور بلیدان کی سکھشا دیوت ہیں۔ اگر ہمارے کہنے اور کرنے میں اتنا فرق ہووے گا تو پھر سب کچھ برباد ہو جاوے گا۔''

''بڑے گرو! آپ خوامخواہ بات کو بڑھا رہا ہے۔ اٹ از ناٹ فیئر۔'' جارج بولا۔

''میں بات ناہیں بڑھا رہا۔ میں صرف یہ کہنا چاہت ہوں کہ اگر کوئی اپرادھی ہے اور آپ اسے سزا دینا چاہت ہیں تو پھر اسے یہاں سے لے جاویں۔ بس۔''

جارج کا چہرہ سرخ انگارہ ہو چکا تھا۔ آنکھوں میں جیسے نیلا زہر بھر گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔ ویسا ہی ہوگا جیسا بڑے گرو چاہیں گے۔''

اس کے بعد وہ مڑا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ لمبے ڈگ بھرتا بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

بڑے گرو نے مجھے قدرے ترحم کی نظروں سے دیکھا۔ پھر اپنے ساتھی بھکشوؤں سے کہا کہ وہ میرے ہونٹ کا خون بند کرنے کے لیے ٹھنڈے پانی اور راکھ کا استعمال کریں۔ کچھ اور بھکشو بھی وہاں جمع ہو گئے تھے۔ بڑے گرو کے سامنے ان کے سر تعظیم سے جھکے ہوئے تھے۔ بڑا گرو ان کے سامنے چلتا ہوا پگوڈے کے اندرونی حصے کی طرف واپس چلا گیا۔

سہ پہر ہوتے ہی ایک بار پھر مجھے عجیب طرح کا اندیشہ لاحق ہو گیا۔ ڈاکٹر چوہان نے مجھے بتایا تھا کہ ہم ''مجسمہ چوری'' کے لیے پگوڈا میں سزا بھگت رہے ہیں۔ ہماری سزاؤں میں

فاقہ کشی کے علاوہ مار پیٹ کی سزا بھی شامل ہے۔ ہمیں یعنی مجھے، میڈم صفورا اور ابرار صدیقی کو ہر شام پگوڈا سے باہر نکالا جاتا ہے اور سنگِ مرمر کی سفید سیڑھیوں پر اوندھا لٹایا جاتا ہے پھر ہمیں زائرین کے سامنے مقررہ تعداد میں بید مارے جاتے ہیں۔ دو دن پہلے یہ سزا میں ایک بار تو بھگت چکا تھا، تاہم اس کے بعد ابھی تک کوئی ایسا واقعہ رُونما نہیں ہوا تھا۔ بہرحال میرے ذہن میں اندیشہ موجود تھا اور سہ پہر کے وقت یہ اندیشہ ایک دم بہت بڑھ جاتا تھا۔ میڈم صفورا سے میری ملاقات دوبارہ ہو چکی تھی لیکن اس کی سزا کے بارے میں، مَیں اس سے کچھ پوچھ نہیں سکا تھا۔ بہرحال یہ شام بھی خیریت سے گزر گئی۔ میرے پاؤں میں زنجیر بدستور موجود تھی اور مجھے بہت تنگ کر رہی تھی۔ میرے پاؤں آزادی چاہتے تھے۔ میں اپنی مرضی سے اپنے جسم کو حرکت دینا چاہتا تھا اور یہ خواہش کسی وقت اتنی شدید ہو جاتی تھی کہ دم گھٹنے لگتا تھا۔ نیند کی حالت میں بھی جیسے یہ احساس ذہن کی گہرائیوں میں موجود رہتا کہ میرے پاؤں کے ساتھ ایک نہایت ناپسندیدہ بوجھ موجود ہے۔

سلطانہ کے حوالے سے بھی میرے ذہن میں اندیشے موجود تھے۔ وقتِ رخصت اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں میرے تصور میں گھومتی رہتی تھیں۔ اس کا بچے کو چومنا پھر الوداعی انداز سے مجھے دیکھنا۔ غنی صاحب، چوہان اور دیگر لوگوں نے مجھے بتایا تھا کہ میری بیوی کی حیثیت سے سلطانہ نے میرے لیے بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ وہ اَن گنت موقعوں پر میرے لیے ڈھال بنی ہے اور اپنی زندگی خطرے میں ڈالی ہے۔ پتا نہیں کہ میں اس کا محبوب تھا یا نہیں لیکن اس کا شوہر ضرور تھا اور وہ ہر طرح سے شوہر پرست عورت لگتی تھی۔ وہ اپنا سرخ عروسی جوڑا اپنے جھولے میں ساتھ لیے پھرتی تھی اور یہ بات بھی یاد رکھنے والی تھی کہ بقول چوہان، سلطانہ نے مجھے تحفظ دینے کے لیے اپنا وہ قیمتی اثاثہ یعنی مہاراج بہادر کی دی ہوئی مہر بھی استعمال کر ڈالی تھی۔ حالانکہ وہ مہر سلطانہ اور اس کے گھرانے کو بڑے سے بڑا فائدہ پہنچا سکتی تھی۔

اب سلطانہ خود خطرے میں تھی۔ معلوم نہیں کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا تھا۔ جارج گورا کو تو میں دیکھ ہی چکا تھا۔ میں نے اس کے کردار کے بارے میں جو سنا تھا وہ اس کے عین مطابق تھا۔ چہرے پر خباثت اور عورت کی بھوک اس کی آنکھوں میں نقش تھی۔ پھر میں بالو کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا وہ واقعی میرا بچہ تھا...... میرا خون؟

اچانک کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور صفورا اندر آ گئی۔ پچھلے دو برس میں وہ کافی کمزور ہو چکی تھی اور شاید یہی حال میرا تھا۔ یہ اس مسلسل فاقہ کشی کا نتیجہ تھا جو یہاں ہم سے زبردستی کرائی

جاتی تھی۔ اب بھی کل دوپہر سے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے بھکشو ہمیش آیا تھا اور اس نے خاموشی سے تھوڑے سے بھنے ہوئے چاول مجھے دیئے تھے، یہ چاول وہ حسبِ سابق اپنی چادر کے پلو میں باندھ کر لایا تھا۔

اندر آتے ہی میڈم صفورا نے پوچھا۔ ''کل جارج اور بڑے گرو جی میں کوئی جھگڑا ہوا تھا؟''

میں نے اثبات میں جواب دیا اور صفورا کو اپنا زخمی ہونٹ دکھایا۔

وہ تاسف سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''یہ بہت بُرا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب جارج تمہیں پگوڈا سے نکالنے کی کوشش کرے گا۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں جیل میں لے جایا جائے۔ ابھی حکم جی زرگاں سے باہر ہے۔ ایک دو روز میں وہ آ جائے گا۔ پھر تمہارا یہاں پگوڈا میں رہنا مشکل ہو گا۔''

''تو یہ جگہ بھی جیل سے کون سی کم ہے۔ جیل میں شاید کھانا تو ملے گا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں...... ایسی بات نہیں...... جو کچھ بھی ہے لیکن یہ ایک عبادت گاہ ہے۔ یہاں کچھ اصول اور قاعدے ہیں۔''

''سیڑھیوں پر لٹا کر لوگوں کے سامنے پیٹھ پر بید مارنا کون سا سنہری اصول ہے۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''بید ہی مارے جاتے ہیں نا...... الٹا لٹکا کر چمڑی تو نہیں ادھیڑی جاتی۔ عورتوں کو بے عزت تو نہیں کیا جاتا اور اب یہ بید مارنے والی سزا بھی تو ختم ہو چکی ہے۔ سات آٹھ مہینے پہلے ہی میرے اور ابرار کے ساتھ یہ سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ اب کم از کم ہمیں تو بید نہیں مارے جاتے۔''

''لیکن مجھے تو منگل کو بھی بید مارے گئے ہیں۔'' میں نے کہا اور وہ ساری تکلیف و توہین ذہن میں تازہ ہو گئی جو مجھے جھیلنا پڑی تھی۔

''لیکن منگل کے بعد تو ایسا کچھ نہیں ہوا نا اور میرا خیال ہے کہ آئندہ بھی نہیں ہو گا لیکن اب یہ جو جارج اور بڑے گرو کی تکرار والا معاملہ ہے، یہ تمہارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ صدیقی کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہوا تھا۔''

''ہاں...... مجھے صدیقی کے بارے میں پوچھنا تھا۔ وہ کہاں ہے؟''

''اسے بھی بڑے گرو اور موہن کمار کی تکرار کے بعد جیل جانا پڑا تھا۔ سات آٹھ مہینے تک اسے جیل میں بہت ''ٹف ٹائم'' گزارنا پڑا ہے۔ بہرحال اب وہ دوسرے پگوڈا میں ہے

اور کسی حد تک سکون میں ہے۔"

کچھ بھکشو لڑکیاں کنول کے پھولوں سے بھری ہوئی ٹوکریاں لے کر اندر جا رہی تھیں۔ ان کے پیچھے کچھ نوجوان بھکشو چاندی کے گول طشت اُٹھائے ہوئے جا رہے تھے۔ میری کوٹھڑی کے اردگرد مکمل سکوت تھا۔ میں نے میڈم صفورا سے کہا۔ "کل ہماری گفتگو کا سلسلہ اچانک ٹوٹ گیا تھا۔ آپ مجھے یہ بتانے لگی تھیں کہ پانڈے جیسے بے رحم شخص نے ہمیں لاہور میں قتل کیوں نہ کر دیا یا ہڈیاں وغیرہ توڑ کر وہیں کیوں نہ پھینک دیا۔ چوری کے جرم میں ہمیں یہاں بھانڈیل اسٹیٹ کیوں لے آیا؟"

میڈم صفورا نے کوٹھڑی کی کھردری دیوار سے ٹیک لگا کر ایک گہری سانس لی اور بولی۔ "یہ صرف چوری کا معاملہ نہیں تھا۔ ایک "خاص" مجسمہ چوری ہوا تھا جو "مت" کو ماننے والوں کے لیے ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ مت کی تعلیمات کے مطابق اپرادھیوں کے لیے ایک کڑی سزا مقرر تھی۔ اگر اپرادھی یعنی ہم اس سزا سے بچ جاتے تو اس کا وبال گروحضرات پر اور پورے مٹھ پر آتا۔ لہٰذا ہمیں سزا کے لیے یہاں زندہ لایا جانا ضروری تھا۔ کم از کم دو چار افراد کو تو یہاں ضرور پہنچنا چاہیے تھا اور اگر زیادہ لوگ پہنچ جاتے تو یہ پانڈے اور اس کے ساتھیوں کی "ایکسٹرا پرفارمنس" تھی۔ اب ہم اسے اپنی خوش قسمتی کہہ لیں یا بدقسمتی...... کہ ہم پاکستان میں پانڈے کی یورش سے تو بچ گئے لیکن عمر قید بھگتنے کے لیے یہاں پہنچ گئے۔ ہم کل پانچ افراد یہاں آئے تھے۔ تم، میں، ابرار صدیقی، عنایت علی اور کرامت سندھو۔ عنایت اور کرامت سندھو کو تم نہیں جانتے بلکہ میں بھی نہیں جانتی۔ بہر حال یہ بھی اس سلسلے میں شامل تھے اور مجسمہ ان لوگوں کے ہاتھوں سے ہو کر صدیقی تک پہنچا تھا۔ ان دونوں بندوں کو پانڈے اور اس کے ساتھیوں نے بہاولپور سے پکڑا تھا۔ بہر حال یہ لوگ بعد میں یہاں سے بھاگنے کی کوشش میں مارے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ جنگل میں انہیں تیندوؤں نے مار دیا تھا۔ اب ہم تین یہاں باقی ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ ہمارا "اینڈ" کیا ہوتا ہے۔"

میرے اور صفورا کے درمیان تادیر گفتگو ہوتی رہی۔ میڈم صفورا نے تصدیق کی کہ میں نے سات آٹھ ماہ یہاں پگوڈا میں سزا کاٹی ہے۔ ہم سے جبری فاقے کرائے گئے ہیں، ہم نے ماریں کھائی ہیں، صفائیاں کی ہیں، غلاظت خانے دھوئے ہیں اور پتا نہیں کیا کچھ...... میڈم جب یہ باتیں کر رہی تھی، میرے ذہن میں دھندلے سے نقش بنتے اور بگڑتے تھے مگر کچھ بھی یاد نہیں آتا تھا۔ میڈم نے اس بات کی تصدیق بھی کی کہ میں یہاں سے فرار ہونے کی کئی کوششیں کر چکا ہوں۔

میں نے کہا۔ "میڈم! مجھے یہ بات غنی صاحب اور پھر چوہان نے بھی بتائی تھی مگر مجھے اس پر یقین نہیں ہوا تھا لیکن اب ہوش میں آنے کے بعد میں خود اس تجربے سے گزر رہا ہوں۔ یہاں زرگاں پہنچنے سے ایک رات پہلے میں پڑاؤ سے بھاگ گیا تھا۔"

میں نے طوفانی بارش میں اپنے ناکام فرار کی ساری روداد میڈم صفورا کے گوش گزار کی اور یہ بھی بتایا کہ آخر میں مجھے کس طرح بالکل غیر متوقع طور پر پکڑ لیا گیا۔ بالکل جیسے تاریک زمین نے تیواری اور ڈیوڈ وغیرہ کو اُگل دیا ہو اور وہ اچانک میرے سامنے آن کھڑے ہوئے ہوں۔

میں نے کہا۔ "میڈم! میری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی کہ یہ لوگ وہاں اچانک کیسے نمودار ہو گئے۔ یہ سخت حیران کرنے والی بات ہے۔ میری جگہ کوئی اور بندہ ہوتا جسے جادو ٹونے اور عملیات وغیرہ پر یقین ہوتا تو فوراً اس کا دھیان ان چیزوں کی طرف چلا جاتا۔ مگر یہ سب کچھ میری سمجھ سے باہر ہے۔"

صفورا نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں...... کچھ ایسی باتیں تو میں نے بھی سنی ہیں کہ پنڈت مہاراج کی آشیرباد سے حکم جی کو روحانی طاقت حاصل ہے اور اس طاقت کی وجہ سے حکم جی کا کوئی قیدی ان کی مرضی کے بغیر اس راجواڑے کی حد سے نہیں نکل سکتا۔ اگر کوشش کرے تو پکڑا جاتا ہے یا مارا جاتا ہے اور پچھلے کئی برس سے ایسا ہی ہو رہا ہے۔"

"کیا آپ کو اس بات پر یقین ہے؟"

"نہیں...... یقین تو نہیں...... لیکن...... جب بہت سے لوگ ایک ہی بات کہیں اور بار بار کہیں تو دماغ اُلجھ ضرور جاتا ہے۔ اب تم بھی ایک تجربہ بیان کر رہے ہو اور یہ تمہارا ذاتی تجربہ ہے۔ ایسی باتوں سے لگتا ہے کہ اس معاملے میں کوئی نہ کوئی بھید ضرور ہے جسے سمجھنے کی ضرورت ہے اور یہ روحانی طاقت والی بات صرف قیدیوں کی حد تک ہی نہیں ہے، مقامی لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ "حکم جی" کئی ایسے کام کر سکتے ہیں جو عام لوگوں کے لیے ممکن نہیں۔"

بات کرتے کرتے اچانک صفورا کا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ سب سے پہلے میری نظر تیواری لال کے گہرے سانولے چہرے پر ہی پڑی۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا پگوڈا کے صحن میں داخل ہوا تھا اور اب میری کوٹھڑی کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ سبز وردیوں والے تین چار مسلح اہلکار بھی تھے۔ ان کی رائفلیں کینوس کے غلافوں میں بند تھیں اور وہ پگوڈا کے احترام میں ننگے پاؤں تھے۔

صفورا نے ٹھٹکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ وہ تمہارے لیے ہی آئے ہیں۔"

دیکھتے ہی دیکھتے وہ لوگ سر پر پہنچ گئے۔ ان کے پیچھے ایک بوڑھا بھکشو لاٹھی ٹیکتا چلا آ رہا تھا۔ تیواری کی آنکھوں میں مجھے اپنے لیے صاف طور پر طیش اور حسد دکھائی دے رہا تھا۔ بوڑھے بھکشو کے ہاتھ میں چابیوں کا ایک چھوٹا سا گچھا تھا۔ اس نے صفورا کو مخاطب کر کے کہا۔

''کورتی! تم مٹھ میں واپس جاؤ۔ یہاں کیا کرت ہو؟ یہاں تمہارا کوئی کام نا ہیں۔''

صفورا اُٹھی اور مایوس نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی کوٹھڑی سے نکل گئی۔ بوڑھے بھکشو نے ایک چھوٹی چابی کی مدد سے میرے گلے کا آہنی کڑا کھول دیا۔ ایک دوسرا بھکشو آگے بڑھا اور اس نے پاؤں سے زنجیر علیحدہ کر دی۔

''چلو۔'' تیواری لال نے تحکم کہا۔

''کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔'' اس کے ساتھ ہی ایک باوردی شخص نے مجھے دروازے کی طرف دھکا دیا۔

میں نے دیکھا، بوڑھے بھکشو کی آنکھوں میں میرے لیے ترحم تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ بے بسی بھی تھی۔ وہ میرے لیے کچھ کر نہیں سکتا تھا۔

باوردی اہلکار مجھے پگوڈا سے باہر لے آئے۔ یہاں سیڑھیوں پر ایک کوڑھی شخص کو بیدوں کی سزا دی جا رہی تھی۔ اردگرد کئی افراد کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ مجھے ایک بند گھوڑا گاڑی میں بٹھایا گیا۔ جونہی گاڑی کا دروازہ بند ہوا، تیواری لال نے مجھے سر کے بالوں سے پکڑ کر زوردار جھٹکے دیئے اور گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

میں خاموشی سے سنتا رہا۔ باوردی افراد بھی مجھے کینہ توز نظروں سے گھور رہے تھے۔ دس پندرہ منٹ بعد گاڑی ایک بہت بڑی پختہ عمارت میں داخل ہوئی۔ لگتا تھا کہ یہ انگریزی دور حکومت کا کوئی بہت بڑا دفتر ہے لیکن کچھ دیر بعد پتا چلا کہ یہ قدیم عمارت زرگاں کی جیل ہے۔ میں نے قیدیوں کو خاکی وردی میں ملبوس اِدھر سے اُدھر جاتے اور مشقت وغیرہ کرتے دیکھا۔ ان کی قمیصوں پر ہندی میں کچھ لکھا تھا اور نمبر لگے ہوئے تھے۔

مجھے گاڑی سے اُتار کر ایک دفتر میں پہنچایا گیا۔ یہاں نہایت کرخت شکل والا ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا تھا۔ اس نے میرے کوائف لکھے پھر ایک رجسٹر پر دو تین جگہ میرا انگوٹھا لگوایا۔ مجھے نمبر الاٹ کیا گیا 412۔ اس کے بعد مجھے پاجامے کرتے پر مشتمل خاکی وردی دی گئی۔ مجھے ایک غلیظ کمرے میں دھکیل دیا گیا تاکہ میں وردی پہن سکوں۔ میرے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ ان احکامات پر عمل کروں۔ میرا اندازہ تھا کہ اب مجھے کسی بیرک میں

دھکیل دیا جائے گا جہاں نہایت واہیات قسم کے بدبودار لوگ بند ہوں گے لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ مجھے ایک چھوٹے احاطے میں لے جا کر ایک دوسری گھوڑا گاڑی میں بٹھایا گیا۔ اس گاڑی میں صرف ایک گھوڑا تھا۔ باوردی افراد بدستور میرے ساتھ موجود تھے لیکن اب ''سیاہ چہرہ'' تیواری لال نظر نہیں آ رہا تھا۔ گھوڑا گاڑی ایک چھوٹے دروازے سے باہر نکلی۔ غالباً یہ جیل کا کوئی عقبی دروازہ تھا۔ دس پندرہ منٹ تک سفر کرنے کے بعد ہم ایک عمارت میں داخل ہوئے۔ میں گھوڑا گاڑی سے باہر نکلا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ راج بھون کی پُرشکوہ عمارت یہاں سے بس نصف فرلانگ کے فاصلے پر نظر آ رہی تھی۔ میں جس عمارت میں کھڑا تھا، یہ بھی کافی شاندار تھی۔ اس کے ادھ کھلے مین گیٹ میں سے ندی کا شفاف پانی جھلک دکھا رہا تھا، عمارت کے سرسبز لانوں میں سفید کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور کچھ لوگ شاہانہ ٹھاٹ باٹ کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

تب ہی میری نظر جارج گورا پر پڑی۔ وہ عمارت کے اندرونی دروازے سے نکل کر آیا تھا۔ اس کی بغل میں ایک قبول صورت لڑکی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں گلاس تھا۔ ایک باوردی اہلکار نے سیلیوٹ مارنے کے بعد کہا۔ ''بندہ حاضر ہے سر!''

جارج گورا نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ ''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔ ابھی اسے سرونٹ کوارٹر میں لے جاؤ۔ باتھ وغیرہ کرواؤ۔ دوسرے کپڑے دو۔ پھر ہم اس کے بارے میں بتائیں گا۔''

مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں جارج گورا کی رہائش گاہ پر ہوں۔ مجھے دھکیل کر سرونٹ کوارٹر میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں دیگر ملازمین بھی موجود تھے۔ وہ میرے ابتر حلیے اور زخم زخم جسم کو دلچسپ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک دو نے مجھ پر فقرے بھی کسے۔ مجھے ایک کوارٹر میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں ہٹے کٹے جسم اور عقابی آنکھوں والا ایک ملہوترا نامی ملازم میرا روم میٹ تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا ملہوترا یہاں گھوڑوں کا ٹرینر تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ سرکش سے سرکش گھوڑا بھی جب پہلی بار اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہے تو اس کی آدھی سرکشی ختم ہو جاتی ہے۔

رات کو سونے سے پہلے ملہوترا نے مجھ سے کہا۔ ''سنا ہے کہ تمہیں بھاگنے کی بیماری ہے۔ یہاں اس بیماری سے دور ہی رہو گے تو اچھا ہووے گا۔ رات کو احاطے میں تین کتے کھلے چھوڑے جاوت ہیں اور ان میں سے ہر کتا تیندوے سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ بندے کو پھاڑتے پہلے ہیں، اس کا نام بعد میں پوچھتے ہیں۔''

رات کو واقعی کوٹھی کے احاطے کی طرف سے دیوہیکل کتوں کی دبی دبی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ یقیناً یہاں کافی تعداد میں پہرے دار بھی موجود تھے۔ کوٹھی کے اندر کہیں مدھم آواز میں پیانو بج رہا تھا اور رقص کی دھن فضا میں بکھر رہی تھی۔ میں جب تک سو نہیں گیا ملہوترا بھی جاگتا رہا اور بیڑی کے کش لیتا رہا۔ یقیناً وہ میرا روم میٹ ہونے کے ساتھ ساتھ میرا نگران بھی تھا۔

صبح جاگنے کے ساتھ ہی میرے ذہن میں پھر اَن گنت اندیشے سر اُٹھانے لگے۔ مجھے گلوڈا سے جیل لے جایا گیا تھا مگر وہاں بھی ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں رکھا گیا تھا۔ اب یہاں میرے ساتھ نہ جانے کیا سلوک ہونے والا تھا۔ ناشتے کے فوراً بعد ملہوترا مجھے لے کر عمارت کے عقب میں گیا۔ یہاں ایک بہت بڑا اصطبل تھا۔ کم وبیش ڈیڑھ سو چھوٹے بڑے گھوڑے تو یہاں ہوں گے۔ خچروں کے لیے ایک بہت بڑا واڑا علیحدہ سے بنایا گیا تھا۔

ملہوترا نے مجھ سے کہا۔ ''تمہیں یہیں پر کام کرنا ہے۔ کچھ کام تو تمہیں آتے ہوں گے، کچھ کام تھوڑے سے تجربے کے بعد سیکھ جاؤ گے۔ گھوڑوں کی لید وغیرہ ڈھونے کے لیے کسی خاص ٹریننگ کی ضرورت نا ہیں ہووے ہے۔ ہاں...... ان کا کھریرا کرنا، ان کو دوا وغیرہ کھلانا۔ یہ کام ذرا مشکل ہوویں ہیں۔ یہ آٹھ دس دن میں سیکھ جاؤ گے۔ نا ہیں سیکھو گے تو پھر میں سکھا دوں گا۔'' آخر میں اس کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا۔

بدبو سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''یہ کام مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔''

''دیکھو...... یہاں اس سے گندے گندے کام بھی موجود ہیں۔ اسے گورا صاحب کی مہربانی جانو کہ تمہیں اصطبل تک رکھا ہے۔ وہ دیکھو، وہاں کتوں کا واڑا ہے۔ اس سے آگے پالتو سور ہیں۔ سوروں کے گند میں رہ لو گے؟'' اس نے آخری الفاظ بڑی ''محبت'' سے کہے۔

اگلے تین چار دن میری مصروفیت بے حد کڑی اور ناپسندیدہ رہی۔ مجھے علی الصباح منہ اندھیرے اُٹھنا پڑتا تھا۔ اس کے لیے ایک الارم تھوڑے تھوڑے وقفے سے تین بار بجایا جاتا تھا۔ ایک رات میں نے ایک بہت تیز اور کریہہ آواز والا سائرن بھی سنا۔ پتا چلا کہ یہ خطرے کا سائرن ہے اور عموماً عمارت کے قریب کسی جنگلی جانور کی موجودگی کے وقت بجایا جاتا ہے۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی اصطبل میں میرا کام شروع ہو جاتا تھا۔ اصطبل کے دروازے ساری رات بند رہتے تھے لہٰذا الصباح جانوروں کی جو بُو اندر سے اُٹھتی تھی وہ نا قابلِ برداشت ہوتی تھی۔ اصطبل میں کم و بیش تیس ملازم تھے۔ ملہوترا ان کا سیکنڈ انچارج تھا۔ وہ سارا دن اصطبل کے طول وعرض میں دندناتا اور ملازموں کو ڈانٹتا ڈپٹتا رہتا۔ مجھ پر وہ خاص شفقت فرماتا تھا۔

کسی چھوٹی سی غلطی کے لیے بالوں سے پکڑ کر بُری طرح جھنجھوڑ دیتا تھا اور مقامی لہجے میں گالیاں دیتا تھا۔ وہ مجھے کسی ایک کام پر ٹکنے بھی نہیں دیتا تھا۔ کبھی مالشیوں میں شامل کر دیتا تھا، کبھی گھوڑوں کو کھریاں لگانے والوں میں۔ کبھی چارے کا انتظام کرنے والوں میں۔ گاہے بہ گاہے وہ مجھے سخت طنز کا نشانہ بھی بناتا تھا۔

ایک دن میرے قریب سے گزرا تو ایک سینئر ملازم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اوئے نادر! لید کی ٹوکری اس کے کندھے پر کیوں رکھوائی ہوئی ہے۔ تمہیں پتا نا ہیں یہ سلطانہ راجپوت کا شوہر نامدار ہے۔ آخر کوئی عزت ہووے ہے شوہر نامدار کی۔''

سینئر ملازم نے فوراً ٹوکری میرے کندھے سے اُٹھا لی۔ ملہوترا بڑی محبت سے بولا۔ ''مہروز جی! آپ ان چار سفید گھوڑیوں کا کھر کھرا کر لیں۔ دوپہر کے بھوجن تک کے لیے یہ کام کافی ہے۔''

کھر کھرا یعنی کھریرا میرے لیے ایک مشکل کام تھا۔ میں اس میں صرف پندرہ بیس فیصد مہارت ہی حاصل کر پایا تھا۔ ایک ملازم نے کھریرے والا برش مجھے پکڑا دیا۔ میں ڈرتے ڈرتے پہلی گھوڑی کے پاس گیا۔ وہ اُچھل کر ایک طرف ہو گئی۔ میں نے دوسری کوشش کی تو اس نے ایک دم گھوم کر لات چلائی۔ میں الرٹ تھا اس لیے سنگین ضرب سے بچ گیا۔ اس کے باوجود لات میرے کندھے پر لگی اور میں اُلٹ کر کچی زمین پر جا گرا۔ یہ جگہ پیشاب اور لید سے لتھڑی ہوئی تھی۔ میرا ایک پہلو اور چہرے کی سائیڈ بُری طرح لتھڑ گئی۔ اردگرد موجود افراد ہنسنے لگے۔ جی چاہا کہ ان میں سے کسی ایک پر جھپٹ پڑوں اور دو چار گھونسے تو ضرور جڑوں لیکن پھر اس کے بعد کی صورتِ حال ذہن میں آئی اور دل مسوس کر رہ گیا۔

ملہوترا کے اشارے پر سینئر ملازم نے مجھے سہارا دے کر اُٹھایا اور بولا۔ ''تم سے پرسوں بھی کہا تھا۔ پیچھے سے نا ہیں، سائڈ کی طرف سے آوت ہیں۔''

''اصل میں مہروز صاحب کے ساتھ یادداشت کا مسئلہ ہے بھئی۔'' ملہوترا نے طنزیہ لہجہ اختیار کیا۔ ''ان کی یادداشت کے ساتھ عجیب گڑبڑ گھوٹالا ہے۔ ان کو دس دن کی باتیں یاد آتی ہیں تو پچھلے دس دن کا دروازہ بند ہو جاوت ہے۔ یہ اپنے ٹائپ کے بڑے انوکھے مریض ہیں۔ ان کو تو کسی میوزیم میں ہونا چاہیے جہاں لوگ انہیں دیکھنے آویں اور بھگوان کے چمتکار کا نظارہ کریں۔'' اس قسم کے مذاق میرے ساتھ اکثر کیے جاتے تھے۔

ایک دوپہر عجیب تماشہ ہوا۔ میرے علاوہ چھ سات ملازمین اصطبل میں موجود تھے۔ ہم

گھوڑوں کے لیے چارا بنا رہے تھے۔ خشک اور تر چارے کو علیحدہ علیحدہ کاٹنا اور پھر اسے مکس کر کے کھرلیوں میں ڈالنا ایک نہایت مشقت مطلب کام تھا۔ ہم پسینے سے شرابور ہو رہے تھے۔ اچانک ایک خوبصورت لڑکی بھاگتی ہوئی آئی۔ غالباً وہ یہ سمجھی تھی کہ اصطبل کے اس حصے میں کوئی موجود نہیں۔ اس نے اندر آ کر دروازہ تیزی سے بند کرنا چاہا مگر ایک شخص دروازے کو دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔

لڑکی ہنستی اور بل کھاتی ہوئی اصطبل کے اندرونی حصے کی طرف بھاگی۔ اس کے پیچھے آنے والا مرد اسے پکڑنے کے لیے دوڑا۔ ہم دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ وہ کوئی اور نہیں یہاں کا کرتا دھرتا جارج گورا تھا۔ وہ نشے میں تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے جسم پر بس ایک پتلون تھی۔ وہ بڑے رومانی موڈ میں دکھائی دیتا تھا۔ اس نے جلد ہی لڑکی کو پکڑ لیا اور گھاس کے ایک بڑے ڈھیر پر گرا لیا۔ لڑکی کے جسم سے ہنسی فوارے کی طرح پھوٹ رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں گم ہونے لگے۔

ملہوترا تیزی سے سرگوشی میں بولا۔ ''چلو چلو...... باہر چلو۔'' وہ ملازمین سے مخاطب تھا۔

ملازمین نے شوخ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور خاموشی سے باہر کھسک گئے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ جارج گورا اور لڑکی گھاس کی حرکت میں گم ہو چکے تھے۔

میں دنگ رہ گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ عمارت جارج کی شکارگاہ ہے۔ وہ جہاں اور جب چاہتا ہے، شکار کرتا ہے۔ اپنی طلب کی شدت میں وہ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ اس کے اردگرد کا ماحول کیا ہے۔ یہاں کے لوگ غالباً اس کے مزاج کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ موقع کے لحاظ سے اپنا ردِعمل ظاہر کرتے تھے۔ جیسے انہوں نے اب کیا تھا۔ وہ خاموشی سے باہر نکل آئے تھے۔ ابھی تو مالک نشے میں تھا۔ کل وہ ہوش میں ہوتا تو جواب طلبی کرتا کہ جب وہ اتنے شدید رومانی موڈ میں تھا تو وہ لوگ موقع سے دفعان کیوں نہیں ہوئے تھے۔

ابھی تک میرے ساتھ سختی کا سلوک نہیں ہوا تھا، مطلب جسمانی تشدد سے ہے۔ ہاں...... اگر بارہ گھنٹے کی شدید مشقت کو دیکھا جائے تو اسے جسمانی تشدد بھی کہا جا سکتا تھا۔ ذہنی تشدد اس کے علاوہ تھا۔ یعنی طنزیہ انداز اور بعض اوقات گالم گلوچ۔ ذہن میں وہ جو ایک اندیشہ سا تھا کہ شاید مجھے اُلٹا لٹکایا جائے گا یا اس نوع کی کوئی اور کارروائی ہوگی، ابھی تک غلط نکلا تھا۔ لیکن پھر ایک روز ایسا کچھ ہوا جس نے ساری کسر نکال دی۔ وہ میری زندگی کا ایک ایسا ناقابلِ فراموش واقعہ ہے کہ جسے اپنے خونی آنسوؤں سے تحریر کروں تو بھی حق ادا نہ ہو اور یہ ایسا واقعہ تھا جس نے مجھے بدلا، میری سوچ کو بدلا اور شاید زندگی کا رُخ ہی بدل دیا۔ میں وہ

نہ رہا جو تھا اور وہ ہو گیا جو نہیں تھا۔ جو ہزار کوشش کے باوجود نہیں بن سکتا تھا۔ ہاں...... وہ ایسے ہی کایا پلٹ لمحے تھے۔

شام کے بعد کا وقت تھا۔ میں اصطبل کے کام سے تھک کر چُور ہو چکا تھا۔ لگتا تھا کہ بستر پر گرتے ہی سو جاؤں گا۔ میں نے سارے دن کی بدبو اور پسینے کی چپچپاہٹ کو صاف کرنے کے لیے غسل خانے کا رُخ کیا۔ شیو کئی دن سے بڑھی ہوئی تھی لیکن شیو کرنے کا سامان نہیں تھا۔ میں نے نیم ٹھنڈے پانی سے نہانے کے بعد کپڑے بدلے اور کھانا کھایا۔ ابھی بستر پر لیٹنے ہی لگا تھا کہ ایک شخص کوارٹر میں داخل ہوا۔

اس نے مجھ سے کہا۔ ''تمہیں بڑے صاحب بہادر نے بلایا ہے۔''

''کیوں...... خیریت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''خیریت کا پتا تو تمہیں وہاں جا کر ہی لگے گا۔ ویسے ڈرنے کی بات ناہیں۔ صاحب بہادر کا ذاتی ملازم اچانک چھٹی پر چلا گیا ہے۔ تمہیں ایک دن کے لیے اس کی جگہ لینی ہے۔''

''ابھی جانا ہوگا؟''

''ناہیں...... جانا تو دو تین روز بعد ہے۔ میں نے سوچا کہ آپ کو پہلے ہی بتا دوں تاکہ آپ اپنے مصروف وقت میں سے تھوڑا سا وقت نکال سکیں۔'' سخت طنزیہ لہجے میں کہا گیا۔

میں اُٹھ کر اس شخص کے ساتھ چل دیا۔ وہ مجھے وسیع گراسی لان میں سے گزار کر عمارت کے رہائشی حصے میں لے گیا۔ یہ قدیم طرز کی عمارت شاہانہ ٹھاٹ باٹ رکھتی تھی۔ بلند چھتیں، محرابی دروازے، پتھر کے چکنے فرش، دبیز پردے، غالیچے اور نادر قالین۔ غرض وہ ہر شے یہاں دکھائی دیتی تھی جس کا تصور کسی بہترین رہائشی عمارت میں کیا جا سکتا تھا۔ یہاں جنریٹرز کے ذریعے بجلی مہیا کی گئی تھی اور وہ ساری آسائشیں بھی موجود تھیں جن کے لیے بجلی ضروری ہوتی ہے۔ باوردی ملازمین بے آواز چلتے اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ ان میں مرد و زن دونوں شامل تھے۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ ملازموں کی اس فوج ظفر موج کے ہوتے ہوئے میری خدمت کی کیا ضرورت پڑ گئی؟ اس میں کوئی چکر لگتا ہے۔ میں ایک طویل راہداری سے گزر کر ایک شاندار بیڈ روم میں پہنچا۔ یہاں خوشبوؤں کا بسیرا تھا۔ کھڑکیوں پر مخملی پردے تھے۔ سجاوٹ کی امپورٹڈ اشیا اور دیواروں پر سجی ہوئی ان جانوروں کی ٹرافیاں جو جارج گورا کے دستِ ستم کا شکار ہوئے تھے۔ بیکال رائفلوں کے ایک نہایت قیمتی جوڑے کے نیچے دیوار پر ایک رائل بنگال ٹائیگر کی کھال آویزاں تھی۔

میرے ساتھ آنے والے شخص نے مجھے بیڈ روم کی جھاڑ پونچھ کا حکم دیا۔ کھڑکیوں کے

پردے تبدیل کیے جانے تھے اور پھر بیڈ شیٹ بدلنی تھی۔ ایک طرف بہت سے تازہ پھول پڑے ہوئے تھے۔ ان پھولوں کو گلدانوں میں سجانا تھا اور واش روم پر بھی ایک نظر ڈالنی تھی۔

اگلے آدھ پون گھنٹے میں، مَیں نے یہ کام کر دیئے اور ایک طرف قالین پر بیٹھ گیا۔ مجھے یہاں لانے والا شخص اندر آیا۔ اس نے ناقدانہ نظروں سے بیڈ روم کا جائزہ لیا۔ ایک دو نقص نکالے، میں نے وہ نقص دور کیے۔ وہ مجھے لے کر ایک اور کمرے میں آ گیا۔ یہ کمرہ عجیب وضع کا تھا۔ بالکل جیسے کوئی لفٹ ہو۔ لگتا تھا کہ یہ چھوٹا سا چوکور کمرہ سارے کا سارا دھات کا بنا ہوا ہے۔ اس کی پیمائش آٹھ فٹ ضرب دس فٹ ہوگی۔ یا شاید اس سے تھوڑی سی زیادہ۔ یہاں ایک طرف کی دیوار میں آہنی سلاخیں تھیں لیکن سلاخوں کی دوسری طرف بھی کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ سلاخوں سے آگے قریباً چار فٹ کے فاصلے پر ایک بلائنڈ شیشہ تھا۔

ملازم نے مجھے اس کمرے میں دھکیل دیا۔ ''مجھے یہاں کیا کرنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''قوالی۔'' اس نے مختصر جواب دیا اور دروازہ لاک کر کے باہر چلا گیا۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سلطانہ اس وقت میرے آس پاس موجود ہے اور جلد ہی میری اس سے ملاقات ہونے والی ہے۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ طبیعت میں عجیب سی بے چینی تھی۔ مجھے یہاں کیوں لایا گیا تھا؟ کیا جارج مجھ سے کسی طرح کی پوچھ گچھ کرنے والا تھا یا اس کی رقابت مجھے کسی اذیت سے دوچار کرنے والی تھی۔

اچانک مجھے یوں لگا کہ میرے دونوں پاؤں پر کسی نے بڑے زور سے لٹھ رسید کی ہو۔ ٹانگیں جھنجھنا اُٹھیں بلکہ پورا جسم جھنجھنا گیا۔ میں تڑپ کر کرسی سے نیچے گرا اور لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ میرے پورے جسم پر جیسے ہتھوڑے برس گئے تھے اور پھر ایک دم سب کچھ تھم گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے کرنٹ لگایا گیا ہے۔ میرے جسم میں غالباً صرف تین چار سیکنڈ کے لیے برقی لہر دوڑی تھی لیکن اس نے مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

میں کچھ دیر تک سکتہ زدہ وہیں پڑا رہا۔ پھر اُٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر دوسرا حملہ ہوا اور یہ پہلے سے کچھ شدید تھا۔ میرا پورا جسم پھر برقی رو کی زد میں آ گیا۔ اس دفعہ میں اوندھے منہ آہنی فرش پر گرا اور ایک بار پھر مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ اس مرتبہ میرے منہ سے بے ساختہ دردناک آوازیں نکلیں۔ میں چلا رہا تھا اور چلاتا جا رہا تھا۔ مجھے لگا کہ آخری وقت آ گیا ہے۔ بس وہ ایک قیامت تھی جس کی شدت کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا اور تب ایک بار پھر اچانک سب کچھ تھم گیا۔ جیسے کسی عفریت نے مجھے نگلنے کے بعد دوبارہ اُگل دیا ہو۔

میں کراہنے لگا۔ میرا سارا جسم لرز رہا تھا اور درد کی ٹیسیں بے حال کر رہی تھیں۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے کیا کیا ہے؟ میرا جرم کیا ہے؟'' میں خوف زدہ ہو کر چلایا۔

یہ خوف بے پناہ شدت کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوا کہ ابھی اس دھاتی کمرے میں پھر کرنٹ چھوڑا جائے گا اور میں موت اور زندگی کے درمیان جھول جاؤں گا۔ سزا دینے والا سامنے ہو تو اور بات ہوتی ہے۔ یہاں سزا دینے والے کا پتا تھا، نہ سزا کی وجہ معلوم تھی۔ نہ یہ پتا تھا کہ اس سزا سے بچنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔ یہ زیادہ خطرناک صورتِ حال تھی۔ مجھے لگا کہ دہشت سے میرے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔ میں اس چوکور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اسٹیل کا یہ سلائڈنگ ڈور لاک تھا۔ میں نے اس پر بے دریغ مکے برسائے لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ نہ ہی کسی نے میری آواز سنی۔ میں ننگے پاؤں تھا اور برقی رو کسی بھی وقت دوبارہ فرش میں اور دیواروں میں دوڑ سکتی تھی۔ ایک اضطراری حرکت کے تحت میں کرسی پر چڑھ گیا۔ اپنے دونوں پاؤں سمیٹ کر اوپر رکھ لیے۔ لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ بظاہر عام نظر آنے والی یہ کرسی بھی دھات کی ہے۔ اس مرتبہ کرنٹ لگا تو میں جیسے کرسی کے ساتھ ہی چپکا رہ گیا۔ پورا جسم شدید ارتعاش کی زد میں آیا اور میرے حواس مختل ہونے لگے۔ مجھے لگا کہ میں بے ہوش ہو رہا ہوں، پھر شاید کبھی ہوش میں نہ آنے کے لیے۔ میری نگاہوں میں اپنے پیاروں کی شکلیں گھومیں۔ فرح، عاطف اور ثروت...... کیا انہیں بھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ مجھ پر کیا گزری؟ میں کہاں اور کس حال میں شکار ہوا؟

میں مر رہا تھا۔ جب اچانک ایک بار پھر سب کچھ تھم گیا۔ مجھے لگا کہ میرے منہ سے رال گر رہی ہے اور ناک سے پانی بہہ رہا ہے۔ پورا جسم خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ میں نے اپنی ناک صاف کرنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا تو لگا کہ وہ منوں وزنی ہو گیا ہے۔ ان آخری برقی جھٹکوں کے دوران میں بُری طرح چلایا تھا اور میرے گلے کے اندر خراشوں کی جلن تھی۔

میں نے بولنا چاہا تو بولا نہیں گیا۔ میری یہ حالت بس آٹھ دس منٹ کے اندر ہو گئی تھی۔

کیوں ہو رہا تھا میرے ساتھ یہ سب کچھ؟ کیا یہ صرف رقابت کی کارستانی تھی؟ مجھے جسمانی اذیت دے کر لطف لیا گیا تھا؟ لیکن یہاں تو دیکھنے والا بھی کوئی نہیں تھا تو کیا کسی ویڈیو کیمرے وغیرہ کے ذریعے مجھے دیکھا جا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور وہی منحوس شخص مسکراتے چہرے کے ساتھ اندر آیا جو مجھے اس عقوبت خانے تک پہنچا کر گیا تھا۔ اس نے مجھے ایک تولیا دیا جس سے میں نے اپنا پسینہ پسینہ چہرہ پونچھا۔ اس کے ہاتھ میں ملک شیک کا گلاس تھا۔ اس نے مجھے ملک شیک پلایا۔ اس کے بعد مجھے تسلی دی کہ اب کچھ نہیں ہوگا۔ میں یہاں آرام کر سکتا ہوں۔ میں ایک سیکنڈ سے پہلے

یہاں سے نکلنے کا آرزومند تھا لیکن وہ مجھے یہاں رکھنے پر مُصر تھا۔ اس نے ایک کرسی کو اسٹریچ کر دیا۔ وہ آرام دہ کرسی بن گئی۔ وہ خود باہر چلا گیا۔

اگلے قریباً دو گھنٹے میں نے اسی لفٹ نما کمرے میں گزارے۔ میری حالت اب بہتر تھی لیکن وہ جو برقی رَو کا خوف سا دل میں جاگزیں ہو گیا تھا، وہ کسی طور نکل نہیں رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اب رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ اچانک آہنی کمرے کا دروازہ پھر کھلا اور ملازم نے مجھے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ ہم ایک خم کھاتے ہوئے کوریڈور سے گزر کر پھر اسی بیڈ روم میں آ گئے جسے ڈھائی تین گھنٹے پہلے میں نے اپنے ہاتھ سے صاف کیا تھا۔ مگر اب یہ بیڈ روم خالی نہیں تھا۔ یہاں جارج گورا کے علاوہ جو چہرہ مجھے نظر آیا، اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ یہ سلطانہ تھی جسے میری بیوی بتایا جاتا تھا۔ سلطانہ کی نظر مجھ سے ملی اور ایک دم جھک گئی۔ مجھے اس میں وہ دم خم نظر نہیں آیا جواب تک آتا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں روئی روئی تھیں۔ وہ صوفے پر بیٹھی تھی اور خاموشی سے ایک ٹی ٹرالی پر جھکی، چائے بنا رہی تھی۔ اس کا لباس بھی آج مختلف تھا۔ اس نے بروکیڈ کا چمکیلا سوٹ پہن رکھا تھا۔ آدھی آستینوں میں سے اس کے سڈول بازو جھلک رہے تھے۔ اس کے لمبے بال ایک موٹی چوٹی کی صورت میں اس کی گود تک پہنچ رہے تھے۔ ہاں...... زیور نام کی کوئی شے آج بھی اس کے جسم پر نہیں تھی۔

"تم بھی چائے پیئیں گا۔" جارج نے گلابی اردو میں پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ مسکرا کر بولا۔ "شاید تم بھی ان لوگوں میں سے ہو جن کو دوسروں کی وائف کا بنایا ہوا چائے اچھا لگتا ہے۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ اگر تم کسی دوسرے کی وائف کے ہاتھ کا چائے پینا مانگتا ہے تو اس کا انتظام بھی ہو جائیں گا آج کی رات۔ ویسے ہم تو آج کی رات تمہاری وائف کے ہاتھ کا چائے ہی پیئیں گا۔"

میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ جارج کی ذو معنی گفتگو اس کے خطرناک ارادوں کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ چوہان نے مجھے بتایا تھا کہ وہ جیل کا انچارج بھی ہے۔ اس کے لیے سلطانہ کو جیل سے نکال کر یہاں اپنے عشرت کدے میں لے آنا کون سا مشکل کام تھا؟ لیکن مجھے حیرانی سلطانہ کا غیر مزاحمتی رویہ دیکھ کر ہو رہی تھی۔ اس نے جارج کی ذو معنی گفتگو اَن سنی کر دی تھی اور خاموشی سے چائے بنا رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد مجھے اس کی سمجھ بھی آ گئی۔ میں سناٹے میں رہ گیا۔ میری نگاہ واش روم کے دروازے کے ساتھ ہی ایک سنہری چوکور شیشے پر پڑی۔ اس سے پہلے جب میں نے

اس کمرے کی صفائی کی تھی تو اس شیشے پر مخملی پردہ پڑا ہوا تھا۔ یہ وہی بلائنڈ شیشہ تھا جسے میں نے اپنے آہنی عقوبت خانے میں سے دیکھا تھا۔ بیڈ روم کی طرف سے یہ بلائنڈ نہیں تھا۔ یہاں سے عقوبت خانے کی آہنی سلاخیں اور سلاخوں کے پیچھے کا سارا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا، وہ دونوں کرسیاں جن پر میں بیٹھا تھا اور وہ خالی گلاس بھی جس میں سے میں نے ملک شیک پیا تھا۔

میں چکرا گیا۔ تو کیا اس بیڈ روم کے اندر سے کوئی میری اذیت کا تماشہ دیکھتا رہا ہے۔ وہ کون ہو سکتا تھا؟

جارج اور سلطانہ ہی ہو سکتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے سلطانہ کی آنکھوں کی غم زدہ سرخی بھی سمجھ میں آ گئی۔ "اوہ گاڈ۔" تو یہاں یہ تماشہ ہوا تھا۔ عقوبت خانے کا آہنی کمرہ ساؤنڈ پروف تھا، لہٰذا باہر کی کوئی آواز مجھ تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ ممکن تھا کہ میرے تڑپنے پھڑکنے کا منظر دیکھ کر سلطانہ نے واویلا مچایا ہو۔ داد فریاد کی ہو لیکن باہر کی کوئی آواز مجھ تک نہیں پہنچی تھی۔ اندھے شیشے کی وجہ سے میں باہر کا منظر دیکھنے سے بھی قاصر رہا تھا۔

میرا جی چاہا کہ نتائج سے بے پروا ہو کر اس سفید سور پر جھپٹ پڑوں۔ وہ سب کچھ کر گزروں جو کر سکتا ہوں لیکن دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا چہرہ سفید ہوتا جا رہا ہے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" جارج نے میری آنکھوں میں اپنی نیلی آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" میں گڑبڑا گیا۔

"میں بتاتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو؟ سلطانہ تمہارا وائف ہے اور تم اپنی وائف کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہو۔ شاید تمہارا دل چاہ رہا ہے کہ مجھ پر جھپٹ پڑو۔ میرے ساتھ فائٹ کرو۔ ایک زبردست فائٹ جسے دیکھ کر تمہاری وائف کا ہارٹ خوش ہو جائے۔ پھر تم میرے ہی پسٹل سے مجھ کو شوٹ کر دو اور اپنی وائف کا ہاتھ پکڑ کر بھاگتے ہوئے یہاں سے نکل جاؤ۔"

میں خاموش رہا۔ وہ بڑے زہریلے انداز میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میں سب جانتا ہوں تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ تم مجھے ایک بہت بڑا ولن سمجھ رہے ہو جس نے اپنے گارڈز کے زور سے تمہیں بے بس کیا ہے اور اب ایک کمزور عورت کو اپنی طاقت دکھانا چاہ رہا ہو۔ ایسا نہیں ہے مائی ڈیئر! بالکل بھی نہیں ہے۔ مجھے ولن بننا کبھی اچھا نہیں لگتا اور نہ ہی یہ اچھا لگتا ہے کہ کوئی مجھے ولن سمجھے۔ چلو، میں تمہیں ایک Heroic پیشکش کرتا

ہوں۔ تم سمجھو کہ تم قید نہیں آزاد ہو۔ تمہارے اردگرد کوئی گارڈ نہیں۔ بس میں اور تم اکیلے ہیں۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور مجھے سرتاپا دیکھ کر بولا۔ ''اور دیکھا جائے تو تم مجھ سے کمزور نہیں ہو۔ قد بھی مجھ سے تھوڑا سا زیادہ ہی ہوئیں گا۔ تم اپنی وائف کو یہاں سے لے جانے کے لیے مجھ سے دوبدو مقابلہ کرسکتا ہے۔ یس، مین ٹو مین اور میں پرامس کرتا ہوں کہ اگر تم نے مجھے زیر کرلیا تو تم سے کوئی بازپرس نہیں ہوگی۔ تم پوری آزادی کے ساتھ اپنی وائف کو لے کر یہاں سے جاسکے گا۔ آئی پرامس یو۔''

میں سکتہ زدہ کھڑا تھا۔ اس نے گلاس میں سے شراب کا ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا اور اپنی قمیص کے نیچے سے کولٹ پسٹل نکال کر سامنے قالین پر پھینک دیا۔ پسٹل کا فاصلہ جارج سے قریباً پندرہ فٹ اور مجھ سے صرف سات آٹھ فٹ کے قریب تھا۔ وہ کھلنڈرے انداز میں بولا۔ ''پسٹل اُٹھاؤ اور کوشش کرو میری باڈی میں ایک ہول کرنے کی۔ چلو شاباش۔''

میرے سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹنے لگے۔ وہ دعوت دے رہا تھا۔ پستول کا فاصلہ مجھ سے بہت کم تھا۔ اگر میں تیزی سے لپکتا تو پستول اُٹھا سکتا تھا۔

لیکن پھر وہی تذبذب...... وہی کم ہمتی...... وہی ناتوانی۔ مجھے اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ جونہی میں پستول کی طرف جھپٹوں گا، جارج بھی جھپٹے گا۔ وہ ایک گھاگ شکاری تھا۔ اس کا اعتماد دیدنی تھا۔ اس اعتماد نے مجھے لرزہ براندام کردیا۔ سلطانہ خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے ہونٹ خشک ہورہے تھے۔ اسے شاید اس ڈرامائی صورتِ حال کی توقع نہیں تھی۔

قریباً ایک منٹ گزر گیا۔ میری پیشانی سے پسینہ ٹپکنے لگا۔ میں پستول کی طرف نہیں بڑھ سکا۔ جارج کی آنکھوں میں استہزائیہ مسکراہٹ اُبھری۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے پاؤں کی حرکت سے پسٹل کو کچھ اور بھی میری طرف کھسکا دیا۔ تب وہ دوبارہ پہلے والی جگہ پر جا کر کھڑا ہوگیا۔ ''اب کیا خیال ہے شوہر صاحب؟'' اس نے پوچھا۔

پسٹل اب مجھ سے فقط چار پانچ فٹ کی دوری پر تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ لوڈڈ ہے۔ اس کا سیفٹی کیچ بھی ہٹا ہوا تھا۔ بس اس تک ہاتھ پہنچائے جانے کی ضرورت تھی۔ میں اب بھی ہمت نہیں کر پایا۔ میرے ہونٹ بالکل خشک ہوچکے تھے۔ میں یہ سمجھنے کی کوشش کررہا تھا کہ اگر میں پسٹل پکڑ کر گولی نہ چلا پایا تو کیا ہوگا۔ کیا جارج مجھے گولی ماردے گا؟ تب جارج آگے بڑھا اور اس نے پسٹل تقریباً میرے پاؤں میں رکھ دیا۔ ''شیر بنو! تھوڑی سی تو ہمت کرو۔'' وہ

بولا اور مجھ سے دس پندرہ فٹ کی دوری پر جاکھڑا ہوا۔

میرے ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ پسٹل میرے پاؤں میں تھا۔ ایک دم میرے دماغ میں دھند سی بھر گئی۔ میں جھکا۔ میں نے کولٹ پسٹل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یہی لمحے تھے جب میں نے کسرتی جسم والے جارج کو بجلی کی طرح اپنی طرف لپکتے دیکھا۔ اس کی پھرتی حیران کن تھی۔ شاید اس پھرتی کے پیچھے وہ گہرا اعتماد بھی تھا جو مجھ میں نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ میں پسٹل پکڑ کر پوری طرح سیدھا ہوپاتا، وہ مجھ پر آن پڑا۔

اس کا طوفانی مکا میرے جبڑے پر لگا، میں اُلٹ کر پیچھے گرا۔ جارج کا دوسرا ہاتھ میرے دائیں ہاتھ پر آیا تھا۔ اس ہاتھ میں پسٹل تھا۔ اس نے میری اس کلائی کو اتنی زور سے مروڑا کہ پسٹل، پکے ہوئے پھل کی طرح میرے ہاتھ کی شاخ سے جدا ہوگیا۔ اس نے میری ٹھوڑی پر اپنا گھٹنا رسید کیا۔ میں نے اسے ٹانگوں سے پکڑ کر گرانا چاہا لیکن وہ خاصا زور آور تھا۔ پُرتعیش زندگی گزارنے والے عام لوگوں کے برعکس اس کا جسم سڈول اور کافی حد تک پھرتیلا تھا۔ وہ گرنے سے بچ گیا اور میری گردن اپنے بازو کے شکنجے میں لے کر مجھے بے بس کردیا۔

سلطانہ اس دوران میں سکتہ زدہ بیٹھی رہی تھی۔ اس کا رنگ جو قندھاری اناروں کی طرح دہکتا تھا، زرد ہوچکا تھا۔ جارج نے میری گردن چھوڑی اور دوقدم پیچھے ہٹ کر بڑے فخریہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔ میرے ہونٹوں سے خون رسنا شروع ہوگیا تھا اور میں اس کا نمکین ذائقہ محسوس کررہا تھا۔ اس نے مجھے کھڑا ہونے کے لیے کہا۔ میں کھڑا ہوگیا۔ اس نے پسٹل اُٹھایا اور اس مرتبہ اسے میرے نیفے میں اڑس دیا۔ تب وہ ایک بار پھر دس بارہ فٹ دور جاکھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں نیلا زہر تھا اور چہرے پر اعتماد کی بے پناہ چمک۔ ہم دونوں آمنے سامنے اس کشادہ بیڈروم میں کھڑے تھے جس میں دنیا کی بہترین آرائشی چیزیں موجود تھیں اور یہ جارج کی شکارگاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ شاید آج وہ یہاں پھر ایک شکار کھیلنے والا تھا اور اس کے نشانے پر وہ راجپوت مسلم لڑکی تھی جسے میری بیوی کہا جاتا تھا۔ اپنے عالیشان بیڈ روم کی ایک دیوار کے ساتھ کھڑا جارج گورا بڑے خباثت بھرے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ یقیناً یہ بات اس کی انا کی تسکین کا باعث تھی کہ میں نے ایک ادنیٰ ملازم کی حیثیت سے آج اس کمرے کی صفائی اپنے ہاتھوں سے کی ہے۔ اسے چمکایا ہے اور پھولوں سے سجایا ہے۔ یہ بھی اذیت رسانی کی ایک قسم ہی تھی۔

وہ دونوں بازو اپنی دونوں جانب لٹکائے میرے سامنے کھڑا تھا۔ کاٹرائے کی پتلون اور

''ڈینم'' کی ہاف سلیو شرٹ میں سے اس کا ٹھوس جسم اپنی جھلک دکھا رہا تھا۔ وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''چلو برادر! ایک اور کوشش کرو۔ اب تو یہ اور بھی ایزی ہے۔ پسٹل تمہارے پاس ہے۔ چلو شاباش! مجھے وشواس ہے کہ تم کامیاب ہو جائیں گا۔''

میں ساکت و جامد کھڑا تھا۔ اس کی عقابی آنکھیں میری ہر حرکت کو نوٹ کر رہی تھیں۔ اپنے پچھلے پاؤں پر جھکے ہوئے کسی خطرناک تیندوے کی طرح ہی وہ مجھ پر جست لگانے کو بالکل تیار تھا۔ کہتے ہیں، خطرناک درندوں کی نظر ان کے شکار کو ہپناٹائز کر دیتی ہے۔ وہ حرکت نہیں کر سکتے۔ اپنا دفاع نہیں کر سکتے۔ بھاگ بھی نہیں پاتے۔ میں بھی شاید ہپناٹائز ہو چکا تھا۔ جارج کے بے پناہ اعتماد نے مجھے مبہوت کر دیا تھا۔ میں نے ایک اضطراری نگاہ سلطانہ پر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں بیچارگی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ جیسے بڑی اچھی طرح جان چکی تھی کہ جارج کا سامنا کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔

میں نے ایک بار پھر اپنی بچی کھچی طاقت جمع کی۔ اپنے دل و دماغ پر لعنت ملامت کے تازیانے رسید کیے۔ خود کو سمجھایا کہ پسٹل تمہارے پاس ہے، تمہارے ہاتھ سے بمشکل ایک فٹ کی دوری پر ہے۔ تم اسے پلک جھپکتے نکال سکتے ہو۔ جارج کے جست لگانے سے پہلے بآسانی اس پر فائر کر سکتے ہو۔

میرے جسم کے مساموں سے پسینہ بہہ نکلا۔ سینے کے اندر جیسے ایک مشعل زور سے پھڑ پھڑانے کے بعد ایک دم بجھ گئی۔ میرے دل نے کہا۔ ''تم یہ نہیں کر سکتے تابی! یہ تمہارے بس میں نہیں۔''

یہ کچھ ویسی ہی کیفیت تھی جو لاہور کے نواح میں ڈیک نالے کے کنارے تاریکی میں لہلہاتے سرکنڈوں کے پاس، مجھ پر اس وقت طاری ہوئی تھی جب عمران نے نالا پار کرنے کے لیے مجھے اپنی طرف بلایا تھا اور میں صد کوشش کے باوجود اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکا تھا اور یہ کوئی ایک موقع تو نہیں تھا۔ ایسے نہ جانے کتنے مواقع میری زندگی میں آ چکے تھے۔ میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ جارج کے سرخ ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ زیادہ گہری اور زہریلی ہو گئی۔ وہ نپے تلے قدموں سے میری طرف آیا۔ اس نے میری قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر اپنا پسٹل واپس لے لیا اور گمبھیر انداز میں بولا۔ ''لگتا ہے کہ تم انڈین فلمیں نہیں دیکھتا۔ ان فلموں میں تو ایسے موقعوں پر ہیرو ایک دم شیر ببر بن جاتا ہے۔''

میں خاموش رہا۔ وہ سلطانہ کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''سلطانہ ڈیئر! یہ شاید ہیرو ہے ہی نہیں۔ تم نے اسے خوانخواہ ہیرو بنایا ہوا تھا۔ اس کا جگہ تو تمہارے پاؤں میں بھی نہیں بنتا اور تم

نے پتا نہیں اسے کہاں تک اجازت دے رکھا تھا۔''

سلطانہ بھی خاموش رہی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس کے جسم سے پھوٹنے والی جنگلی پھولوں کی خوشبو نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔

جارج نے وہسکی کا ایک گھونٹ لیا اور میری طرف گھوم کر بولا۔ ''چلو باسٹرڈ! اب نکلو یہاں سے۔ اب یہاں تمہارا کوئی کام نہیں۔''

باسٹرڈ کی گالی میرے سینے پر گھونسے کی طرح لگی لیکن پچھلے تین چار گھنٹوں میں ایسے نہ جانے گھونسے میں سہہ چکا تھا۔ میں نے ہمت کر کے کہا۔ ''سلطانہ کا اگر کوئی قصور ہے تو اسے قانون کے مطابق سزا ملنی چاہیے۔ تم اسے جیل سے یہاں کیوں لائے ہو؟''

''یہاں اسے سزا دینے کے لیے نہیں محبت کرنے کے لیے لائے ہیں۔ مائی ڈیئر چوہے۔'' جارج نے دانت پیس کر گلابی اردو میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے گریبان سے پکڑ کر دروازے کی طرف دھکا دیا۔

میں چاندی کے ایک قیمتی گلدان پر گرا۔ گلدان نیچے لڑھک گیا۔ میں نے مزاحمتی نظروں سے جارج کو دیکھا۔ وہ ایک دم پھر آگ بگولا ہو گیا۔ ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو باسٹرڈ! ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟''

اس نے زنانے کا تھپڑ میرے منہ پر رسید کیا۔ پھر مجھے سر کے بالوں سے پکڑا اور دیوار پر دے مارا۔ وہ ایک بار پھر مجھ پر پل پڑا تھا۔ سلطانہ چلاتی ہوئی ہم دونوں کے درمیان آ گئی۔ اس نے میرا گریبان جارج کے ہاتھوں سے چھڑایا۔ پھر مجھے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے بولی۔ ''تم چلے جاؤ یہاں سے۔ میری قسمت (قسمت) میں یہی ہے۔ تم جاؤ۔''

اس کی آنکھیں نم تھیں۔ اس نے مجھے دروازے سے باہر دھکیلا۔ پھر دروازے کو ہولے سے بند کر کے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ اس کے چہرے کی بیچارگی کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

میں بند دروازے کو دیکھتا رہ گیا۔ میرا پورا جسم خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ ہٹا کٹا ملازم آگے بڑھا۔ اس کے ساتھ ایک گارڈ بھی تھا۔ عقب میں دو باوردی گارڈز مزید کھڑے تھے۔ ہٹے کٹے ملازم کی آنکھوں میں چھپا چھپا تمسخر تھا۔ ''چلو جی پتی دیو صاحب!'' اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا اور بازو سے پکڑ کر دوسری طرف لے چلا۔

جلد ہی مجھے واپس کوارٹر میں پہنچا دیا گیا۔ کوارٹر میں آج اتفاقاً میں اکیلا تھا۔ اصطبل کا

سیکنڈ انچارج اور میرا روم میٹ ملہوترا آج اپنے گھر گیا ہوا تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کیا اور چارپائی پر چت لیٹ گیا۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب تھا۔ سینے میں انگارے دہک رہے تھے۔ میں تصور کی نگاہ سے کچھ دل دوز منظر دیکھ رہا تھا۔ سلطانہ، جارج کے پنجہ ستم میں تھی۔ اس چار دیواری میں اسی چھت کے نیچے۔ پھر مجھے بالو کا خیال آیا، وہ پتا نہیں کہاں تھا؟ وہ بھی تو اپنی ماں کے ساتھ ہی جیل گیا تھا۔ شاید وہ بھی اسی چار دیواری میں کہیں تھا۔

مجھے لگا کہ میرے سر کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ہچکیوں سے رونے لگا۔ میں اتنا رویا کہ میرا بازو آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ مجھے اپنے آپ پر طیش آ رہا تھا۔ خود کو مار لینے کو دل چاہتا تھا۔ میں نے بلک کر فریاد کی۔ ''اے خدا! میری اس بے کار زندگی کو ختم کر دے۔ میں اور جینا نہیں چاہتا اور دُکھ سہنے کی ہمت نہیں۔ میں وہی رہوں گا جو ہوں۔ ایک بے کار، بزدل کمزور اور نحوستوں کا مارا انسان! میرے بخت میں تاریکیوں اور ذلتوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ میں ہار گیا ہوں یا رب......''

آج میں اس قدر ٹوٹا ہوا تھا کہ خدائے بزرگ و برتر کو پکارتے ہوئے بھی میرے لہجے میں تپش تھی۔ شاید یہ دعا نہیں تھی، شکوہ تھا۔ ایک ایک کر کے مجھے اپنے سارے کرتوت یاد آ رہے تھے۔ میں نے ثروت کو اپنی آنکھوں سے بربادی کی طرف جاتے دیکھا اور کچھ نہ کر سکا۔ میری ماں میرے سامنے اذیتیں سہہ کر مر گئی۔ میرا یار، میرا غمگسار سراسر میری بزدلی کا شکار ہو کر تاریکیوں کا رزق ہو گیا اور آج ایک غیر ملکی بدکار نے میری مبینہ بیوی کی آنکھوں کے سامنے میری بے مثال ذلت کا انتظام کیا۔ اس نے مجھے مزاحمت کرنے کے دلیرانہ مواقع دیئے اور بار بار مجھے شرمناک پسپائی سے دوچار کیا۔

میں روتا رہا۔ میری آنکھوں سے آتشیں آنسو بہہ کر میرے رُخساروں پر چلتے رہے اور میری بے بسی کا نوحہ پڑھتے رہے۔

نہ جانے کتنی ہی دیر اسی طرح گزر گئی۔ پھر کمرے میں روشن موم بتی پگھل پگھل کر ختم ہو گئی اور کمرے میں گہری تاریکی چھا گئی۔ کمرے سے باہر دیو ہیکل کتے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے اور گاہے بہ گاہے مسلح پہریداروں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ان پہریداروں میں دو گھڑ سوار بھی شامل تھے جو تھوڑے تھوڑے وقفے سے عمارت کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ اندر کی طرف چکر مکمل کرتے تھے۔

میں اس رات بہت رویا لیکن جتنا رویا، آنکھوں کی آگ اتنی ہی بھڑکتی گئی۔ میں نے

بڑی سنجیدگی سے سوچا کہ خود کو ختم کر لوں۔ کوارٹر کے باورچی خانے میں سبزی اور گوشت کاٹنے والی تیز چھری موجود تھی۔ میں اس سے اپنی کلائی کی رگیں کاٹ سکتا تھا اور موت کی آغوش میں پہنچنے کے لیے چارپائی پر چت لیٹ سکتا تھا۔ یا پھر الماری میں سے شراب کی وہ بوتلیں نکالتا جو ملہوترا نے اپنے استعمال کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔ اتنی زیادہ شراب اپنے معدے میں اُنڈیل لیتا کہ میری موت واقع ہو جاتی۔ اس طرح کے کچھ مزید جان لیوا خیال بھی ذہن میں آئے لیکن ان سب میں سے، چھری سے رگیں کاٹنے والا خیال غالب رہا۔

اس رات دل و دماغ کی کچھ ایسی کیفیت ہو گئی کہ میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ شاید یہ وہی کیفیت تھی جو دو ڈھائی سال پہلے مجھ پر لاہور میں طاری ہوئی تھی۔ میں گندم کی گولیاں نگلنے کے لیے سو فیصد تیار ہو گیا تھا۔ اس وقت تو عمران کی صورت میں ایک ''روشن چہرہ'' فرشتہ آیا تھا اور مجھے میرے ارادے سے روکنے میں کامیاب رہا تھا۔ لیکن آج یہاں کس نے آنا تھا؟ آج کسی نے نہیں آنا تھا۔

میں نہایت گہری تاریکی میں ٹٹولتا ہوا اُٹھا اور باورچی خانے میں سے نہایت تیز پھل والی چھری لے آیا۔ اندوہ کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ مجھے یہ سب کچھ آسان لگنے لگا تھا۔ میں بستر پر لیٹ گیا۔ گہری تاریکی میں آنکھیں بند کر لیں۔ یہی وقت تھا جب مجھے اپنے قریب سے کہیں عمران کی آواز سنائی دی۔ ''کیا کر رہے ہو تابی؟''

میں چونک کر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ ظاہر ہے کہ وہاں کوئی نہیں تھا مگر آواز اتنی صاف اور واضح تھی کہ میں ششدر رہ گیا۔ یہ صرف میرے تصور کا کرشمہ تھا۔

میں نے آنکھیں پھر بند کر لیں۔ عمران کا ہنستا مسکراتا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ اس نے بڑی ادا سے میری طرف دیکھا۔ ''جگر! بھول گئے جو میں نے کہا تھا؟''

''کیا کہا تھا؟'' میں نے اشک بار لہجے میں بہ زبان خاموش پوچھا۔

اس کے تصوراتی ہاتھ نے آگے بڑھ کر میری ناک کو چٹکی میں پکڑا اور بولا۔ ''لکڑی کے باندر! تیرا بھیجا بھی ایک دم فائیو اسٹار ہے۔ میں نے ایک مرتبہ خودکشی کے بارے میں کچھ بتایا تھا اور کہا تھا کہ اسے یاد رکھنا۔''

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور اس جھماکے کے ساتھ ہی عمران کا تصور اوجھل ہو گیا۔ تاہم یہ تصور اوجھل ہوتے ہوتے ایک ایسا جملہ میرے دماغ کو تھما گیا جس نے مجھے سر تا پا ہلایا اور میرے مُردہ جسم میں زندگی کی لہر دوڑائی۔

مجھے ان نہایت سنگین گھڑیوں میں عمران کا وہ بے مثال چمکیلا فقرہ یاد آیا جو اس نے مجھ

سے ملنے کے بعد لاہور میں کہا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ''اگر تمہیں خودکشی کرنی ہی ہے تو پھر اس کی ذمے داری خود پر نہ لو۔ بس اپنے آپ کو جان لیوا حالات کے دھارے پر چھوڑ دو۔ جو قدرت کو منظور ہوگا وہ ہو جائے گا۔''

اس کا یہ بھولا بسرا فقرہ اتنی شدت سے میرے دماغ میں آیا کہ سوچ کے بے شمار بند کواڑوں کو ایک دھماکے سے کھول گیا۔ شاید کچھ لمحے ایسے ہی انقلاب آفریں ہوتے ہیں اور کچھ لفظ ایسا ہی ''کایا پلٹ'' اثر رکھتے ہیں۔ میں مبہوت رہ گیا۔ وہ منوں وزنی بوجھ جو میرے سینے کو کچل رہا تھا، اچانک میرے سینے سے ہٹ گیا۔ مجھے لگا کہ مجھے اپنی نجات کی راہ نظر آ گئی ہے۔ یہ کیا ہوا تھا؟ یکا یک تبدیلی کی یہ کیسی ہوا چلی تھی میرے اندر؟ شاید یہ سب اس گریہ زاری کا صلہ تھا جو آج شب میں نے اپنے خدا کے حضور کی تھی اور ان بے شمار آنسوؤں کا اجر جو آج اس کمرے کی تیرگی میں، مَیں نے بہائے تھے۔ تو کیا قدرت نے بالآخر میری سن لی تھی؟ میں مرنا چاہتا تھا لیکن حرام موت مرنا نہیں چاہتا تھا اور مجھے راستہ نظر آ رہا تھا۔ وہی راستہ جو میرے یار نے مجھے ایک روز دکھایا تھا۔ آگے بڑھنے کا...... سنگین ترین خطرات سے ٹکرانے کا۔ موت کے پیچھے بھاگنے کا اور میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ میرے پورے جسم پر لرزہ طاری تھا لیکن یہ خوف کا لرزہ نہیں تھا۔ یہ کچھ اور تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا۔ باہر عمارت کے وسیع کمروں میں برقی روشنی تھی جو جنریٹرز سے مہیا ہوتی تھی۔ میرے کوارٹر سے چند گز کے فاصلے پر وہی ہٹا کٹا مسلح ملازم کھڑا تھا جو پانچ چھ گھنٹے پہلے مجھے کسی گائے بکری کی طرح ہانک کر عمارت کے اندرونی حصے میں لے گیا تھا اور ''عقوبت خانے'' کے حوالے کیا تھا۔ چھوٹی نال کی ایک رائفل اس کے کندھے سے لٹک رہی تھی۔ وہ ٹہلنے کے ساتھ ساتھ ٹرانزسٹر ریڈیو پر کچھ سن رہا تھا۔

وہ قطعی بے پروا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میں عجیب ذہنی کیفیت میں کوارٹر سے باہر نکل آیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرے ہاتھ میں کیا ہے۔ میں نے جوتی بھی پہنی ہوئی ہے یا نہیں۔ مجھے اردگرد موجود کوئی اور شخص دیکھ رہا ہے یا نہیں۔ رکھوالی کے خوفناک کتے کہاں ہیں؟ چھت پر موجود مسلح پہریدار کی پوزیشن کیا ہے؟ اور میں ان باتوں کے بارے میں سوچتا بھی کیوں؟ میں تو موت کا راہی تھا۔ مجھے مرنا تھا یا مار دینا تھا اور جتنی جلدی یہ مرحلے طے ہو جاتے، اتنا ہی بہتر تھا۔ میں اپنی دلی کیفیت بالکل کھول کر بیان کر رہا ہوں اور حقیقت یہی ہے کہ ان لمحوں میں مجھے اپنے اردگرد موجود تمام رکاوٹیں اور دیواریں یکسر حقیر نظر آئیں۔

میں اندھادھند مسلح شخص کی طرف بھاگا۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر وہ میری طرف مڑا اور اس وقت مجھے یہ احساس ہوا کہ میرے ہاتھ میں کوئی چیز دبی ہوئی ہے اور یہ وہی تیز پھل والی چھری تھی۔ مجھے یوں اپنی طرف آتے دیکھ کر گوبندر نامی یہ ملازم گھبرایا۔

''اوئے...... اوئے۔'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ میں اس پر جا پڑا۔ میں نے بایاں ہاتھ اس کے گریبان پر ڈالا۔ میرے دائیں ہاتھ کی ''مہلک حرکت'' میں میری عمرِ رفتہ کی ساری بے کسی، بیچارگی اور اذیت ایک عجب لہر بن کر دوڑ رہی تھی۔ تیز دھار چھری قریباً آٹھ انچ تک گوبندر کے چربی دار پیٹ میں گھسی۔ گوشت اور لوہے کا تصادم...... گوشت کٹنے کی آواز، گوبندر کی کربناک آہ اور اپنے ہاتھ پر گرم خون کے چند چھینٹے۔ یہ سب کچھ میں نے پورے ہوش و حواس کے ساتھ محسوس کیا۔

میں نے چھری کھینچی لیکن وہ نہیں نکلی۔ مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ کسی کو چھری ماری جائے تو وہ اس طرح پھنس بھی جاتی ہے۔ گوبندر پشت کے بل گرا۔ اس کی رائفل اس کے جسم سے علیحدہ ہو گئی۔ میں نے رائفل اُٹھائی۔ میری نگاہیں ایک لمحے کے لیے گوبندر کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔ وہ مجھے دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں دنیا جہان کی حیرت سمٹ آئی تھی۔ اب رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ مجھے ایک دفعہ عمران نے بتایا تھا کہ سیفٹی کیچ کہاں ہوتا ہے اور کیسے ہٹایا جاتا ہے۔ میں نے سیفٹی کیچ ہٹایا اور مین گیٹ کی طرف دوڑا۔ ابھی مین گیٹ سے پندرہ بیس قدم دور تھا کہ دو دیوہیکل کتے میری طرف جھپٹے۔ یہ خوفناک منظر تھا لیکن موت سے بڑھ کر خوف اور کس چیز کا ہو سکتا ہے اور میں ان لمحوں میں اس خو پر غلبہ پا چکا تھا۔ میں نے ٹریگر دبایا۔ دھماکوں کے ساتھ رائفل نے شعلے اُگلے۔ میں نے کم و بیش چھ فائر کیے۔ عمارت کے سناٹے تہلکہ خیز آوازوں سے گونج اُٹھے۔ دونوں کتے مجھ سے دس پندرہ قدم کی دوری پر گر گئے اور لوٹ پوٹ ہونے لگے۔

اب میرا رُخ گیٹ کی طرف تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ عمارت کے بیرونی گیٹ سے نکلنا میرے لیے اس قدر آسان ثابت ہوگا۔ یہاں تو خوفناک سرخ آنکھوں والے ڈشکرے چکراتے تھے اور ان کی رائفلوں پر چڑھی ہوئی سنگینیں لشکارے مارتی تھیں۔ رات کے اس پہر گیٹ پر صرف دو افراد موجود تھے۔ وہ سگریٹ پھونک رہے تھے اور ان کی رائفلیں چوبی کیبن کی دیوار کے ساتھ رکھی تھیں۔ انہوں نے دو تین سیکنڈ تو صورتِ حال کو سمجھنے میں لگا دیئے۔ پھر وہ رائفلوں کی طرف لپکے۔ ایک پہریدار ٹانگ پر گولی کھا کر راستے میں ہی گرا، دوسرا رُخ بدل کر باہر کی طرف بھاگا۔

میں دندناتا ہوا مین گیٹ سے باہر تھا۔ میرے دونوں ہاتھ بڑی مضبوطی سے رائفل پر جمے ہوئے تھے۔ میری آنکھوں میں لہو تھا۔ میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ مجھے دور درختوں میں ایک گھوڑا گاڑی کھڑی نظر آئی۔ میں اس کی طرف دوڑا۔ ''رُک جاؤ...... رُک جاؤ...... گولی مار دوں گا۔'' عقب سے ایک چنگھاڑتی ہوئی آواز آئی۔ میں نہیں رُکا۔ اب مجھے نہیں رُکنا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ عمارت میں بے شمار روشنیاں جل اُٹھی ہیں۔ ہر طرف خطرے کے مخصوص الارم بجنا شروع ہو گئے تھے۔

الارموں کی آواز بڑی تیز اور کریہہ تھی۔ جیسے کوئی بدبودار مکروہ جانور اپنے گروہ کو اکٹھا کرنے کے لیے چلا رہا ہو۔ یہ ڈوبتی اُبھرتی آواز عمارت کے مین گیٹ اور جنوب کی باؤنڈری وال کی طرف سے اُبھر رہی تھی۔ میری نگاہ گھوڑا گاڑی پر تھی۔ میں سیدھا گھوڑا گاڑی کی طرف گیا۔ گیس لیمپ کی مدھم روشنی میں گاڑی بان نے میرا حلیہ اور میرے تاثرات دیکھے تو اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ مجھے لگا کہ وہ گاڑی سے چھلانگ لگا کر بھاگ نکلے گا۔ اگر وہ بھاگ نکلتا تو یہ گاڑی میرے لیے بیکار تھی۔ میں گھوڑوں کو ہانک نہیں سکتا تھا۔

میں نے رائفل گاڑی بان کی طرف سیدھی کی اور پھنکار کر کہا۔ ''خبردار...... نیچے نہ اُترنا...... گولی مار دوں گا۔''

زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ میں نے اس انداز میں کسی کو دھمکایا تھا اور یہ خالی خولی دھمکی نہیں تھی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر اس شخص نے میری بات نہ مانی تو میں اسے گولی مار دوں گا اور یہی بات شاید درمیانی عمر کے اس گاڑی بان کو بھی معلوم ہو گئی تھی۔ وہ اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہ گیا۔ میں جست لگا کر گاڑی کے اگلے حصے پر سوار ہوا اور بے دریغ رائفل کی نال گاڑی بان کی فربہ گردن پر رکھ دی۔

''گاڑی بھگاؤ۔'' میں نے نال اس کی گردن میں دھنساتے ہوئے کہا۔ غیظ و غضب کی شدت سے میری آواز اتنی بگڑی ہوئی تھی کہ خود مجھ سے بھی پہچانی نہیں گئی۔

گاڑی بان نے ایک لحظے کے لیے تذبذب دکھایا۔ میں نے رائفل اس کے سر پر ماری۔ اس کی پگڑی اُچھل کر دور جا گری۔ اس کے ساتھ ہی اس نے باگیں تھام کر چابک دکھایا۔ گاڑی کے دونوں گھوڑے ایک جھٹکے سے آگے بڑھے۔ یہی وقت تھا جب میں نے عمارت کے آہنی گیٹ پر ہلچل دیکھی۔ گارڈز افراتفری میں باہر آ رہے تھے۔ بوکھلاہٹ اور تاریکی کے سبب انہیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ پہلے انہوں نے اندھا دھند

ہوائی فائرنگ کی۔ پھر کسی نے تیزی سے درختوں میں اوجھل ہوتی ہوئی گھوڑا گاڑی کو دیکھا۔

''وہ دیکھو۔'' ایک پکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔

اسی دوران میں گھوڑا گاڑی نے درختوں کے درمیان ایک موڑ مڑا اور بل کھاتے راستے پر سرپٹ بھاگتی چلی گئی۔

مجھے پتا تھا کہ تعاقب کیا جائے گا۔ جلد ہی تعاقب کے آثار نظر آنے لگے۔ دور عقب میں تیزی سے حرکت کرتی مشعلیں دکھائی دیں۔ یقیناً یہ وہ مسلح گھڑ سوار تھے جو جارج کی رہائش گاہ سے نکلے تھے اور تیزی سے میری طرف آ رہے تھے۔

''تیز چلاؤ۔'' میں نے گاڑی بان کے ننگے سر پر رائفل کے آہنی بیرل کی ٹھوکر لگائی۔ وہ کراہ کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے باگوں کو جھٹکے دیئے اور چابک لہرایا گھوڑوں کی گردنیں اوپر اُٹھیں اور رفتار ایک دم بڑھ گئی۔

گھوڑوں اور گھوڑا گاڑی کی رفتار میں خاصا فرق ہوتا ہے۔ ایک دو منٹ میں ہی گھڑ سوار نزدیک آ گئے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے گولیاں چلائیں۔ دھاکوں سے شعلے لپکے۔ گولیوں کی شائیں شائیں ہمارے سروں سے کافی اوپر سنائی دی۔

یقیناً یہ فائرنگ مارنے کے لیے نہیں ڈرانے کے لیے تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم گھوڑا گاڑی روک لیں۔ میں نے ایک بار پھر رائفل گاڑی بان کی گردن میں دھنسائی اور سرسراتی آواز میں کہا۔ ''گاڑی روکو گے تو اسی جگہ گولی مار دوں گا۔''

گاڑی بان بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

یہ گھنے درختوں کے درمیان سے گزرتا ہوا تاریک اور نیم پختہ راستہ تھا۔ ہر گھڑی یہی لگتا تھا کہ گھوڑا گاڑی کسی تناور درخت سے ٹکرا جائے گی مگر گھوڑے ان نشیب و فراز کے شناور تھے۔ وہ اپنے مالک کے اشاروں پر سرپٹ بھاگے چلے جا رہے تھے اور پھر گھڑ سوار بالکل قریب پہنچ گئے۔ ایک گھڑ سوار نے للکار کر کہا۔ ''اوئے گاڑی روکو۔ نہیں تو مارے جاؤ گے۔''

گاڑی بان کی صورت دیدنی تھی۔ وہ دونوں طرف سے موت کی دھمکی سن رہا تھا۔ گہری تاریکی کے سبب اس کے تاثرات ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہے تھے تاہم اتنا پتا چلتا تھا کہ وہ دہشت زدہ ہے۔ اچانک سرپٹ بھاگتے گھوڑوں میں سے ایک کو ٹھوکر لگی۔ وہ سنبھلنے کی کوشش کرتا ہوا گرا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا گھوڑا بھی گرا۔ گاڑی جیسے ہوا میں معلق ہوئی۔ مجھے لگا کہ میں پہلے اوپر اُٹھنے کے بعد اب تیزی سے نشیب کی طرف جا رہا ہوں۔ میں گھنی

جھاڑیوں میں گرا اور پتلی پتلی شاخوں کو توڑتا ہوا کچی زمین پر آ گیا۔ میں نے اپنے عقب میں گھوڑوں کی دردناک ہنہناہٹ سنی۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی کے گرنے اور ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ میں حیرت انگیز طور پر شدید چوٹوں سے محفوظ رہا تھا۔

میں اُٹھتے ساتھ ہی پھر دوڑا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرا رُخ کس طرف ہے، میں کہاں جا رہا ہوں؟ میں بس جلد از جلد اس جگہ سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ تاروں کی مدھم روشنی میں مجھے راستہ دکھائی دے رہا تھا۔ میرے اردگرد کیکر، ناگ پھنی اور جنتر کے درخت تھے اور وہ ساری نباتات تھیں جو جنگلی علاقے میں نظر آتی ہیں۔ دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ رائفل ابھی تک میرے ہاتھ میں ہے۔ رائفل کے لمس نے میرے اعتماد میں اضافہ کیا۔ زندگی میں شاید پہلی بار مجھے ہتھیار کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوا تھا۔

O.....❖.....O

ہوا بہت تیز تھی اور میرے عقب سے چل رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ یہ ہوا مجھے دھکیل رہی ہے اور میں بھاگنے کے بجائے اُڑتا چلا جا رہا ہوں۔ یہ سب جاگتی آنکھوں کے خواب جیسا تھا۔ میں بہت سے خطروں سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ درختوں سے ٹکرا کر زخمی ہونے کا خطرہ، کسی گڑھے میں گرنے کا خطرہ، عقب سے گولی چلنے کا خطرہ، کسی جنگلی جانور کا ڈر...... کچھ بھی میرے ذہن میں نہیں تھا۔ میں بس نکلنا چاہتا تھا۔ نکل جانا چاہتا تھا اس سیاہی مائل جنگل کے حصار سے۔ میں اس منحوس نرغے کو توڑ دینا چاہتا تھا۔ مجھے آزادی درکار تھی۔ بس آزادی...... اور میں بھاگ رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میرا تعاقب ہو رہا ہے۔ میں نے اپنے عقب میں دور افتادہ آوازیں سنیں۔ ان میں کتوں کی آواز بھی شامل تھی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ آوارہ کتے تھے یا خاص بُو گیر کتے جو گھڑسواروں کے ساتھ میرے پیچھے آ رہے تھے۔ میں دو کتوں کو عمارت کے احاطے میں مار چکا تھا۔ میں مزید کو بھی مار سکتا تھا۔ اگر میرا راستہ روکا جاتا تو میں نے اس رائفل میں موجود ایک گولی بھی بچا کر نہیں رکھنا تھی اور مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس رائفل میں کتنی گولیاں ہیں۔ یہ برسٹ مارنے والی رائفل تھی اور ایک بار عمران یا شاید اقبال نے مجھے بتایا تھا کہ ایسی رائفلوں میں عموماً بیس پچیس تک گولیاں موجود ہوتی ہیں۔ میں نے اب تک بمشکل سات آٹھ گولیاں ہی استعمال کی تھیں۔

میں اندھا دھند بھاگتا رہا۔ پتا نہیں کہ میں کتنی دیر بھاگا۔ آٹھ دس منٹ یا بیس پچیس منٹ۔ بس مجھے یہ احساس تھا کہ میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی ہے اور میری ٹانگیں شل ہوتی جا رہی ہیں۔ کسی وقت مجھے لگتا تھا کہ میں بھاگتے بھاگتے اچانک گر پڑوں گا اور تا دیر اُٹھ نہیں سکوں گا۔ مگر میں پھر بھی ٹانگوں کو حرکت دیتا رہا۔ تسلی کی صرف ایک بات تھی۔ اب مجھے اپنے عقب میں تعاقب کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ کتوں کی آواز بھی سنائی نہیں دے

رہی تھی۔ تو کیا میں متعاقب افراد کو جُل دینے میں کامیاب ہو گیا ہوں؟ اس سوال کا یقینی جواب دینا تو ابھی مشکل تھا۔ بھاگتے بھاگتے میرے ذہن میں خیال آیا کہ ہوا میرے عقب سے چل رہی ہے۔ میں نے سنا تھا کہ اگر تیز ہوا اسی سمت میں چل رہی ہو جس سمت میں کتوں کا ''شکار'' جا رہا ہو تو پھر کتوں کی حس شامہ کند ہو جاتی ہے۔ شاید یہاں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میرے پیچھے آنے والے گھڑ سوار کسی اور جانب نکل گئے تھے۔

میری ٹانگیں اب کسی بھی وقت جواب دینے والی تھیں۔ میں ایک جگہ پر برگد کے بڑے بڑے درختوں تلے بیٹھ گیا۔ درختوں کی جڑیں اوپر سے نیچے کی طرف آ رہی تھیں اور اندھیرے میں یوں لگتا تھا کہ درجنوں سانپ ہوا میں جھول رہے ہیں۔ موسم میں خنکی تھی پھر بھی مجھے شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ پنڈلیوں میں نئے کانٹے چبھ گئے تھے اور جسم پر تازہ خراشوں کی جلن تھی۔

میں نے آٹومیٹک رائفل گود میں رکھ لی اور درخت سے ٹیک لگا کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ سلطانہ کی بے بسی کا خیال ذہن میں یوں آیا جیسے اندھیرے میں اچانک بجلی چمکتی ہے۔ اس کا مجھے باہر دھکیل کر دروازہ بند کر دینے کا انداز دل کو لہولہو کرنے والا تھا۔ پتا نہیں آج رات اس پر کیا بیتی تھی اور اب وہ کہاں تھی؟ اور وہ چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں والا معصوم صورت بالو...... جسے وہ میرا بچہ کہتی تھی۔ وہ سلطانہ کے ساتھ ہی جیل میں گیا تھا لیکن جارج کی چار دیواری میں وہ سلطانہ کے ساتھ نہیں تھا۔ خبر نہیں وہ کہاں تھا؟ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ سلطانہ جیسی نڈر لڑکی اگر جارج کے جال میں آئی تھی تو اس کی وجہ میں تھا۔ مجھے اذیت کے ناقابلِ برداشت شکنجے میں دیکھ کر سلطانہ نے جارج کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اس نے مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مرتے ہوئے دیکھنے سے بہتر سمجھا تھا کہ وہ اپنی شوہر پرستی کو ایک نیا رُخ دے دے اور اپنا آپ مجھ پر لٹا دے۔

اس منحوس دھاتی کمرے میں برقی رو کی ''اذیت رسانی'' میرے ذہن میں آئی تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے تین بار چند سیکنڈ کے لیے کرنٹ دیا گیا تھا اور اب مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں تین بار جان کنی کا عذاب سہہ کر اور موت کے منہ میں جا کر واپس آیا ہوں۔ جہاں جہاں سے کرنٹ میرے جسم میں داخل ہوا تھا، وہاں وہاں سے ابھی تک رگ پٹھے پھوڑے کی طرح دُکھتے تھے اور سیاہی مائل داغ نظر آتے تھے۔

میں چار پانچ منٹ تک تاریکی میں درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ ٹانگوں میں قدرے جان آ گئی۔ میں پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ برگد کی لٹکی ہوئی جڑوں میں سے ایک جڑ میرے

کندھے پر آئی اور سینے کی طرف رینگ گئی۔ یک لخت مجھے محسوس ہوا کہ ''جڑ'' واپس میرے کندھے کی طرف آ رہی ہے۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن نے کہا کہ یہ برگد کی جڑ نہیں ہے۔ ایک تیز اضطراری حرکت کے تحت میں نے اپنے جسم کو جھٹکا دیا اور پیچھے ہٹا۔ کئی فٹ لمبا سانپ میرے جسم سے جدا ہو کر دھپ سے کچی زمین پر گرا۔ میں نے اس کی پھنکار سنی۔ تاریکی میں اس کا ہیولا دیکھا۔ وہ پھن پھیلائے میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے رائفل سیدھی کی۔ انگلی ٹریگر پر رکھی لیکن پھر ایک دم دماغ نے کام کیا۔ اس سانپ سے زیادہ اس رائفل کا فائر میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ گولی چلنے کی آواز میرے دشمنوں کو میری طرف کھینچ سکتی تھی۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ سانپ اپنے شکار کا پیچھا بھی کرتا ہے۔ دادی کہا کرتی تھیں کہ بھڑکا ہوا سانپ کبھی کبھی گھڑ سوار کو بھی جا لیتا ہے۔ میں اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹتا رہا اور میری نظریں سانپ کے ہیولے پر مرکوز رہیں۔ وہ پیچھے نہیں آیا۔ میں نے رُخ پھیرا اور پھر ہوا کے رُخ پر بھاگنا شروع کر دیا۔

وہ بڑی عجیب رات تھی۔ میں کچھ دن پہلے بھی اسی طرح ایک تاریک جنگل میں بھاگا تھا اور خود کو بھانڈیل اسٹیٹ کے جنگل سے نکالنا چاہا تھا لیکن تب اور آج کی صورتِ حال میں بہت فرق تھا۔ آج میرے ہاتھوں میں ایک مہلک ہتھیار تھا اور سینے میں اس ہتھیار کو چلانے کی ہمت بھی تھی۔ آج میں بلا تردد کسی کو مار سکتا تھا اور مر بھی سکتا تھا۔ ہاں...... کچھ اوقات ایسے ہی کایا پلٹ ہوتے ہیں اور کچھ فقروں کی بازگشت اور کچھ مناظر کی یاد ایسے ہی زندگیوں کے رُخ بدلتی ہے۔ عمران کا مسکراتا چہرہ ایک بار پھر میری نگاہوں میں آیا۔ بے شک اس نے کہا تھا۔ ''مرنا تو میں بھی چاہتا ہوں لیکن میں اپنی موت کی ذمے داری خود پر لینا نہیں چاہتا۔ اس لیے خطرات سے ٹکراتا ہوں اور بدترین حالات کا پیچھا کرتا ہوں۔''

میں بھاگتا رہا اور چلتا رہا اور دم لیتا رہا پھر بھاگتا رہا۔ یہاں تک کہ سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا۔ رات بھر گھونسلوں میں دبکے رہنے والے پرندے بیدار ہوئے اور چہچہانے لگے۔ پہلے ان کی آوازیں مدھم تھیں پھر بلند ہوتی چلی گئیں۔ اندھیرے میں سفیدی گھلی اور پھر غالب ہوتی چلی گئی۔ ہوا کا رُخ بھی بدل چکا تھا۔ اردگرد کے مناظر واضح ہونے لگے۔ پتوں سے اٹی ہوئی زمین، جھاڑیاں، درخت اور درختوں کی بلند شاخوں کے پیچھے سے جھلک دکھاتا ہوا نیلگوں آسمان۔ میں ایک یکسر ویران جنگل میں تھا۔ آثار سے تو یہی لگتا تھا کہ دور تک کسی آدم زاد یا متنفس کا نشان نہیں۔ روشنی ذرا زیادہ ہوئی تو مجھے کہیں کہیں کچی زمین پر پنجوں اور کھروں کے نشان دکھائی دیئے۔ میں جنگلی زندگی سے قطعی نا آشنا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ کن

جانوروں کے قدموں کے نشانات ہو سکتے ہیں اور کہیں کہیں جو فضلہ بکھرا دکھائی دیتا ہے، وہ کن جانوروں کا ہے۔ رات گاہے بگاہے مجھے جانوروں کی دور افتادہ آوازیں بھی سنائی دیتی رہی تھیں لیکن میں ان کے بارے میں بھی کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے قاصر رہا تھا۔

ایک جگہ بارشی پانی کا چھوٹا سا تالاب نظر آیا۔ اس کے گرد بھی پنجوں کے نشانات کثرت سے تھے۔ ایک طرف کسی ہرن سائز کے جانور کا ڈھانچا پڑا تھا۔ پانی نتھرا ہوا تھا۔ پیاس کی شدت زیادہ تھی اور دھوپ نکلنے کے بعد مزید بڑھ سکتی تھی۔ میں نے دل کڑا کر کے تھوڑا سا پانی پیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ اپنے کُرتے کے گیلے دامن سے رائفل پر لگا ہوا کیچڑ صاف کیا۔ یہ روسی ساخت کی رائفل تھی۔ خم دار میگزین کافی لمبا تھا۔ میں میگزین علیحدہ کر کے گولیوں کی تعداد دیکھ سکتا تھا لیکن یہ تجسس مہنگا پڑ سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ میں میگزین دوبارہ رائفل سے اٹیچ نہ کر پاتا۔

دس پندرہ منٹ وہاں سستانے اور اپنی چوٹوں کو سہلانے کے بعد میں پھر چل پڑا۔ گھوڑا گاڑی کے اُلٹنے سے کوئی زخم تو نہیں لگا تھا مگر جسم پر کئی جگہ نیل موجود تھے۔ اب وقت گزرنے کے ساتھ ان چوٹوں کا احساس ہو رہا تھا۔ خاص طور سے بائیں بازو کو حرکت دینا دشوار لگ رہا تھا۔

اگلے تین چار گھنٹے میں مسلسل چلتا رہا۔ کبھی کبھی بھاگنا بھی شروع کر دیتا تھا۔ اس عرصے میں مجھے صرف ایک بھینس نما سیاہ جانور کی جھلک دکھائی دی یا پھر دو چیتل (نیل گاؤ) تھے جو تیزی سے بھاگتے ہوئے ایک طرف اوجھل ہو گئے۔ چاروں طرف درختوں کے لامتناہی سلسلوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ان درختوں میں سرکنڈوں اور جھاڑیوں کے درمیان کہیں کہیں بارشی پانی کے گڑھے تھے یا کسی تیز آندھی سے اُکھڑے ہوئے درختوں کے تنے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اس رُوئے زمین پر اس گھنے جنگل کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔

مجھے یہاں سے نکلنا ہے۔ مجھے اپنوں کے پاس واپس جانا ہے۔ مجھے ہر صورت اس گھیرے کو توڑنا ہے۔ میں دل ہی دل میں دہرا رہا تھا اور چلتا جا رہا تھا۔

شاید سلطانہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں ایک پھڑ پھڑاتا ہوا پنچھی ہی تھا۔ یہ پنچھی ایک مدت سے اپنا پنجرہ توڑنا چاہ رہا تھا۔ کسی کی کشش اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ کسی کی خوبصورت آنکھیں اسے شب و روز بے کل رکھتی تھیں۔ وہ پنجرے کی سلاخوں سے ٹکراتا تھا۔ لہولہو ہو کر گر جاتا تھا۔ زخم مندمل ہوتے تھے تو وہ پھر پھڑ پھڑانا اور ٹکرانا شروع کر دیتا تھا۔ ایک عرصے سے یہ سلسلہ جاری تھا۔

دوپہر ہو گئی تھی۔ دھوپ اب جسم میں چبھنے لگی تھی۔ مجھے درختوں کے درمیان ایک آبی گزرگاہ نظر آئی۔ اس کا پاٹ دس بارہ میٹر سے زیادہ نہیں تھا۔ کنارے کٹے پھٹے تھے اور ان پر کثرت سے داب اُگی ہوئی تھی۔ میں اس آبی گزرگاہ کے کنارے گھنے درختوں کے سائے میں بیٹھ گیا۔ یوں لگتا تھا کہ میرے اردگرد سیکڑوں میل تک کوئی انسان موجود نہیں ہے۔ جنگل سائیں سائیں کرتا تھا اور تیز دھوپ کے سبب نباتات کی مہک فضا میں پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر اس وقت یہاں کوئی سیاہ فام حبشی نظر آ جائے تو اس جگہ کانگو یا تنزانیہ وغیرہ کا جنگل تصور کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

میں وہاں بیٹھا رہا اور دوپہر ڈھلنے کا انتظار کرتا رہا۔ کسی نکیلی شاخ کے لگنے سے میری کلائی پر گہرا زخم آیا تھا۔ قریباً دو انچ جگہ سے کھال اُتر گئی تھی۔ اس تازہ زخم کی وجہ سے کلائی کے ایک بہت پُرانے زخم کا نشان بھی معدوم ہو گیا تھا۔ میرے دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں ثروت اس طرح ٹوٹ کر یاد آ رہی تھی کہ دل کسی آہنی مٹھی میں آ گیا تھا۔ مجھے ایک واقعہ یاد آنے لگا۔ ہمارے والدین نے ہماری شادی کے وقت کا باقاعدہ اعلان تو نہیں کیا تھا تاہم بین السطور یہ بات طے تھی کہ شادی کب اور کس موسم میں ہونی ہے۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ ثروت نے اپنی فائل میں انتظار کے ماہ و سال کو دنوں میں تبدیل کر رکھا ہے اور ان دنوں کی تعداد کے مطابق کاغذ پر لکیریں لگا رکھی ہیں۔ وہ ہر صبح اُٹھ کر ان لکیروں میں سے ایک لکیر کاٹ دیتی تھی۔ اس روز ہم ایک پارک میں بیٹھے تھے۔ میری نظر ثروت کی فائل پر پڑی۔ وہاں لکیریں نظر آئیں تو میرا تجسس جاگ گیا۔ میں فائل دیکھنے کے لیے فائل پر جھپٹا تو ثروت نے فائل ایک دم اپنے پیچھے چھپا لی۔ میں نے اس سے فائل لینا چاہی۔ اسی دوران میں ثروت کے ہاتھ میں پکڑا ہوا قلم، نب کی طرف سے میری بازو میں چبھ گیا۔ کلائی اور کہنی کے درمیان سے خون نکل آیا۔ وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے قلم اور فائل دونوں پھینک دیئے اور میرا بازو دیکھنے میں مشغول ہو گئی۔

زخم کا وہ نشان انگریزی کے حرف ''ایس'' سے ملتا جلتا تھا۔ میں یہ زخم دکھا کر اسے اکثر ستایا کرتا تھا۔ کہتا تھا، دیکھو کتنی بے رحم ہو تم۔ لوگ درختوں کے تنوں کو چھیدتے ہیں، تم نے اپنے نام کے لیے میرے بازو کو چھیدا ہے۔ وہ شرمندہ ہو جاتی تھی اور پھر کئی دفعہ تلافی کے لیے میرے بازو کے نشان کو چوم لیتی تھی۔ ایک دن جب اس نے ایسا کیا تو میں نے شرارت سے کہا تھا۔ اچھا ہوتا اگر اس دن تمہارا قلم کلائی کے بجائے میرے ہونٹوں پر لگا ہوتا۔ اس نے شولڈر بیگ میرے سر پر دے مارا تھا۔ وہ ذرا سا چوک کر میری ناک پر لگا۔ ''ٹھہر جا...... تیری

تو۔'' میں اس کے پیچھے لپکا۔

وہ اٹھلاتی اور بل کھاتی ہوئی بھاگی اور اپنے گھر کی سیڑھیاں چڑھ کر سیدھی چھت پر چ
گئی جہاں خالہ صفیہ اور پھوپھو سکینہ وغیرہ بیٹھی تھیں۔

وہ دن ایسی ہی خوبصورت یادوں اور شرارتوں سے عبارت تھے۔ آج کلائی کے اس
تازہ زخم کے ساتھ اس پُرانے زخم کا نشان معدوم ہو گیا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میر
کوئی نہایت قیمتی چیز کھو گئی ہے۔

میں تھک گیا تھا۔ میرے چاروں طرف گنجان جنگل تھا۔ مجھے کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا
اب تو مجھے یوں لگنے لگا تھا کہ میں کئی ہفتے بھی یہاں بھٹکتا رہوں تو باہر نکلنے کی راہ نہ پاؤں گا
میں اس چھوٹی ندی کے ساتھ ساتھ پھر چل پڑا۔ اندھیرا ہونے تک چلتا رہا۔ ہریالی کم ہو
کے بجائے مزید بڑھتی جا رہی تھی۔ بھوک سے بُرا حال تھا۔ شام ہوتے ہی پرندے اپ
ٹھکانوں پر واپس آ گئے۔ جوں جوں تاریکی پھیلتی گئی، جنگل جاگتا گیا۔ گاہے بگاہے مختلف
جانوروں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ مجھے معلوم تھا کہ رات کے وقت مجھے کسی درخت پ
ہونا چاہیے مگر درخت پر بھی کیڑوں مکوڑوں اور دیگر حشرات کے خطرات موجود تھے۔ پھر مجھے
معلوم تھا کہ تیندوے اور جنگلی بلے وغیرہ بھی جو ازحد خطرناک ہوتے ہیں، درختوں پر چڑھ
جاتے ہیں۔ مگر پتا نہیں کیا بات تھی کہ میں زیادہ خوف محسوس نہیں کر رہا تھا۔ شاید اس کی ایک
وجہ وہ طاقتور رائفل تھی جو میرے ہاتھ میں تھی اور ایک وجہ وہ انقلابی کیفیت بھی تھی جو کل نیم
شب سے میرے سینے میں موجزن ہو چکی تھی۔

وہ رات جیسے تیسے میں نے شاہ بلوط کے ایک بلند درخت پر گزاری۔ میں ساری رات
نیم غنودگی کی کیفیت میں رہا۔ چھوٹی نال والی روسی ساختہ رائفل ایک قیمتی اثاثے کی طرح
میرے کندھے سے لٹکی رہی۔ جنگلی حیات کی موجودگی صرف آوازوں تک محدود تھی اور یہ
آوازیں مجھ تک پہنچتی رہیں۔

صبح میں ایک بار پھر اپنے خستہ جاں بدن کو سمیٹ کر چل پڑا۔ بھوک اب نقاہت بن کر
جسم کے ہر ہر ریشے میں اُترنے لگی تھی۔ میں اس کٹی پھٹی گم راہ ندی کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔
ٹانگیں بے جان ہو رہی تھیں اور سر چکرا رہا تھا۔ دوپہر کے وقت میں نیم جان ہو کر پھر اس مدا
چلنے والے پانی کے کنارے شیشم اور جنتر کے درختوں کے نیچے بیٹھ گیا۔ میں ڈھونڈتا تو مجھے ان
رنگ رنگ کے درختوں، پودوں اور جھاڑیوں میں کہیں نہ کہیں نباتاتی خوراک مل سکتی تھی لیکن
میں ابھی تک تذبذب میں تھا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ میں کیا کھا سکتا ہوں اور کیا نہیں۔

عجیب سی مایوسی مجھ پر طاری ہونے لگی۔

کیا میں کبھی یہاں سے نکل نہ سکوں گا؟

کیا میں پھر پکڑا جاؤں گا؟

کیا بھاگنے کے جرم میں اس بار میری گردن اُتار دی جائے گی۔

ذہن میں ایک بار پھر سوال ہجوم کرنے لگے۔

دفعتاً میری نگاہ داب اور کیچڑ میں پھنسی ہوئی ایک شے پر پڑی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ یہ براؤن شیشے کی ایک بوتل تھی۔ نہ جانے یہ کہاں سے بہتی ہوئی آئی تھی اور کب سے یہاں دو پتھروں کے درمیان پھنسی ہوئی تھی۔ اس پر کائی جم چکی تھی۔ میں نے یہ بوتل نکال لی۔ یہ اندر سے خالی تھی۔ میں نے اسے ایک طرف پھینک دیا اور ایک بار پھر درخت سے ٹیک لگا لی۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میں اسی گنجان جنگل میں ہمیشہ چکراتا رہوں گا۔ کبھی یہاں سے نکل نہیں پاؤں گا۔ یاسیت کے سبب دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں نمی جاگ گئی۔ اپنے بچھڑے ہوئے شدت سے یاد آنے لگے۔ بیٹھے بیٹھے دل میں پتا نہیں کیا آئی، میں نے بوتل پھر اُٹھا لی۔ اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ میرے بازو کے زخم سے اب بھی خون رس رہا تھا۔ میں نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ ایک جیب سے ایک کرنسی نوٹ مل گیا۔ میں نے ایک پتلی سی شاخ ڈھونڈی جسے قلم کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اپنے بازو کے زخم کو کرید کر میں نے اسے کچھ مزید خونچکاں کیا۔ شاخ کے قلم کو اس خون میں ڈبو کر کرنسی نوٹ پر لکھا۔

''میرے پیارو! میں زندہ ہوں۔ میرا انتظار کرنا۔ میں ایک دن ضرور آؤں گا۔ تابش......'' اس سے آگے اپنا لاہور کا مختصر پتا لکھا۔

نوٹ کی دوسری طرف میں نے اپنے لہو سے تین نام لکھے۔ ''فرح...... عاطف...... ثروت۔'' پھر میں نے اس نوٹ کو کائی زدہ بوتل کے اندر رکھا۔ بوتل کا ڈھکن بند کیا اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ اسے پانی میں بہا دیا۔ میں جانتا تھا کہ اس بوتل کو کہیں نہیں پہنچنا۔ شاید وہ کچھ ہی آگے جا کر کہیں گھاس وغیرہ میں اٹک جائے گی یا پھر اس بے کراں جنگل کے اندر ہی کہیں کسی بارشی جھیل میں جا ٹھہرے گی۔ لیکن بوتل کو اس طرح بہتے پانی میں ڈالنا مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ میں نے خود کو کسی قدیم کہانی کے کردار کی طرح محسوس کیا۔ وہ کہانیاں جن میں انہونیوں کی اُمیدیں پالی جاتی ہیں۔ جن میں گہری تاریک راہوں پر آس اور انتظار کے دیپ جلائے جاتے ہیں۔ ان کہانیوں میں اپنوں سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے والے اور دور دراز

کے جزیروں میں سدا کے لیے محصور ہو جانے والے لوگ، ساحلوں پر بیٹھتے ہیں اور اُفق کے پار دیکھتے ہیں۔ وہ پانیوں کو پار کرنے کے لیے کبھی تنوں سے کشتیاں بناتے ہیں، کبھی درختوں کو آگ لگا کر دور دراز کے جہازوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی نامے لکھ کر اور انہیں بوتلوں میں بند کر کے لہروں کے سپرد کرتے ہیں۔

میں نے بھی بوتل کو ندی کے بہاؤ میں بہا دیا۔ وہ تیرتی گئی اور مجھ سے دور ہوتی گئی۔ میں اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا یہ دور دیس کے کسی ایسے پانی میں پہنچے گی جہاں کوئی کشتی ران، کوئی مچھیرا اسے نکالے گا اور میرے پیاروں تک پہنچا دے گا۔ میری نگاہیں بوتل پر جمی رہیں۔ وہ دور ہوتی گئی۔ دھیرے دھیرے ایک نکتہ بنی اور پھر معدوم ہو گئی۔

میں نے رُخ پھیر کر دیکھا۔ میرے سامنے چار افراد کھڑے تھے۔ ان میں سے دو کے ہاتھ میں رائفلیں اور تیسرے کے ہاتھ میں خوفناک پھل کی کلہاڑی تھی۔ بالکل یہی لگا کہ وہ اچانک زمین کے اندر سے نمودار ہو گئے ہیں یا درختوں کے تنے چیر کر باہر نکل آئے ہیں۔ میں اپنی جگہ پتھرا کر رہ گیا۔ میری نگاہیں گہرے سانولے چہرے والے تیواری لال پر جمی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں قہر کی بجلیاں چمک رہی تھیں۔ مجھے اپنی بصارت پر بھروسہ نہیں ہوا۔ دل و دماغ کی کچھ وہی کیفیت ہوئی جو چند روز پہلے اس وقت ہوئی تھی جب بادو باراں کی رات میں ایک سنسان جنگل کے اندر اچانک ہی ان لوگوں نے مجھے آدبوچا تھا لیکن تب میں اور آج میں ایک فرق تھا۔ ایک سنگین اور مہلک فرق اور یہ ''فرق'' آگ کی ایک دیو قامت لہر کی طرح میرے سینے میں موجزن تھا اور میرے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ میری رائفل مجھ سے تین چار فٹ دور گہری سبز گھاس پر پڑی تھی۔

تیواری لال کی زہریلی پھنکار میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''بڑا شوق ہے تجھے بھاگنے کا۔ میرا خیال ہے کہ اگر بھگوڑوں کا عالمی مقابلہ کرایا جائے تو تُو حرام جادہ پہلے نمبر پر تو آ ہی جاوے گا۔''

میں خاموش کھڑا تھا لیکن میرے جسم میں آج جو جدا قسم کی ہلچل تھی، اس سے تیواری اور اس کے ساتھی بے خبر تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اذیت کی انتہا بالآخر بے خوفی میں بدل چکی ہے۔ درد کی بھٹی میں تپ تپ کر اور جل جل کر ایک خام دھات نے آخر کار اپنی شکل تبدیل کر لی ہے۔

''ہاتھ اوپر اُٹھاؤ۔'' تیواری کے پہلو میں کھڑے شخص نے میرے سینے کا نشانہ لیتے ہوئے کرخت آواز میں کہا۔

لڑائی ایک فن بھی ہے لیکن لڑائی ایک دیوانگی بھی ہے۔ یہ ایک آرٹ بھی ہے اور ایک ایسی سرکش لہر بھی ہے جو کسی ضابطے، قاعدے کو نہیں مانتی۔ ایسی سرکش لہر کو تجربہ درکار ہوتا ہے۔ نہ ماحول اور نہ حکمتِ عملی اور میں ایک ایسی ہی لہر کے زیر اثر تھا۔

مجھے ہاتھ اوپر اُٹھانے کا حکم دیا گیا تھا لیکن میں اپنی رائفل کی طرف گیا۔ رائفل اُٹھانے کے لیے میرا تیزی سے جھکنا میری زندگی کا جواز بن گیا۔ دھماکے کے ساتھ ایک گولی میرے سر کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میں رائفل پر گرا۔ تب رائفل بردار نے دوسری گولی چلائی۔ یہ گولی میرے پہلو کے پاس سے کچی زمین میں لگی۔ تب تک میں بھی ٹریگر دبا چکا تھا۔ میں نے دو فائر کیے۔ ان میں سے ایک گولی سیدھی رائفل بردار کی گردن میں جا گھسی۔ وہ جھاڑیوں میں گرا۔ کلہاڑی بردار اور تیواری لال دونوں بوکھلا کر پیچھے ہٹے۔ تیواری لال کا پاؤں پھسلا اور وہ اُلٹ کر نشیب میں چلا گیا۔ اس کی دھوتی کے اندر سے اس کی کالی سیاہ ٹانگیں دور تک نظر آئیں۔ دوسرا رائفل بردار ڈیوڈ تھا۔ اس نے رائفل میری طرف سیدھی کر رکھی تھی مگر اس کے چہرے پر شدید گھبراہٹ کے آثار تھے۔ وہ پیچھے ہٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ رائفل کو جھٹک رہا تھا۔ اس وقت تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا لیکن کئی دن بعد معلوم ہوا کہ ڈیوڈ نے مجھ پر گولی چلائی تھی مگر گولی چیمبر میں پھنس گئی تھی۔

ڈیوڈ برف کی طرح سفید چہرے کے ساتھ کئی قدم پیچھے ہٹا پھر اچانک رُخ پھیر کر بھاگ نکلا۔ کلہاڑی بردار اس سے دس قدم آگے تھا۔ میں نے بے دریغ، ڈیوڈ نامی اس بندے پر فائر کیے۔ ایک گولی تو ضائع ہو گئی دوسری اس کی ٹانگ میں کہیں لگی لیکن وہ رُکا نہیں، لنگڑاتا ہوا بھاگتا رہا۔ میرے سر پر خون سوار تھا۔ میں جنونی لہجے میں چلّایا۔ ''مجھے مارو...... مجھے مارو۔ بھاگتے کیوں ہو حرامزادو! مجھے جان سے مار دو۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے کئی گولیاں چلائیں اور ان کے پیچھے لپکا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے درختوں میں اوجھل ہو گئے۔

میں جنونی انداز میں ان کے پیچھے دوڑتا رہا۔ میری آواز جنگل میں دور تک گونجتی رہی۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ دونوں افراد گھوڑوں پر سوار ہو کر بھاگ نکلے ہیں۔ ممکن تھا کہ وہ کہیں پاس سے کمک لینے گئے ہوں اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بدحواس ہو گئے ہوں۔

اچانک مجھے تیواری لال کا خیال آیا۔ وہ بوکھلاہٹ میں پیچھے ہٹا تھا اور نشیب کی جھاڑیوں میں گرا تھا۔ میں رائفل سونت کر اس نشیب کی طرف بھاگا۔ مگر بیس پچیس میٹر آگے ہی گیا تھا کہ دائیں طرف سے مجھ پر دو فائر ہوئے۔ یہ پستول کے فائر تھے۔ ایک گولی میرے بازو کو چھیدتی ہوئی گزر گئی۔ میں تلملا کر پلٹا۔ جھاڑیوں میں تیواری لال کی سفید دھوتی کی

جھلک نظر آئی۔ میں نے یکے بعد دیگرے تین فائر کیے۔ جنگل دھماکوں سے گونج اُٹھا۔ دھوتی جیسے زمین پر بچھ گئی۔ طیش کے سبب میں ہوش وحواس سے بیگانہ ہو رہا تھا۔ یہ خیال کیے بغیر کہ تیواری کے پاس پستول ہے اور وہ اب بھی مجھ پر جوابی فائر کر سکتا ہے، میں بھاگتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اسے صرف ایک گولی لگی تھی لیکن یہی کام دکھا گئی تھی۔ یہ گولی اس کے پیٹ میں داخل ہو کر پسلیوں کی طرف سے نکل گئی تھی۔ مجھے پہلی بار پتا چلا کہ سر پر خون کیسے سوار ہو جاتا ہے۔ کس طرح ایک قتل کے بعد دوسرے قتل بائیں ہاتھ کا کھیل نظر آنے لگتے ہیں۔ میری آنکھوں میں جنون دیکھ کر تیواری لال کا سانولا چہرہ کالا سیاہ ہو گیا۔

وہ گھگیایا۔ ''گولی مت چلانا...... مم...... میرا کوئی دوش ناہیں...... یہ گورا صاحب کا حکم تھا۔''

میں پھنکارا۔ ''گورا صاحب کے حکم پر ہی تُو سلطانہ کو زرگاں لایا تھا۔ اسی کے حکم پر تُو نے اسے جیل سے نکال کر اس کی کوٹھی میں پہنچایا ہوگا اور اسی کے حکم پر تُو نے کوٹھی کے باہر پہرا دیا ہوگا تا کہ وہ آسانی سے اس کی آبرو خراب کر سکے۔''

''ناہیں...... ناہیں۔'' تیواری نے کرب کے عالم میں اپنا سر نفی میں ہلایا۔ ''سلطانہ کو زرگاں لانے والا میں ناہیں، موہن کمار ہے۔ میں سوگند کھاوت ہوں۔''

میں نے صرف تین انچ کے فاصلے سے اس کے سر پر فائر کیا۔ اس کی کھوپڑی ٹوٹ گئی۔ شاید میں مزید فائر بھی کر گزرتا لیکن ذہن میں یہ احساس موجود تھا کہ میرے پاس ایمونیشن کم ہے۔

تیواری کی منحوس، متلاشی آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے بجھانے کے بعد میں نڈھال سا ہو گیا۔ ہانپا ہوا سا میں چند قدم پیچھے ہٹ گیا اور ایک درخت سے ٹیک لگا لی۔ چالیس پچاس فٹ آگے ندی کا کنارہ تھا اور وہاں دوسری لاش پڑی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ کیا ان دونوں جیتے جاگتے انسانوں کو میں نے مارا ہے؟ اپنے ہاتھوں سے مارا ہے؟

بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن حقیقت سامنے تھی اور ابھی سینے میں آگ کی وہ دیوقامت لہر بھی بلندی میں کم نہیں ہوئی تھی۔

میں نے ندی کے کنارے مرنے والے محافظ کی لاش چیک کی۔ گولی اس کی فربہ گردن کی ہڈی توڑ کر دوسری طرف نکل گئی تھی۔ اس شخص کی رائفل اس کے پاس ہی پڑی تھی۔ اس رائفل میں بڑا میگزین لگا ہوا تھا اور یہ نسبتاً بڑی بھی تھی۔ میں نے یہ رائفل اُٹھا لی اور دوسری رکھ دی کیونکہ دونوں رائفلوں کو لے کر چلنا آسان نہیں تھا۔ یہ دوسری رائفل حاصل کرنے کا

ایک فائدہ مجھے یہ بھی ہوا کہ گولیوں کی ایک بیلٹ بھی ملی۔ یہ بیلٹ مرنے والے کی کمر سے بندی ہوئی تھی۔ میں نے بیلٹ کھول کر جیسے تیسے اپنی کمر سے باندھ لی۔ اپنی والی چھوٹی نال کی رائفل پانی میں پھینک دی۔ تیواری لال کے پاس پڑا ہوا پستول بھی میرے کام آ سکتا تھا۔ یہ پستول بھی میں نے اُٹھا لیا۔

میرا دل کہہ رہا تھا کہ اب مجھے جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ ڈیوڈ اور اس کا کلہاڑی بردار ساتھی کمک لے کر واپس آ سکتے تھے۔ تیواری لال کی جامہ تلاشی میں کچھ کرنسی، سگریٹ اور دیگر اشیاء بھی ملیں جو میں نے اپنے پاس رکھ لیں۔ اس کے بعد میں وہاں سے چل دیا۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ اگر ڈیوڈ اور کلہاڑی بردار شخص گھوڑوں پر یہاں آئے تھے تو تیواری اور اس کا مرنے والا ساتھی بھی یقیناً گھوڑوں پر ہوں گے۔ ان کے گھوڑے بھی یہیں کہیں ہو سکتے تھے۔ میں تھوڑا آگے گیا اور دو گھوڑے درختوں میں بندھے ہوئے مل گئے۔ وہ بڑے انہماک سے ہری بھری گھاس پر منہ مار رہے تھے۔

میں نے ان میں سے ایک گھوڑا منتخب کیا۔ میری گھڑ سواری صرف مری اور ایبٹ آباد وغیرہ تک محدود تھی۔ ہم اپنے والدین کے ساتھ ان ''ہل اسٹیشنز'' پر جاتے تھے اور کرائے کے گھوڑوں پر تھوڑی بہت سواری کر لیتے تھے۔ کچھ تجربہ یہاں جارج گورا کے وسیع و عریض اصطبل میں آ کر حاصل ہوا تھا۔ گھوڑوں کی عادات کا تھوڑا بہت پتا چلا تھا۔

میں نے ایک گھوڑا کھولا۔ اسے تھپکیاں دے کر ذرا شانت کیا اور پھر سوار ہو گیا۔ حقیقی معنوں میں یہ میری زندگی کی پہلی گھڑ سواری تھی۔ میں گھوڑے کو پہلے آہستہ چلاتا رہا پھر تھوڑی تھوڑی ایڑ لگانی شروع کی۔ میں نے ڈیوڈ اور اس کے ساتھی کو شمال کے رُخ پر بھاگتے دیکھا تھا، میں نے جنوب کا رُخ کیا۔

تجربے کے بغیر گھوڑے پر بیٹھنا اور گھنے درختوں میں ایک طویل سفر کرنا نہایت دشوار کام تھا مگر میری ذہنی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ میں سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھا۔ جب مرنا تھا تو پھر ڈرنا کیا۔ بازو پر لگنے والی گولی نے مجھے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ یہ ایک قابلِ برداشت زخم تھا۔

میں نے قریباً ایک گھنٹے تک گھوڑے پر سفر کیا۔ اس دوران میں کوئی خاص واقعہ تو نہیں ہوا مگر میرا ذہن مسلسل سوچتا رہا اور تحیر کی لہریں مجھے اتھل پتھل کرتی رہیں۔ غنی صاحب نے سلطانہ نے اور پھر بھکشو ہمیش نے ملتی جلتی بات ہی کہی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ مجھے کسی سفلی عمل کے ذریعے اس راجواڑے کی حدود میں پابند کر دیا گیا ہے۔ میں ان گنجان جنگلوں کو پار

نہیں کرسکتا اور جب بھی کوشش کروں گا، پکڑا جاؤں گا اور مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ میں ایسی کئی ایک ناکام کوششیں کر چکا ہوں۔ شروع میں مجھے ان باتوں پر یقین نہیں آیا تھا مگر اب ذہن میں عجیب سی بے کلی تھی۔ چند دنوں کے اندر یہ دوسرا واقعہ ہوا تھا۔ اس گھنے ویران جنگل میں جہاں بیسیوں میل تک کسی آدم زاد کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ تیواری، ڈیوڈ اور ان کے ساتھی یوں وارد ہوئے تھے جیسے زمین سے نکل آئے ہوں۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا؟ وہ کیونکر کسی گائیڈڈ میزائل کی طرح مجھ تک آپہنچے تھے اور سلطانہ نے بتایا تھا کہ یہ کچھ میرے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔ اسٹیٹ کے وہ خاص قیدی جنہیں بہرصورت یہاں رکھنا مقصود ہوتا ہے، اس ''سحر'' کے اثر میں لائے جاتے ہیں اور پھر وہ کبھی اس اسٹیٹ کو چھوڑ نہیں سکتے۔

میں اپنے ذہن کا کیا کرتا؟ میرا ذہن ایسی کسی بھی بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں گھوڑے پر محوِ سفر رہا۔ میرے لیے جو چیز سب سے زیادہ اطمینان کا باعث تھی، وہ یہ تھی کہ گھوڑے کے ساتھ خاکی کینوس کا ایک بڑا تھیلا بھی لٹکا ہوا تھا۔ اس میں کھانے پینے کا کافی سامان موجود تھا۔ خشک گوشت، بھنے ہوئے چنے، چاولوں کی پنجیری، کوئی ایک درجن سیب اور صاف پانی۔ یہ سامان میرے لیے کئی دن تک کافی تھا۔ میں نے دلکی چال چلتے گھوڑے پر ہی تھوڑی سی پیٹ پوجا کی اور سفر جاری رکھا۔

نہ جانے کیوں میرے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ میں جہاں بھی چلا جاؤں گا، جتنی بھی دور نکل جاؤں گا۔ میرا تعاقب کرنے والے وہاں پہنچ جائیں گے اور قریباً دو گھنٹے کے سفر کے بعد یہی کچھ ہوا۔ ہانپتا ہوا گھوڑا، ایک ڈھلوان چڑھنے کے بعد بلندی پر آیا تو میری نگاہ اپنے عقب میں نشیب کی طرف اُٹھ گئی۔ یکایک میں چونک گیا۔ مجھے دور نیچے اندازاً چھ کلومیٹر کے فاصلے پر درختوں کے درمیان متحرک چیزیں دکھائی دیں۔ یہ کچھ اور نہیں گھوڑے تھے۔ فاصلے سے ان کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل تھا مگر وہ آٹھ دس سے کم ہرگز نہیں تھے۔ میں نے بلندی پر ہونے کی وجہ سے انہیں دیکھ لیا تھا، اب معلوم نہیں کہ انہوں نے مجھے دیکھا تھا یا نہیں۔ میری رگوں میں لہو کی گردش پھر بڑھ گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ گنجان درختوں اور ٹیڑھے میڑھے راستوں پر دو گھنٹے کا مسلسل سفر بھی مجھے میرے دشمنوں سے دور نہیں لے جاسکا تھا۔

ایک عجیب سی جھنجھلاہٹ مجھ پر طاری ہوگئی۔ ایک بار پھر میرا دل چاہا کہ ان سارے حالات سے چھٹکارا پانے کے لیے خود کو گولی مارلوں۔ اپنی ٹھوڑی کے نیچے رائفل کی نال رکھ کر ٹریگر دبانا مجھے کوئی بہت زیادہ مشکل نظر نہیں آتا تھا لیکن تب ہی وہ ہمیشہ مسکراتا چہرہ پھر

میری نگاہوں کے سامنے آگیا۔ غیر مرئی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ''جگر! مرنا تو ہے لیکن اس کی ذمے داری خود پر نہیں لینی۔''

میں نے درختوں کی اوٹ سے دیکھا، گھڑسوار تیزی سے قریب آتے جارہے تھے۔ ان کی تعداد میرے اندازے سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ وہ سیدھے میرے رُخ پر آرہے تھے۔ حالانکہ میں نے راستے میں کئی بار اپنا رُخ تبدیل کیا تھا۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیا اور گھوڑے سے اُتر آیا۔ خوراک اور پانی والا تھیلا میں نے گھوڑے کی زین سے علیحدہ کرلیا۔ اس کے بعد میں نے گھوڑے کی پشت پر چند چھڑیاں رسید کیں۔ وہ گردن اُٹھا کر ہنہنایا اور دوڑتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں جھاڑیوں سے اٹی ہوئی ایک دشوار ڈھلوان پر پاؤں جما جما کر اُترا اور بائیں رُخ پر بھاگنا شروع کردیا۔ اب رائفل کے علاوہ وزنی تھیلا بھی میرے پاس تھا۔ میں اپنی رفتار تیز نہیں رکھ سکتا تھا۔

قریباً ایک کلومیٹر آگے جانے کے بعد راستہ مسدود نظر آیا۔ وہی آبی گزرگاہ میرا راستہ روکے کھڑی تھی جس کے ساتھ ساتھ میں نے پچھلے دو گھنٹے تک سفر کیا تھا۔ اب وہ خم کھاتی ہوئی جارہی تھی اور اس کے کنارے کافی بلند تھے۔ اگر اب پھر میں اس کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کردیتا تو گھڑسواروں سے زیادہ دور نہیں جاسکتا تھا۔ ضروری تھا کہ میں اسے پار کر جاؤں۔ اسے پار کرنے کے لیے نہ جانے کب کسی نے ''لونگ پیپر'' کے درخت کا کٹا ہوا تنا اس کے پاٹ کے اوپر پھینک دیا تھا۔ ندی اس کے نیچے قریباً پندرہ بیس فٹ کی گہرائی میں بہہ رہی تھی۔ میں تین چار فٹ قطر کے اس تنے کے اوپر سے گزر کر ہی ندی پار کرسکتا تھا۔

میرے ذہن میں وہی ڈیک نالے والا منظر پھر تازہ ہوگیا۔ درد کی ایک لہر سی پورے جسم میں چل گئی۔ دو ڈھائی سال پہلے ایک ایسی ہی صورتِ حال میں تو عمران مجھ سے جدا ہوا تھا۔ کچھ ایسا ہی پانی تھا، کچھ ایسا ہی رستہ تھا اور عقب میں چلتے ہوئے کچھ ایسے ہی خطرات تھے۔ ''ہمت کرو تابی! تم یہ کرسکتے ہو۔ یہ زیادہ مشکل نہیں۔'' عمران کی بے چین آواز تاریکی کا سینہ چیر کر مجھ تک پہنچی تھی۔

میں نہیں کرسکا تھا لیکن آج میں کرسکتا تھا۔ آج دل و دماغ کی کیفیت کچھ اور تھی۔ بے رحم خزاؤں کے تھپیڑے سہہ سہہ کر اندر کے موسم بدل چکے تھے اب کھونے کو کچھ باقی نہیں تھا اور جب کچھ نہ ہو تو ڈر بھی باقی نہیں رہتا۔ میں نے ایک ہاتھ میں رائفل، دوسرے میں بیگ تھاما۔ دونوں چیزوں کو دونوں کندھوں سے لٹکایا اور تنے پر پاؤں رکھ دیئے۔ میرے پاؤں مستحکم تھے۔ جبڑے بھنچے ہوئے تھے اور نگاہیں دوسرے کنارے پر مرکوز تھیں۔ میں نیچے نہیں

دیکھ رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ گزر جاؤں گا۔ میں اگلے کنارے سے دس بارہ فٹ دور تھا کہ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے مجھے ڈانواں ڈول کیا۔ میں نے خود کو سنبھالنا چاہا لیکن توازن بگڑ چکا تھا۔ کوشش کے باوجود میں سنبھل نہیں پایا۔ میں پھسلا۔ دایاں کندھا بُری طرح تنے سے ٹکرایا اور میں سر کے بل ندی کے پانی میں آیا۔ یہ سب کچھ میں نے پورے ہوش و حواس کے ساتھ اور بے خوفی کے عالم میں محسوس کیا۔ ڈر کے بجائے ایک عجیب سی جھنجلاہٹ مجھ پر طاری ہوئی۔ میں نے سرد پانی میں چند غوطے کھائے اور پھر سطحِ آب پر رہنے کے لیے ہاتھ چلانے شروع کر دیئے۔ تیز بہاؤ مجھے اپنے ساتھ لیے چلا جا رہا تھا۔ سب سے پہلے مجھے اپنی رائفل کا خیال آیا وہ ابھی تک میرے کندھے پر تھی تاہم میرے ساتھ ہی پانی میں ڈبکیاں لے رہی تھی۔ کینوس کا بیگ کندھے سے اُتر کر ناپید ہو چکا تھا۔

میں بہت اچھا تیراک تو نہیں تھا تاہم ہاتھ پاؤں چلا کر خود کو سطحِ آب پر رکھ سکتا تھا۔ اگلے دس منٹ تک مٹیالے سرد پانی نے مجھے تیزی سے اپنے ساتھ بہایا۔ اس پانی میں درختوں کی پتلی شاخیں، زرد پتے، جنگلی پھولوں کے آثار اور پتا نہیں کیا کچھ میرے ساتھ بہہ رہا تھا۔ دس منٹ بعد پانی کی رفتار قدرے کم ہوگئی۔ میں نے کوشش کی اور خود کو کنارے کی طرف لے آیا۔ یہاں کناروں کی بلندی بھی دو تین فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ میں شرابور کپڑوں کے ساتھ باہر نکلا۔ عقب میں دیکھا، ایک بار پھر دور تک کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ میں خطرے سے باہر نہیں ہوں۔ میں نے ایک بار پھر تیزی سے چلنا شروع کر دیا۔ گاہے بگاہے دوڑنے لگتا تھا۔ میرا سامان کھو گیا تھا لیکن اس سے زیادہ تشویشناک بات یہ تھی کہ رائفل بُری طرح بھیگ چکی تھی۔ اب مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ اس طرح بھیگی ہوئی رائفل بہ وقتِ ضرورت کام کر سکتی ہے یا نہیں۔ میں ٹریگر دبا کر ہی اسے ٹیسٹ کر سکتا تھا لیکن اگر گولی چل جاتی تو اس کی آواز بھی خطرناک تھی۔ میرا تعاقب کرنے والے تو پہلے ہی مقناطیس کی طرح میری طرف کھنچتے چلے آتے تھے۔

میں اپنے زخم زخم جسم کو سمیٹے اسی طرح چلتا رہا۔ ایک جگہ گھنی جھاڑیوں میں دو تین جانور دکھائی دیئے۔ ان کی جسامت کتے کی طرح تھی۔ اس معاملے میں میری شناخت کی قابلیت صفر تھی۔ وہ بھیڑیے ہو سکتے تھے، لومڑ یا پھر جنگلی کتے جو اپنی جبلت میں بڑے خطرناک تصور کیے جاتے ہیں۔ بہرحال انہوں نے مجھے نظر انداز کیا اور میں نے انہیں۔ میں تھوڑا آگے گیا تھا کہ جھاڑ جھنکاڑ میں کوئی سیاہی مائل چیز نظر آئی۔ جیسے کوئی بڑا ریچھ یا سیاہ بھینسا چھپا بیٹھا ہو مگر دھیان سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ کوئی ذی روح نہیں۔ یہ دراصل کسی کھوہ کا دہانہ تھا۔

کچی زمین کے اندر ایک دراڑ کی سی شکل تھی جو نیچے سے پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے چند لمحے سوچا اور پھر اس دراڑ میں گھس گیا۔ خطرہ کہاں نہیں تھا؟ خطرہ یہاں بھی تھا۔ سانپ، بچھو یا کوئی جانور۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا یہاں اور میری رائفل بھیگ چکی تھی۔ کہیں سنا تھا کہ کبھی کبھی انسان خونخوار درندوں سے بڑھ کر خطرناک ہو جاتا ہے۔ آج یہ بات درست محسوس ہو رہی تھی۔ درندہ تو صرف شدید بھوک میں ہی حملہ آور ہوتا ہے اور اس میں حکمتِ عملی کا بھی فقدان ہوتا ہے۔ لیکن یہ جاندار جس کا نام انسان ہے، جب درندگی پر اُترتا ہے تو اس کے لیے سارے اوقات برابر ہو جاتے ہیں۔ اپنی خداداد صلاحیت سے وہ ایسی ایسی بھیانک چالیں سوچتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ یہ نیم تاریک دراڑ اتنی گہرائی تک جائے گی۔ میں چلتا گیا اور وہ مجھے راستہ دیتی گئی۔ میں آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ذرا گہرائی میں بھی اُتر رہا تھا۔ کہیں کہیں جالے لگے ہوئے تھے۔ جانوروں کی مینگنیاں اور گوبر وغیرہ بھی دکھائی دیتا تھا۔ دراڑ کی دیواریں کچی لیکن سخت مٹی کی تھیں۔ کافی آگے جا کر مجھے ایک جگہ تھوڑی سی راکھ اور کوئلے نظر آئے۔ یہاں آگ جلائی گئی تھی۔ اس واقعے کو کتنا عرصہ ہوا تھا، اس کے بارے میں کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ فی الحال یہ دراڑ بالکل سنسان نظر آتی تھی۔ کسی جگہ دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا لیکن کسی جگہ ہوا کی مدھم سی حرکت بھی محسوس ہوتی تھی۔ بھیگی ہوئی رائفل میں نے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑی ہوئی تھی۔ آگے جا کر دراڑ دو شاخوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ میں دائیں شاخ میں داخل ہو گیا۔

''رُک جاؤ نا ہیں تو گولی مار دوں گا۔'' ایک للکارتی ہوئی آواز مجھے عقب سے سنائی دی۔

میں ایک بار پھر سکتہ زدہ رہ گیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ نیم تاریکی میں بظاہر کوئی دکھائی نہیں دیا۔ ''بندوق پھینک کر ہاتھ اوپر اُٹھاؤ۔'' ایک بار پھر کرخت لہجے میں کہا گیا مگر اس بار آواز دوسری تھی۔ مطلب یہ تھا کہ یہاں ایک سے زیادہ افراد ہیں۔

''کون ہو تم؟'' میں نے رائفل پھینکے بغیر کہا۔

''سب کچھ بتا دیں گے۔ پہلے اپنی اس ماں کو نیچے پھینکو۔'' پہلے شخص نے گرج کر حکم دیا۔

میرے دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ یہ لوگ کسی صورت میرا پیچھا چھوڑنے کو

تیار نہیں تھے۔

میں نے رائفل نیچے پھینک دی لیکن کسی بھی کارروائی کے لیے تیار رہا۔ کُرتے پاجامے اور ٹوپی والا ایک مقامی شخص میرے سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے ریوالور کا رُخ میری طرف رکھا اور رائفل اُٹھانے کے لیے آگے بڑھا۔ اس کے عقب میں دو تین اور ہیولے سے دکھائی دے رہے تھے۔ جونہی اس نے رائفل اُٹھانی چاہی، میں نتائج سے بے پروا اس پر جا پڑا۔ میری ٹانگ بڑے زور سے اس کے چہرے پر لگی۔ وہ لڑکھڑا کر اس سرنگ نما دراڑ کی دیوار سے ٹکرایا۔ اس کی انگلی بے ساختہ ریوالور کے ٹریگر پر دب گئی تھی۔ دھماکے کے ساتھ شعلہ نکلا اور ایک دیوار کی طرف چلا گیا۔ رائفل کی نال میرے ہاتھ میں آ چکی تھی۔ میں نے اُسے لاٹھی کی طرح گھما کر ریوالور بردار کے ہاتھ پر مارا۔ نشانہ درست لگا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ ڈکراتا ہوا پشت کے بل گرا۔

یہی وقت تھا جب دو تین سائے مجھ پر جھپٹے۔ ان میں سے دو کے ہاتھ میں پُرانی طرز کی تلواریں اور ایک کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ وہ چنگھاڑتے ہوئے مجھ پر آئے۔ میں نے پیچھے ہٹ کر ایک فائر کرنا چاہا لیکن وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ بُری طرح بھیگی ہوئی کیچڑ آلود رائفل نے کام نہیں کیا۔ تلوار کا پہلا وار میں نے رائفل پر ہی روکا۔ پھر رائفل کو کسی لاٹھی کی طرح استعمال کرتے ہوئے میں حملہ آوروں سے بھڑ گیا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا، میں کیا کر رہا ہوں؟ کیوں کر رہا ہوں؟ اس کا انجام کیا ہوگا؟ بس میرے سینے میں آگ کی دیو قامت لہر تھی اور دماغ میں چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ لڑنے کے ساتھ ساتھ میں جنونی انداز میں دھاڑ رہا تھا۔ ''ماردو مجھے...... جان سے ماردو۔ میرے ٹکڑے کردو......''

اور جن لوگوں کو میں یہ دعوت دے رہا تھا، وہ سخت بدحواس نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو سر پر شدید چوٹ کھانے کے بعد زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ دوسرے کے ہاتھ سے تلوار نکل گئی تھی اور وہ چلا چلا کر اپنے ساتھیوں کو مدد کے لیے بلا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس جگہ پر کہرام سا مچ گیا تھا۔ پھر بھاگتے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی ایک گرج دار آواز اُبھری۔ ''ٹھہرو...... یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ سلطانہ کا شوہر ہے۔''

میرے اردگرد ایک دم سکوت سا ہو گیا۔ تلوار بردار اور اس کے ساتھی پیچھے ہٹ گئے۔ وہ اب آواز کے ماخذ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تب میں نے ڈاکٹر چوہان کو دیکھا اور حیران رہ گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں کو تسلی دینے کے انداز میں ہلا رہا تھا اور میری طرف آ رہا تھا۔ ''رُک جاؤ تابش! یہ دوست ہیں۔'' اس نے پکار کر کہا۔

میں حیرت زدہ کھڑا تھا۔ میرے ہاتھ اب بھی رائفل پر تھے۔ میں نے اسے نالی کی طرف سے بڑی مضبوطی کے ساتھ تھام رکھا تھا۔ سانس دھونکنی ہو رہی تھی۔ میں لڑنے مرنے کو بالکل تیار تھا۔

چوہان نے آگے بڑھ کر رائفل میرے ہاتھ سے لے لی اور مجھے کھینچ کر ایک طرف لے گیا۔ میرے شدید حملے سے زخمی ہونے والے دو افراد کو بھی دوسرے لوگوں نے سہارا دے کر اُٹھا لیا اور ایک طرف لے گئے۔ چوہان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس نے مجھے گلے لگا لیا اور بولا۔ ''ہمیں ہرگز امید نہیں تھی کہ تمہیں یہاں دیکھیں گے۔ یہ تو ایک کرشمہ ہے۔''

''یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے مجھ پر حملہ کیا ہے۔ مجھے مارنے کی کوشش کی ہے۔''

''یہ غلط فہمی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر ان کی وجہ سے تمہیں کوئی نقصان پہنچ جاتا تو سب سے زیادہ دُکھ بھی ان لوگوں کو ہی ہوتا۔ یہ دشمن نہیں، دوست ہیں۔ تمہاری اور سلطانہ کی خاطر ہی یہاں اس جگہ چھپے ہوئے ہیں۔ شاید تمہیں پتا نہیں وہاں زرگاں میں اس رات کیا کچھ ہوا ہے۔''

''تم کس رات کی بات کر رہے ہو؟''

''جب سلطانہ کو جیل سے نکال کر جارج گورے کی رہائش گاہ پہنچایا گیا اور تم جارج کے دو ملازموں کو زخمی کر کے وہاں سے بھاگے۔''

میں سوالیہ نظروں سے چوہان کا چہرہ تک رہا تھا۔

وہ بولا۔ ''تمہیں پتا ہے، تم اب کس جگہ ہو؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے کہا۔

''تم ایک بار پھر تل پانی کے آس پاس پہنچ چکے ہو اور یہ ایک بڑی اچھی پناہ گاہ ہے جہاں تم آ گئے۔ یہ ایک زبردست اتفاق ہے۔ یہاں موجود لوگوں میں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم از خود یہاں پہنچ جاؤ گے۔''

''تم اس رات کی بات کر رہے ہو۔ کیا ہوا تھا اس رات؟''

''میں تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔ پہلے تم اپنا لباس درست کر لو۔ تمہیں مرہم پٹی کی ضرورت بھی ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے تم نہا لو۔''

میں ایک بار پھر شدید حیرت کی زد میں تھا۔ میں نے خود کو ایک تنکے کی طرح محسوس کیا جسے حالات کی ہوا اپنے ساتھ اُڑائے لیے پھر رہی تھی۔

یہاں نہانے کا انتظام موجود تھا۔ میرے لیے ایک مقامی لباس بھی فراہم کر دیا گیا۔

ڈاکٹر چوہان نے اپنے ہاتھ سے میرے مختلف زخموں اور خراشوں وغیرہ کی مرہم پٹی کی۔ اس

دوران میں دیکھتا رہا کہ میرے اردگرد موجود لوگوں کی نگاہوں میں میرے لیے ہمدردی او دوستی کی جھلک ہے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ کم و بیش چالیس افراد تھے۔ ان میں عورت کوئی نہیں تھی۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ یہ سب مسلمان دکھائی دیتے تھے۔ ان کے پاس آتشیں اسلحے کے علاوہ تلواریں اور لاٹھیاں وغیرہ بھی تھیں۔ مجھے ان میں سے چند ایک کے چہرے اور جسم پر چوٹوں کے تازہ نشان بھی نظر آئے۔

یہ دراڑ یہاں آ کر کئی شاخوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ کئی جگہ گہری تاریکی تھی جہاں مشعلیں وغیرہ جل رہی تھیں۔ کئی حصوں میں ہلکا اُجالا موجود تھا۔ ویسے بھی اب مجھے یہاں داخل ہوئے ڈیڑھ دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ میری آنکھیں بتدریج نیم تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ یہ جگہ زیرزمین ایک وسیع و عریض قدرتی غار کی طرح تھی۔ ایک تنہا گوشے میں چٹائی بچھی تھی اور دو موم بتیاں روشن تھیں۔ چوہان مجھے وہاں لے آیا۔ اس نے مجھے زبردستی تھوڑا سا پنیر کھلایا۔ ساتھ میں خشک گوشت کے ٹکڑے اور بھنے ہوئے چنے تھے۔ پانی پی کر قدرے میری جان میں جان آئی۔ میری نگاہوں میں وہ دو عدد لاشیں گھومنے لگیں جنہیں میں اپنے پیچھے آبی گزرگاہ کے کنارے چھوڑ آیا تھا۔ ناقابلِ یقین بات یہ تھی کہ ان لوگوں کو میں نے مارا تھا اور اپنے ہاتھوں سے مارا تھا۔

چوہان نے مجھ سے پوچھا۔ ''جہاں تک میں جانتا ہوں جو رائفل تمہارے پاس ہے، وہ حکم جی کے ذاتی گارڈز کے استعمال میں ہوتی ہے۔ یہ تمہارے پاس کہاں سے آئی؟''

''میں تمہیں اس بارے میں بتاؤں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ اس رات زرگاں میں کیا ہوا ہے؟''

''وہ کچھ جو بہت کم لوگوں نے سوچا تھا۔ دراصل جب عام لوگوں کے دلوں کے اندر لاوا پکتا رہتا ہے تو پھر ایک روز اسے باہر تو نکلنا ہی ہوتا ہے۔ جبر، طاقت اور چالبازی سے ان جذبوں کو دبایا نہیں جا سکتا جو انسانوں کے اندر پلتے ہیں اور ہر گزرنے والے دن کے ساتھ پھلتے پھولتے ہیں۔ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ حد ختم جائے تو پانی جیسی نرم رقیق شے بھی بڑے بڑے مضبوط بند بہا کر لے جاتی ہے۔ زرگاں میں بھی صورتِ حال کچھ ایسی ہی ہوتی جا رہی ہے۔ اس تازہ واقعے نے لوگوں کو اور زیادہ بدظن کر دیا ہے۔ جارج گورا نے جو کچھ کیا، بڑی رازداری سے کیا۔ تمہیں پتا ہی ہوگا کہ جارج گورا زرگاں کی جیل کا انچارج بھی ہے۔ وہ بڑی رازداری سے سلطانہ کو رات کے وقت جیل سے نکلوا کر اپنے گھر لے گیا تھا لیکن یہ بات راز نہیں رہ سکی۔ جیل کا ایک ملازم مظفر جو یوں تو جارج کا وفادار ہے لیکن اس زیادہ

کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے بڑی مسجد کے امام صاحب کو جا کر سارا واقعہ بتا دیا۔ اس وقت تک رات کے بارہ بج چکے تھے۔ پورا زرگاں سویا پڑا تھا لیکن یہ ایسی خبر تھی جو دیکھتے ہی دیکھتے مسلمان آبادی میں پھیل گئی۔ اگلے روز صبح منہ اندھیرے سیکڑوں لوگ جارج کے گھر کے سامنے اکٹھے ہو گئے۔ جوں جوں دن چڑھتا گیا، یہ ہجوم بڑھتا گیا۔ لوگوں کے تیور دیکھ کر جارج نے بہت سے مسلح گارڈز بلا لیے۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی لوگوں نے جارج کے گھر پر ہلا بول دیا۔ گارڈز نے پہلے تو لاٹھی چارج اور ہوائی فائرنگ کے ذریعے لوگوں کو ڈرانا چاہا۔ جب بس نہیں چلا تو سیدھی فائرنگ شروع کر دی۔ وہاں بہت ہنگامہ ہوا مہروز...... میرا مطلب ہے تابش! کیا تمہیں اس کی کچھ خبر نہیں؟'' چوہان نے پوچھا۔

''نہیں...... مجھے کچھ پتا نہیں۔ میں اسی رات زرگاں سے نکل گیا تھا۔ میں نے یہ دو دن بالکل ویرانے میں گزارے ہیں۔'' میں نے کہا۔

چوہان نے بتایا۔ ''اس ہنگامے میں کم از کم آٹھ لوگوں کی جان گئی ہے۔ چھ بندے مظاہرہ کرنے والوں میں سے مرے ہیں۔ دو گارڈز بھی جان سے گئے ہیں۔ انہیں کلہاڑیوں اور چھریوں کے زخم لگے تھے۔ اسی دوران میں جارج اور اس کے دو قریبی ساتھی موقع دیکھ کر عقبی راستے سے کوٹھی سے نکل گئے۔ حکم جی تو زرگاں سے باہر ہے۔ اس کے قائم مقام نے گارڈز کی مزید نفری منگوائی اور بڑی مشکل سے اس ہنگامے پر کنٹرول کیا۔''

''سلطانہ کا کیا بنا؟'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''لوگوں نے اسے اور تمہارے بچے بالو کو بھی کوٹھی سے نکال لیا۔''

''کہاں ہیں وہ؟''

چوہان نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، اسے کہاں ہونا چاہیے؟''

''کیا...... وہ یہیں پر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

چوہان نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''لیکن اس کی حالت ایسی نہیں کہ تم فوری طور پر اس سے مل سکو۔ اس نے سارے حالات کا بہت زیادہ اثر لیا ہے۔ یہاں ایک بندے کے پاس افیون تھی۔ میں نے وہ اسے دی ہے تاکہ وہ کچھ سکون سے رہ سکے۔'' چوہان کے چہرے پر دُکھ کے تاثرات تھے۔

میری نگاہوں میں ایک بار پھر وہی دل دوز منظر گھوم گیا جب میں بے بسی کی حالت میں جارج کے کمرے سے باہر آ رہا تھا اور سلطانہ دروازہ بند کر رہی تھی۔ یہ منظر جیسے میرے حافظے

سے چپک کر رہ گیا تھا۔ میری سانس تیزی سے چلنے لگی اور رگ پٹھوں میں تناؤ محسوس ہوا۔

''کیا بات ہے؟'' چوہان نے میرا چہرہ دیکھ کر پوچھا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، کہیں دور سے بچے کے رونے کی مدھم آواز سنائی دی۔ یہ بالو ہی تھا۔

''میں سلطانہ اور بچے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اٹل لہجے میں کہا۔

''لیکن اس سے سلطانہ اور ڈسٹرب ہو سکتی ہے۔''

''اس نے جتنا ڈسٹرب ہونا تھا، ہو چکی ہے۔'' میں نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ٹھہرو...... ٹھہرو...... ایسے نہیں۔'' چوہان نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے روک لیا۔ ''پہلے مجھے سلطانہ کے پاس جا کر وہاں کی صورت حال دیکھنے دو۔''

وہ مجھے وہیں بٹھا کر ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ ایک شخص دوستانہ انداز میں میرے پاس آ بیٹھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ سلطانہ کا باپ اور بھائی زرگاں سے نکل نہیں سکے۔ اس بات کا سب کو بہت افسوس ہے۔ چند افراد ایک طرف چادریں بچھا کر نماز کی تیاری کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ بھی لیتے تھے۔ ان کی نگاہوں میں میرے لیے ہمدردی تھی لیکن اب پتا نہیں کیوں یہ ہمدردی مجھے ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ ہمدردی کے ساتھ ساتھ مجھ پر ترس بھی کھا رہے ہیں اور مجھے اب ترس کی ضرورت نہیں تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اب میں جتنے ہفتے، دن یا گھنٹے زندہ رہوں، سر اُٹھا کر رہوں اور کوئی مجھے قابل رحم نہ سمجھے۔ یوں لگتا تھا کہ ان چند دنوں کے اندر میری پوری کیمسٹری ہی بدل گئی ہے۔

ایک شخص دائیں طرف دیوار کے ساتھ بیٹھا کراہ رہا تھا۔ اس کا بازو ٹوٹ گیا تھا اور اب ایک پٹی میں باندھا ہوا گلے میں جھول رہا تھا۔ یقیناً یہ بھی اس خونی ہنگامے کا زخمی تھا جو تین دن پہلے جارج گورا کی رہائش گاہ پر ہوا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ وہ ہمیش تھا۔ وہی جواں سال بھکشو جس سے پکوڑا میں پہلے ہی روز میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ میرے ساتھ محبت سے پیش آیا تھا۔ اس نے بھنے ہوئے چاولوں سے میری تواضع کی تھی۔ آج وہ یہاں اس مسلمان جتھے کے ساتھ موجود تھا جس نے حکم جی اور جارج وغیرہ کے خلاف بغاوت کا علم اُٹھایا تھا اور اب یہاں اس زیرزمین پناہ گاہ میں موجود تھا۔

میری آنکھیں ہمیش کی آنکھوں سے چار ہوئیں۔ ہمیش کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔

میں اُٹھ کر اس کے پاس چلا گیا۔ ''تم یہاں کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''میں کیوں نا ہیں ہوسکتا؟''

''میرا مطلب ہے تم تو بودھی بھکشو ہو۔''

''بھکشو بھی تو انسان ہی ہووت ہے۔ ظلم زیادتی دیکھ کر اس کا سینہ بھی جلتا ہے اور پھر جس طرح کے ظلم حکم جی اور جارج وغیرہ کر رہے ہیں، یہ تو پتھر کو بھی رونے پر مجبور کر دیوت ہیں۔'' نوجوان بھکشو کی شفاف آنکھوں میں گہرا دکھ پھیل گیا۔

''تو تم بھی جارج کے گھر گھسنے والوں میں شامل تھے؟''

''ہاں..... اور میرے دو اور دوست بھی تھے۔ جب ہمیں جانکاری ہوئی کہ مختار راجپوت کی بیٹی سلطانہ کو رات کے وقت جیل سے نکال کر جارج گورا کے گھر پہنچایا گیا ہے اور اب بہت سے لوگن جارج کے گھر کے سامنے جمع ہیں تو میں بھی نہ رہ سکا۔ میں وہاں پہنچ گیا۔ وہاں لوگن کے اندر آگ بھڑک رہی تھی اور وہ غصے سے دیوانے ہو رہے تھے۔ اچانک جارج کے غنڈوں نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے بعد وہاں جو کچھ ہوا، وہ ڈاکٹر چوہان نے تمہیں بتایا ہی ہووے گا۔''

میں خاموش رہا۔ ہمیش بھی خاموشی سے اپنے ٹوٹے بازو کو سہلاتا رہا۔ آخر اس نے ہولے سے کہا۔ ''تم وہاں سے کب نکلے تھے؟''

''مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''میرا دچار ہے کہ وہ رات دو ڈھائی بجے کا ہووے گا۔ اس وقت ہم نے جارج کی کوٹھی کی طرف سے خطرے کے سائرن سنے تھے۔ پر اس وقت ہم کو بالکل پتا نا ہیں تھا کہ یہ سائرن تمہارے کارن بجائے جا رہے ہیں۔ یہ تو اگلے روز پتا چلا کہ تم بھی جیل کے بجائے جارج کی کوٹھی پر ہی تھے اور رات کو جارج کے دو بندے زخمی کر کے وہاں سے بھاگ نکلے ہو۔ جس گھوڑا گاڑی پر تم بھاگے تھے، وہ آگے جنگل سے ملی تھی۔ بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ ایک گھوڑے کی ریڑھ ٹوٹی تھی اور وہ مر گیا تھا۔''

میں اب بھی خاموش رہا۔ اس رات کے تہلکہ خیز مناظر ذہن میں تازہ ہونے لگے۔ ہمیش میرے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ تعریف کا مدھم سا عکس بھی تھا۔ جیسے بہ زبان خاموشی کہہ رہا ہو۔ تم نے دلیری دکھائی ہے۔ تمہیں ایسے ہی کرنا چاہیے تھا بلکہ بہت پہلے سے ایسے کرنا چاہیے تھا۔

اسی دوران میں چوہان واپس آ گیا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ میں اور چوہان پھر کونے میں بچھی چٹائی پر جا بیٹھے۔ چوہان نے کہا۔ ''تابش! ابھی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ذہنی طور

پر بھی بُری طرح اپ سیٹ ہے۔ تمہیں تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔ کم از کم کل تک۔''

''ہم یہاں کب تک رہیں گے؟'' میں نے چوہان سے پوچھا۔

''ابھی کچھ پتا نہیں۔ ویسے نل پانی میں چھوٹے سرکار کو ساری بات معلوم ہو چکی ہے۔ وہ جلد ہی کوئی فیصلہ کر لیں گے۔ اگر انہوں نے اس بار تمہیں اور سلطانہ کو پناہ دے دی تو یہ بہت اچھا ہوگا اور میرا خیال ہے کہ اگر تمہیں پناہ ملی تو ان چالیس پینتالیس لوگوں کو بھی مل جائے گی جو تمہارے ساتھ یہاں موجود ہیں۔''

''اور اگر پناہ نہ ملی تو؟''

''پھر کافی مشکل ہوگی۔ یہ لوگ اس پناہ گاہ میں بہت دیر تک چھپے نہیں رہ سکیں گے۔ پھر ان سب کو......'' وہ کہتے کہتے ایک دم خاموش ہو گیا۔

بہرطور اس کا ادھورا فقرہ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ پھر ان سب کو مرنا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ان سب میں سلطانہ اور میں بھی شامل تھے۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟ چھوٹے سرکار کب تک فیصلہ کریں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس بارے میں وشواس سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ چھوٹے سرکار کے لیے یہ بہت کٹھن فیصلہ ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ان کی پوری طرح ٹھن جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ یہ جھگڑا سنگین شکل اختیار کر جائے۔''

''کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ چھوٹے سرکار ہم لوگوں کی خیر خواہی میں اس حد تک چلے جائیں گے۔''

چوہان نے دیوار سے ٹیک لگائی۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی گہری پرچھائیاں لہرائیں۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ''بے شک دونوں بھائی ہیں اور کئی معاملوں میں ان کا مفاد ایک ہے۔ مثلاً دونوں یہ چاہتے ہیں کہ اس راجواڑے میں باہر سے کوئی مداخلت نہ ہو۔ راجواڑے میں ایسے لوگوں کو سر نہ اٹھانے دیا جائے جو کل کو راج پاٹ کے لیے خطرہ بن جائیں یا اس قسم کی دوسری باتیں۔ مگر یہ بات سب جانتے ہیں کہ چھوٹے سرکار میں حکم جی سے کہیں زیادہ رواداری اور انصاف پسندی ہے۔ وہ اپنے بڑے بھائی حکم جی کا جبر پسند نہیں کرتے اور جو لوگ اس جبر، ناانصافی کے ہاتھوں تنگ ہو کر نل پانی کا رُخ کرتے ہیں، انہیں پناہ دیتے ہیں۔ اب تمہارے اور سلطانہ کے معاملے میں بھی جو کچھ زرگاں میں ہوا ہے، وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ سلطانہ کا وہ خدشہ بالکل درست ثابت ہوا ہے جو اس نے مقدمے کی کارروائی میں چھوٹے سرکار کے سامنے بیان کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اسے موہن کمار وغیرہ

کے حوالے کر دیا گیا تو زرگاں میں اس کی آبرو اور جان دونوں خطرے میں پڑ جائیں گی اور یہی کچھ ہوا ہے۔ اب اس میں شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ بیسیوں لوگ گواہ ہیں۔ سلطانہ اور اس کا بچہ جارج کی رہائش گاہ سے برآمد ہوئے ہیں۔''

گہرے تاسف کے ساتھ چوہان خاموش ہو گیا۔ جلد ہی شام ہوئی اور پھر رات ہو گئی۔ اس زیرزمین پناہ گاہ کے اندر گہری تاریکی پھیل گئی۔ اس تاریکی میں کہیں کہیں مشعلوں اور لالٹینوں کی روشنی تھی۔ جب دھوئیں سے گھٹن محسوس ہونے لگی تو مشعلیں بجھا دی گئیں اور لالٹینیں جلتی رہنے دی گئیں۔ ایک طرف سے شور اُٹھا۔ پتا چلا کہ کچھ لوگوں نے کسی تاریک گوشے میں چھپے ہوئے ایک خطرناک جنگلی بلّے کو مارا ہے۔ رات کو بھی اس پناہ گاہ میں موجود لوگوں نے خشک راشن ہی استعمال کیا۔ چوہان نے میری کیچڑ آلود رائفل کو ایک انور خاں نامی شخص کے حوالے کیا تھا۔ اس نے رائفل کے حصے بخرے کر کے اسے صاف کیا، پھر جوڑا اور تیل وغیرہ لگا کر چمکا دیا۔ گولیاں بھی بھیگی تھیں تاہم انور خاں کا خیال تھا کہ یہ قابلِ استعمال ہیں۔

رات کو لوگ، کھوہ کے مختلف حصوں میں چادریں وغیرہ بچھا کر سو گئے۔ کھوہ کے دہانے کی طرف انور خاں نے دو تین افراد کو مقرر کر دیا تھا۔ میں اور چوہان ساتھ ساتھ ہی لیٹے۔ چوہان کچھ دیر بعد سو گیا لیکن میں جاگتا رہا۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ سینے میں مسلسل آگ سی روشن تھی۔ آدھی رات کے وقت مجھے پھر بچے کے رونے کی مدھم آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی کوئی کراہا اور کچھ بولا۔ یہ نسوانی آواز تھی۔ یہ سلطانہ کے سوا کس کی آواز ہو سکتی تھی۔

میں آہستگی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ نیم تاریکی میں احتیاط سے پاؤں رکھتا اور سوئے ہوئے لوگوں کو پھلانگتا ہوا میں کھوہ کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں سلطانہ اور اس کا بچہ موجود تھے۔ یہاں ایک لالٹین جل رہی تھی۔ اس کی مدھم روشنی میں چٹائی پر ایک لڑکی نظر آئی۔ یہ سلطانہ تھی مگر یہ وہ سلطانہ تو نہیں تھی جسے چند روز پہلے میں نے دیکھا تھا۔ وہ دنوں میں ہی مہینوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔ میں نے دیکھا کہ لالٹین کی زرد روشنی میں اس کا رنگ زرد تر نظر آ رہا تھا۔ رُخساروں کے قندھاری انار اس پژمردہ زردی میں دفن ہو چکے تھے۔ وہ بال کھولے ایک گٹھڑی پر سر رکھے لیٹی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور بالو اس کے پہلو میں کسمسا رہا تھا۔

میری طرف دیکھنے کے بعد بھی اس نے جیسے مجھے پہچانا نہیں۔ چند لمحے خالی خالی

نظروں سے مجھے تکتی رہی۔ پھر اس کی آنکھوں میں عجیب تاثرات اُبھرے۔ کچھ دیر کے لیے ایسے لگا کہ وہ ایک دم کروٹ بدل کر اپنا چہرہ چھپا لے گی یا پھر ویسے ہی اُٹھ کر کسی طرف بھاگ جائے گی۔ مگر بتدریج اس کی شفاف آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ یہ آنسو موتی مثل بوندوں کی صورت اس کے زرد رُخساروں پر ڈھلکنے لگے۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اوڑھنی اپنے سر پر پھیلا لی اور کسی شرمسار مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔ میرا دل جیسے سینے میں کٹ کر ٹکڑوں میں تبدیل ہو گیا۔ مجرم کون تھا؟ وہ تو نہیں تھی۔ اگر کوئی تھا تو پھر شاید میں تھا اور میرے حالات تھے۔

نہ جانے دل کی کیا کیفیت تھی کہ میں اس کے قریب دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ روتا ہوا بالو اب چپ ہو گیا تھا اور اپنی چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں سے پُرحیرت انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ آنسو ابھی تک اس کی معصوم آنکھوں میں موجود تھے لیکن وہ انہیں یکسر بھول چکا تھا۔ میں نے اس کا گال سہلایا۔ وہ مسکرانے لگا۔ وہ اس درد و کرب سے یکسر بے خبر تھا جو اس کی ماں کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔

''مہرو! مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔'' سلطانہ کربناک انداز میں منمنائی اور اپنا سر اپنے گھٹنوں پر جھکا لیا۔

''کیوں چھوڑ دوں؟'' میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

اسے جیسے برقی رو چھو گئی۔ اس نے ایک دم ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ ''مجھے مت چھوؤ مہرو! میں تمہارے خابل ناہیں ہوں۔ تم چلے جاؤ یہاں سے۔ خدا کے لیے۔''

''تمہارا کوئی قصور نہیں ہے سلطانہ! تم خود کو گناہگار کیوں سمجھ رہی ہو؟'' میں نے بڑے کرب سے کہا۔

وہ رونے لگی۔ اس کی سسکیاں جلد ہی ہچکیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ وہ ایک دم پلٹی اور اس نے اپنا سر میرے پاؤں پر رکھ دیا۔ ''مجھے معاف کر دینا مہرو! میں بے بس ہو گئی تھی۔ وہ تمہیں مار دیتا، وہ بالو کو مار دیتا اور تم دونوں اچ دنیا میں ناہیں رہتے تو میرے جندہ رہنے کا کیا فائدہ تھا؟''

''سلطانہ...... سلطانہ......'' میں نے اسے اپنے پاؤں سے اُٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ چمٹی رہی۔

''تم میرے سرتاج ہو مہرو! میں تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں لیکن اب مجھ میں اتنی

ہمت ناہیں کہ اپنی نحوست کو تمہاری جندگی کا روگ بنا کر رکھوں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو مہرو! کہیں چلے جاؤ اور ہو سکے تو بالو کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔'' وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اس کے بال میرے پاؤں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ کچھ فاصلے پر سوئے ہوئے دو تین افراد اُٹھ بیٹھے اور تعجب سے دیکھنے لگے۔ میں نے پھونک مار کر لالٹین بجھا دی۔ کھوہ کے اس حصے میں تاریکی پھیل گئی۔

میں نے سلطانہ کے بالوں کو سہلاتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔ ''تمہارا کوئی قصور نہیں سلطانہ! تم بالکل پاک صاف ہو۔ اسی طرح ہو جس طرح پہلے تھیں۔ تم خود کو......''

''ناہیں...... ناہیں مہرو۔'' سلطانہ نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ ''تم ناہیں جانتے، عورت کی عجت آبرو کا ماملہ کتنا نا جک ہوتا ہے۔ میرے منہ پر جو کالک مل گئی ہے، وہ اب مجھے کبھی چین سے ناہیں رہنے دے گی۔'' وہ رو رہی تھی اور مسلسل میرے پاؤں سے چمٹی ہوئی تھی۔

اس کا فقرہ میرے کانوں میں گونجنے لگا۔ تم ناہیں جانتے عورت کی عجت آبرو کا ماملہ کتنا نا جک ہوتا ہے۔

وہ غلط کہہ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ معاملہ کتنا نازک ہوتا ہے۔ میں نے اس نزاکت اور اس نزاکت کی بے مہر سنگینی کو بھگتا ہوا تھا۔ ثروت کا چہرہ میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ وہ حالانکہ غنڈوں کے چنگل سے نکل کر بخیریت گھر آ گئی تھی لیکن ایک رات گھر سے باہر رہنے کی پاداش میں اس کے ساتھ اور اس کے اہلِ خانہ کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، وہ درد کا ناقابلِ فراموش ماجرا تھا اور سلطانہ؟ سلطانہ تو ''بخیریت'' بھی واپس نہیں آ سکی تھی۔ ہر جگہ اندوہ کی وہی کہانی تھی۔ شکاریوں کے وہی جال اور شکار ہونے والوں کی وہی بے چارگیاں۔ آسمانی کتابوں کے مطابق عورت نے غلطی کی۔ اس نے آدم کو بہکایا اور جنت سے نکلوایا۔ شاید اس غلطی کی سزا ہر بنت حوا آج تک بھگت رہی ہے۔

میں نے بمشکل سلطانہ کو اپنے پاؤں سے جدا کیا اور دیوار کے سہارے بٹھایا۔ تاریکی میں دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر بتر ہے۔

تاریکی کی وجہ سے بالو نے ایک بار پھر رونا شروع کر دیا تھا۔ سلطانہ اس سے قطعی بے پروا نظر آ رہی تھی۔ وہ اسے ہاتھ لگاتے ہوئے بھی کتراتی تھی۔ میں ان دونوں کے پاس سے اُٹھ کر باہر آ گیا۔ دماغ میں آندھی چل رہی تھی۔ ایسی بے کار زندگی کا کیا فائدہ تھا؟ اسے ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ جلد سے جلد ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ مجھے پچھلے دو برس کے بارے میں کچھ یاد

نہیں تھا لیکن لوگ جو کچھ بتا رہے تھے، ان سے یہی پتا چلتا تھا کہ سلطانہ نے میرے لیے بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ جب میں ایک بار اس کا شوہر بن گیا تو پھر اس نے مجھے واقعی اپنا شوہر سمجھا اور ایک جاں نثار شریکِ حیات کی حیثیت سے میری مصیبتوں کے سامنے دیوار بن گئی۔ ایک مرتبہ اس نے میری حفاظت کی خاطر اپنے گھرانے کی سب سے قیمتی متاع، راجا پرتاب بہادر کی بخشی ہوئی مہر داؤ پر لگائی اور اب اس نے میری زندگی کے لیے اپنا آپ ہی داؤ پر لگا دیا تھا۔ اس کے بدلے میں نے کیا کیا؟

یہ سوال دہکی ہوئی آہنی میخ کی طرح میرے دماغ میں گڑ گیا۔ دماغ میں چلتی ہوئی آندھی مزید تند و تیز ہو گئی۔ عمران نے ہی تو کہا تھا ایک بار...... جب مرنے کا ارادہ کر لو تو پھر پیچھے مڑ کر نہ دیکھو۔ پیچھے دیکھنے سے زندگی کا کالا جادو چل جاتا ہے۔ ڈاکٹر چوہان، ہمیش اور انور خاں وغیرہ سب اپنی اپنی جگہوں پر سوئے ہوئے تھے۔ میں نے ایک نظر ان سب پر ڈالی۔ پھر انور خان کے پاس سے اس کی رائفل اُٹھائی اور ایک عجیب کیفیت کے زیرِ اثر وہاں سے چل پڑا۔ میرا رُخ اس طویل کھوہ کے دہانے کی طرف تھا۔

میں کیا کرنا چاہتا تھا؟ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ فی الوقت بس ایک ہی خواہش تھی۔ سرخ و سپید چہرے والا جارج میرے سامنے ہو۔ میں رائفل اپنے اور اس کے درمیان پھینک دوں پھر چلا کر کہوں۔ ''چل کتے...... تُو مجھے مار دے یا میں تجھے مار دوں۔'' ایسی درندگی کے ساتھ اس پر جھپٹوں کے بس چند سیکنڈ میں میری یا اس کی موت کا فیصلہ ہو جائے۔

جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا، کھوہ تاریک تر ہوتی گئی۔ مجھے ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھنا پڑا۔ بالآخر میں دہانے تک پہنچ گیا۔ یہاں تاریکی میں دو ہیولے نظر آئے۔ یقیناً یہ وہی لوگ تھے جنہیں انور خاں نے پہرے پر مقرر کیا تھا۔

میں پاس پہنچا تو ان میں سے ایک بولا۔ ''کون؟'' اس کے ساتھ ہی اس نے ایک ٹارچ کی روشنی مجھ پر پھینکی۔

''کیا بات ہے؟ تم کہاں جاوت ہو؟'' ایک شخص نے ٹھٹکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''مجھے کوئی کام ہے۔'' میں نے تیزی سے کہا اور آگے بڑھنا چاہا۔

اس شخص نے میرا راستہ روکا۔ میں نے دھکا دے کر اسے پیچھے ہٹا دیا۔

''دیکھو...... تم ایسے ناہیں جا سکت ہو۔'' اس نے کہا اور دوبارہ میرے راستے میں آ گیا۔ اس مرتبہ دوسرا شخص بھی اس کے ساتھ تھا۔

''بکواس بند کرو۔'' میں نے وحشت کے عالم میں اسے پھر دھکا دیا۔ اس مرتبہ وہ

لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔

وہ دوبارہ میرے سامنے آتا تو میں اس پر رائفل تان لیتا مگر اس سے پہلے کہ نوبت یہاں تک پہنچتی، کسی نے عقب سے مجھے بازوؤں میں لے لیا۔ ''نہیں تابش! ایسے نہیں کرنا۔ یہ ٹھیک نہیں۔''

یہ چوہان کی آواز تھی۔ پتا نہیں وہ کب میرے پیچھے آن موجود ہوا تھا۔ میں نے زور مارا۔ ''مجھے چھوڑ دو۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں اسے مار ڈالوں گا۔'' میں چنگھاڑا۔ میری آواز فرطِ طیش سے بگڑی ہوئی تھی۔ میرا اشارہ جارج کی طرف تھا۔

اسی دوران میں دو اور افراد مجھ سے لپٹ گئے۔ ان میں سے ایک انور خاں تھا۔

''میں قتل کر دوں گا یا قتل ہو جاؤں گا۔ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے مرنے دو۔'' میں دھاڑ رہا تھا اور خود کو چھڑانے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔ وہی آنسو جو بے بسی کی انتہا کو چھونے کے بعد بجنگ آمد کی کیفیت میں آنکھوں میں آتے ہیں۔

کچھ دیر بعد ہیجان میں کچھ کمی آئی چوہان نے نرمی کے ساتھ رائفل میرے ہاتھ سے لے لی اور انور خاں کو واپس کر دی۔ وہ لوگ مجھے دلاسہ دیتے ہوئے کھوہ کے اندرونی حصے میں واپس لے آئے۔

چوہان نے مجھے سمجھانا شروع کیا۔ اس نے کہا کہ اس موقع پر ہمیں بہت سوچ سمجھ کر قدم اُٹھانا ہوگا۔ ہماری کسی بھی جلد بازی سے حکم جی اور جارج وغیرہ کو فائدہ پہنچے گا اور وہ پہلے ہی کچھ کم طاقتور نہیں ہیں۔ اس نے مجھے انور خاں کے بارے میں بھی بتایا۔ اس نے کہا۔ ''انور خاں بڑا باکمال آدمی ہے۔ علاقے کے مسلمان باشندے اسے ایک ہیرو کی طرح مانتے ہیں۔ حکم جی وغیرہ کو بھی انور خاں کے ساتھ بنا کر رکھنی پڑتی ہے۔ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ انور خاں کسی بھی وقت مسلمان باشندوں کو بھڑکا بھی سکتا ہے اور ان کے جذبات کو ٹھنڈا بھی کر سکتا ہے۔ چند دن پہلے تک انور خاں کے تعلقات حکم جی اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ٹھیک ہی تھے مگر اب سب کچھ اُلٹ پلٹ ہو گیا ہے۔ انور خاں نے سلطانہ کو جارج کے شکنجے سے چھڑانے میں باقاعدہ کردار ادا کیا ہے۔ بلکہ لوگوں کو جارج کے گھر کے سامنے جمع ہونے اور پھر ہلا بولنے کی ہمت انور خاں کی وجہ سے ہی ہو پائی تھی۔''

چوہان نے مجھے انور خاں کے بارے میں کئی ایک باتیں بتائیں۔ میں سن تو رہا تھا مگر میرا دماغ کئی خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ جو سب سے پریشان کن خیال بار بار میرے ذہن سے ٹکرا رہا تھا، وہ یہی تھا کہ آخر میرے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں جہاں جاتا ہوں، میرا

پیچھا کرنے والے وہاں پہنچ جاتے ہیں؟ اگر وہ ہر جگہ پہنچ گئے تھے تو پھر یہاں بھی پہنچ سکتے تھے۔ میں نے اب تک پیش آنے والے سارے واقعات سے چوہان کو آگاہ کرنا بہتر سمجھا۔ میں نے جب چوہان کو بتایا کہ حکم جی کا خاص ہرکارہ اپنے ایک ساتھی سمیت میرے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے تو چوہان ششدر رہ گیا۔

اس نے مجھ سے تفصیل پوچھی۔ میں نے اسے بتایا۔ ''وہ میرے پیچھے آ رہے تھے۔ میں جنگل میں بہت آگے نکل گیا تھا مگر وہ پھر بھی مجھ تک پہنچ گئے۔ وہ گھوڑوں پر آئے تھے۔ ان کے ساتھ وہ غیر ملکی ڈیوڈ بھی تھا۔ انہوں نے مجھے پکڑنا چاہا تو میں نے گولی چلا دی۔ ڈیوڈ اور اس کا ایک ساتھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ تیواری اور ایک دوسرا بندہ وہیں مارے گئے۔ میں ان کی لاشیں ندی کے کنارے چھوڑ آیا ہوں۔''

''یہ بات اب آگے تک جائے گی۔'' چوہان نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''تیواری اور ڈیوڈ وغیرہ حکم جی کے لیے بڑے خاص لوگ ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ بہت سی تبدیلیوں کا وقت ہے۔ یہاں کافی ہلچل مچنے والی ہے۔'' چوہان کی آنکھوں میں بدستور حیرت ناچ رہی تھی۔

اچانک ایک طرف سے پھر شور ابھرا۔ ہم نے خیال کیا کہ شاید پھر کہیں سے کوئی جانور نکل آیا ہے۔ لیکن اس مرتبہ صورتِ حال مختلف تھی۔ دو افراد آپس میں لڑ پڑے تھے۔ وہ گتھم گتھا تھے۔ دوسرے افراد انہیں چھڑانے میں لگے ہوئے تھے۔ چند سیکنڈ تک یہ ہنگامہ رہا پھر دونوں متصادم افراد کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا گیا۔

معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک نوجوان کا نام فیروز اور دوسرے کا نام اکبر ہے۔ اکبر درمیانی عمر کا تھا۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ وہ اب بھی بلند آواز سے بول رہا تھا۔ ''میں پھر کہتا ہوں۔ یہ فیروز! ہم کو نقصان پہنچا دے گا۔ اس نے روپ بدلا ہوا ہے۔ اس کا دل اب بھی ان لوگوں کے ساتھ دھڑکتا ہے جن کا یہ نمک کھاتا ہے۔''

''بکواس بند کرو۔'' انور خاں زور سے دھاڑا۔ ''ثبوت کے بغیر کوئی بھی بات نہ کرے۔ جو بھی ثبوت کے بغیر بات کرے گا، میں اس کا گریبان پکڑوں گا۔''

اس نے ڈانٹ ڈپٹ کر زیادہ بولنے والے شخص اکبر کو چپ کرا دیا۔ دونوں طرف سے لوگ بول رہے تھے۔ انور خاں پانچ چھ افراد کو لے کر ایک طرف چل گیا۔ کچھ دیر تک وہاں میٹنگ ہوتی رہی۔ پھر لگا کہ معاملہ ٹھنڈا پڑ رہا ہے۔ صرف دس پندرہ منٹ بعد میں دیکھ رہا تھا کہ فیروز اور اکبر نامی دونوں افراد آپس میں گلے مل رہے ہیں۔ انہیں گلے ملانے والا انور خاں ہی تھا۔

''یہ کیا معاملہ تھا؟'' میں نے چوہان سے پوچھا۔

''بس غلط فہمی تھی جس کی وجہ سے جھگڑا ہو گیا لیکن اس جھگڑے کی وجہ سے ایک اہم انکشاف بھی ہو گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

چوہان نے سنسنی خیز لہجے میں بتایا۔ ''دراصل فیروز نام کا یہ لڑکا جس سے اکبر علی نے جھگڑا کیا ہے، حکم جی کے ملازموں میں سے ہے۔ فیروز کی والدہ ہندو تھی مگر شادی کے وقت مسلمان ہو گئی۔ پر کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ پھر بھی ہندو ہی رہی تھی۔ اس وجہ سے وہ فیروز سے بھی عناد رکھتے ہیں جبکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اب بھی اسی بات پر جھگڑا ہوا ہے۔ اکبر نے فیروز پر الزام لگایا ہے کہ وہ جاسوسی کے لیے ان کے ساتھ موجود ہے۔ ورنہ وہ اب بھی حکم جی کے گھر میں اس کے پودوں کو پانی دے رہا ہوتا یا اس کی گاڑیاں صاف کر رہا ہوتا۔ جواب میں فیروز نے جو کچھ کہا ہے، اس نے سب کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ فیروز نے کہا ہے کہ وہ اس بندے کی موت کی وجہ سے حکم جی کا باغی ہوا ہے جو کچھ دن پہلے سلطانہ کے ہاتھوں زخمی ہوا تھا۔''

''تم ہارون کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

چوہان نے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ ''فیروز نے انکشاف کیا ہے کہ ہارون اس وجہ سے نہیں مرا تھا کہ اسے سلطانہ نے کلہاڑی ماری اور پھر کھوہ میں اسے باندھ کر نل پانی چلی گئی۔ اس کی موت حکم جی کے اپنے بندوں کی وجہ سے ہوئی۔ اسے موہن کمار اور اس کے ساتھیوں نے مارا اور اس وجہ سے مارا کہ ہارون کی موت کو سلطانہ کے سر تھوپ کر اسے نل پانی سے واپس لایا جا سکے۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ واقعی یہ سنسنی خیز انکشاف تھا۔ میں خود بھی کئی دن تک الجھن میں رہا تھا۔ بے شک سلطانہ کی کلہاڑی سے ہارون کے سر کے پچھلے حصے پر گہرا زخم آیا تھا لیکن یہ ایسا زخم نہیں تھا کہ اس کی فوری موت کا باعث بن جاتا۔ یقیناً یہ سازش ہی تھی۔ بندھے ہوئے ہارون کو کھوہ کے اندر موہن کمار نے مارا تھا پھر اس کی لاش لے کر دہائی دیتا ہوا نل پانی جا پہنچا تھا۔ اس کی دہائی کارگر رہی تھی اور چھوٹے سرکار نے مجھے اور سلطانہ کو پناہ دینے کے بجائے موہن کمار اور گرومودان وغیرہ کے سپرد کر دیا تھا۔

چوہان نے مدھم لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اصل میں یہ نوجوان فیروز اور ہارون ایک دوسرے کے دوست بھی تھے۔ فیروز کو معلوم تھا کہ ہارون کی موت حقیقت میں

کس طرح ہوئی ہے۔ وہ اپنے دل میں غم چھپائے پھر رہا تھا۔ اس دوران میں یہ دوسرا واقعہ ہو گیا۔ پتا چلا کہ جارج نے سلطانہ کو جیل سے نکال کر اپنے گھر پہنچایا ہے۔ دیگر لوگوں کی طرح فیروز بھی اپنے غم و غصے کو دبا نہیں سکا۔''

''یہ تو بالکل نئی صورتِ حال سامنے آ گئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں... اور اس نئی صورتِ حال میں ہمارا کافی فائدہ ہو سکتا ہے۔ اب جب یہ ساری بات چھوٹے سرکار کے سامنے آئے گی تو مجھے پوری آشا ہے کہ ان کا رویہ بہت نرم ہو جائے گا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ موہن کمار وغیرہ کی یہ سازش بڑے اچھے وقت پر سامنے آئی ہے۔''

کچھ ہی دیر بعد انور خاں اپنے ساتھ فیروز نامی اس لڑکے کو لے آیا۔ اس کی عمر بائیس تیئیس سال تھی۔ اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ شاید وہ ابھی تک یہاں ہونے والے جھگڑے کے اثرات سے نکلا نہیں تھا۔ انور خاں نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے بہت دلیری والا کام کیا ہے۔ اکبر علی تو کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ تمہارا قد ہم سب سے اونچا ہو گیا ہے۔''

چوہان نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں فیروز کہ تم کل میرے ساتھ چھوٹے سرکار کے پاس چلو۔ تمہاری گواہی ہمارے لیے بڑی فائدے مند ثابت ہو گی۔ مجھے پورا وشواس ہے کہ اس بار چھوٹے سرکار کا فیصلہ تم لوگوں کے حق میں ہو گا۔''

فیروز نے اثبات میں سر ہلایا۔ تاہم میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں جلتی ہوئی آگ دھیمی نہیں ہوئی۔ وہ انور خاں اور چوہان کی باتیں سن تو ضرور رہا تھا لیکن اس کے ذہن میں شاید کچھ اور ہی چل رہا تھا۔ غالباً اس کو ہندو ماں کا بیٹا ہونے کا جو طعنہ دیا گیا تھا، وہ اسے آگ بگولا کیے ہوئے تھا اور وہ اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔

اگلے سترہ اٹھارہ گھنٹے بھی کھوہ کے اندر ہی گزرے۔ کھوہ میں میرے اور سلطانہ سمیت قریباً پینتالیس افراد موجود تھے۔ انور خاں ان کا لیڈر تھا۔ ڈاکٹر چوہان ایک خیر خواہ اور مددگار کی حیثیت سے یہاں موجود تھا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح ان پینتالیس لوگوں کو ٹل پانی میں چھوٹے سرکار کے پاس پناہ مل جائے۔ اس سلسلے میں گفتگو اور پیغام رسانی کا سلسلہ جاری تھا۔ ابھی تک چوہان اور انور خاں وغیرہ خود اس کھوہ سے باہر نہیں نکلے تھے۔ یقینی بات تھی کہ کھوہ سے باہر سب کے لیے خطرات موجود ہیں۔ سلطانہ بدستور نیم غنودگی کی کیفیت میں تھی۔ چوہان اسے محفوظ مقدار میں 'نیون' دے رہا تھا کہ وہ زیادہ دیر سوئی رہے اور اس کے ذہن کو نارمل ہونے کے لیے وقت ملے۔

آدھی رات کو جب سارے سوئے ہوئے تھے، ایک سایہ سا مجھ پر جھکا اور میرے شانے کو ہولے سے ہلایا۔ میں غنودگی میں تھا، جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

میں نے پہچان لیا۔ وہ کل اکبر نامی شخص کے ساتھ جھگڑنے والا فیروز ہی تھا۔ اس نے دوستانہ انداز میں مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ میں چند لمحے تک تذبذب میں رہنے کے بعد اس کے پیچھے چل دیا۔ وہ مجھے کھوہ کی دو تین تنگ و تاریک شاخوں سے گزارنے کے بعد ایک حجرہ نما جگہ پر لے آیا۔ اس قدرتی حجرے میں ایک چھوٹی سی میلی کچیلی لالٹین روشن تھی۔ یقیناً یہ لالٹین اور اسی طرح کا دیگر سامان چوہان اور اس کے ساتھی ہی یہاں لے کر آئے تھے ورنہ باقی لوگ تو افراتفری میں زرگاں سے بھاگے تھے۔ اس حجرہ نما جگہ پر پہلے سے دو نوجوان موجود تھے۔ ان کی عمریں بائیس چوبیس سال کے قریب رہی ہوں گی۔ ان دونوں کے پاس رائفلیں موجود تھیں۔ ان کا لباس اور وضع قطع بتا رہی تھی کہ وہ مسلمان ہیں۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں غصے کی سرخی نظر آتی تھی۔

انہوں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ''میرا نام اسحاق ہے۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''اور میرا نام ماجد ہے۔ میں فیروز کا ماموں زاد بھی ہوں۔'' دوسرے نے بھی دھیمے لہجے میں اپنا تعارف کرایا۔

''اور مجھے تو تم جانتے ہی ہو۔ میں فیروز ہوں۔ حکم جی کے غنڈوں کے ہاتھوں بے موت مارے جانے والے ہارون کا دوست۔'' فیروز بولا۔

''تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''آہستہ بولو۔'' فیروز نے سرگوشی کی۔ ''ہم نہیں چاہتے کہ یہاں ہونے والی بات چیت کسی کے کانوں تک پہنچے۔''

اسحاق بولا۔ ''کل رات تمہارا جوش جذبہ دیکھا۔ تمہیں چوہان صاحب اور انور بھائی وغیرہ نے زور مار کر روک لیا ورنہ تم نے یہاں سے نکل جانا تھا۔ لگتا ہے کہ تم بھی اسی طرح سوچ رہے ہو جس طرح ہم سوچ رہے ہیں۔ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے اور وہ حد گزر چکی ہے۔ ہم تینوں نے آج رات ایک فیصلہ کیا ہے اور ہم چاہت ہیں کہ تم بھی اس فیصلے میں شامل ہو جاؤ۔''

''لیکن یہ تمہاری اپنی مرضی کی بات ہے، کوئی زور زبردستی ناہیں ہے۔'' فیروز بولا۔

"تم کس فیصلے کی بات کر رہے ہو؟"

میری رگوں میں لہو اُچھل گیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے فیروز کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی چنگاریاں تھیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں...... اب صبر کی حد گزر چکی ہے۔ یہ سفید بھیڑیا ہماری عورتوں کو کھاوت ہے۔ ان کے جسم نوچت ہے۔ اس نے ہر طرف جال پھیلا رکھے ہیں۔ کہیں زور زبردستی کا جال، کہیں پیار محبت کا جال۔ اس کے پاس سو حیلے بہانے ہیں اور یہ اپنے شکار کو چھوڑتا ناہیں ہے۔ اب اس بدنصیب سلطانہ کو ہی دیکھو۔ وہ کوئی ایسی خوبصورت ناہیں۔ ایک بچے کی ماں بھی ہے لیکن اس سفید سور نے اس کو بھی معاف ناہیں کیا۔ دو تین سال سے اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا اور کوشش میں لگا ہوا تھا۔ آخر کامیاب ہوا۔ اب ہم اس کی کامیابی کو آخری ناکامی میں بدل دیویں گے۔ اس کے ناپاک بستر کے اوپر ہی اس کے ٹکڑے کر دیویں گے۔" آخری الفاظ کہتے کہتے فیروز کے لہجے میں عجیب سی گرج آ گئی۔ پیشانی کی رگیں اُبھر آئیں۔

"ہاں...... ہم جارج کو ماردیں گے یا خود مر جائیں گے۔" ماجد نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

فیروز بولا۔ "ہم تینوں کل رات اس عہد کے ساتھ یہاں سے نکلیں گے کہ جارج گورے کو مار کر واپس آئیں گے یا کبھی واپس ناہیں آئیں گے۔" اس نے کچھ لمحے توقف کیا، پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا تم اس کام میں ہمارے ساتھ شریک ہونا چاہت ہو؟"

بے بسی کا منظر ایک بار پھر نگاہوں میں چمکا۔ بڑی آن بان والی سلطانہ لاچاری کی تصویر تھی۔ وہ مجھے جارج کے بیڈروم سے باہر نکال کر دروازہ بند کر رہی تھی۔

رائفل پر میری گرفت مضبوط تر ہو گئی۔ سینے میں آگ کی دیوقامت لہر پھر حرکت میں آنے لگی۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "لیکن اس سیکیورٹی کا کیا کرو گے جس نے جارج کے گھر کو گھیرا ہوا ہے؟ اب تو یہ سیکیورٹی اور بھی سخت ہو گی۔"

"مہروز بھائی! جب جان ہتھیلی پر رکھ لی جاوے تو پھر کوئی رکاوٹ بھی آگے بڑھنے والے کا راستہ ناہیں روک سکتی۔ اب تم خود کو ہی دیکھو۔ جب تم نے جان ہتھیلی پر رکھ لی تو تم جارج کے کتوں اور اس کے رکھوالوں کو لہولہان کر کے اس کے گھر سے نکل آئے۔ نکل آئے یا ناہیں؟" فیروز نے کہا۔

"کیا تمہارے ذہن میں کوئی منصوبہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں...... منصوبہ بھی ہے لیکن سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جو بات یہاں ہم چاروں کے درمیان ہو گی، اس کا پتا انور بھائی اور چوہان صاحب وغیرہ سمیت کسی کو ناہیں چلے گا۔" فیروز نے کہا۔

میں خاموش رہا۔ اسحاق بولا۔ "ایسی بات ناہیں کہ ہم انور بھائی اور چوہان صاحب وغیرہ سے علیحدہ سوچت ہیں۔ سوچ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اس راجواڑے میں سے جارج گورا جیسے کتوں کا خاتمہ کر دینا ہے۔ وہ یہ کام اور ڈھنگ سے کرنا چاہت ہیں لیکن ہم اور ڈھنگ سے کریں گے اور یہ حرامی جارج گورا والا کام تو بس چند پہروں کے اندر ہی ہو گا اور اگر ناہیں ہو گا تو پھر ہم ناہیں ہوں گے۔"

"لیکن ایک بات سوچنے کی ہے۔" میں نے کہا۔ "چوہان اور انور خاں وغیرہ کا خیال ہے کہ اس بار سلطانہ کو اور ہم سب کو ٹل پانی میں پناہ مل جائے گی۔ سب کو پتا ہے کہ جارج اور اس کے پشت پناہ حکم جی نے ظلم کیا ہے لیکن اگر ہماری طرف سے بھی کوئی کارروائی ہو گئی تو پھر کچھ لوگ اسے بھی ظلم قرار دیں گے۔ یوں یہ پناہ والا معاملہ خطرے میں پڑ جائے گا۔"

اسحاق نے کہا۔ "تمہاری بات اپنی جگہ درست ہے مگر جارج کی موت ایک ایسا واقعہ ہووے گی جس پر شاید حکم جی اور اس کے قریبی ساتھیوں کے سوا ہر کوئی خوش ہو گا۔ جارج جو کچھ کرتا ہے اس سے صرف مسلمان ہی متاثر ناہیں، ہر کوئی متاثر ہے اور ہم تو سمجھتے ہیں کہ جارج مارا گیا تو حکم جی اور اس کے حواریوں کی کمر بھی ٹوٹ کر رہ جاوے گی۔ ایک دم سب کچھ اچھا ہو جاوے گا۔"

"مگر ایک دم سب بُرا بھی تو ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

فیروز نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور گلوگیر لہجے میں بولا۔ "اب اس سے بُرا اور کیا ہووے گا۔ ہم جیتے جی دفن ہو رہے ہیں۔ اب اور برداشت کریں گے تو پھر ہم بھی مجرم ہوں گے۔ ناہیں...... اب ناہیں۔" اس کا جوش اس کے لہجے سے عیاں تھا۔

میں نے کہا۔ "مجھے یہاں کے حالات کے بارے میں زیادہ کچھ معلوم نہیں، لہٰذا اگر تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ جارج کو مارنے کے لیے یہ ٹھیک موقع ہے تو پھر میں تمہارے ساتھ ہوں۔ بلکہ میں ابھی اور اسی وقت تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔"

"بہت اچھے۔" اسحاق نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ پھر وہ اٹھا اور فیروز کو آنکھوں آنکھوں میں کچھ سمجھا کر ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ ہم وہاں لالٹین کی مدھم روشنی میں بیٹھے رہ گئے۔ رات خاموش اور بھیدوں بھری تھی۔

میرے اندازے کے مطابق ہم زمین کے نیچے کم از کم سو فٹ کی گہرائی میں موجود تھے۔ سرنگوں کا ایک شاخ در شاخ سلسلہ تھا۔ میرے قیافے کے مطابق اس کی طوالت ڈیڑھ دو میل کے قریب تو ہوگی۔ حکم جی اور جارج گورا کے کم از کم پینتالیس باغی اس وقت اس زیرِ زمین پناہ گاہ میں موجود تھے اور ایک خونچکاں منصوبے کے تانے بانے بُن رہے تھے۔

میں نے فیروز سے پوچھا۔ ''اسحاق کہاں گیا ہے؟''

وہ سرگوشی میں بولا۔ ''اسحاق کے ذمے اسلحے کا انتظام ہے۔ وہ اسی کام کے لیے گیا ہے۔''

''رائفلیں تو تم سب کے پاس موجود ہیں اور میرے پاس بھی ہے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن ہمیں کچھ اور کی ضرورت بھی پڑے گی۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''یہ اسحاق زرگاں کا رہائشی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں...... اس کی سگی بہن بھی جارج گورا کا شکار ہوئی ہے۔ کوئی چار مہینے پہلے وہ بیمار ہو کر مر گئی تھی لیکن جاننے والے جانت ہیں کہ وہ مری ناہیں تھی، اس نے خود کو مارا تھا۔ کوئی زہریلی چیز کھائی تھی اس بدنصیب نے۔''

''کیا ہوا تھا اس کے ساتھ؟''

''اس کا معاملہ سلطانہ سے مختلف تھا۔ دراصل جارج جیسے شکاریوں کے پاس ہزار طرح کے جال ہوتے ہیں۔ جس رنگ کی زمین ہو، وہ اسی طرح کا جال بچھاوت ہیں۔ وہ لڑکی بڑی پیاری تھی، بالکل گڑیا کی طرح اور بہت ہنس مکھ بھی۔ روبینہ نام تھا۔ اس کی شادی اپنے ماموں زاد سے ہوئی تھی۔ یہ لڑکا بے روزگار تھا۔ پھر ہیروئن اور گانجا وغیرہ بھی پینے لگا۔ اسی دوران میں پکی آبادی میں کہیں جارج کی نگاہ روبینہ پر پڑ گئی۔ اس نے اسے اپنے شکار کے طور پر منتخب کر لیا۔ اس نے روبینہ کے شوہر باسط کو اپنے پاس ملازمت دی اور اس کے ساتھ ہی دعویٰ کیا کہ وہ اس کی ہیروئن چھڑا کر اسے ایک کارآمد شخص بنا دیوے گا لیکن جو کچھ ہوا، وہ اس کے اُلٹ تھا۔ اس نے باسط کی ہیروئن تو چھڑا دی لیکن شراب کی پکی پکی لت لگا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لڑکا جارج کی مہربانی کا غلام ہو کر رہ گیا۔ اسے قیمتی شراب درکار تھی اور عیاشی کا دیگر سامان بھی۔ یہ چیزیں اسے صرف اور صرف جارج کی جی حضوری سے ہی مل سکت تھیں۔ جارج نے باسط کو رہنے کے لیے ایک سرونٹ کوارٹر بھی دے دیا تھا۔ اس کے بعد باسط کے ساتھ ساتھ روبینہ بھی جارج کی چار دیواری میں آ گئی۔ اسے چار دیواری کے بجائے شکار گاہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ پھر ایک دن ایسا آیا کہ باسط نے خود نو بیاہتا بیوی کو مجبور کیا کہ وہ

جارج گورا کی خواہش کے سامنے اپنا سر جھکائے۔ وہ بے آسرا لڑکی تھی۔ ایک بھائی کے سوا اس کا آگے پیچھے کوئی ناہیں تھا اور بھائی بھی مزدوری کے لیے زرگاں سے بہت دور تھا۔ وہ کیا کرتی؟ اس نے ہچکچاہٹ دکھائی تو شوہر نے اسے مارا پیٹا۔ بالآخر وہ بیچاری اس غلاظت میں گر گئی جس میں اس کا شوہر اسے گرانا چاہت تھا۔ مگر اس کا دل اس کے ساتھ ناہیں تھا۔ وہ روز روز خود کو جارج کے بستر پر تاراج ہوتے ناہیں دیکھ سکت تھی۔ اس نے ایسے جنون سے موت بہتر سمجھی۔ ایک رات اس نے کچھ لیا۔ اس کا دم اُلٹ گیا۔ اس کے گلے میں ایک پھندا سا لگ گیا۔ وہ تین روز تک اس طرح سانس لیتی رہی کہ اس کے سانس کی آواز پورے گھر میں گونجت تھی۔ اس کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے اور وہ بار بار بے ہوش ہووت تھی۔ آخر وہ مر گئی۔ اس کی عمر صرف اٹھارہ بیس سال تھی۔ یہ اس کے ہنسنے کھیلنے کے دن تھے۔ سکھیوں کے ساتھ مل کر گیت گانے، میلوں ٹھیلوں میں جانے اور تہوار منانے کا وقت تھا اور وہ بیماری کا بہانہ کر کے منوں مٹی کے نیچے جا سوئی۔ اسے کس جرم میں موت کی سزا ملی؟ اس کا کیا دوش تھا؟ شاید صرف یہی دوش تھا کہ بے سہارا عورت تھی اور ایک چالباز ہوس کار کی نگاہ میں آ گئی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی ایک راز داں سہیلی سے معلوم ہوا کہ روبینہ نے اپنے ہاتھوں اپنی جان لی ہے۔ پھر اس حکیم نے بھی اس بات کی تصدیق کی جس نے روبینہ کا علاج کیا تھا۔ بعد میں اس حکیم کی بھی جارج کے ہاتھوں بہت شامت آئی۔ اسے جان کے لالے پڑ گئے اور اسے زرگاں چھوڑنا پڑا۔ زور آور کے خلاف آواز اُٹھانا بہت مشکل ہووت ہے۔ جو چند ایک آوازیں اٹھیں بھی، وہ جلد ہی دم توڑ گئیں۔''

اسی دوران میں اسحاق واپس آ گیا اور اس کے آنے سے فیروز خاموش ہو گیا۔ اسحاق کے پاس ترپال کا بنا ہوا ایک سیاہ تھیلا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، اس تھیلے میں رائفلوں کا ایمونیشن اور ہینڈ گرینیڈ وغیرہ تھے۔ اسحاق، ماجد اور فیروز نے ایک بار پھر سرگوشیوں میں بات چیت شروع کر دی۔ اس بات چیت سے اندازہ ہوا کہ کل کا دن جارج گورا پر ایک کارگر حملہ کرنے کے لیے بہت موزوں ہے۔ جارج گورا ہفتے کے دن شام کے وقت سورج ڈھلنے سے کچھ پہلے اپنی رہائش گاہ سے باہر نکلتا تھا اور زرگاں کی پُرانی آبادی میں پُرانے پگوڈا کے سامنے لوگوں میں خوراک تقسیم کرتا تھا۔ بظاہر جارج اور خیرات دو متضاد چیزوں کی طرح نظر آتے تھے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جارج اور حکم جی جیسے دنیا پرست لوگ اکثر عوام الناس کو دھوکا دینے کے لیے ایسے ڈھونگ رچاتے ہیں۔ شاید وہ اپنے طور پر اپنی زندگی کے کھاتے میں اپنے گناہوں کو ''بیلنس'' کرنے کی کوشش کرتے ہیں، چنگیز، ہلاکو اور ہٹلر جیسے اَن گنت

جابر لوگوں کی زندگیوں میں کہیں نہ کہیں اس قسم کی ڈراما بازی موجود رہی ہے۔ غالباً یہ ایسے ہی منافق رویے کا عکس تھا۔ جارج جیسا ظالم شخص ہر ہفتے ایک خاص دن میں غربا کی بستی میں پہنچتا تھا اور ان کے دُکھوں میں شریک ہونے کی نمائش کرتا تھا۔ وہ جس راستے سے گزر جاتا تھا، وہیں پر ایک خاص جگہ ایسی تھی جہاں اس کے مختصر قافلے پر گھات لگا کر حملہ کیا جا سکتا تھا۔ اسحاق، ماجد اور فیروز وغیرہ اس حملے کے بارے میں ساری تفصیلات پہلے ہی بتا چکے تھے۔

○……❖……○

ابھی شام ہوئی نہیں تھی مگر گھنے درختوں کی وجہ سے نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ شام ہوتے ہی یہ جگہ گھٹا ٹوپ تاریکی میں ڈوب جائے گی۔ ہم اپنی زیر زمین پناہ گاہ سے کل رات کو ہی نکل آئے تھے۔ ہم نے ساری رات اور تقریباً سارا دن سفر کیا تھا۔ اس سفر کے لیے فیروز اور اسحاق وغیرہ نے گھنے جنگل میں شارٹ کٹ راستے استعمال کیے تھے۔ یوں وہ اندازاً دس پندرہ میل کا سفر کم کرنے میں کامیاب رہے تھے اور اب ہم اس خاص مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں ہمیں گھات لگانا تھی۔

یہاں اسحاق وغیرہ کو درختوں میں ایک ٹوٹی پھوٹی گھوڑا گاڑی بھی مل گئی۔ یہ چار پہیوں والی گاڑی تھی۔ اس کے اگلے بانس ٹوٹ چکے تھے۔ ایک پہیہ بھی علیحدہ پڑا تھا۔ اسحاق، ماجد اور فیروز نے مشورہ کیا اور اس گاڑی کو حملے میں استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسحاق اور فیروز تیزی سے گاڑی کا پہیہ جوڑنے میں مصروف ہو گئے۔

''اس گاڑی کا کیا کرو گے؟'' میں نے فیروز سے پوچھا۔

''اس کو راستہ روکنے کے لیے استعمال کریں گے۔'' فیروز نے جواب دیا اور مجھے لے کر ان گھنے درختوں میں آ گیا جہاں سے راستہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یہ ایک کچا لیکن بالکل ہموار راستہ تھا۔ دونوں طرف گھنے درخت تھے۔ زرگاں کی نئی آبادی بائیں طرف تھی اور بلند درختوں کے اندر سے کہیں کہیں اس کے آثار نظر آتے تھے۔ عمارتوں کے سنہری اور سفید کلس اور مندروں کی چوٹیاں ڈوبتے سورج کی روشنی میں جھلک دکھا رہی تھیں۔ راستے تک ایک چھوٹی سی ڈھلوان جاتی تھی۔ فیروز نے ڈھلوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جب جارج کا قافلہ قریب آوے گا تو ہم اس چار پہیوں والی گاڑی کو ڈھلوان کی طرف دھکیل دیویں گے۔ وہ گاڑی دوسرے کنارے کے درختوں سے ٹکرائے گی اور راستے کے عین اوپر رُک جاوے گی۔ بات سمجھ میں آ رہی ہے نا۔''

''اس کے بعد کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم دو طرف سے جارج کی گاڑی پر حملہ کریں گے۔ چھلنی کر دیویں گے حرامزادے کو اور اس کے ساتھیوں کو۔''

''اس کی گاڑی کی پہچان کیا ہے؟''

''سفید گھوڑوں والی لال گاڑی۔ وہ چار گاڑیوں کے قافلے میں سب سے الگ نظر آوے گی۔ اس کے آگے مسلح گارڈز کی گاڑی ہو گی۔ اس کے پیچھے والی گاڑی میں دو چار مصاحب بیٹھے ہوویں گے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خبیث موہن کمار بھی موجود ہو۔ آخری گاڑی میں بھی گارڈز کا دستہ ہوگا۔ ان لوگوں کے پاس جی تھری گن موجود ہوتی ہے۔ اس آخری گاڑی کے عقب میں دو گھڑ سوار ہوں گے۔ ان کے پاس بھی اسلحہ ہوگا۔ تاہم یہ اسلحہ صرف نمائشی ہوتا ہے۔ یعنی تلوار، آرائشی رائفل اور خنجر وغیرہ۔''

مجھے موقع دکھانے کے بعد فیروز واپس گھنے درختوں کے تاریک جھنڈ میں لے آیا۔ وہاں ماجد اور اسحاق بھی بالکل تیار تھے۔ ان کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ رگ پٹھے تنے ہوئے تھے۔ ہم چاروں نے اپنی پوری پلاننگ پر ایک بار پھر غور کیا۔ یہ طے ہوا کہ پکڑے جانے کے بجائے ہم لڑتے ہوئے جان دینا بہتر سمجھیں گے اور اگر خدانخواستہ کسی شخص کی گرفتاری یقینی ہو جائے تو وہ خود اپنی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ یہ بے حد جذباتی صورتِ حال تھی اور جو باتیں ہم ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے، انہیں کہنے کے لیے لوہے کا جگر اور فولاد کا دل درکار تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ میں اس جانباز ٹولی کا حصہ ہوں اور آج اپنی جان محاورتاً نہیں حقیقتاً ہتھیلی پر رکھی ہوئی ہے۔ ہاں آج میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اگر میں یہ کہوں تو جھوٹ ہوگا کہ میرے دل میں زندگی کی خواہش نہیں تھی لیکن جس طرح کی ذلت آمیز زندگی میں گزار رہا تھا، اس سے موت بہتر نظر آتی تھی۔

میں نے دل ہی دل میں عمران کو یاد کیا اور کہا۔ ''دیکھو عمران! میں نے اب تمہارے بغیر زندہ رہنے اور مرنے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے۔ میں اب وہی بنتا جا رہا ہوں جو تم چاہتے تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے تمہاری کمی محسوس نہیں ہوتی۔ تم کیا جانو، ان گزرے ماہ و سال میں، مَیں نے کس کس طرح تمہیں یاد کیا ہے۔ تم میری زندگی کا ایک لازمی جزو بن چکے ہو میرے یار! میں ایک پل کے لیے بھی تمہیں بھول نہیں سکتا اور آج اس گھنے جنگل کی اس دھواں دھواں شام میں جب میں زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑا ہوں اور آنے والے لمحوں میں میرے قدم کسی بھی سمت میں اُٹھ سکتے ہیں، میں ایک بار پھر تمہیں بڑی شدت سے

یاد کر رہا ہوں۔ دل پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ کاش! اس وقت تم میرے ساتھ ہوتے۔ میرا کندھا تمہارے کندھے سے ملا ہوتا۔ ہم اس دھواں دھواں شام میں ایک ساتھ للکار بلند کرتے اور اپنے دشمن پر جا پڑتے۔''

میری آنکھوں میں آتشیں نمی تھی۔ میں ہر دلعزیز عمران کو یاد کر رہا تھا کہ میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ میں فرح اور عاطف کو یاد کر رہا تھا کہ ان کے ساتھ میرا بچپن گزرا تھا اور میں ثروت کو یاد کر رہا تھا کہ وہ میری پہلی اور آخری محبت تھی۔ اپنے ملک سے، اپنے شہر سے ہزاروں میل دور اس دور دراز خطے میں اس دھواں دھواں شام میں، مَیں زندگی اور موت کی بازی لگانے جا رہا تھا۔ حالات کی ستم ظریفیوں نے میرے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا۔

ہم چاروں نے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر ایک بار پھر ''مرو یا مار دو'' والے عہد کو دہرایا اور اپنے اپنے کام کے لیے بالکل تیار ہو گئے۔ سب سے پہلے ہم نے اپنے چہرے صافہ کپڑوں میں چھپائے پھر اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لی۔ فیروز اور میں راستے کے دائیں کنارے پر تھے جبکہ ماجد اور اسحاق بائیں کنارے پر۔ جارج کی آمد کے آثار دیکھ کر فیروز نے چار پہیوں والی گاڑی کو ڈھلوان پر دھکیلنا تھا اور اس کے ساتھ ہی کھیل شروع ہو جانا تھا۔ جوں جوں وقت قریب آ رہا تھا، ہماری دھڑکنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ میں بار بار جارج کا مکروہ چہرہ نگاہوں کے سامنے لہرا رہا تھا تاکہ میرے اندر غیظ وغضب کی وہ بلند لہر رواں دواں رہے جس نے چند دن پہلے میرے سینے میں جنم لیا تھا اور مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ اس لہر کو رواں دواں رکھنے کے لیے مجھے کوئی خاص کوشش کرنا نہیں پڑ رہی تھی۔ یہ لہر ایک عجیب سی زہرناک تلخی کے ساتھ گھل مل کر میرے لہو میں شامل ہو چکی تھی اور میری شریانوں میں مستقل بسیرا کر چکی تھی۔

شام کے سائے طویل ہوتے جا رہے تھے۔ درختوں پر پرندوں کی چہکاریں تھیں۔ پچھلے ایک گھنٹے میں اس راستے پر سے چند گھوڑا گاڑیوں، چند گھڑ سواروں اور ایک عدد سیاہ جیپ کے سوا کوئی سواری نہیں گزری تھی۔ ہماری نگاہیں مغرب کی طرف لگی ہوئی تھیں جہاں کسی بھی وقت گرد وغبار اُٹھ سکتا تھا۔ یہ گرد وغبار جارج کے قافلے کی آمد کا اعلان ہوتا۔

شام گہری ہوتی گئی لیکن قافلے کے آثار نظر نہیں آئے۔ فیروز کے لیے یہ تاخیر بڑی تعجب خیز تھی۔ فیروز کو اور اس کے دونوں ساتھیوں کو معلوم تھا کہ جارج کے معمول میں کبھی فرق نہیں آتا۔ پچھلے دو تین برسوں میں شاید ہی ایک آدھ بار ایسا ہوا ہو کہ وہ مقررہ وقت پر

پُرانے پگوڈا پر نہ پہنچا ہو۔ جب شام کا ملگجا تاریکی میں بدل گیا تو فیروز اور اس کے ساتھیوں کو اندازہ ہونے لگا کہ کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ فیروز مایوسی کے عالم میں بڑبڑایا۔ ''اتنی دیر تو پہلے کبھی نا ہیں ہوئی۔''

اسی دوران میں اسحاق بھی راستہ پار کر کے ہماری طرف آ گیا۔ وہ بھی مایوس تھا۔ اس نے فیروز سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''غور سے سنو...... ڈھول کی آواز آ رہی ہے۔''

فیروز نے بھی ہمہ تن متوجہ ہو کر سنا۔ چند لمحے بعد ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی مدھم آواز ہماری سماعتوں تک پہنچی۔ یہ ڈھول نہیں تھا، غالباً کوئی بہت بڑا نقارہ تھا۔ اسے ایک خاص ردھم سے بجایا جا رہا تھا۔

اس آواز کو سننے کے بعد فیروز اور اس کے دونوں ساتھی بے دم سے ہو کر زمین پر بیٹھ گئے۔ میں نے بھی ان کی تقلید کی۔ ''کیا ہوا؟'' میں نے فیروز سے پوچھا۔

''وہ حرامی کسی دوسرے راستے سے ہو کر پگوڈا پہنچ گیا ہے۔ یہ ڈھول کی آواز سنائی دے رہی ہے؟ یہ اس کی پگوڈا میں آمد کا اعلان ہے۔''

نقارے کی دور افتادہ تھرتھراہٹ مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ اندازاً یہ کوئی دو ڈھائی میل کے فاصلے سے آ رہی تھی۔ فیروز اور ماجد آپس میں جھگڑنا شروع ہو گئے۔ ماجد کا خیال تھا کہ انہوں نے یہاں گھات لگا کر غلطی کی تھی۔ انہیں قریباً ایک میل پیچھے گھات لگانی چاہیے تھی جہاں سے دوراہا پھوٹتا تھا۔

فیروز تڑخ کر بولا۔ ''مگر وہاں کون سی جگہ تھی چھپنے والی؟ کھلے میدان میں بیٹھتے تو اب تک دھر لیے گئے ہوتے۔''

اس سے پہلے کہ فیروز اور ماجد کا یہ تنازع شدت اختیار کرتا، ایک آواز نے سب کو چونکایا۔ یہ گھوڑے کی ہنہناہٹ تھی اور ہمارے عقب سے اُبھری تھی۔ پھر ایک ساتھ ایسی کئی اور آوازیں اُبھریں۔

''میرا خیال ہے یہ حکم جی کے گارڈز ہیں۔'' فیروز نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''رائفلیں چھپا دو۔'' اسحاق نے فوراً تجویز پیش کی اور اپنی رائفل خشک پتوں کے ایک ڈھیر میں گھسیڑ دی۔ فیروز اور میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ ماجد کی رائفل پہلے ہی جنگلی گھاس میں پڑی تھی اور تاریکی کے سبب نگاہوں سے مکمل طور پر اوجھل تھی۔ ہینڈ گرینیڈز اور گولیوں والا تھیلا بھی وہیں تھا۔ ہم چار پہیوں والی خستہ حال گھوڑا گاڑی کے گرد جمع ہو گئے۔ اندازاً ایسا ہی تھا جیسے گھوڑا گاڑی کو قابلِ استعمال بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ چند ہی سیکنڈ بعد

چودہ پندرہ گھڑ سوار محافظ موقع پر آن موجود ہوئے۔ یہ سب باوردی اور مسلح تھے۔ ''کون ہو تم؟'' ایک فربہ جسم کے شرابی گھڑ سوار نے بارعب لہجے میں پوچھا۔

''ٹھاکر کیدار ناتھ کے ملازم ہیں جی۔ اس گاڑی کو ٹھیک کر رہے تھے۔'' فیروز نے پتہ نہیں کس ٹھاکر کا نام لیا تھا کہ گارڈز کے کڑے تیور ذرا نرمی اختیار کر گئے۔

''یہ کس کی گاڑی ہے؟'' انچارج گارڈ نے شرابی لہجے میں پوچھا۔

''ٹھاکر صاحب کے ایک دوست کشوری لال جی کی تھی۔ عرصے سے یہاں خراب پڑی ہے جی۔ ہم نے ان سے مانگ لی ہے۔ صبح سے اسے ٹھیک کر رہے تھے۔ اب اندھیرا ہو گیا ہے۔ اب کل آویں گے۔'' فیروز نے مسکین لب و لہجے میں کہا۔

اندازہ ہوا کہ فربہ اندام شرابی انچارج فیروز کے جواب سے کافی حد تک مطمئن ہو گیا ہے۔ وہ اپنے سات آٹھ ساتھیوں کے ہمراہ آگے بڑھ گیا۔ باقی پانچ چھ محافظ وہیں موجود رہے۔ وہ اپنے گھوڑوں کو ایک بارشی گڑھے میں سے پانی پلانے لگے۔ ایک دراز قد گارڈ یونہی گھوم پھر کر چار پہیوں والی مرمت طلب گھوڑا گاڑی کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی جس کی روشنی وہ بے پروائی سے گاڑی کے مختلف حصوں پر ڈال رہا تھا۔ گاڑی پر لگی ہوئی ایک زنگ آلود پلیٹ دیکھ کر وہ چونکا۔ اس نے ٹارچ کا روشن دائرہ پلیٹ پر مرکوز کیا۔ پھر فیروز سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم کیسے کہوت ہو کہ یہ ٹھاکر کیدار ناتھ کے دوست کی گاڑی ہے؟''

یہی وقت تھا جب ایک گارڈ نے چلا کر کہا۔ ''یہاں گڑ بڑ ہے جی۔ میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ یہ فیروز ہے جی، حکم جی کا ملازم۔'' اس کے ساتھ ہی چلانے والے نے اپنی ٹارچ کا روشن دائرہ فیروز کے چہرے پر مرکوز کیا۔

دراز قد گارڈ بھی ٹھٹک گیا۔ اس کے ساتھ ہی تین چار رائفلیں ہماری طرف اُٹھ گئیں۔ ان میں دراز قد گارڈ کی اپنی رائفل بھی شامل تھی۔ وہ باقی گارڈز میں سے سینئر لگتا تھا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور اپنی جدید رائفل کو حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ''خبردار...... اپنے ہاتھ اوپر اُٹھاؤ۔ جلدی کرو۔''

فیروز اور ماجد نے ہاتھ اوپر اُٹھا دیئے۔ چند لمحے بعد میں نے اور اسحاق نے بھی تقلید کی۔ کم از کم تین ٹارچوں کے روشن دائرے ہمارے چہروں پر پڑ رہے تھے۔ گارڈز کی انگلیاں رائفلوں کے ٹریگرز پر تھیں۔ اس شدید تناؤ کی کیفیت میں کسی لمحے بھی کچھ ہو سکتا تھا اور مجھے پتا تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔ ہمارے درمیان طے تھا کہ پھنس جانے کی صورت میں ہم

گرفتاری نہیں دیں گے اور فی الحال ہم پھنس گئے تھے۔

''زمین پر لیٹ جاؤ اوندھے...... جلدی کرو۔'' دراز قد گارڈ دھاڑا۔

پہلے ماجد لیٹا، پھر فیروز اور آخر میں، میں اور اسحاق، ہم نے اپنے ہاتھ دونوں طرف پھیلا لیے تھے۔ لیٹتے ہوئے میں تھوڑا سا بائیں طرف ہو گیا تھا۔ ایسا کرنے سے میں اپنی اس رائفل کے قریب تر ہو گیا جو خشک پتوں کے ڈھیر کے نیچے چھپی ہوئی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ میرے ہاتھ رائفل کے تقریباً اوپر تھے۔ میرے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا کہ میں رائفل اُٹھاؤں اور کچھ کر گزروں۔ ایسا کام کرنے کے لیے جس قسم کی ہمت درکار تھی، وہ آج میں اپنے اندر موجود پا رہا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ میں یہ کر گزروں گا اور اگر نہ کر سکا تو کیا ہو گا؟ وہی کچھ ہو گا جس کے لیے میں پہلے سے تیار تھا۔ تخت یا تختہ۔

میں نے زرد نرم پتوں کے نیچے رائفل کی سختی کو محسوس کیا۔ دراز قد گارڈ گالیاں بک رہا تھا۔ وہ رائفل سونتے ہوئے آگے بڑھا۔ غالباً وہ ہماری جامہ تلاشی لینا چاہ رہا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ ہمارے لباس میں کوئی ہتھیار وغیرہ ہو گا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ مجھے اوندھا لیٹنے کا حکم دے کر وہ خود مجھے میرے ہتھیار کے قریب پہنچا چکا ہے۔ وہ سامنے کی طرف سے آ رہا تھا۔ ابھی وہ مجھ سے پانچ چھ قدم دور تھا کہ میں نے پتوں کے ڈھیر میں چھپی ہوئی رائفل نکالی۔ اس کا سیفٹی کیچ پہلے سے ہٹا ہوا تھا۔ میں نے رائفل سیدھی کی۔ ایک لحظے کے لیے دراز قد گارڈ پتھر کا بت بنا کھڑا رہ گیا۔ رائفل نے دھماکے سے شعلہ اُگلا۔ گولی دراز قد گارڈ کے سینے پر کہیں لگی۔ وہ اُچھل کر کانٹے دار جھاڑیوں میں گرا۔ میں نے دوسرا فائر اس شخص پر کیا جو پیچھے ہٹتے ہوئے اپنی ''بیکال'' رائفل سیدھی کر رہا تھا۔ میرا پہلا فائر خالی گیا۔ مدِمقابل نے گولی چلائی جو میرے سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی عقب میں درخت کے تنے پر لگی۔ میں نے تیسری بار ٹریگر دبایا۔ اس مرتبہ گولی نے مدِمقابل کو زخمی کیا۔ وہ پیٹ پکڑ کر جھکتا چلا گیا۔ اس کی کراہ دردناک تھی۔

اسی اثناء میں اسحاق، ماجد اور فیروز بھی پتوں میں سے رائفلیں برآمد کر چکے تھے۔ ماجد کو تو فائر کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس سے پہلے کہ وہ رائفل کو پوری طرح اپنے ہاتھوں میں لے سکتا، بارہ بور کی ایک گولی اس کے جبڑے اور سر کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ تاہم میں اسحاق اور فیروز درختوں کے پیچھے پناہ لینے میں کامیاب ہوئے۔ گارڈز بھی مختلف درختوں کے عقب میں پناہ لے چکے تھے۔ ان میں سے دو نے خستہ حال گھوڑا گاڑی کے پیچھے پوزیشن لی تھی۔ قریباً ایک منٹ تک اندھا دھند فائرنگ ہوئی۔ دھماکوں سے جنگل گونج اُٹھا۔ تاریکی میں ہر

طرف شعلے لپکتے نظر آئے۔ یہ شعلے مخصوص آوازوں کے ساتھ درختوں کے تنوں میں پیوست ہو رہے تھے اور شاخوں سے ٹکرا رہے تھے۔ میں ایک تناور درخت کی اوٹ میں تھا۔ میں لڑائی کے داؤ پیچ سے زیادہ واقف نہیں تھا لیکن میرے اندر کی ہیجانی کیفیت مجھے راستہ دکھا رہی تھی۔ میں نے تناور درخت کی اوٹ چھوڑی اور تیزی سے بھاگ کر بارشی گڑھے میں کود گیا۔ ایسا کرنے سے میں ان دو افراد کو ٹارگٹ بنانے میں کامیاب ہوگیا جو گھوڑا گاڑی کے عقب سے گولی چلا رہے تھے۔ میری فائرنگ سے ان میں سے ایک شدید زخمی ہو کر گرا اور دوسرا پسپا ہو کر تاریکی میں اوجھل ہوگیا۔

''شاباش مہروز!'' فیروز کی پُر جوش آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

اسی دوران میں اسحاق بھی اپنی پوزیشن تبدیل کر کے کچھ آگے جا چکا تھا۔ اس کی رائفل برسٹ پر سیٹ تھی۔ اس کے چلائے ہوئے دو تین برسٹس نے گارڈز میں کھلبلی مچا دی۔ ہم نے انہیں تاریکی میں بھاگتے ہوئے دیکھا۔ ان کو بھاگتے دیکھ کر ہمارے حوصلے سوا ہوئے۔ ''مارو حرامزادوں کو۔'' اسحاق کی للکارتی ہوئی آواز تاریکی میں گونجی۔

ہم نے اپنی پوزیشنیں چھوڑ کر جارج گورا کے رکھوالوں پر گولیاں چلائیں۔ اس فائرنگ سے ایک اور گارڈ نشانہ بنا، باقی تاریکی میں اوجھل ہوگئے۔

بارشی گڑھے میں کودنے سے میں سینے تک بھیگ چکا تھا۔ مجھے گڑھے کے پاس ہی ایک گارڈ کی ٹارچ پڑی نظر آئی۔ میں نے ٹارچ اُٹھا کر روشن کی۔ ہمارا ساتھی ماجد اپنا عہد نبھا چکا تھا۔ وہ پہلو کے بل کچی زمین پر پڑا تھا۔ اس کے سر کے آس پاس خون کا ایک چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا۔ اسحاق نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنے ساتھی کا ماتھا چوما اور گلوگیر آواز میں بولا۔

''گھبرا مت آج ہم جارج کو مار دیویں گے یا خود بھی تیرے پاس پہنچ جاویں گے۔''

سوگ منانے کا وقت نہیں تھا۔ یہاں تقریباً دو منٹ تک لگاتار فائرنگ ہوئی تھی۔ فائرنگ کی آوازیں ان گارڈز کے باقی ساتھیوں کو کسی بھی وقت یہاں کھینچ سکتی تھیں۔ یقیناً وہ بھی یہیں کہیں درختوں میں گشت کر رہے تھے۔ جس گارڈ پر میں نے پہلی گولی چلائی تھی، وہ جہنم واصل ہو چکا تھا۔ اس کا لمبا جسم کسی گھڑیال کی طرح جھاڑیوں میں مردہ پڑا تھا۔ جس گارڈ کے پیٹ میں گولی لگی تھی، وہ شدید زخمی حالت میں تھا اور بے ہوش ہو چکا تھا۔ ایک دوسرے گارڈ کی لاش بھی جھاڑیوں میں پڑی تھی۔ اس گارڈ کی رائفل اور گولیوں والی بیلٹ فیروز نے اُٹھالی۔ ''ہمیں یہاں زیادہ دیر ناہیں ٹھہرنا چاہیے۔'' وہ تیزی سے بولا۔

اسحاق نے ہینڈ گرینیڈز والا تھیلا اُٹھایا اور ہم وہاں سے چل پڑے۔ گارڈز کے تین چار

گھوڑے جھاڑیوں میں اِدھر اُدھر چکرا رہے تھے۔ ہم انہیں نظرانداز کرتے ہوئے تاریکی میں لپکتے چلے گئے۔ ماجد کی موت نے اسحاق کو کچھ زیادہ ہی ہیجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ بے قراری سے رائفل کو اپنے ہاتھوں میں حرکت دے رہا تھا۔ جیسے اپنے سامنے آنے والے کسی بھی شخص کو مار دینے کا ارادہ رکھتا ہو۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' فیروز نے تیز تیز چلتے ہوئے پوچھا۔

''میں تو کہوت ہوں، آج جارج کو ڈھونڈ نکالیں۔ اسے مار ڈالیں یا خود مر جاویں۔''

''لیکن مجھے لگتا ہے کہ اب اس تک پہنچنا بڑا مشکل ہووے گا۔ وہ بہت چوکس ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس حرامی نے گپوڈا تک جانے کے لیے بھی دوسرا راستہ استعمال کیا ہے اور اب یہاں ہونے والی فائرنگ کے بعد تو وہ اور بھی چوکنا ہو گیا ہووے گا۔''

''مگر ہم نے اسے مارنے کی قسم کھا رکھی ہے۔'' اسحاق بولا۔

''قسم تو کھا رکھی ہے اور اللہ کو منظور ہوا تو ہم اس کا قصہ تمام بھی کریں گے۔ لیکن اگر ہم نے جلد بازی کی تو ہماری جان ضائع چلی جاوے گی اور یہ ہم کو منظور ناہیں ہے۔'' فیروز نے کہا۔

''تو کیا ہم ماجد کو گنوا کر یہاں سے خالی ہاتھ واپس چلے جاویں گے؟''

چلتے چلتے فیروز چند لمحے کے لیے رُک گیا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''ناہیں...... ہم بالکل خالی ہاتھ واپس ناہیں جاویں گے۔ آج ہم جارج تک نہیں پہنچ سکے لیکن اپنے دوسرے ''بہترین نشانے'' پر ضرور پہنچیں گے۔''

''دوسرا بہترین نشانہ...... کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم ماریا تک پہنچیں گے۔ ماریا جارج کی سوتیلی بہن ہے لیکن ماں کی طرف سے سگی ہے اور وہ اس سے بہت محبت بھی کرتا ہے۔ ہم جارج کو ایسا زخم دیں گے جو اسے زندگی اور موت کے درمیان لٹکا دیوے گا۔ مر سکے گا نہ جی سکے گا۔''

''وہ بدذات ہمیں کہاں ملے گی؟'' اسحاق نے دانت پیس کر پوچھا۔

''میں اچھی طرح جانت ہوں، وہ اس وقت کہاں ہووے گی۔ وہ اپنی ایک دوست کے گھر آئی ہوئی ہے۔ ٹھاکر کیدار ناتھ کی بیٹی کامنی دیوی کی سگائی کی رسم ہے۔ مجھے پتا ہے کہ وہاں بہت زیادہ لوگ ناہیں ہوں گے۔ حفاظت کا بھی کوئی خاص انتظام ناہیں ہووے گا۔ ہم اس موقع کا فائدہ اُٹھا کر ماریا کو عدم آباد روانہ کر سکت ہیں۔ بالکل کر سکت ہیں۔''

''اگر ایسا ہو جائے تو واقعی یہ بہت بڑی بات ہووے گی۔''

''یہ بات ہووے گی اور ابھی ہووے گی۔'' فیروز کے لہجے میں سخت ہیجان تھا۔

ہم نے درختوں کے درمیان تیزی سے سفر کیا۔ ہمارے پاس ٹارچیں موجود تھیں لیکن ہم انہیں استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ اسحاق اور فیروز یہاں کے راستوں کے شناور تھے۔ وہ بڑی مہارت سے محفوظ اور شارٹ کٹ راستے استعمال کر رہے تھے۔ ایک جگہ وہ ایک برساتی نالے کے اندر سے بھی گزرے۔ جب اس نالے سے باہر نکلے تو میں نے بالکل غیر متوقع طور پر خود کو اس خوشبودار نہر کے کنارے پایا جو زرگاں کے راج بھون کو تقریباً چھوتی ہوئی گزرتی تھی لیکن ہم راج بھون کے پاس نہیں تھے بلکہ بارونق آبادی کے پاس بھی نہیں تھے۔ یہ زرگاں کا مضافاتی علاقہ نظر آتا تھا۔ ہم تینوں نے اپنے چہرے ڈھاٹوں میں چھپا لیے۔ فیروز نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے تیز سرگوشی کی۔ ''وہ دیکھو...... ان پیڑوں کے پیچھے جو نیلی روشنیاں نظر آ رہی ہیں، یہ ٹھاکر کیدار ناتھ کی حویلی ہے۔ ٹھاکر ذرا عام لوگوں سے الگ تھلگ رہنے کا عادی ہے۔ آج یہیں پر اس کی بیٹی کی رسم ہو رہی ہے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نا ہیں ہے۔ ہمیں جو کرنا ہے فوراً کرنا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے۔ سیدھے اندر گھس جاوت ہیں۔ جو بھی راستہ روکے گا، بھون ڈالیں گے اس حرامی کو۔''

کچھ دیر بعد اسحاق نے عجیب جذباتی انداز میں فیروز کا کندھا تھاما۔ ''میں نے تمہاری بات مانی ہے فیروز! اب تم میری بھی ایک بات مانو۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ اگر وہ حرام کی جنی ماریا ہمارے ہاتھ آ گئی تو ہم اسے زندہ پکڑنے کی کوشش کریں گے۔''

''وہ کیوں؟''

''اس بارے میں، مَیں تمہیں پھر بتاؤں گا لیکن مجھ سے وعدہ کرو۔''

تاریکی میں فیروز نے چند لمحوں کے لیے اسحاق کو بغور دیکھا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔''

ہم شیشم، نیم اور کچنار کے پیڑوں میں سے نکل کر نیلی روشنیوں والی حویلی پر یوں حملہ آور ہوئے جیسے شکاری جانور اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ حویلی سے باہر سات آٹھ خوبصورت گھوڑا گاڑیاں کھڑی تھیں۔ دو تین موٹریں بھی نظر آ رہی تھیں۔ گاڑی بان، ڈرائیور اور چوکیدار وغیرہ یہاں وہاں ٹہل رہے تھے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اچانک اس طرح کی افتاد ان کے سر پر ٹوٹ پڑے گی۔ وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکے۔ ہم تینوں دندناتے ہوئے حویلی میں گھس گئے۔ صرف ایک ملازم نے برآمدے میں ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی۔

فیروز نے اس کی ٹانگ میں گولی ماری، وہ ڈکراتا ہوا نہانے والے تالاب میں جا گرا۔ اس حویلی کو جنریٹرز کی مدد سے جگمگایا گیا تھا۔ اندرونی حصے میں مہمانوں کا جمگھٹا تھا۔ رنگین آنچل لہرا رہے تھے۔ ڈھولک کی تھاپا تھپ گونج رہی تھی۔ پکوانوں کی خوشبو تھی۔ پہلے تو فائر کی آواز نے لوگوں کو چونکایا پھر جب ہم اسلحہ لہراتے ہوئے اچانک اندر گھس آئے تو ہر طرف کہرام مچ گیا۔ مرد و زن چلاتے شور مچاتے چاروں طرف بھاگے۔ کرسیاں اُلٹ گئیں۔ کھانوں کی بیش قیمت رکابیں فرش پر بکھرتی نظر آئیں۔ جس لڑکی کی سگائی تھی، وہ سرخ ساڑھی پہنے سولہ سنگھار کیے اسٹیج پر بیٹھی تھی۔ اس کے گرد بھی خوش رنگ لڑکیوں کا ہجوم تھا۔ یہ سب بھی حواس باختہ ہو کر اُٹھیں، ان میں سے دو تین سفید فام بھی تھیں۔ فیروز اور اسحاق نے ان میں سے اپنا شکار پہچان لیا تھا۔ یہ سرخی مائل بالوں والی ایک دراز قد لڑکی تھی۔ اس کی عمر تئیس چوبیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ سفید فام ہونے کے باوجود اس نے مقامی لباس ہی پہن رکھا تھا۔ یہ چمکیلی کام دار ساڑھی پر مشتمل تھا۔ لڑکی مضبوط جسم اور قوی اعصاب کی مالک نظر آتی تھی۔ اسٹیج پر سے اُترنے والیوں میں وہ سب سے آخر میں تھی اور وہ منہ پھیر کر بھاگی بھی نہیں تھی، اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹ رہی تھی۔ تاہم دیگر لوگوں کی طرح اس کے چہرے کا سارا خون بھی نچڑ چکا تھا۔

فیروز اور اسحاق عقابوں کی طرح اس پر جھپٹے اور پکڑ لیا۔ ''ہیلپ...... ہیلپ۔'' وہ دہشت زدہ ہو کر چلائی لیکن فی الحال یہاں اس کی پکار سننے والا کوئی نہیں تھا۔

شاید لوگوں نے بھانپ لیا تھا کہ ہمارے سروں پر خون سوار ہے اور ان لمحوں میں ہم کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اسحاق نے انگریز لڑکی کی پشت سے رائفل کی نال لگا دی تھی اور فیروز اسے کھینچتا ہوا دروازے کی طرف لا رہا تھا۔ یہی وقت تھا جب دو تنومند افراد جو یقیناً گارڈز تھے، ہمارے سامنے آئے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ وہ حق نمک ادا کرنا چاہتے تھے مگر یہ کوشش انہیں مہنگی پڑی۔ اسحاق نے بے دریغ برسٹ چلایا۔ دونوں افراد کے چہرے اور سینے پر گولیاں لگیں۔ وہ ٹریگر دبانے کی حسرت دل میں لیے مردہ چھپکلیوں کی طرح دہلیز پر جا گرے۔ ایک گولی ایک بھاگتی ہوئی فربہ اندام خاتون کی ٹانگ میں لگی۔ میں نے اسے برآمدے کے بڑے بڑے گول ستونوں کے پاس گرتے ہوئے دیکھا۔

ہم ماریا کو کھینچتے ہوئے حویلی کے لان میں پہنچے۔ ہر طرف وحشت کا عالم تھا۔ لوگ کونے کھدروں میں چھپ گئے تھے اور وہیں سے واویلا کر رہے تھے۔ ''ہوائی فائرنگ کرو۔'' فیروز نے مجھے مشورہ دیا اور خود بھی رائفل کی نال اوپر اُٹھا کر ٹریگر دبا دیا۔

تڑتڑ کی لرزہ خیز آوازوں نے ماحول کو مزید دہشت ناک کر دیا۔ میں نے بھی فیروز کی تقلید کی اور اندھا دھند گولیاں چلائیں۔ زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ ''پہل'' کرنے کے فائدے کیا ہوتے ہیں اور کسی ماحول پر اچانک چھا جانے اور اسے تسخیر کر لینے کا نشہ کیا ہوتا ہے۔ ہمارے اردگرد کوئی معمولی لوگ نہیں تھے۔ وہ ٹھاکر تھے، رائے اور کنور تھے اور پتا نہیں کیا کچھ تھے لیکن اس وقت وہ جان بچانے کے لیے معمولی کیچوؤں کی طرح کونے کھدروں میں رینگ رہے تھے اور چھپ رہے تھے۔ ان کی بھاری پگڑیاں، قیمتی جوتیاں اور ان کے بلوری جام ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔

جس وقت ہم ماریا کے ساتھ بیرونی گیٹ پر تھے، حویلی کی چھت سے ہم پر پھر ایک فائر ہوا لیکن اس سے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اس فائر کے جواب میں، مَیں نے چھت کے بائیں کنارے کی طرف تین چار فائر کیے اور فیروز وغیرہ کے ساتھ بھاگتا ہوا حویلی سے نکل آیا۔

حویلی سے باہر ایک لینڈ روور جیپ موجود تھی۔ ڈرائیور بھی پاس ہی موجود تھا اور ہمیں سکتہ زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ہم انگریز لڑکی کو کھینچتے ہوئے جیپ میں لے آئے۔ فیروز نے رائفل کی نال ڈرائیور کی طرف اُٹھائی اور پھنکارا۔ ''گاڑی اسٹارٹ کر۔''

ڈرائیور کسی معمول کی طرح ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور جیب سے چابی نکال کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ فیروز نے اسے بھاگنے کا حکم دیا۔ وہ اس حکم کو ماننے کے لیے ایک سو ایک فیصد تیار تھا۔ وہ گاڑی سے نکل کر درختوں کی طرف بھاگتا چلا گیا۔ فیروز نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور پلک جھپکتے میں جیپ کو نیلی روشنیوں والی حویلی سے دور لے آیا۔

اگلے پندرہ بیس منٹ میں فیروز نے درختوں کے درمیان کچے راستوں پر طوفانی ڈرائیونگ کی۔ لڑکی کو اسحاق نے دبوچ رکھا تھا اور ٹرپل ٹو رائفل کی نال اس کی گردن سے لگا رکھی تھی۔ ہم جیپ کے ساتھ ہی فٹ فٹ بھر اوپر اُچھل رہے تھے اور ہمارے سر بار بار جیپ کی چھت سے ٹکراتے تھے۔ لڑکی سمجھ چکی تھی کہ اب شور مچانے اور مزاحمت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ اُلٹا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ فیروز کی ڈرائیونگ بھی اس کے لب و لہجے کی طرح سخت ہیجانی تھی۔ اس نے جیپ کو طوفانی انداز سے ایک برساتی نالے میں سے گزار دیا اور پھر ایک نہایت خطرناک ڈھلوان پر اندھا دھند دوڑاتا چلا گیا۔ ایک موقع ایسا آیا کہ جنگل نہایت دشوار ہو گیا اور جیپ نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ درختوں سے ٹکرا ٹکرا کر اس کا فرنٹ برباد ہو چکا تھا اور ایک طرف کے شیشے میں دراڑیں آ گئی تھیں۔

جب جیپ رُک گئی تو ہم اس میں سے نکلے اور لڑکی کو لے کر نہایت گھنے تاریک درختوں میں گھس گئے۔ ایک ٹارچ کی مدد سے راستہ دیکھتے ہوئے ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ لڑکی کی ساڑھی اس کے بالائی جسم پر سے کھل گئی تھی اور اس کے پیچھے گھسٹ رہی تھی۔ اسحاق نے اسے تیز دھار چاقو سے کاٹا اور پھر پھاڑ کر علیحدہ کر دیا۔ اب لڑکی کی ساڑھی کا بالائی حصہ اس کے جسم پر موجود نہیں تھا۔ اسحاق نے اسے اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیا۔ کچھ آگے جا کر لڑکی پھسلی اور گر گئی۔ اسحاق نے اسے اُٹھانا چاہا لیکن وہ وہیں بیٹھی رہی اور ہانپتی رہی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولی۔ ''ہام کا تمہارا کوئی دشمنی نہیں، تم ہام کے ساتھ ایسا کیوں کرتا؟ اگر تم کو منی چاہیے تو ہام تم کو دینے کو تیار ہے۔ آئی ایم شیور۔ مائیکل تمہارا ہر مطالبہ پورا کر دے گا۔''

''ہمیں تمہاری دولت ناہیں چاہیے۔ کچھ اور چاہیے۔'' اسحاق سفاک لہجے میں بولا۔

''بتاؤ کیا چاہیے...... میں مرنا نہیں چاہتی۔''

''بس یہی ہماری مجبوری ہے ہم تمہیں زندہ ناہیں چھوڑ سکتے۔'' اسحاق نے اس کے سرخی مائل بالوں کو پکڑ کر زوردار جھٹکے دیئے اور پھر طیش کے عالم میں اس کا چہرہ گیلی زمین میں دھنسا دیا۔

وہ کچھ بول رہی تھی مگر اس کی آواز ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ یقیناً وہ منت سماجت ہی کر رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر مائیکل کا نام بھی لیا۔

''یہ مائیکل کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کتیا کا شوہر...... اور جارج حرامی کا یار...... وہ بھی ڈاکٹر ہے۔''

چہرہ کیچڑ میں دھنس جانے کی وجہ سے ماریا کا سانس بند ہو رہا تھا۔ جب وہ ہاتھ پاؤں پھینکنے لگی تو اسحاق نے اس کی گردن پر سے دباؤ ہٹا دیا۔ ٹارچ کی روشنی میں ماریا کا چہرہ دہشت کی تصویر نظر آتا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنے چہرے کا کیچڑ صاف کیا اور ڈری ڈری آنکھوں سے ہمیں دیکھنے لگی۔ یہ وہی خوف تھا جو ہر اس جوان لڑکی کی آنکھوں میں نظر آ سکتا ہے جسے مسلح افراد نے اغوا کر لیا ہو اور کسی تنہا جگہ پر لے آئے ہوں۔ یہ اپنی آبرو کا خوف ہوتا ہے۔

ماریا بھی غالباً یہی سمجھ رہی تھی کہ آنے والے منٹوں یا گھنٹوں میں اس کے ساتھ کچھ بُرا ہونے والا ہے۔

ہم نے جنگل میں قریباً ایک گھنٹہ مزید سفر کیا اور ایک ایسی جگہ پر آ گئے جو فیروز اور اسحاق کے خیال کے مطابق رُکنے کے لیے محفوظ تھی۔ یہ جگہ نباتات سے اٹی ہوئی تھی۔ یہ تو

رات تھی، غالباً دن میں بھی یہاں سورج کی روشنی کا گزر نہیں ہوتا تھا۔ یہاں گنجان درختوں کے درمیان تھوڑی سی خالی جگہ تھی۔ رات کے وقت ایسی جگہوں پر جنگلی جانوروں کا بہت ڈر ہوتا ہے اور آگ جلانا پڑتی ہے لیکن ہم آگ جلانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ یقینی بات تھی کہ اب تک ہماری تلاش شروع ہو چکی ہوگی۔ ہمیں صرف ٹارچ کی روشنی پر ہی اکتفا کرنا تھا۔

اسحاق کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ یہاں پہنچتے ہی وہ جیسے انگریز لڑکی ماریا پر پل پڑا۔ اس نے ماریا کی ساڑھی کا وہ حصہ اپنی کمر سے کھولا جو پھاڑ کر علیحدہ کیا تھا۔ اس کی لمبائی دو ڈھائی میٹر رہی ہوگی۔ اس نے یہ کپڑا ایک رسّی کی طرح ماریا کے گلے میں ڈالا اور اسے گرہ دے دی۔ ماریا خوف سے چلانے لگی۔ ''ہیلپ...... ہیلپ! کوئی ہے؟''

یہاں کس نے ہونا تھا؟ کپڑے کا دوسرا سرا اسحاق کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں کوئی ایسی مناسب شاخ ڈھونڈ رہا تھا جس پر لٹکا کر سفید فام ماریا کو پھانسی دے سکے اور وہ یہ کام کرنے کے لیے سو فیصد تیار تھا۔ اس پر جنون کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ پھنکارنے لگا۔ ''میری بہن جس طرح مری تھی، تجھے بھی اسی طرح مرنا ہوگا۔ بس اتنی رعایت تجھ سے ضرور کریں گے کہ تیری عزت خراب نا ہیں کریں گے۔''

اس نے ساڑھی کے کپڑے کو زوردار جھٹکا دیا۔ سانس ماریا کے گلے میں اٹکنے لگی۔ وہ ہوا کے لیے تڑپنا شروع ہوگئی۔ ''ہاں..... اسی طرح..... اسی طرح۔'' اسحاق نے زہرناک لہجے میں کہا۔ ''وہ بھی ایسے ہی سانس کے لیے تڑپ تڑپ کر مری تھی۔ زہر کے سبب اس کا گلا اندر سے سوج گیا تھا۔ وہ ہوا کھینچ نا ہیں سکتی تھی، آج تو بھی نا ہیں کھینچ سکے گی۔''

اس نے شیشم کی ایک موٹی شاخ پکڑ کر نیچے جھکائی اور ساڑھی کے کپڑے کا دوسرا سرا شاخ کے اوپر سے گزار دیا۔ اب وہ زور لگا کر کسی بھی وقت ماریا کو ہوا میں لٹکا سکتا تھا۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آ رہی تھی کہ کچھ دیر پہلے اسحاق نے فیروز سے یہ وعدہ کیوں لیا تھا کہ جارج کی بہن کو زندہ پکڑنا ہے۔ وہ اسے اپنے طریقے سے قتل کرنا چاہتا تھا اور وہ آگ ٹھنڈی کرنے کا خواہاں تھا جو کئی ماہ سے اس کے سینے میں بھڑک رہی تھی۔

میں نے فیروز کی طرف دیکھا۔ فیروز تذبذب میں دکھائی دیتا تھا۔ وہ جیسے فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ لڑکی کو مار دینا چاہیے یا نہیں۔

میں نے فیروز کو ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں اپنا دل دماغ ٹھنڈا رکھنا چاہیے۔ یہ لڑکی ہمارے ہاتھ میں آگئی ہے۔ ایک طرح سے یہ جارج کی دُکھتی رگ ہے۔ وہ

اس لڑکی کو چھڑانے کے لیے ہماری کئی باتیں مان سکتا ہے۔ ہمیں اس موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔''

فیروز چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''میرا اپنا خیال بھی یہی ہے۔ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہووت ہے۔ یہ لڑکی ہمارے ساتھ ہووے گی تو ہمیں یہاں سے نکلنے میں آسانی ہووے گی اور اس کے بعد بھی ہم جارج کی ناک میں نتھ ڈال سکیں گے۔''

''تو پھر اسے روکو۔'' میں نے کہا۔

فیروز نے مجھے رائفل بدست لڑکی کے پاس کھڑا کیا اور خود اسحاق کو لے کر ایک طرف درختوں میں چلا گیا۔

میں لڑکی سے دو تین فٹ کے فاصلے پر کھڑا رہا۔ میرے ہاتھ میں ٹارچ تھی اور اس کا روشن دائرہ لڑکی پر مرکوز تھا۔ وہ قابلِ رحم حالت میں تھی۔ چہرہ ایک طرف سے سیاہ کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا۔ گلے میں مضبوطی سے بندھے ہوئے کپڑے کی وجہ سے اس کے ماتھے کی رگیں اُبھر آئی تھیں۔ پاؤں سے ایک سینڈل غائب تھا۔ بالائی جسم پر فقط چولی رہ گئی تھی۔ ہاں وہ قابلِ رحم نظر آ رہی تھی مگر قابلِ رحم نہیں تھی۔ مجھے اس کی شکل میں جارج کی جھلکیاں نظر آئیں۔ وہی جارج جو اس بھانڈیل اسٹیٹ کی عورتوں کا دشمن تھا۔ نہ جانے مختلف حیلے بہانوں سے کتنی زندگیاں تباہ کر چکا تھا۔ یہ اسی کی بہن تھی۔ عورت ہونے کے باوجود وہ اپنے جیسی عورتوں کو برباد ہوتے دیکھتی تھی اور اس کے کان پر جوں نہیں رینگتی تھی۔ شاید وہ بھی ان سفید فاموں میں سے تھی جو دیگر رنگ و نسل کے لوگوں کو انسان کا درجہ ہی نہیں دیتے۔ آج وہ اپنے بھائی کے کرتوتوں کے سبب خود ایک سخت مصیبت میں تھی۔ جھاڑیوں کی دوسری طرف فیروز اور اسحاق کا مکالمہ جاری تھا۔ کبھی ان کی آواز مدھم پڑ جاتی تھی، کبھی بلند ہو جاتی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اسحاق فوری طور پر بدلہ لینے پر تلا ہوا ہے وہ ماریا کی جان بخشی کے لیے تیار نہیں۔ یہ گفتگو قریباً دس منٹ جاری رہی پھر دونوں واپس آ گئے۔ ماریا نے ڈری ڈری نظروں سے اسحاق کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کی وحشت جوں کی توں تھی۔ بہرحال اس کی آنکھوں کی ہیجانی کیفیت کچھ ماند پڑی ہوئی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور ماریا کی گردن سے کپڑے کا پھندا کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ بُری طرح کھانس رہی تھی۔ فیروز نے پھندا کھولنے میں اسحاق کی مدد کی۔

پھندا کھل گیا تو اسحاق نے اسی کپڑے سے ماریا کے ہاتھ اس کی پشت پر باندھ دیئے۔ ماریا اب بالکل مزاحمت نہیں کر رہی تھی۔ جب اسحاق اس کے ہاتھ باندھ رہا تھا اور

ساتھ ساتھ اس پر لعن طعن کر رہا تھا، میں نے سرگوشی میں فیروز سے پوچھا۔ ''کیا فیصلہ ہوا؟''

فیروز بولا۔ ''بس وہ یہاں تک راضی ہوا ہے کہ راستے میں لڑکی کو کچھ ناہیں کہے گا۔''

''مطلب ہے کہ وہاں سرنگ میں جا کر مار دے گا۔''

فیروز نے اثبات میں سر ہلایا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم پھر اپنے راستے پر رواں تھے۔ مجھے فیروز اور اسحاق کی مہارت کی داد دینا پڑ رہی تھی۔ وہ اس تاریک گھنے جنگل میں بڑے اعتماد سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ٹارچ بھی بس وہ کہیں کہیں خاص ضرورت کے وقت ہی روشن کرتے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ اس دشوار گزار راستے کے نشیب و فراز کو اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح جانتے ہیں۔ فیروز سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے ماریا، اس کے پیچھے اسحاق اور آخر میں، مَیں تھا۔ ماریا جہاں کہیں سُست پڑتی، اسحاق بے رحمی سے اسے رائفل کے بیرل سے ٹہوکا دیتا اور لعن طعن کرنے لگتا۔ اچانک ہوا کے دوش پر تیر کر کچھ دور افتادہ آوازیں ہمارے کانوں میں پڑیں۔ یہ آوازیں چونکا دینے والی تھیں۔ آخر وہی ہوا تھا جس کا خطرہ تھا۔ جارج کی بہن اغوا ہوئی تھی۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس کی بازیابی کے لیے جارج اور حکم جی نے اپنے ہرکارے جنگل میں پھیلا دیئے تھے۔ یہ لوگ ابھی کافی فاصلے پر تھے لیکن یقینی بات تھی کہ یہ زیادہ دیر فاصلے پر نہیں رہیں گے۔

''امید ناہیں تھی کہ یہ لوگ اتنی جلدی ہماری راہ پر لگ جاویں گے۔'' اسحاق نے دانت پیسے۔

''اب اس حرامزادی کے زندہ ہونے کا فائدہ ہووے گا ہمیں۔'' فیروز نے بھی جلتی ہوئی سرگوشی کی۔

واقعی یہ لڑکی اب ہمارے لیے ایک قیمتی اثاثے کی طرح ہوگئی تھی۔ فیروز کو یقین تھا کہ جارج اور اس کے ہرکارے کسی صورت بھی ماریا کی زندگی کا رسک نہیں لیں گے۔ اب ہم نے ٹارچ مستقل طور پر بجھا دی اور بہت احتیاط مگر تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ اگلے آدھ پون گھنٹے میں فیروز اور اسحاق نے کئی موڑ مڑے اور شارٹ سرکٹ راستے استعمال کیے لیکن جلد ہی ہمیں اندازہ ہوگیا کہ ہم تعاقب کرنے والوں سے اپنا فاصلہ بڑھانے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ وہ مسلسل ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔

اچانک فیروز رُک گیا۔ اس نے دھیان سے میری طرف دیکھا۔ پھر وہ ایک دم بیٹھ گیا اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ بظاہر یہی لگا کہ وہ ہانپ کر بیٹھا ہے لیکن میں اس کے چہرے کے بدلے ہوئے تاثرات دیکھ چکا تھا اور میرا دل کہہ رہا تھا کہ بات کچھ اور ہے۔

''کیا ہوا؟'' میں اس سے پوچھا۔

''کچھ ناہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''کچھ تو ہے۔ شاید تم چھپا رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا۔ تاریکی میں اس کے تاثرات پوری طرح دکھائی نہیں دیتے تھے، تاہم اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک دم سخت پریشان ہوگیا ہے۔ اس نے ایک نظر اسحاق پر ڈالی۔ وہ رائفل ماریا کی پشت سے لگائے چوکس کھڑا تھا۔ اس نے ٹریل ٹو رائفل ایک ہاتھ سے تھام رکھی تھی۔ اپنے دوسرے ہاتھ سے وہ ماریا کے بندھے ہوئے ہاتھوں کی گرہ ٹٹول رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بجا طور پر یہ خطرہ موجود تھا کہ ماریا کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرے۔ اس حوالے سے میرا اپنا تجربہ بھی یہی کہتا تھا کہ ماریا ٹائپ کے سفید فام غیر ملکی زیر ہونے کے باوجود بھی زیر نہیں ہوتے اور اپنی ذہنی برتری کے زعم میں چالاکی دکھانے کا موقع تلاش کرتے رہتے ہیں۔

فیروز مجھے ایک طرف لے گیا اور ہولے سے بولا۔ ''کیا تمہیں اس بات پر وشواس ہے جو عام طور پر تمہارے بارے میں اور کچھ دوسرے بندوں کے بارے میں کہی جاوت ہے؟''

''کون سی بات؟''

''یہی کہ...... تم لوگن کہیں بھی اپنی مرضی سے ناہیں جا سکت ہو اور نہ ہی اس اسٹیٹ سے باہر نکل سکت ہو۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ایک سرد لہری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتی محسوس ہوئی۔

''تمہارا مطلب ہے کہ یہ لوگ میری وجہ سے ہمارے پیچھے آ رہے ہیں؟'' میں نے اٹک اٹک کر پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔ بس اسی طرح بے حرکت بیٹھا رہا اور ان دور افتادہ آوازوں کو سنتا رہا جو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ بہت مدھم صورت میں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ اسحاق کو شاید ماریا کے ہاتھوں کی کمزور بندش کا احساس ہوا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ دوبارہ سے باندھنے میں مصروف تھا۔ فیروز نے کھوئی کھوئی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بدستور سرگوشی کے لہجے میں بولا۔

''کیا تم جادو ٹونے اور عملیات وغیرہ پر وشواس رکھتے ہو؟''

''کیا تم رکھتے ہو؟'' میں نے جوابی سوال کیا۔

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''رکھتا بھی ہوں اور ناہیں بھی لیکن ایک بات سچ ہے۔ جو بات ہماری سمجھ میں ناہیں آتی، اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی انہونی وجہ تو ضرور ہووت ہے۔''

میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ یہ روحانیت اور مادیت وغیرہ پر بحث کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ہمیں اپنے پیچھے آتے ہوئے دشمن سے خطرہ تھا اور یہ خطرہ تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ لوگ پھیل کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کی آوازیں دو مختلف اطراف سے آ رہی تھیں۔

فیروز خاموش تھا اور اس کی خاموشی گمبھیر تھی۔ آخر میں نے پوچھا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟ اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو میں تم لوگوں سے علیحدہ ہو جاتا ہوں۔''

''نا ہیں...... نا ہیں۔ ایسی بات دماغ میں بھی نہ لانا۔ ہم ساتھ چلے ہیں۔ ہم نے اکٹھے جینے مرنے کا عہد کیا ہے اور یہ عہد پورا ہووے گا۔''

''لیکن یہ بھی تو ٹھیک نہیں کہ یہ عہد پورا کرتے کرتے ہم سارے ہی دھر لیے جائیں۔''

''نا ہیں...... اس کا کوئی حل نکالتے ہیں۔'' وہ بیتابی سے بولا اور پھر اُٹھ کر اسحاق کے پاس چلا گیا۔

اسحاق اور وہ ایک طرف جا کر مدھم آواز میں باتیں کرنے لگے۔ میں ماریا کی نگرانی کے لیے اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ درخت سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اور بار بار میری رائفل کی طرف متوحش نظروں سے دیکھ لیتی تھی۔

اسحاق اور فیروز کا مکالمہ دو تین منٹ میں ختم ہو گیا۔ وہ دونوں جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گئے تھے۔ میں ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھا۔ اگر وہ اپنے اندیشوں کے پیش نظر مجھے خود سے علیحدہ ہونے کا کہتے تو میں فوراً ہو جاتا لیکن انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔

فیروز بولا۔ ''ہم کالی مٹی والے راستے کی طرف سے جاویں گے۔ یہاں ندی بہت تیز چلت ہے۔ اگر ہم کسی طرح اسے پار کر گئے تو ہمارے بچنے کی آشا پیدا ہو جاوے گی۔''

''وہاں ندی پار کرنے کا کوئی انتظام ہے؟''

''ہاں...... انتظام تو ہے۔ اب اللہ کرے یہ انتظام ہمارے کسی کام آ سکے۔'' اسحاق نے کہا۔

ایک بار پھر بھیگی بھیگی سی تاریکی میں ہمارا سفر شروع ہوا۔ اب سمت بدل گئی تھی۔ ہم قدرے ڈھلوان راستے پر بائیں طرف جا رہے تھے۔ یہاں درختوں اور خودرو جھاڑ جھنکاڑ کی وجہ سے بار بار ہمارا راستہ مسدود ہو رہا تھا۔ کئی جگہ ہمیں درختوں کے درمیان سے بیٹھ کر یا رینگ کر گزرنا پڑا۔ کپڑے اُلجھ رہے تھے اور جسم کے عریاں حصوں پر گہری خراشیں آ رہی

تھیں۔ ماریا کے لیے سفر زیادہ مشکل تھا کیونکہ اس کے ہاتھ عقب میں بندھے ہوئے تھے۔ اب اسحاق نے اس پر سے رائفل ہٹا لی تھی اور اسے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ سہارا دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم عقب سے آنے والی آوازوں پر بھی دھیان رکھے ہوئے تھے۔ گاہے بگاہے آوازوں کی موجودگی ثابت ہوتی تھی۔

قریباً ایک گھنٹے تک ہم نے یہ نہایت دشوار سفر ایک ڈھلوان پر طے کیا۔ یہ ڈھلوان غیر محسوس لیکن مسلسل تھی۔ ہم بوقتِ ضرورت صرف چند سیکنڈ کے لیے ٹارچ روشن کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب ایسے ہی اسحاق نے ٹارچ روشن کی تو ہمیں خود سے صرف آٹھ دس قدم کے فاصلے پر دو نہایت چمکیلی آنکھیں نظر آئیں۔ اس کے ساتھ ہی خطرے کا شدید احساس ہوا۔ یہ جھاڑیوں میں دبکا ہوا کوئی جانور تھا۔

ہم اپنی جگہ ساکت رہ گئے۔ ''تیندوا......'' فیروز کے منہ سے بے ساختہ سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

ہم اپنی جگہ پتھر بنے کھڑے تھے۔ تب فیروز نے پھرتی دکھائی۔ اس نے تیزی کے ساتھ رائفل پوزیشن کی اور فائر کر دیا۔ رائفل سے شعلہ نکلا اور جنگل دھماکے سے گونج اُٹھا۔ وہ تیندوا یا جو کچھ بھی تھا، جھٹکے سے پیچھے گیا۔ یقیناً اسے گولی لگی تھی۔ ایک کربناک آواز بلند ہوئی اور روشن آنکھیں جو چھوٹے چھوٹے سرخ بلبوں کی طرح نظر آتی تھیں، تیزی سے تاریکی میں اوجھل ہو گئیں۔ کسی درندے کو اس قدر قریب سے دیکھنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔

درست کہتے ہیں کہ بڑے خطرے کے وقت نسبتاً چھوٹے خطرے کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ فیروز کو بھی معلوم تھا کہ فائر کی آواز ہمارے دشمنوں کو ہمارے مزید قریب لے آئے گی لیکن خونخوار جانور کو اپنے رُوبرو دیکھ کر وہ پیچھے آنے والے خطرے کو بھول گیا تھا اور اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔ اب جانور تو زخمی ہو کر راہ فرار اختیار کر گیا تھا لیکن جو ''جانور'' ہمارے پیچھے آ رہے تھے ان کو واضح راہنمائی مل گئی تھی۔

''ندی کتنی دور ہے؟'' میں نے فیروز سے پوچھا۔

''بس اب پہنچنے ہی والے ہیں۔'' فیروز نے ہانپی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

واقعی لگ رہا تھا کہ ہم نباتات کے اس گھنے جال سے نکل کر کسی کھلی جگہ پر پہنچنے والے ہیں۔ ڈھلوان قدرے بڑھ گئی تھی۔ سامنے سے ہوا کی آمد بھی محسوس ہو رہی تھی۔ ذرا آگے گئے تو پانی کا مدھم شور بھی سنائی دینے لگا۔ یقیناً یہ چوڑی پاٹ والی ایک تیز رفتار ندی تھی۔ ہمارے تھکے ہارے جسموں میں نئی توانائی آ گئی۔ جوں جوں آگے بڑھتے گئے، پانی کا شور بلند

ہوتا گیا۔ آخر ہم لمبے سرکنڈوں میں سے گزر کر ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ تاروں کی مدھم روشنی میں اس تیز رفتار آبی گزرگاہ کا پاٹ خاصا وسیع نظر آتا تھا۔ کنارے دلدلی تھے اور یہاں بہت سنبھل کر پاؤں رکھنا پڑ رہا تھا۔ قریب ہی گھاس پھوس کی ایک جھونپڑی نظر آئی۔ یہاں دو گھوڑے بندھے ہوئے تھے اور رکھوالی کا کتا تھا۔ کتے نے ہماری آمد محسوس کرتے ہی شور مچانا شروع کر دیا تھا اور بے چینی سے اپنے کھونٹے کے گرد چکر کاٹ رہا تھا۔ ندی کے کنارے پر ساتھ ساتھ تین کشتیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ایک ذرا بڑی تھی اور اس پر ترپال تنی ہوئی تھی۔ یہ غالباً مچھلیاں پکڑنے کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی۔ دو کشتیاں عام سائز کی تھیں۔

جلد ہی کتے کا شور شرابا رنگ لے آیا۔ جھونپڑی کا دروازہ کھولا اور ایک سایہ متحرک دکھائی دیا۔ فیروز نے ٹارچ کی روشنی اس پر ڈالی۔ یہ بڑھی ہوئی سفید شیو والا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بد حال سی دیسی بندوق تھی۔ وہ فی الوقت صرف ایک لنگی میں دکھائی دے رہا تھا۔

''کون ہو بھئی؟'' وہ دھاڑ کر بولا۔

''بندوق نیچے کر لو۔ ناہیں تو اتنی گولیاں لگیں گی کہ شکل پہچاننا مشکل ہو جاوے گی۔'' فیروز بھی جواباً گرجا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ٹارچ کے روشن دائرے کو حرکت دے کر میرے اور اسحاق کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی جدید رائفلوں کو ہائی لائٹ کیا۔

بات ادھیڑ عمر شخص کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے بندوق کی نال نیچے جھکا لی۔ اس کا کتا مسلسل اُچھل اُچھل کر شور مچا رہا تھا۔ اچانک اس نے کھونٹا اُکھاڑ لیا اور تیر کی طرح ہماری طرف لپکا۔ یہ نمک حلالی اسے مہنگی پڑی۔ اسحاق نے اپنی ٹرپل ٹو کا ٹریگر دبا دیا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا نشانہ کافی اچھا ہے۔ پہلی گولی نے ہی کتے کو ڈھیر کر دیا۔ وہ ہم سے آٹھ دس قدم کے فاصلے پر دو لڑھکنیاں کھا کر بے سدھ ہو گیا۔ دھماکے سے جہاں قرب و جوار گونجے وہیں جھونپڑی کے اندر سے چلّانے کی آواز بھی سنائی دی۔ یہ نسوانی آواز تھی۔ لگتا تھا کہ جھونپڑی میں ایک یا ایک سے زائد عورتیں موجود ہیں۔

کتے کو گولی لگنے کا منظر ادھیڑ عمر شخص کو سکتہ زدہ کر گیا۔ فیروز پھر گرجا۔ ''بندوق نیچے پھینک، ناہیں تو آوت ہے گولی تیرے کھوپڑے میں.....'' فقرے کے آخر میں ایک زوردار گالی بھی تھی۔

اس مرتبہ ادھیڑ عمر شخص نے بندوق پھینک دی۔ فیروز نے اسے پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ جب وہ چار پانچ قدم پیچھے ہٹ گیا تو فیروز نے اس کی بندوق اُٹھا لی۔

ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔ ہم جھونپڑی کے پیچھے سیاہ جنگل میں چند جگنو سے چمکتے دیکھ سکتے تھے۔ یقیناً یہ ہمارے عقب میں آنے والوں کی ٹارچیں تھیں۔

فیروز مجھ سے مخاطب ہو کر تیزی سے بولا۔ ''مہروز! تم دیکھو جھونپڑی میں اور کون ہے۔ ہم کشتیوں کو دیکھت ہیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ فیروز اور اسحاق تیز قدموں سے کشتیوں کی طرف بڑھ گئے۔ ماریا ان کے ساتھ تھی۔ اس کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ وہ عقلمندی دکھا رہی تھی کہ بالکل مزاحمت نہیں کر رہی تھی۔ ورنہ اسے اب تک اسحاق کی طرف سے کئی چوٹیں سہنا پڑ چکی ہوتیں۔

میں نے رائفل کے زور پر ادھیڑ عمر شخص کو اس کی جھونپڑی سے کچھ مزید پیچھے ہٹا دیا پھر جھونپڑی کے دروازے کو لات مار کر کھولا۔ یہ چوبی دروازہ تھا اور اس پر ٹین کا پتر چڑھا ہوا تھا۔ میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ جھونپڑی میں پھینکا تو اندر ایک سکڑی سمٹی مقامی لڑکی نظر آئی۔ اس نے اپنے جسم کے گرد چادر لپیٹ رکھی تھی اور ایک گوشے میں دبکی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر واویلا کرنے لگی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ دونوں میاں بیوی ہیں اور رات کے اس پہر رومانی موڈ میں سو رہے تھے یا جاگ رہے تھے۔ دونوں کی عمروں میں بہت فرق تھا لیکن اس فرق کی وجہ جاننے اور تفصیل میں جانے کا وقت ہرگز نہیں تھا۔ میں نے بڑی سرعت سے جھونپڑی کی تلاشی لی۔ وہاں اب ایک کلہاڑی کے سوا کوئی ہتھیار موجود نہیں تھا۔ یہ عجیب سے پھل والی تیز دھار کلہاڑی تھی۔ میں نے یہ کلہاڑی بھی قبضے میں لے لی اور جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔

ادھیڑ عمر شخص جو یقیناً کنارے پر کھڑی تینوں کشتیوں کا مالک تھا۔ حکم کا منتظر تھا۔ ہمارے لب و لہجے اور انداز نے اسے تقریباً دہشت زدہ کر دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس میں مزاحمت کی قوت بالکل ختم ہو چکی ہے۔ حالانکہ دیکھا جاتا تو یہ شخص کمزور اعصاب کا مالک نہیں ہو سکتا تھا۔ اس تیز رفتار ندی اور گھنے جنگل کے خطرناک سنگم پر ایک جھونپڑی میں اپنے کتے اور بندوق کے ساتھ تنہا رہنے والا شخص کمزور اعصاب کا مالک تو نہیں ہو سکتا تھا۔ پہلی بار مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ طاقت کیا ہوتی ہے اور منہ زور رویوں کے سامنے اچھے بھلے لوگ کیسے مغلوب ہو جاتے ہیں۔

ادھیڑ عمر شخص ڈگمگاتا ہوا جھونپڑی میں داخل ہوا تو میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''اپنی بیوی کے ساتھ لیٹ جا اور اوپر چادر لے لے۔ خبردار جو تم دونوں میں سے کسی نے چادر سے

منہ باہر نکالنے کی کوشش کی۔ اگر ایسا ہوا تو تم دونوں کی لاشیں بھی کتے کے پاس پڑی نظر آئیں گی۔''

ان دونوں نے لپیٹ کر چادر اپنے اوپر تان لی۔ میں جھونپڑی کا دروازہ باہر سے بند کر کے کنارے کی طرف آ گیا۔ میرے پہنچنے تک فیروز اور اسحاق نے دو چھوٹی کشتیوں کی رسیاں کاٹ کر انہیں پانی کے تیز بہاؤ میں بہا دیا تھا۔ تیسری کشتی میں ہم خود سوار ہو گئے۔ اب دور دور تک اور کوئی کشتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ فیروز نے لمبے بانس نما چپو کی مدد سے کشتی کو تیزی سے دوسرے کنارے کی طرف کھینا شروع کر دیا۔

رواں دواں بہاؤ کی وجہ سے ہم پلک جھپکتے میں جھونپڑی سے بہت دور نکل آئے۔ جھونپڑی کے ساتھ ساتھ درختوں میں چمکتے ہوئے جگنو بھی ہم سے بہت زیادہ دور رہ گئے۔ ہمیں ایسے تیز رفتار اور کامیاب فرار کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ میرے اندازے کے مطابق صرف پانچ چھ منٹ میں ہم ملاح کی جھونپڑی اور اس کے گھاٹ سے قریباً دو میل آگے نکل آئے۔ کشتی بتدریج دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی، تاہم کنارہ ہنوز بیس تیس میٹر دور تھا۔ کشتی کے اندر سے مچھلیوں کی بُو اُٹھ رہی تھی۔ مچھلیاں پکڑنے کے جال اور دیگر لوازمات بھی کشتی میں نظر آ رہے تھے۔ کشتی کے پیندے کو مچھلیاں اسٹور کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس پیندے کو ایک چھوٹے سے تہہ خانے کی شکل دے دی گئی تھی۔ ایک گول سوراخ کے ذریعے اس چار پانچ فٹ گہرے تہہ خانے میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ یہ اسٹور نما تہہ خانہ فی الحال خالی تھا۔ اس میں مچھلیاں صاف کرنے اور انہیں نمک وغیرہ لگا کر محفوظ کرنے کا انتظام موجود تھا۔

فیروز نے بہت کوشش کر کے ندی کا دوسرا کنارہ پکڑا۔ ورنہ ہمیں یوں لگ رہا تھا کہ تاریک پانی کا سرکش بہاؤ ہمیں مزید کئی میل آگے لے جائے گا۔ اب کشتی کو روکنے کا مسئلہ تھا۔ وہ کافی وزن دار تھی اور اس کا مومینٹم تھا۔ ایک مناسب جگہ پر فیروز اور اسحاق چھلانگیں لگا کر کنارے پر پہنچے اور انہوں نے رسّوں کی مدد سے کشتی کو سنبھالا۔ اس دوران میں، مَیں رائفل بدست ماریا کے پاس موجود رہا۔

کشتی رُک گئی تو میں نے اور اسحاق نے ماریا کو سہارا دے کر نیچے اُتارا۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہونے کی وجہ سے وہ اوندھے منہ ریت پر گر گئی۔ اس سے پہلے کہ میں بھی ماریا کے پیچھے کنارے پر اُتر جاتا، ایک آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ مجھے یوں لگا کہ کشتی کے چھوٹے سے تہہ خانے میں کوئی موجود ہے۔

''کیا بات ہے۔ تم نیچے کیوں ناہیں آ رہے؟'' فیروز نے پوچھا۔

''ایک منٹ...... مجھے شک سا ہو رہا ہے۔'' میں نے سرگوشی کی اور پلٹ کر تہہ خانے کے سوراخ کی طرف آیا۔ ٹارچ میرے ہاتھ میں تھی۔

تب دوسری مرتبہ آہٹ ہوئی۔ میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ تہہ خانے کے اندر اُتارا۔ بظاہر کچھ دکھائی نہیں دیا۔ میں ہمت کر کے نیچے چلا گیا۔ یہاں بدبو تھی۔ لکڑی کا فرش گیلا ہو رہا تھا۔ اس تہہ خانے کی چھت اتنی نیچی تھی کہ میں کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے ہی ٹارچ کو دائیں بائیں گھمایا اور اچانک سکتہ زدہ رہ گیا۔

لکڑی کے اس غلیظ تہہ خانے میں مچھلیاں پکڑنے والے جالوں، رسیوں اور مختلف اوزاروں کے درمیان ایک جیتا جاگتا شخص موجود تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ بال کندھوں تک پہنچ رہے تھے۔ اس کے جسم پر فقط ایک لنگوٹ تھا۔ اس کے عریاں جسم پر چند چھوٹے بڑے زخم موجود تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس جواں سال شخص کی ایک ٹانگ اور ایک بازو ندارد تھا۔ وہ چلنے کے لیے جس لکڑی کو بیساکھی کے طور پر استعمال کرتا تھا، وہ بھی پاس ہی رکھی ہوئی تھی۔

تہہ خانے میں مچھلی کی ناگوار بُو کے علاوہ ایک اور بُو بھی موجود تھی۔ یہ شراب کی تھی۔ لکڑی کے فرش پر دو تین خالی بوتلیں لڑھکی ہوئی تھیں۔ میں نے رائفل سیدھی کی۔ ''کون ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔

جواب نہیں ملا۔ کیچوے کی طرح لیٹا ہوا شخص بالکل بے حرکت رہا۔ بس اس کی سوجی سوجی پلکوں میں تھوڑی سی حرکت ہوئی۔ وہ شکل وصورت سے نیپال کی طرف کا لگتا تھا۔ جسم کمزور اور میلا کچیلا تھا۔ اسی دوران میں اسحاق بھی چھلانگ لگا کر واپس کشتی پر آ گیا۔ اس نے کشتی کے تہہ خانے میں جھانکا اور پھر ٹارچ کی روشنی میں میرے تاثرات دیکھ کر اندر آ گیا۔ وہ بھی اس عجیب الخلقت ننگ دھڑنگ شخص کو دیکھ کر حیران ہوا۔ ''کون ہے یہ؟'' اسحاق نے پوچھا۔

''میں بھی دو تین بار پوچھ چکا ہوں۔ کچھ بتا نہیں رہا۔ ڈھیٹ بنا لیٹا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

اسحاق نے آگے بڑھ کر ٹارچ کا روشن دائرہ اس کے چہرے پر پھینکا اور پھر غصیلے لہجے میں بولا۔ ''اوئے...... کون ہو تم؟ بولتے کاہے ناہیں؟''

اس نے اپنی سرخ آنکھیں کھول کر بے نیازی سے اسحاق کو دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر

لیں۔ اسحاق نے ایک زوردار ٹھوکر اس کی پسلیوں میں لگائی۔ پھر دوسری ٹھوکر پھر تیسری۔

مجھے یوں لگا جیسے یہ شخص بلبلا اُٹھے گا مگر حیرت انگیز طور پر ردِ عمل سے مس نہیں ہوا۔ شاید اس نے کچھ زیادہ تکلیف ہی محسوس نہیں کی تھی۔ کیا یہ نشے کی وجہ سے تھا یا کوئی اور بات تھی۔

''اُٹھ جاؤ۔'' اسحاق دھاڑا۔

اس مرتبہ عجیب الخلقت نے اپنے سیاہی مائل ہونٹ ہلائے اور انگریزی میں بولا۔ ''دفع ہو جاؤ۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔'' اس کی آواز بھی اس کی طرح عجیب تھی۔

''تمہاری تو ایسی کم تیسی۔'' اسحاق نے دانت پیس کر رائفل سیدھی کر لی۔ ''اُٹھ جا حرامی! ناہیں تو میں گولی چلاوت ہوں۔''

حیرت انگیز طور پر اس بار بھی اجنبی شخص کی طرف سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ اسحاق دھاڑا۔ ''میں پانچ تک گنوں گا پھر گولی مار دوں گا۔''

اس نے گنتی شروع کی...... اور پھر ختم بھی کر دی۔ مدقوق شخص اسی طرح پڑا رہا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا اکلوتا بازو پکڑا اور اسے سیدھا کر کے بٹھانے کی کوشش کی۔ وہ ایک بار تو بیٹھا لیکن پھر مٹی کے ڈھیر کی طرح ڈھے کر لیٹ گیا۔ اسحاق کا پیمانہ صبر اب لبریز ہو چکا تھا۔ اس پر جنونی کیفیت تو پہلے ہی طاری تھی۔ اجنبی شخص کے اڑیل پن نے اسے مزید مشتعل کر دیا۔ اس نے اسے اکلوتے بازو سے پکڑا اور بے دردی سے کشتی کے ڈیک کی طرف کھینچنے لگا۔

اب اس ننگ دھڑنگ شخص نے مزاحمت کی اور تہہ خانہ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ وہ اب اسحاق کی مخالف سمت میں زور لگا رہا تھا۔ مدقوق ہونے کے باوجود اس کے جسم میں مناسب طاقت موجود تھی۔

اسحاق اسے کھینچنے کے ساتھ ساتھ ٹھوکریں بھی رسید کر رہا تھا۔ اچانک ننگ دھڑنگ شخص نے بھنا کر اسحاق کو لات ماری۔ یہ لات اسحاق کی ناف میں لگی اور وہ تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ بہر حال یہ جرأت ننگ دھڑنگ شخص کو کافی مہنگی پڑی۔ اسحاق نے اس کی جسمانی حالت کی پروا کیے بغیر اسے روئی کی طرح دھنک دیا۔ دو چار ٹھوکریں میں نے بھی رسید کیں۔ اتنا کچھ کسی صحت مند و توانا شخص کے ساتھ ہوا ہوتا تو وہ بھی تکلیف کے سبب دہائی دینے لگتا، مگر اس پر کچھ خاص اثر نہیں ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کا جسم گوشت پوست کے بجائے ربڑ یا پلاسٹک کا بنا ہوا ہے یا پھر وہ اس قدر نشے میں ہے کہ درد کا احساس ہی ختم ہو چکا ہے۔

کشتی بُری طرح ڈگمگا رہی تھی۔ باہر سے فیروز چلا چلا کر پوچھ رہا تھا۔ ''کیا ہو رہا ہے...... کون ہے یہ؟''

وہ ماریا کو اکیلا چھوڑ کر کشتی پر بھی نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے تہہ خانے میں سے سر باہر نکال کر فیروز کو تسلی دی اور بتایا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔

میں نے دوبارہ تہہ خانے میں دیکھا تو ننگ دھڑنگ شخص بالکل بے سدھ پڑا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اسحاق نے رائفل کے وزنی کندے سے اس کے سر پر کاری ضرب لگائی تھی اور اسے نیم جان کر ڈالا تھا۔

''مر گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''پتا ناہیں۔'' اسحاق نے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی آنکھیں شعلے اُگل رہی تھیں۔ وہ باہر نکل گیا۔ میں تذبذب میں کھڑا تھا۔ پتا نہیں کہ یہ کون تھا؟ اس کے ساتھ کیا گزری تھی اور یہ کشتی چھوڑنے سے کیوں انکار کر رہا تھا؟ اگر ہم اسے اس حالت میں یہاں چھوڑ کر چلے جاتے تو یہ مر بھی سکتا تھا۔ میری ٹارچ کا روشن دائرہ اجنبی کے چہرے پر تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس شخص کے چہرے میں کہیں اپنے یار عمران کے چہرے کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ خاص طور سے اس کی پیشانی بھنویں اور رُخساروں کی اُبھری ہوئی ہڈیاں۔ بے شک یہ عمران نہیں تھا۔ اس کے بال گھنگریالے تھے، قد بھی ذرا چھوٹا تھا لیکن اپنے پیارے دوست کی ایک ہلکی سی جھلک بھی میرے لیے بہت اہمیت رکھتی تھی۔ اس شخص کے لیے میرے دل میں جو نرم گوشہ شروع سے موجود تھا، کچھ اور وسیع ہو گیا۔ میرا دل نہیں چاہا کہ ہم اسے یہاں اس حال میں اکیلا چھوڑ کر چلے جائیں۔

میں نے دیکھا، اس کے اکلوتے بازو پر انمٹ روشنائی سے اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ یہ کچھ عجیب سا نام تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا۔

اسی دوران میں فیروز بھی کشتی میں آ گیا۔ وہ باہر اسحاق کو ماریا کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ اس نے بھی دلچسپی سے اس ننگ دھڑنگ شخص کو دیکھا۔

میں نے کہا، ''فیروز! یہ زخمی ہے۔ ہمیں اسے اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے۔''

''لیکن ہمارے پاس وقت بالکل ناہیں ہے۔ ہم گھاٹ سے بہت زیادہ دور ناہیں آئے۔ وہ لوگ کسی بھی سمے یہاں پہنچ سکت ہیں۔''

میں نے ایک بار پھر اس کے چہرے کی طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ عمران نہیں تھا لیکن اس میں عمران کی ہلکی سی جھلک تھی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ میں نے پُر زور لہجے میں کہا۔ ''فیروز! شاید یہ مسلمان ہے۔ لگتا ہے کہ ہماری ہی طرح کسی مصیبت میں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی یہ حالت بھی حکم جی یا جارج وغیرہ کی وجہ سے ہوئی ہو۔ ہمیں اسے

اس طرح نہیں چھوڑنا چاہیے۔''

فیروز جزبز ہوگیا۔ ''لیکن ہم اسے لے جائیں گے کیسے؟''

''چلو...... یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اسے اُٹھالیتا ہوں۔ اس کا وزن ہی کتنا ہے۔''

فیروز نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ غالبًا میرے تاثرات نے اسے سمجھا د
کہ میں اپنے فیصلے پر اٹل ہوں۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ اگر تم
اسے لے جاسکت ہوتو لے جاؤ۔''

میں نے اپنی رائفل اور ٹارچ فیروز کو تھمائی۔ ایک کپڑا جلدی سے مدقوق شخص کے سر کے زخم پر باندھا اور اسے اُٹھا کر باہر لے آیا۔ کشتی سے اُتر کر میں نے اسے کندھے پر لادا وہ بالکل ہلکا محسوس ہوا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا تھا۔ پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ اس کے جسم میں ایک ٹانگ اور ایک بازو کا بوجھ شامل نہیں تھا۔

اسحاق کو بہت ناگوار گزرا کہ میں نے اس شخص کو کندھے پر لاد لیا ہے۔ وہ شاید مجھ سے بحث کرنا چاہ رہا تھا تاہم فیروز اسے ایک طرف لے گیا اور دانائی کے ساتھ سمجھا بجھا لیا۔ تاریک جنگل میں رات کا بسیرا تھا اور جنگلی جانوروں کی آوازیں تھیں۔ ہم ٹارچوں کی روشنی میں تیزی سے آگے بڑھتے گئے۔ اب ہمیں اپنے عقب سے زیادہ خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ کچھ آگے جا کر فیروز نے اصرار کے ساتھ مدقوق شخص کا بوجھ اپنے کندھے پر اُٹھالیا۔ میں نے اپنی رائفل کے ساتھ ساتھ اس کی رائفل بھی تھام لیا۔ جھونپڑی سے ملنے والی دیسی ساخت کی رائفل ہم نے راستے میں ایک بارشی جوہڑ کے اندر پھینک دی تھی۔ وہاں سے ملنے والی کلہاڑی جو بالکل چھوٹے دستے کی تھی۔ اسحاق کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اس کے عجیب وضع کے پھل سے راستے میں رکاوٹ ڈالنے والے جھاڑ جھنکاڑ کو کاٹ رہا تھا۔ ہمارے قدموں میں ایک طرح کی تیزی تو اب بھی موجود تھی لیکن تعاقب کا شدید خطرہ معدوم ہوگیا تھا۔

○......❖......○

رات کا آخری پہر تھا جب ہم ایک جگہ رُک گئے۔ یہ درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ جھنڈ کے عین درمیان ایک اُبھری ہوئی جگہ تھی جیسے کوئی ٹیلا ہو۔ ہم اس چھوٹے سے ٹیلے پر بیٹھ گئے۔ میرا خیال تھا کہ اسحاق وغیرہ نے ذرا ستانے کے لیے اس ٹیلے کو منتخب کیا ہے لیکن معاملہ کچھ اور تھا۔ فیروز اور اسحاق میں ایک بار پھر کھسر پھسر شروع ہوگئی۔ ماریا ایک لاچار قیدی کی طرح درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنی اکلوتی جوتی اُتار چکی تھی۔ اس کے پاؤں بُری طرح زخمی تھے۔ دشوار گزار سفر نے ہماری طرح اس کے چہرے پر بھی کئی خراشیں ڈال دی تھیں۔

اس کے کانوں میں ڈائمنڈ کے بڑے بڑے آویزے تھے۔ یہ راستے میں شاخوں سے اُلجھے رہے تھے اور اس کے ایک کان سے خون رسنے لگا تھا۔

وہ منمنائی۔ ''ہام کو سخت پیاس لگا۔''

میں نے کہا۔ ''پیاس تو ہم کو بھی لگی ہے لیکن یہاں کہیں پانی نظر نہیں آتا۔''

''ڈھونڈو۔ شاید کہیں مل جائے۔'' وہ انگلش لہجے میں بولی۔ اس کی آواز میں التجا تھی۔

''کیا بکتی ہے یہ؟'' اسحاق نے دور سے پھنکار کر پوچھا۔

''پانی مانگ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''پلاوت ہیں۔ ابھی پلاوت ہیں تجھے پانی۔ ہم بکری کو پانی پلائے بغیر ذبح ناہیں کرتے۔'' اسحاق کی آواز میں زہر تھا۔

''یہ کیا کہتا؟'' ماریا نے مجھ سے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔'' میں نے بے رُخی سے جواب دیا۔

وہ ڈرے ڈرے انداز میں بولی۔ ''ہام کو لگتا کہ یہ ہام کو زندہ ناہیں چھوڑے گا۔ یہ ہام کو مارنے کا پروگرام بنا رہا۔''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اسحاق اور فیروز کی سرگوشیاں دھیرے دھیرے بلند ہوتی چلی گئیں۔ اسحاق پھنکارا۔ ''مجھے سب پتا ہے فیروز! ہم وہاں انور بھائی کے پاس سرنگ میں چلے گئے تو کچھ ناہیں ہو سکے گا۔ ہمیں اس حرامزادی سے ابھی حساب برابر کرنا ہووے گا۔ ابھی اور اسی وقت۔''

فیروز بولا۔ ''دیکھ لو، میرے دماغ میں تو جو آوت تھا، میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ مشورے سے جو کام ہو، وہ اچھا ہوتا ہے۔''

''ہم مشورے سے ہی چلے تھے۔'' اسحاق تڑخ کر بولا۔ ''اور مشورہ یہ تھا کہ اس کتے جارج کو مار کر آویں گے یا خود بھی وہیں رہ جاویں گے۔ وہ حرامی تو بچ گیا۔ اب کم از کم اس سفید سورنی کی گردن تو توڑیں۔ کچھ نہ کچھ تو ٹھنڈک پڑے ہمارے کلیجے میں۔'' اس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ فیروز ٹھیک کہتا تھا۔ اسحاق نے وقتی طور پر ماریا کی جان بخشی کی تھی۔ اب چونکہ ہم خطرناک حدود سے نکل آئے تھے اور اس زمین دوز دراڑ کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے جہاں انور خاں، چوہان اور دیگر پینتیس چالیس افراد موجود تھے۔ لہٰذا اسحاق چاہتا تھا کہ یہیں اسی جگہ پر ماریا کا کام تمام کر دیا جائے۔ سارھی کا وہ

کپڑا اس کے ہاتھ میں تھا جسے وہ اس سے پہلے رسّی کے طور پر استعمال کر چکا تھا۔ اب وہ پھر اسے استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

ماریا پتھر کا بت بنی بیٹھی تھی۔ اسے اپنا انجام سامنے نظر آ رہا تھا اور حقیقت یہی ہے کہ اس کے لیے میرے دل میں بھی کسی طرح کا رحم یا ترس موجود نہیں تھا۔ اس کی رگوں میں وہی زہریلا خون دوڑ رہا تھا جو جارج کی رگوں میں تھا اور جارج کی درندگی میں اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کر چکا تھا۔ اس خبیث نے اپنے بیڈ روم میں سلطانہ کے سامنے مجھے دوبدو مقابلے کا موقع دیا تھا۔ اس نے بھرا ہوا پسٹل میرے پاؤں میں پھینک دیا تھا اور مجھے ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ میں ان لمحوں کو یاد کرتا تھا تو پسینے میں ڈوب جاتا تھا۔ شاید وہی لمحے تھے۔ وہی وقت تھا جب میرے اندر تبدیلی کی داغ بیل پڑی تھی۔ میں پستی اور ہزیمت کی انتہا کو چھونے کے بعد اُبھرنا شروع ہو گیا تھا اور اب میں تہ دل سے محسوس کرتا تھا کہ میں اُبھر چکا ہوں۔ بدل چکا ہوں اور یہ کوئی عارضی تبدیلی نہیں تھی۔ میری کیمسٹری میں مستقل طور پر کوئی ردوبدل ہو چکا تھا۔ میں نے حسرت سے سوچا۔ کاش ایک بار پھر ''وقت'' اسی طرح مجھے جارج کے رُوبرو کر دے۔ وہ پسٹل میرے سامنے پھینکے اور میری مزاحمت کو للکارے۔

میں سوچ رہا تھا اور اس چھوٹے سے ٹیلے پر وقت کا قلم، رات کے اس آخری صفحے پر کچھ انوکھا لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے مدقوق شخص کو بڑی احتیاط کے ساتھ گھاس پر دراز کر دیا تھا۔ اس کی بے ہوشی نیم بے ہوشی میں بدل چکی تھی۔ اس کے منہ سے شراب کی بُو اُٹھ رہی تھی۔ راستے میں فیروز نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے گُڑ کی شراب پی رکھی ہے جسے ''رم'' کہا جاتا ہے۔ بے خبری کی حالت میں وہ گاہے بگاہے کراہ اُٹھتا تھا۔ اس طویل ہنگامہ خیز رات کے بطن سے نمودار ہونے والا یہ انوکھا کردار تھا۔ وہ اس بدبودار کشتی سے کسی جونک کی طرح چمٹ کر رہ گیا تھا۔ پھر مجھے اس کی سخت جانی یاد آئی۔ اس نے اسحاق کے تند و تیز حملے یوں جھیلے تھے جیسے نشانہ اس کا اپنا جسم نہ ہو کسی اور کا جسم ہو۔ اس کی شباہت میں کہیں عمران کی ہلکی سی جھلک موجود تھی اور یہ جھلک سیدھی میرے دل پر اثر انداز ہوئی تھی۔ شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے، محبوب چیزوں کی طرف تو انسان کا دل کھنچتا ہی ہے، ان سے ملتی جلتی چیزوں پر بھی پیار آ جاتا ہے۔ یہ دل کے معاملے بڑے عجیب ہوتے ہیں۔

یکایک اسحاق اور فیروز کے درمیان ہونے والا مکالمہ ختم ہو گیا اور اسحاق ایک بار پھر غصے سے بھرا ہوا ماریا کی طرف بڑھا۔ ''پلیز...... ایسا مت کرو...... پلیز۔'' ماریا نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''تیری تو......'' اسحاق پھنکارا اور ماریا کو بالوں سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ گر گئی۔

اسحاق جیسے دیوانگی کے عالم میں اس کے اوپر چڑھ بیٹھا اور ساڑھی کے کپڑے کو اس کی لمبی گردن کے گرد ایک بل دینے کے بعد بھینچنے لگا۔ ماریا کی آواز گلے میں دب کر رہ گئی۔ وہ بُری طرح مچل رہی تھی۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اس لیے وہ مزاحمت کے قابل بھی نہیں تھی۔ فیروز نے مجھے اشارہ کیا کہ میں آگے بڑھ کر اسحاق کو روکوں۔

میں نے خود بھی محسوس کیا تھا کہ اسحاق میری بات پر اتنا مشتعل نہیں ہوتا۔ میں نے آگے بڑھ کر ماریا کی گردن اسحاق کے ہاتھوں سے چھڑائی اور اسے ماریا سے پیچھے ہٹایا۔ وہ اوندھی ہو گئی۔ بُری طرح کھانسنے اور اُبکائیاں لینے لگی۔

اسحاق نے خونی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ ''کیا بات ہے؟'' وہ دھاڑا۔

''میں تم سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد تمہارا جو جی چاہے کرنا۔''

''کیا کہتے ہو؟''

میں اسے ایک طرف لے گیا۔ ماریا نے اب بلند آواز سے رونا شروع کر دیا تھا۔ اس کی ہمت اب جواب دیتی جا رہی تھی۔ میں نے اسحاق سے کہا۔ ''مجھے صرف ایک بات بتا دو۔ ہم جارج کو مارنے کے لیے کیوں نکلے تھے اور یہ سب لوگ جو حکم جی کے مجرم بن کر اب سرنگ میں چھپے ہوئے ہیں، کیوں مجرم بنے ہیں؟''

''تم کیا کہنا چاہت ہو؟ یہ سامنے کی بات ہے۔ سلطانہ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، اس کے بعد ہمارا صبر ختم ہو گیا ہے۔ وہ مسلمان ہے۔ ہماری بہن ہے۔ ہم اس کے آنسو ناہیں دیکھ سکتے۔ ہم ان سارے سفید کتوں کو رونے چلانے پر مجبور کر دیویں گے۔''

''تم نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔ ہم سلطانہ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتے۔ اب ذرا غور کرو۔ کیا سلطانہ کی آنکھوں میں اس وقت آنسو نہیں آئیں گے جب اسے پتا چلے گا کہ اس کے بوڑھے باپ اور بیمار بھائی کو جارج نے زندہ درگور کر دیا ہے۔ یا تکلیفیں دے دے کر جان سے مار دیا ہے۔''

اسحاق ذرا ٹھٹکا۔ ''تم کیا کہنا چاہت ہو؟''

''بالکل سامنے کی بات ہے۔ تم لوگ سلطانہ اور اس کے بچے کو تو زرگاں سے نکال لائے ہو لیکن اس کے گھر والے وہیں ہیں۔ پکی بات ہے کہ وہ جارج اور حکم جی کے شکنجے میں آ چکے ہوں گے یا آنے والے ہوں گے۔ ہم انہیں بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ ہم سب تو وہاں سے نکل آئے ہیں۔ اس لڑکی کی شکل میں ہمارے ہاتھ ایک بہت خاص پتا آ گیا

ہے۔''

اسحاق کی آنکھوں کے شعلے کچھ مدھم پڑ گئے تاہم چہرے کی سختی برقرار رہی۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔''اسحاق! اور بات صرف سلطانہ کے گھر والوں ہی کی نہیں ہے۔ ہم اس لڑکی کے زور پر اور بھی کئی باتیں جارج اور حکم جی سے منوا سکتے ہیں۔ اس لڑکی کو فوری طور پر مار کر ہم بہت کچھ گنوا دیں گے۔''

ایسا لگا کہ میری بات اسحاق کی سمجھ میں آنا شروع ہو گئی ہے۔ اس کا تنا ہوا جسم ذرا ڈھیلا پڑ گیا۔ یہ بدلی ہوئی صورتِ حال دیکھ کر فیروز بھی ہمارے پاس چلا آیا اور اس گفتگو میں شریک ہو گیا۔

○ ...... ❖ ...... ○

قریباً ایک گھنٹے بعد ہم زمین دوز دراڑ میں واپس پہنچ گئے۔ اس دراڑ کا دہانہ حیران کن حد تک پوشیدہ تھا۔ رات تو رات، دن کی روشنی میں بھی اسے شناخت کرنا آسان نہیں تھا۔ دہانے کی سیاہی دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کوئی ریچھ جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا ہو۔ ہم جس وقت دہانے پر پہنچے، سپیدۂ سحر نمودار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ جنگل سے جانوروں کی آوازیں معدوم ہو گئی تھیں اور اس کی جگہ پرندوں کی چہچہاہٹ لے رہی تھی۔

غیر متوقع طور پر دراڑ کے دہانے پر کوئی پہرے دار موجود نہیں تھا۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔ کچھ عجیب سا لگا، کہیں کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آئے۔ ہم کچھ اور آگے بڑھے اور تب یہ انکشاف ہوا کہ سرنگ خالی ہے۔ ہم جن چالیس بیالیس ساتھیوں کو یہاں چھوڑ کر گئے تھے، وہ اب یہاں موجود نہیں تھے۔ ان کا سامان وغیرہ بھی ناپید تھا۔ شواہد سے پتا چلتا تھا کہ وہ شاید چند گھنٹے پہلے یہاں سے جا چکے ہیں۔ ایک طرف ٹوٹے ہوئے دستوں والی دو زنگ آلود تلواریں پڑی تھیں۔ ان کے پاس ہی زخموں سے اُتاری جانے والی کچھ خون آلود پٹیاں اور خوراک کے بچے کھچے حصے تھے۔ ہاں ...... یہاں کے مکین یہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔ یہ صورتِ حال خاص طور سے فیروز کے لیے مایوس کن تھی۔ اسے بندو ماں کا طعنہ دینے والا اکبر بھی یہاں موجود نہیں تھا۔ شاید فیروز، اکبر کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہونا چاہتا تھا اور اسے بتانا چاہتا تھا کہ دیکھو میں نے جان کی بازی لگائی ہے اور دشمن کے گھر میں گھس کر اسے گھاؤ لگایا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہاں کیا ہوا ہے؟

ابھی ہم اسی اُدھیڑ بُن میں تھے کہ ایک طرف سے آہٹ سنائی دی۔ پھر کسی نے گرج دار آواز میں پوچھا۔''کون ہے؟''

فیروز نے یہ آواز پہچان لی۔ وہ زور سے بولا۔''ہم ہیں انور بھائی! کہیں گولی شولی نا ہیں چلا دینا۔''

چند سیکنڈ بعد انور خاں ہمارے سامنے آ گیا۔ فیروز نے ٹارچ کا روشن دائرہ انور خاں کی طرف کیا۔ اس کے چہرے پر حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ اس کے پیچھے ہمیش بھی باہر آ گیا۔ اس کا ٹوٹا ہوا بازو اس کے کندھے سے جھول رہا تھا۔ بھکشو ہمیش کے ساتھ ایک تیسرا شخص بھی تھا۔ یہ تئیس چوبیس سال کا نوجوان تھا اور ان پہرے داروں میں سے تھا جنہوں نے پرسوں مجھے دراڑ سے باہر نکلنے سے روکا تھا۔

''یہ سب کیا ہے انور بھائی! باقی سب لوگ کہاں گئے؟'' فیروز نے پوچھا۔

''میں سب بتاتا ہوں لیکن پہلے میری حیرت دور کرو۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ کہیں میری آنکھیں دھوکا تو نہیں کھا رہیں؟ یہ جارج گورے کی بہن ماریا ہی ہے نا؟''

''بالکل انور بھائی! یہ وہی ہے۔ اس حرامی نے ہماری مسلمان بہن سلطانہ کے ساتھ جو کچھ کیا ہے، اس کے بعد وہ کسی رُو رعایت کا حق دار نا ہیں ہے اور نہ یہ سفید کتیا ہے۔'' اسحاق نے کہا اور ماریا کو بالوں سے پکڑ کر بُری طرح جھنجھوڑا۔

''لل ...... لیکن ...... یہ تم نے کیا کس طرح؟ اور ...... یہ تو بہت خطرناک کام ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟''

''نتیجہ کچھ نا ہیں نکلے گا انور بھائی۔'' اسحاق بولا۔''ہم نے یہ سب کچھ سامنے آئے بغیر کیا ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نا ہیں کہ اس میم کو اُٹھا کر لے جانے والے کون ہیں؟''

انور خاں کی حیرت برقرار تھی۔ وہ اسحاق کے جواب سے پوری طرح مطمئن نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر اس کی نگاہ ایک ٹانگ اور ایک بازو والے مدقوق شخص پر پڑی۔ اس نے پوچھا۔''اور یہ کون ہے؟ اسے کہاں سے اُٹھا لائے ہو؟''

''یہ بھی ایک عجوبہ سا ہے جی! یہ راستے میں ملا ہے۔'' فیروز نے جواب دیا اور مدقوق شخص کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل بتائی۔

انور خاں اور ہمیش حیرت آمیز دلچسپی سے سن رہے تھے۔ انور خاں نے میرے ہاتھ سے ٹارچ لے لی تھی اور اس کی روشنی میں مدقوق شخص کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔

مدقوق شخص اب مکمل ہوش میں آ رہا تھا۔ فیروز نے احتیاط کے طور پر اسے ایک گوشے میں لٹایا اور اس کی اکلوتی ٹانگ کو ایک زنجیر سے باندھ کر اس طرح موڑ دیا کہ وہ گھٹنے پر سے

مکمل طور پر مڑگئی اور سیدھی ہونے سے قاصر ہوگئی۔ ہمارے اور انور خاں کے درمیان تفصیل
گفتگو ہوئی۔ انور خاں اس بات پر ناراض تھا کہ ہم اسے بتائے بغیر یہاں سے نکل گئے
تاہم ماریا کی شکل میں جو ایک ہتھیار ہمارے ہاتھ میں آ گیا تھا، وہ اس پر خوش بھی تھا۔ اس
موقع پر فیروز نے انور خاں کو یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ ماجد بھی ہمارے ساتھ تھا اور وہ زندہ
واپس نہیں آ سکا۔ انور خاں، ماجد کو لاپتا سمجھ رہا تھا۔

انور خاں نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ''آخر کار چھوٹے سرکار نے ایک دلیری کا
فیصلہ کر ہی لیا ہے۔ انہوں نے سلطانہ، بالو اور مہروز سمیت سب لوگوں کو نل پانی میں پناہ دے
دی ہے۔ آج رات دوسرے پہر وہ سب لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں۔'' پھر وہ میری طرف
دیکھ کر بولا۔ ''تمہیں بھی مبارک ہو مہروز! چھوٹے سرکار کسی کو پناہ دیتے ہیں تو پھر اس پناہ کا
حق بھی ادا کرتے ہیں۔ اب تم ہر طرح محفوظ ہو اور جس وقت چاہو نل پانی جا سکتے ہو۔''

''لیکن...... تم کیوں نہیں گئے؟ اور ہمیش بھی یہیں ہے اور اس کے ساتھ یہ تیسرا بندہ؟''
میں نے پوچھا۔

''ہمیں پناہ نہیں ملی۔'' انور خاں نے جواب دیا۔ ''اور میرے خیال میں چھوٹے سرکار
کا یہ فیصلہ صحیح ہے۔ اگر وہ ہمیں بھی رکھ لیتے تو پھر معاملہ بہت زیادہ بگڑ جانا تھا۔''

ہمیش بولا۔ ''لوگ تو انور بھائی کے بغیر جانا ہی نا ہیں چاہت تھے۔ انور بھائی نے بڑی
مشکلوں سے انہیں رضامند کیا۔ یہ انور بھائی کی بڑائی ہے۔''

''میں نہیں چاہتا تھا کہ ہم تین بندوں کی وجہ سے باقی لوگوں کی زندگی بھی خطرے میں
پڑ جائے۔ میں نے ہمیش اور احمد سے مشورہ کیا اور انہوں نے بھی میری رائے سے رائے
ملائی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ہوا، بہت اچھا ہوا ہے۔'' انور خاں نے کہا۔

میں سوالیہ نظروں سے احمد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انور خاں نے میرے تجسس کو دو
کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا نام احمد ہے۔ یہ مارشل آرٹ کا زبردست کھلاڑی ہے۔ پہلے الہ
آباد کا چیمپئن تھا، اب الہ آباد سے باہر بھی اس کو مانا جاتا ہے۔''

''اس کے یہاں رہنے کی وجہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس سمجھ لو کہ یہ بھی ہم دونوں کی طرح حکم جی کا خاص مجرم ہے۔ اس کا ناقابلِ معا
قصور میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔'' انور خاں نے جواب دیا۔

ہمارے درمیان آدھ پون گھنٹہ بات چیت ہوئی۔ اس میں آئندہ کا لائحہ عمل طے ہوا
اس لائحہ عمل میں میرے لیے یہ تجویز تھی کہ میں خود کو ملنے والے موقع کو ضائع نہ کروں اور ف

نل پانی کا رُخ کروں۔ انور خاں کا کہنا تھا کہ مجھے پناہ مل چکی ہے اور مجھے اپنی بیوی بچے کے
پاس ہونا چاہیے۔

میرے اندر کچھ اور طرح کی آندھی چل رہی تھی۔ مجھے پناہ نہیں چاہیے تھی۔ مجھے راستہ
چاہیے تھا۔ وہ راستہ جو مجھے اس راجواڑے کی حدوں سے نکال سکتا۔ میرے اندر اس قیدی
پرندے کی روح تھی جو سدا پر پھڑپھڑاتا ہے اور اپنے دیس میں اپنے پیاروں میں واپس پہنچنا
چاہتا ہے۔ مجھے سلطانہ کی حالت پر ترس تو آتا تھا اور میں اسے خطروں سے باہر دیکھنا چاہتا تھا
لیکن اس سے یا اس کے بچے سے میری کوئی دلی وابستگی نہیں تھی۔ میری وابستگی تو میری زمین
سے تھی۔ میرے گلی کوچوں سے۔ انہی گلی کوچوں میں میرا پیار بھی تھا اور میری نفرت بھی۔
ہاں...... میری نفرت بھی۔ انہی گلیوں کوچوں میں وہ بدذات شخص موجود تھا۔

''کس سوچ میں کھو گئے؟'' ہمیش نے اپنے صفاچٹ سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ وہ ابھی تک
بھکشوؤں کے سرخی مائل لباس میں تھا۔

''میں نل پانی نہیں جاؤں گا۔ میں تم لوگوں کے ساتھ رہوں گا۔ ہم ہر مشکل کا مقابلہ
اکٹھے کریں گے۔''

''یہ کیا بات کر رہے ہو؟'' انور خاں نے مجھے سرزنش کی۔ ''ہم تمہیں خطرے میں نہیں
ڈال سکتے۔ ہم نے تم میاں بیوی کو خطرے سے نکالنے کے لیے تو یہ سب کچھ کیا ہے۔''

''اگر تم میرے لیے خود کو خطرے میں ڈال سکتے ہو تو میرا بھی یہ فرض ہے کہ تمہارے
خطروں میں حصے دار بنوں۔''

ہمارے درمیان چند منٹ تک بحث ہوئی۔ بہرحال میں اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ مجھے لگتا
تھا کہ میری خود اعتمادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور اب میں جو بات کرتا ہوں، اس پر
مستحکم رہنا میرے لیے زیادہ دشوار نہیں ہوتا۔ انور خاں نے مجھے کچھ مزید سوچنے کا مشورہ دیا۔

اسحاق نے ماریا کے پاؤں میں زنجیر ڈالی اور اسے سرنگ کے ایک نیم تاریک گوشے
میں اس طرح مقید کر دیا کہ وہ کوئی چالاکی، ہوشیاری نہ دکھا سکے۔ اس کے ہاتھ بدستور پشت
پر بندھے ہوئے تھے۔ انور خاں کا کہنا بھی یہی تھا کہ یہ بہت ہوشیار و شاطر لڑکی ہے۔ اس کی
طرف سے بہت چوکنا رہنے کی ضرورت ہوگی۔ ہم تھکے ہوئے تھے لیکن سونا نہیں چاہتے
تھے۔ ہم باتیں کرتے رہے۔ جب ہم دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے، دہانے کی طرف سے
قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ ہم چوکس ہو گئے۔ امکان یہی تھا کہ یہ کوئی اپنا بندہ ہی ہوگا۔ یہ
خیال درست نکلا۔ یہ چوہان تھا۔ اس کے ہاتھ میں دو تھیلے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا

ان میں خوراک تھی اور ضرورت کی دیگر اشیاء تھیں۔

ہم ایک دوسرے سے گلے ملے۔ فیروز کو دیکھ کر چوہان کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ وہ بولا۔ ''میں راستے میں دعا مانگتا آ رہا تھا کہ میں یہاں پہنچوں تو تم واپس آ چکے ہو۔ میری دعا قبول ہوئی ہے۔ وہاں نل پانی میں تمہاری بہت زیادہ ضرورت ہے لیکن تم لوگ چلے کہاں گئے تھے؟''

فیروز بولا۔ ''اس بارے میں بھی آپ کو سب کچھ بتاتے ہیں لیکن نل پانی میں میری کیا ضرورت پڑ گئی ہے؟''

ڈاکٹر چوہان نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹے سرکار اور حکم جی میں پوری طرح ٹھن گئی ہے۔ دونوں طرف سے بڑے سخت بیان آ رہے ہیں۔ پچھلی بار سلطانہ کو پناہ اس لیے نہیں مل سکی تھی کہ اس پر گارڈ ہارون کی موت کا الزام آ گیا تھا۔ اب یہ بات سامنے آ گئی ہے کہ ہارون کو خود حکم جی کے بندوں نے ہی قتل کیا تھا اور اس قتل کے اہم ترین گواہ تم ہو۔ تمہاری گواہی حکم جی اور ان کے ساتھیوں کے منہ بند کر کے رکھ دے گی۔''

''میں یہ گواہی ضرور دوں گا۔'' فیروز نے سینہ تان کر کہا۔ ''میں ابھی آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔''

''لیکن تم لوگ چلے کہاں گئے تھے؟'' ڈاکٹر چوہان نے ایک بار پھر اپنا پُرتجسس سوال دہرایا۔

فیروز نے مختصر الفاظ میں چوہان کو اپنی مہم جوئی سے آگاہ کیا اور بتایا کہ جارج گورا کس طرح اپنے انجام تک پہنچنے سے بال بال بچا ہے۔

○....❖....○

چوہان یہ جان کر ششدر ہوا کہ جارج کی عالی مرتبت بہن ماریا فرگوسن اس وقت یہاں اس سرنگ میں موجود ہے۔ اس کی حیرت میں اندیشوں کی آمیزش بھی تھی۔ وہ سنسنی آمیز لہجے میں بولا۔ ''یہ خبر ابھی کچھ دیر پہلے ہی نل پانی پہنچی ہے کہ زرگاں میں کچھ نامعلوم لوگوں نے جارج گورا کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کر لیا ہے۔ اس واقعے میں دو تین بندوں کی ہلاکت کے بارے میں بھی بتایا جا رہا ہے۔ بہت سے لوگ اسے سلطانہ والے واقعے کی کڑی ہی قرار دے رہے ہیں۔ اب تم نے یہ بتا کر حیران کر دیا ہے کہ یہ کارروائی تم لوگوں نے ہی کی ہے۔'' چوہان واقعی ہکا بکا تھا۔

چوہان، ماریا کو دیکھنا چاہ رہا تھا۔ اسحاق اور فیروز اسے لے کر ماریا کی طرف گئے۔ میں اور انور خاں بھی ان کے پیچھے گئے۔ ہم اس تاریک گوشے میں پہنچے جہاں اسحاق نے ماریا کو باندھا تھا۔ وہاں ایک شدید حیرت ہماری منتظر تھی۔ ماریا اپنی جگہ موجود نہیں تھی۔ ساڑھی کا وہ کپڑا جس سے ماریا کے ہاتھ باندھے گئے تھے، ایک طرف پڑا تھا۔ وہ زنجیر کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی جو اسحاق نے اس کی ٹانگ سے منسلک کی تھی۔ ''کہاں گئی وہ؟'' اسحاق نے ٹھٹک کر کہا۔

''اوہ خدایا......'' انور خاں بھی سرسراتی آواز میں بولا۔ ''میں نے کہا تھا نا، یہ بڑی تیز طرار عورت ہے۔''

''وہ یہیں کہیں ہوگی۔'' فیروز بولا۔ ''اگر وہ دہانے کی طرف جاتی تو ہماری نظروں میں ضرور آتی۔''

فیروز اور اسحاق بھاگ کر گئے اور اپنی رائفلیں اُٹھا لائے۔ میری رائفل پہلے ہی میرے پاس تھی۔ ہم نے ٹارچیں روشن کیں اور چاروں طرف پھیل گئے۔ اچانک تاریکی میں

سے فائر ہوا۔ دھماکے کے ساتھ ہی میں نے فیروز کو لڑکھڑاتے دیکھا۔ کوئی تاریکی میں سے نکل کر دہانے کی طرف بھاگا۔ میرے سینے میں چنگاریاں سی بکھر گئیں۔ یہ جارج کی بہن ماریا تھی۔

میں اس کے پیچھے لپکا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی بڑا ہتھیار نہیں۔ شاید پستول یا ماؤزر ہے۔ وہ پلٹ کر مجھ پر گولی چلا سکتی تھی لیکن میں ہر خطرے سے بے نیاز تھا۔ ابھی میں اس سے دس پندرہ قدم دور تھا کہ وہ حسبِ اندیشہ پلٹی۔ اس نے فائر کیا لیکن نشانہ چوک گیا۔ اسی دوران میں وہ کسی شے سے ٹکرا کر گری۔ میں نے اس پر چھلانگ لگائی اور اسے چھاپ لیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا جو ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ وہ پوری طرح میرے بوجھ کے نیچے دب گئی۔ انور خاں اور احمد وغیرہ بھی بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ان کے عقب میں ڈاکٹر چوہان تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑے سائز کی ٹارچ تھی۔

ماریا کو بے بس کر دیا گیا۔ وہ بُری طرح ہانپی ہوئی تھی اور ہمیں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہی تھی۔ ''یو باسٹرڈ! تم کو پتا نا ہیں کہ تم کیا کر رہا ہے؟ تم کو بہت بُرا نتیجہ بھگتنا پڑیں گا۔ تم لائف اور ڈیتھ کے درمیان لٹک جائے گا۔''

اسحاق نے اسے چند تھپڑ مارے تو اس کا ہیجان قدرے کم ہوا اور اس نے رونا شروع کر دیا۔ اس کے ایک پاؤں میں زنجیر بدستور موجود تھی اور جب وہ بھاگ رہی تھی تو وہ اس کے ساتھ ہی گھسٹ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بھاگتے ہوئے لنگڑا رہی تھی۔

اسحاق اور احمد اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے واپس مرکزی جگہ پر لائے۔ فیروز دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی بائیں ٹانگ ران سے دبا رکھی تھی۔ گولی ران میں لگی تھی اور خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اپنے دوست کی یہ حالت دیکھ کر اسحاق کا غصہ سوا ہو گیا۔ وہ گالیاں دیتا ہوا ماریا پر پل پڑا۔ اس نے اسے نیچے گرا دیا۔ اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ اس کا بالائی جسم بالکل عریاں ہو گیا۔ وہ چلا رہی تھی، اور ''ہیلپ...... ہیلپ'' پکار رہی تھی۔ اسحاق اپنی ہیجانی کیفیت میں شاید اسے بالکل ہی برہنہ کر ڈالتا لیکن میں اور ڈاکٹر چوہان آڑے آئے۔ میں نے اسحاق کو تقریباً گھسیٹ کر ماریا سے پیچھے ہٹایا۔ چوہان نے اسے جسم ڈھانپنے کے لیے چادر دی۔

میں نے کہا۔ ''اسحاق! اگر ہم بھی ایسا ہی کریں گے تو پھر ان میں اور ہم میں کیا فرق رہ جائے گا؟''

وہ غضبناک لہجے میں بولا۔ ''آنکھ کا بدلہ آنکھ، کان کا بدلہ کان ہے۔ یہ سفید ناگن کسی

رعایت کی حق دار نا ہیں ہے۔ اس کا سر یہیں کچل دینا چاہیے۔''

''دیکھو...... تم یہ بھول رہے ہو کہ ہم اس سے کیا فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، ہم اسے زندہ رکھ کر جارج کو کہیں زیادہ تکلیف دے سکتے ہیں۔''

میں نے اسحاق کو بمشکل سنبھالا۔ اس سلسلے میں انور خاں اور احمد نے بھی میری مدد کی۔ ہم اسحاق کو ماریا سے دور لے گئے۔ چوہان، زخمی فیروز کو دیکھنے میں مصروف تھا۔

اسحاق ذرا ٹھنڈا ہوا تو ہم ماریا کی طرف متوجہ ہوئے۔ سب سے پہلے اس کے لیے لباس کا انتظام کیا گیا۔ زنانہ لباس ملنا تو یہاں مشکل تھا، مجبوراً مردانہ لباس سے ہی کام چلایا گیا۔ پاجامے کُرتے پر مشتمل یہ لباس اس سامان میں موجود تھا جو چوہان اپنے ساتھ لایا تھا۔ ماریا چونکہ لمبی تڑنگی تھی، یہ لباس اس کے جسم پر پورا آ گیا۔ ہم نے بڑی احتیاط سے اس کے ہاتھ پاؤں دوبارہ باندھ دیئے۔

ہاتھ پاؤں تو پہلے بھی باندھے گئے تھے لیکن ماریا نے بڑی ہوشیاری دکھائی تھی۔ اس کے ہاتھ ساڑھی کے کپڑے سے باندھے گئے تھے۔ ماریا نے موم بتی کے شعلے سے اس کپڑے کو جلایا تھا اور ہاتھ آزاد کر لیے تھے۔ اس کوشش میں اس کی کلائیوں پر چند زخم بھی آئے تھے۔ بعدازاں اس نے پاؤں کی زنجیر ایک طرف سے کھول لی تھی۔ دراصل اس زنجیر کو لاک کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور اسے رسّی کی طرح دو گرہیں دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ گرہیں ماریا نے کھول لیں۔ چھوٹے سائز کا پستول حیرت انگیز طور پر ماریا کے پاس پہلے سے ہی موجود تھا۔ یہ لیڈی پستول اس کے لباس میں ہی چھپا ہوا تھا۔ جب ہم نے ماریا کو پکڑا تھا تو اس خیال سے اس کی تلاشی نہیں لی تھی کہ وہ منگنی میں ایک تقریب میں شرکت کے لیے آئی ہوئی تھی۔ وہاں اسلحے کا کیا کام تھا۔ ویسے بھی اس کے عورت ہونے کی وجہ سے ہم نے جامہ تلاشی لینا ضروری نہیں سمجھا تھا مگر اب پتا چل رہا تھا کہ یہ غلطی تھی۔ شکر کا مقام تھا کہ اسحاق نے راستے میں ماریا سے کسی طرح کی رعایت نہیں کی تھی اور اس کے ہاتھ پشت پر باندھے رکھے تھے، ورنہ کئی موقعے ایسے آئے تھے جب وہ بآسانی ہمیں اپنے اس ننھے منے لیکن طاقتور پسٹل سے شوٹ کر سکتی تھی۔

اب ہماری سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ یہ لڑکی ہماری توقع سے زیادہ خطرناک ہے۔ احمد نے زنجیر کے لیے ایک چھوٹے سے تالے کا انتظام کر لیا۔ اس کے علاوہ طے ہوا کہ ہم اس لڑکی کو ہر وقت اپنی نگاہوں کے سامنے رکھیں گے۔

چوہان نے بڑی مہارت سے ایک تیز دھار خنجر سے نشتر کا کام لیا۔ فیروز نے بھی بہت

برداشت اور حوصلے کا ثبوت دیا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر اس کی ران میں سے پسٹل کی گولی نکال لی گئی۔ کچھ اینٹی سیپٹک دوائیں چوہان کے چھوٹے سے بیگ میں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ ان کی مدد سے فیروز کی مرہم پٹی کر دی گئی۔

احمد نے کہا۔ ''فیروز بھائی! آپ کے بچنے سے دہری مسرت ہو رہی ہے۔ آپ بچ گئے اور آپ کی قیمتی گواہی بھی بچ گئی۔''

''اسی لیے کہتا ہوں کہ اس گواہی سے جتنی جلدی فائدہ اُٹھا سکتے ہو اُٹھا لو۔ اگر کوئی انتظام ہو جاوے تو میں ابھی چھوٹے سرکار کے پاس چلنے کو تیار ہوں۔''

''خیر...... اب ایسی جلدی بھی نہیں۔ رات ہو لینے دو۔ اندھیرا ہوتے ہی نکل چلیں گے۔'' چوہان نے کہا۔

''اور اگر اندھیرا ہونے سے پہلے میرے ساتھ کچھ اور ہو گیا تو؟'' فیروز نے کہا۔

''میں سمجھ رہا ہوں۔'' چوہان نے اثبات میں سر ہلا کر فیروز کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔ ''تمہیں اپنی جان کی نہیں اپنی گواہی کی فکر ہے۔ گھبراؤ مت۔ تمہاری جان اور گواہی دونوں اب سلامت رہیں گی۔''

''میں موہن کمار کو پھانسی کے تختے پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہارون کے قتل میں سب سے بڑا مجرم وہی بدذات ہے۔ اس نے بے رحمی کی انتہا کی ہے۔ ہارون، حکم جی کا وفادار تھا۔ ان کے لیے درجنوں بار اپنا جیون خطرے میں ڈال چکا تھا۔ اس کی قربانیوں کا موہن کمار کی طرف سے یہ صلہ ملا۔ جب وہ زخمی تھا، مرہم اور دوا کے لیے ترس رہا تھا اور اس کھوہ میں اپنے کسی ساتھی کا انتظار کر رہا تھا، موہن کمار نے اپنا رستہ سیدھا کرنے کے لیے اسے بے دردی سے قتل کر دیا اور یہ قاتل موہن کمار اب بھی حکم جی کی ناک کا بال ہے۔ اگر ہارون کے ساتھ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے تو حکم جی کے کسی وفادار کا جیون محفوظ نا ہیں ہے......'' فیروز بولتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے سینے میں جیسے آگ بھڑک رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اب اسے اپنی گواہی کی اہمیت کا احساس ہوا ہے اور وہ جلد از جلد یہ گواہی چھوٹے سرکار کے کانوں تک پہنچا دینا چاہتا ہے۔ میرا اپنا دل بھی یہی کہہ رہا تھا کہ اگر یہ اہم گواہی چھوٹے سرکار تک پہنچ گئی تو وہ ضرور اسے متاثر کرے گی۔ وہ ایک انصاف پسند شخص تھا اور یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ عدالت میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ اس کا بے لاگ رویہ مجھے یاد تھا۔

سرنگ کے ایک نیم تاریک گوشے میں اسحاق اور انور خاں میں کسی بات پر بحث ہو رہی تھی۔ گاہے بگاہے ان کی آواز قدرے بلند بھی ہو جاتی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس بحث میں

میرا نام بھی بار بار آ رہا ہے۔ کچھ دیر بعد فیروز اور چوہان بھی اس بحث میں شریک ہو گئے۔ اس خیال سے کہ الفاظ مجھ تک نہ پہنچیں، ان چاروں نے اپنی آوازوں کو دبا رکھا تھا۔ صرف اسحاق ہی تھا جو کسی وقت بھڑک کر بولتا تھا اور اس کے الفاظ مجھے سنائی دے جاتے تھے۔ اس نے فیروز کی کسی بات کے جواب میں تیز لہجے میں کہا تھا۔ ''ہم کو چاہیے کہ سچ کو سچ مان لیں اور اس کے ساتھ یہ بھی مان لیں کہ اس وجہ سے ہم سب خطرے میں ہیں۔''

جواب میں چوہان نے کچھ کہا۔ اسحاق کی بھڑکیلی آواز پھر سنائی دی۔ ''آپ پڑھے لکھے لوگ ہو۔ ظاہر ہے آپ نے پڑھے لکھوں والی بات ہی کرنی ہے مگر جو کچھ سامنے نظر آ رہا ہے اس کو ہم کیسے جھٹلا دیں گے اور اگر جھٹلا دیں گے تو اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی چلا دیں گے۔''

کچھ دیر تک یہ تکرار جاری رہی، اسی دوران میں عجیب الخلقت شخص اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی اکلوتی ٹانگ گھٹنے پر سے موڑ کر زنجیر میں باندھ دی گئی تھی اس لیے وہ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے سرنگ کی ناہموار دیوار سے ٹیک لگا لی اور سوئی ہوئی نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے انداز میں عجیب سی لاتعلقی اور ناراضی تھی۔ اس کے بازو پر انمٹ روشنائی سے لکھا ہوا نام ہمارے لیے اب بھی ناقابلِ فہم تھا۔ یہ باریدے یا بارودے پڑھا جاتا تھا۔ اس کے آگے انگریزی کا حرف جی یا پھر جے لکھا ہوا تھا۔

وہ انگریزی میں بولا۔ ''مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ مجھے میرے گھر سے کیوں نکالا ہے؟ مجھے واپس لے جاؤ۔ میں کہیں اور مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے واپس لے جاؤ۔''

چوہان بولا۔ ''ہم تمہیں کسی گھر سے نہیں لائے۔ کشتی میں سے لائے ہیں۔ تم اس بدبودار کشتی کو اپنا گھر کہہ رہے ہو؟''

''ہاں...... وہی میرا گھر ہے۔ مجھے وہاں لے جاؤ۔'' وہ کراہا پھر بُری طرح کھانسنے لگا۔ کھانستے کھانستے بولا۔ ''میرا گلا بالکل خشک ہو گیا ہے۔ مجھے تھوڑی سی شراب دو۔'' اس کی آواز گلے میں اٹک رہی تھی۔

چوہان نے احمد کو اشارہ کیا۔ وہ ایک گلاس میں پانی لے آیا۔ عجیب الخلقت شخص نے ایک گھونٹ بھرا پھر کلی کر دی اور گلاس ایک طرف پھینکتے ہوئے بولا۔ ''یہ کیا بدبودار چیز لے آئے ہو۔ مجھے شراب دو۔ میری سانس رُک رہی ہے۔ جلدی کرو۔''

مجھے یاد آیا کہ کشتی میں جہاں ہم نے اس شخص کو پایا تھا، وہیں پر ''رم'' کی بہت سی بوتلیں بکھری ہوئی تھیں۔ لگتا تھا کہ یہ شخص شراب خانہ خراب کا زبردست رسیا ہے۔ نشہ ٹوٹنے کے

سب اب اس کی بُری حالت ہو رہی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ یہاں شراب موجود نہیں تھی۔ یہاں پناہ لینے والے تقریباً سب ہی مسلمان تھے اور اس لت سے دور تھے۔ چند منٹ کے اندر ہی اس شخص کی بُری حالت ہو گئی۔ اس کا مدقوق جسم لرزنے لگا اور سانس جیسے اس کی ہڈیوں بھرے سینے میں اُلجھنے لگی۔ وہ بار بار بس ایک ہی بات کہہ رہا تھا۔ ”میں اپنے گھر واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں کہیں اور مرنا نہیں چاہتا۔“

چوہان کے متعدد بار پوچھنے کے بعد اس نے فقط اتنا بتایا کہ اس کا نام بارونڈا ہے اور وہ طویل عرصے سے اس مچھلیاں پکڑنے والی کشتی کے اندر رہ رہا ہے۔ اس رہائش کے لیے اور شراب، خوراک وغیرہ کے لیے اس نے ادھیڑ عمر ملاح سیوک رام کو معقول معاوضہ دیا ہوا ہے۔ وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ اس حرامی سیوک نے مجھ سے دھوکا کیا ہے۔ اس نے مجھے کشتی سے نکالنے کے لیے یہ سارا ڈھونگ رچایا ہے۔ تم سارے کرائے کے ٹٹو ہو۔ تم نے اس حرامی سیوک سے پیسے لیے ہیں۔“

اس کے منہ میں جو آ رہا تھا، وہ بول رہا تھا اور بار بار اُٹھنے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ کوشش اس کی بندھی ہوئی ٹانگ کی وجہ سے ناکام ہو جاتی تھی۔

وہ اپنی ”گھر بدری“ کے لیے ملاح سیوک رام کو موردِ الزام ٹھہرا رہا تھا۔ وہ جانتا نہیں تھا کہ سیوک رام تو خود گن پوائنٹ پر رہا ہے اور اسے اپنی تین کشتیوں سے ہاتھ دھونے پڑے ہیں۔ انور خاں ابھی تک اس بارونڈا نامی شخص کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ انور خاں انگریزی نہیں جانتا تھا۔ اس نے چوہان کے توسط سے بارونڈا سے چند سوال پوچھے تاہم ان سے بھی کوئی نتیجہ اخذ نہیں ہوا۔ انور خاں نے فیروز سے مخاطب ہو کر بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ”مجھے شک ہے کہ ڈیڑھ دو سال پہلے میں نے اس بندے کو زرگاں میں کہیں دیکھا ہے۔ شاید راج بھون میں ہی دیکھا ہے۔ کوئی خاص موقع تھا شاید۔ ہو سکتا ہے کہ ساتویں کے جشن کا ہی ہلا گلا ہو۔“

بارونڈا نامی اس شخص کا شور شرابا جب زیادہ بڑھ گیا تو ڈاکٹر چوہان نے سلطانہ کی طرح اسے بھی معقول مقدار میں افیون کھلا دی اور لمبا لیٹنے پر مجبور کر دیا۔ بارونڈا کو زبردستی افیون کی خوراک دینے کے لیے ڈاکٹر چوہان، اسحاق اور انور خاں کو کافی زور آزمائی کرنا پڑی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ شخص ننگی زمین پر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ زور آزمائی کی وجہ سے اس کا لنگوٹ عریانی کی حد تک کھسک گیا تھا۔ ڈاکٹر چوہان نے یہ لنگوٹ پوری طرح کھول کر دوبارہ سے اس کے مدقوق جسم پر باندھ دیا۔

بارونڈا والا یہ ہنگامہ ختم ہوا تو توجہ پھر اس بحث و مباحثے کی طرف چلی گئی جو کچھ دیر پہلے انور خاں اور اسحاق کی گفتگو سے شروع ہوئی تھی۔ چوہان کے چہرے پر گہری سنجیدگی نظر آ رہی تھی۔ وہ مجھے ایک طرف لے گیا۔ ہم سرنگ کی اسی حجرہ نما جگہ پر جا بیٹھے جہاں تین دن پہلے فیروز اور اس کے دونوں ساتھیوں نے جارج گورا کو جان سے مار دینے کا منصوبہ ترتیب دیا تھا۔ کسی بھی طرح کی اہم گفتگو کے لیے یہ بڑی محفوظ جگہ تھی۔ یہاں چھوٹی سی لالٹین روشن تھی اور زمین پر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ اس چٹائی پر میل کی ہلکی سی تہہ تھی۔

ہم آمنے سامنے بیٹھ گئے تو میں نے چوہان سے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ میرے بارے میں کوئی خاص بات چیت ہوئی ہے۔“

”کچھ ایسا ہی ہے۔“ چوہان نے کہا۔

”شاید اسحاق نے مجھ پر کچھ اعتراضات کیے ہیں۔“

چوہان نے میری سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ایک بات بتاؤ مہروز! میرا مطلب ہے تابش! اس بارے میں تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟ میری بات سمجھ رہے ہو نا تم؟ یہ جو حکم جی کے لوگ سائے کی طرح تمہارے پیچھے رہتے ہیں اور تم کسی بھی جگہ ان سے محفوظ نہیں ہو۔ اس کے پیچھے کیا وجہ ہے؟“

کچھ دیر پہلے ہونے والی بحث کے موضوع کے بارے میں میرا اندیشہ درست نکلا تھا۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر چوہان! کیا میں یہ سمجھوں کہ اب تمہارے ذہن میں بھی جادو ٹونے والی باتیں آنا شروع ہو گئی ہیں؟“

”نہیں تابش! میں چاہوں بھی تو انداز سے نہیں سوچ سکتا لیکن...... کچھ لوگ ایسا سوچ رہے ہیں اور اپنی جگہ شاید وہ بھی ٹھیک ہیں۔ اب تک جو کچھ ہوتا آیا ہے اس کی وجہ سے اچھے بھلے بندے کا ذہن چکرا سکتا ہے۔ پھر جن لوگوں کے ذہنوں نے ایسی باتوں کو پہلے سے قبول کر رکھا ہو، وہ تو اور زیادہ متاثر ہو سکتے ہیں۔ اب اس اسحاق ہی کو لو۔ یہ بندہ پہلے سے تعویذ گنڈے اور عملیات وغیرہ پر وشواس رکھتا ہے۔ اب جب یہ تمہارے بارے میں سوچتا ہے تو اس کے دل میں عجیب سے اندیشے پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک اندیشہ یہ بھی ہے کہ تمہاری وجہ سے ہم یہاں اس سرنگ میں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ حکم جی کے ہرکارے کسی بھی وقت تمہارا سراغ لگاتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں گے۔“

”میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ مجھے یہاں سے جانے دیں۔ آپ سب لوگوں نے مجھے زبردستی روکا تھا۔“

''ہم اب بھی تمہیں زبردستی روکیں گے۔ یہ بات دل سے نکال دو کہ میں تمہیں یہاں سے جانے دوں گا لیکن بات یہ ہے تابش کہ ہمیں حقیقت کی تہہ تک پہنچنا چاہیے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو تم؟''

چوہان خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کا ذہن جیسے کسی دور دراز کے سفر پر روانہ تھا۔ چھوٹی لالٹین کی مدھم روشنی اس حجرہ نما جگہ کو نیم روشن کر رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر فیروز اور احمد وغیرہ باتوں میں مصروف تھے۔ ان کی آواز اس شاخ در شاخ سرنگ میں ہولے ہولے گونجتی تھی۔ اس سرنگ سے باہر دھیرے دھیرے شام اُتر رہی تھی اور شام کی سیاہی میں سے تھوڑا تھوڑا حصہ سرنگ کو بھی ملنا شروع ہو گیا تھا۔

چوہان نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا تم دو منٹ کے لیے اپنی قمیص اُتارو گے؟''

''کیا دیکھنا چاہتے ہو؟''

''کچھ نہیں۔ تم قمیص تو اُتارو۔'' چوہان لالٹین کو میرے بالکل پاس لاتے ہوئے بولا۔

میں نے قمیص اُتار دی۔ وہ اپنا چہرہ میرے سینے کے بالکل نزدیک لے آیا اور بہت غور سے کچھ دیکھنے لگا۔ وہ میری جلد پر ہاتھ پھیر رہا تھا، بڑے دھیان سے وہاں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ پھر اس نے پنڈلیوں پر سے میرے پاجامے کو اونچا کیا اور گھٹنوں سے اوپر تک معائنہ شروع کر دیا۔

''کچھ مجھے بھی بتاؤ۔'' آخر میں نے زچ ہو کر کہا۔

وہ ذرا پیچھے ہٹ گیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بولا۔ ''تابش! مجھے کئی دنوں سے ایک شک ہے۔ حکم جی اور جارج جیسے لوگوں سے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ان لوگوں نے تمہارے جسم کے اندر کچھ چھپا دیا ہو۔ جس کی وجہ سے انہیں ہر جگہ تمہاری موجودگی کا پتا چل جاتا ہو۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''تمہیں پتا ہی ہو گا، جدید ٹیکنالوجی آج کل کیا کیا کرشمے دکھا رہی ہے۔ جنگلی اور سمندری حیات پر ریسرچ کرنے والے لوگ جانوروں کے جسم میں چھوٹی چھوٹی چپس رکھ دیتے ہیں۔ یہ چپس طاقتور سگنلز دیتی ہیں اور ان سگنلز کے ذریعے جانوروں کو گھنے جنگل اور گہرے سمندر میں بھی دوبارہ کھوج لیا جاتا ہے۔''

میرے پورے جسم میں سنسناہٹ کی لہریں دوڑ گئیں۔ چوہان نے ایک انوکھا نکتہ بیان

کیا تھا۔ میں نے اس سے پہلے اس انداز میں سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نے حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتے ہوئے سوچا۔ تو کیا واقعی میں اپنے جسم میں کوئی "Chip" لیے پھرتا ہوں جو حکم جی کے اہلکاروں کو میری لوکیشن کی خبر دیتی رہتی ہیں؟

چوہان بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ چپ چھوٹے سے آپریشن کے ذریعے جانور کے جسم میں رکھی جاتی ہے یا پھر اسے ایک ایسا کالر پہنا دیا جاتا ہے جس میں چپ موجود ہوتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ حکم جی اور جارج وغیرہ یہ طریقہ ان قیدیوں پر استعمال کرتے ہوں جنہیں وہ ہر صورت اس اسٹیٹ کی حدود میں رکھنا چاہتے ہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا تم؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں نے سنا ہے کہ ماریا کا شوہر سرجن ہے اور جارج کا گہرا دوست بھی ہے۔'' اپنے لہجے میں حیرت کی لہر خود مجھے بھی محسوس ہو رہی تھی۔

''ہاں...... میرا اپنا ذہن بھی اس رُخ پر سوچ رہا ہے۔'' چوہان نے فوراً کہا۔ ''یہ بات عین ممکن ہے کہ قیدیوں کے اندر چپ رکھی جاتی ہو اور یہ کام ماریا کا شوہر اسٹیل انجام دیتا ہو۔ میں نے اس سے پہلے بھی اندازہ لگایا ہے کہ یہ لوگ یہاں اسٹیٹ میں بڑی رازداری سے مختلف کاموں کے لیے جدید ٹیکنالوجی استعمال کرتے ہیں۔ یہ کام جارج اور اس کے دو چار ساتھیوں کے ذمے ہے لیکن مقامی لوگوں کو بیوقوف بنانے کے لیے اور ان کی توہم پرستی سے فائدہ اُٹھانے کے لیے ایسے کاموں کا سہرا حکم جی کے سر باندھ دیا جاتا ہے۔ مقامی لوگ چونکہ حکم جی کو روحانی پیشوا بھی مانتے ہیں اس لیے انہیں فوراً و شواس ہو جاتا ہے کہ فلاں کام حکم جی نے اپنی اندرونی شکتی کی مدد سے کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ قیدیوں والا معاملہ ہی دیکھ لو۔ یہاں کے سادہ لوح لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ان قیدیوں کو جادو کے ذریعے ''کیل'' دیا گیا ہے اور وہ یہاں سے نکل نہیں سکتے۔''

میں نے پہلی بار اپنے جسم کو تحقیقی نظروں سے دیکھا۔ اگر واقعی میرے اندر کوئی ''چپ'' وغیرہ رکھی گئی تھی تو پھر اس کا کوئی نشان ہونا چاہیے تھا اور اگر یہ چپ گہرائی میں نہیں تھی، بالائی جلد کے نیچے تھی تو پھر ٹٹولنے سے اسے محسوس بھی کیا جا سکتا تھا۔ میں چکر میں پڑ گیا۔

چوہان بولا۔ ''ایسا کرتے ہیں کہ میں تھوڑی دیر کے لیے باہر چلا جاتا ہوں۔ وہاں موڑ پر کھڑا ہو کر میں یہ دھیان رکھوں گا کہ کوئی اس طرف نہ آئے پائے۔ تم اپنے سارے کپڑے اُتار لو اور بڑے دھیان سے دیکھو کہ کہیں کوئی کٹ وغیرہ کا نشان تو نہیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ چوہان اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں نے خود کو بے لباس کیا اور جہاں جہاں تک میری نگاہ جاتی تھی، خوب اچھی طرح اپنی جلد کا جائزہ لیا۔ جسم کو ٹٹول کر اور دبا

کر بھی کسی چیز کی موجودگی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ جسم پر جو چند ایک زخم مندمل ہو چکے تھے۔ ان کے نیچے بھی کچھ چھپایا جا سکتا تھا لیکن ایسا ہوتا تو پھر ٹٹولنے اور دبانے سے کچھ نہ کچھ محسوس ہونا لازمی تھا۔

قریباً آدھے گھنٹے بعد چوہان واپس آ گیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کٹ کا نشان تو کہیں نہیں۔ نہ ہی کہیں کوئی اسٹیچنگ وغیرہ ہے۔''

میں نے پاجامہ پہن لیا تھا لیکن بالائی جسم ابھی تک عریاں تھا۔ وہ باریک بینی سے ایک بار پھر میری کمر اور کندھوں وغیرہ کا معائنہ کرنے لگا۔ یہ بات بالکل سامنے کی تھی کہ اگر چوہان کی تھیوری درست ہے اور میرے جسم میں واقعی کوئی چیز رکھی گئی ہے تو پھر جسم پر سرجری کا نشان ہونا چاہیے تھا۔ دو ڈھائی سال میں تو اس طرح کا نشان معدوم نہیں ہو سکتا۔

شام سے ذرا پہلے جب میں چٹائی پر لیٹا تھا اور اسی معاملے پر غور کر رہا تھا، اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ جسم میں ایک جگہ ایسی بھی ہوتی ہے جہاں سرجری کے نشان چھپ سکتے ہیں۔ اگر سر میں کسی جگہ کٹ لگایا جائے یا اسٹیچنگ کی جائے تو بعد ازاں بال اسے مکمل طور پر ڈھانپ لیتے ہیں۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی میں نے اپنے سر کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔

''کیا بات ہے، سر درد کر رہا ہے؟'' میرے قریب لیٹے چوہان نے پوچھا۔

''نہیں...... میں ایک شک نکالنا چاہتا ہوں۔ ذرا میرے ساتھ آؤ۔'' میں نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں پھر اسی حجرے کی طرف چل دیئے۔ عجیب الخلقت باروندا ایک طرف پڑا سو رہا تھا۔ ماریا سر گھٹنوں میں دیئے بیٹھی تھی۔ اس کے پاؤں زنجیر میں لپٹے ہوئے تھے۔ ہم قریب سے گزرے تو اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہم سنی اَن سنی کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ میں اپنے ساتھ ایک ٹارچ لے آیا تھا۔ حجرہ نما جگہ پر پہنچ کر میں نے ٹارچ چوہان کے ہاتھ میں تھمائی اور اس سے کہا کہ وہ میرے سر کا معائنہ کرے۔

چوہان نے ٹارچ کی تیز روشنی میں میرے سر کو دیکھنا شروع کیا۔ جب وہ گدی کی طرف آیا تو اس کی انگلیاں ایک دم ٹھٹک گئیں۔ گدی پر نیچے کی طرف جہاں سے سر کے بال شروع ہوتے ہیں، اسے کچھ نظر آیا تھا۔ ''اوہ گاڈ'' اس نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''یہاں کچھ ہے۔ ایک دو تین...... ہاں تین ٹانکے ہیں۔''

اس نے سر کے پیچھے اس نرم جگہ کو چند بار زور سے دبایا اور پھر لرزتے لہجے میں بولا۔

''میرا خیال ہے تابش! ہم نے ڈھونڈ لیا ہے۔ یہاں گوشت کے نیچے کچھ ہے۔ کیا تمہیں محسوس ہو رہا ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر گدی کے پُر گوشت حصے پر رکھا اور میری انگلیوں کی پوروں کو کچھ محسوس کرانے کی کوشش کی۔ میں فوری طور پر تو کوئی اندازہ نہیں لگا سکا لیکن اتنا احساس ضرور ہوا کہ یہاں کچھ ہے۔

ٹارچ کی روشنی میں چار پانچ منٹ کے بغور معائنے کے بعد چوہان نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''ہمارا اندازہ درست نکلا ہے تابش! یہاں کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ یہ چیز تھوڑی سی گہرائی میں پلانٹ کی گئی ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''چپ کیوں ہو گئے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اسے آسانی سے نکالا نہ جا سکے۔''

آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں اندیشے جھلک دکھلانے لگے۔ اس جھلک نے مجھے بھی متاثر کیا۔ واقعی اگر کوئی شے یہاں موجود تھی اور ہم اسے آسانی سے نکال بھی نہیں سکتے تھے تو پھر مسئلہ گمبھیر تھا۔

''اب کیا ہوگا؟'' میں نے کہا۔

''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔'' چوہان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ ''اگر یہ چیز یہاں تمہارے جسم کے اندر موجود ہے تو پھر ہم یہاں محفوظ نہیں ہیں۔ حکم جی کے اہلکار اس چپ کے سگنل پکڑ کر کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔''

ایک دم میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا، میں نے کہا۔ ''ایک بات غور کرنے کی ہے ڈاکٹر چوہان! میں اس سرنگ میں کئی راتیں گزار چکا ہوں اور اب تک کا یہ سارا وقت بخیریت ہی گزرا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس زمین دوز سرنگ میں میرا پتا چلانا مشکل ہو۔ میرا مطلب ہے کہ اگر میرے جسم میں واقعی کوئی چپ موجود ہے تو پھر زیر زمین اس کے سگنل کمزور بھی تو پڑ سکتے ہیں یا ویسے ہی ختم ہو سکتے ہیں۔''

چوہان کی آنکھیں چمک اُٹھیں، وہ بولا۔ ''تم نے پتے کی بات کی ہے۔ یہ جگہ جہاں ہم بیٹھے ہیں، زمین کی سطح سے کم از کم سو فٹ نیچے ہے اور شاید...... یہی وجہ ہے کہ یہاں تمہارا کھوج نہیں لگایا جا سکا۔''

اس نے ایک بار پھر ٹارچ پکڑی اور مزید توجہ کے ساتھ میری گردن کے پچھلے حصے کا معائنہ کرنے میں مصروف ہوگیا۔ تین چار منٹ کے بعد اس کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ننانوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ ہم معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے ہیں۔ یہاں تمہارے اندر کوئی سگنل دینے والا ڈیوائس رکھا گیا ہے اور یہ ایک چپ ہی ہے۔''

''کیا ہم کسی طرح اسے نکال سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہارا یہ سوال غور طلب ہے۔ چھوٹا موٹا آپریشن تو میں خود کر سکتا ہوں لیکن اگر یہ چیز زیادہ گہرائی میں ہے اور ریڑھ کی ہڈی کو چھو رہی ہے تو پھر مشکلات ہو سکتی ہیں۔''

''میرا تو خیال ہے کہ تم ابھی کوشش کرو۔'' میں نے کہا۔

''نہیں...... اتنی جلدی نہیں اور نہ ہی اتنی جلد کی ہمیں کوئی ضرورت ہے۔ یہ بات تو تقریباً کنفرم ہے کہ اس سرنگ میں تم محفوظ ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حکم جی کے گارڈز بہت پہلے یہاں ہلا بول چکے ہوتے۔''

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی فیروز بھی لنگڑاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔ اس نے کہا۔ ''اسحاق اب احمد اور انور بھائی کو بھی اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تابش کی وجہ سے ہم سب مشکل میں پڑ جائیں گے۔ وہ کہتا ہے اگر تابش کو چھوٹے سرکار نے نل پانی میں پناہ دے دی ہے تو پھر اسے فوراً وہاں چلے جانا چاہیے۔''

چوہان نے کہا۔ ''یہاں کچھ نئی باتیں سامنے آئی ہیں فیروز! اور یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی ہے کہ اس سرنگ میں ہم تابش کے ساتھ بھی بالکل محفوظ ہیں۔''

''آپ کیا کہنا چاہت ہیں؟'' فیروز نے پوچھا۔

جواب میں چوہان نے فیروز کو سب کچھ بتا دیا۔ میرے جسم کے اندر کسی چپ کے بارے میں جان کر فیروز ششدر رہ گیا۔ پہلے تو اسے اس بات پر یقین نہیں آیا لیکن جب ساری تفصیل اس کے سامنے آئی تو وہ ہماری باتوں کو اہمیت دینے پر آمادہ ہوگیا۔

وہ لرزاں آواز میں بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ وہ باقی قیدی بھی جن کے بارے میں کہا جاوت ہے کہ وہ حکم جی کے سحر کے اثر میں ہیں، دراصل اسی طرح سے جکڑے گئے ہیں۔''

''اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' چوہان نے کہا۔ ''ان قیدیوں میں سے کوئی اگر فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے تو سگنل پکڑنے والے آلے کے ذریعے اس کا پیچھا کیا جاتا

ہے اور وہ جہاں کہیں بھی ہو، دھر لیا جاتا ہے۔ تابش کے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ یہ جب بھی زرگاں کی حدوں سے نکلا ہے، فوراً اس کا پیچھا کیا گیا ہے اور یہ جہاں کہیں بھی گیا ہے اس کو گھیر لیا گیا ہے۔''

''ایک بات اور بھی سمجھ میں آ رہی ہے۔'' فیروز نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ ''کسی بھاگنے والے کو جب بھی پکڑا جاوت تھا، پکڑنے والے تیواری لال اور ڈیوڈ ہی ہووت تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کو اس کام کی خاص طور پر تربیت دی گئی ہو۔ ڈیوڈ تو جارج گورا کا قریبی ساتھی ہے اور بہت ہنرمند بھی سمجھا جاوت ہے۔''

''بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔'' چوہان نے تائید کی۔ ''عین ممکن ہے کہ ان لوگوں کے پاس سگنل ریسیو کرنے والا ڈیوائس اور انٹینا وغیرہ ہوتا ہو۔ اس کی مدد سے وہ کسی بھی جگہ پر اپنے شکار کو ڈھونڈ لیتے ہوں۔''

''لیکن کیا دوسرے لوگن ان باتوں پر وشواس کر لیویں گے؟ جیسے یہ اسحاق ہے۔ اس کو پورا پورا یقین ہے کہ حکم جی جادو ٹونے اور عملیات کا ماہر ہے۔ وہ ایسے کام کر سکتا ہے جو عام لوگن نا ہیں کر سکتے۔ اس کے دل میں عجیب طرح کا خوف بیٹھا ہوا ہے۔ مجھے نا ہیں لگتا کہ ہم آسانی سے اس خوف کو نکال سکیں گے۔''

''سچ کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ خود کو منوا لیتا ہے۔ اگر ہم کوشش کریں گے اور حکم جی کی سازشوں کے مناسب ثبوت دیں گے تو لوگ بھی حقیقت کو تسلیم کرنا شروع کر دیں گے۔'' چوہان نے وثوق سے کہا۔

ابھی ہماری گفتگو تھی کہ سرنگ کے دہانے کی طرف کھٹ پٹ سنائی دی۔ پھر گھنٹیاں سی بجنا شروع ہو گئیں۔ ہم نے اپنی رائفلیں سنبھالیں اور دہانے کی طرف لپکے۔ خطرے کا احساس میرے دل کو طوفانی رفتار سے دھڑکایا کرتا تھا لیکن آج کل ایسا نہیں ہو رہا تھا۔ آج کل اس طوفانی دھڑکن کے بجائے سنسنی کی ایک لہر سراپا میں دوڑتی تھی اور دل میں مرنے یا مار دینے کی اُمنگ پیدا ہوتی تھی۔ ہاں...... موسم بدل چکے تھے۔ حبس اور گھٹن کی ایک طویل رُت نے بالآخر دل و دماغ کو ایک آشوب سے آشنا کر دیا تھا۔

ہم قریباً دوڑتے ہوئے دہانے پر پہنچے۔ یہاں چند بکریاں نظر آئیں۔ وہ جیسے زبردستی اس قدرتی سرنگ میں گھس آئی تھیں۔ سانولے رنگ کا ایک ادھیڑ عمر چرواہا انہیں واپس لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ تیرہ چودہ سال کا ایک لڑکا بھی تھا۔ بکریوں کے گلے میں بندھی ہوئی پیتل کی گھنٹیوں کی آواز پوری سرنگ میں گونج رہی تھی۔

چرواہے کو دیکھ کر چوہان ٹھٹک گیا اور بولا۔ ''میں اسے جانتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ اتفاق سے یہاں نہیں آیا۔ یہ کوئی چکر ہے۔''

احمد دہانے کی نگرانی پر موجود تھا۔ وہ چرواہے سے اُلجھ رہا تھا۔ چوہان تیزی سے ان دونوں کے پاس پہنچا۔ ادھیڑ عمر چرواہے نے چوہان کو دیکھا۔ یوں لگا کہ وہ بھی اسے پہچانتا ہے لیکن اس نے کچھ ظاہر نہیں کیا۔ چوہان اور چرواہے میں چند جملوں کا تبادلہ ہوا۔ پھر وہ دونوں ایک گوشے میں چلے گئے۔ کم عمر لڑکا بکریوں کو سمیٹ کر دہانے کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔ شکل سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ چرواہے کا بیٹا ہے۔ دونوں کا لباس دھوتی، کُرتے اور پگڑی پر مشتمل تھا۔ چوہان اور چرواہے کے درمیان پانچ دس منٹ بات ہوئی پھر چوہان، چرواہے کو لے کر ہمارے پاس آ گیا۔ چرواہے نے اپنے کندھے سے ایک گٹھڑی سی لٹکا رکھی تھی۔

چوہان نے سنسنی آمیز لہجے میں چرواہے کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''اس کا نام نریندر سنگھ ہے۔ یہ دراصل چھوٹے سرکار کے مصاحب خاص مراد شاہ صاحب کی طرف سے ایک خاص پیغام لے کر آیا ہے۔'' پھر چوہان نے اس چرواہے نریندر سنگھ سے کہا کہ وہ اپنی زبان سے سب کچھ بتائے۔

نریندر سنگھ کا رنگ سانولا تھا۔ اس نے سرمہ لگا رکھا تھا۔ اس کی مہندی لگی داڑھی دھول مٹی سے اٹی ہوئی تھی۔ اس نے ایک ایسی مقامی زبان میں بولنا شروع کیا جس کے بہت کم الفاظ میری سمجھ میں آ رہے تھے۔ بہرحال فیروز، اسحاق اور انور خاں وغیرہ اس کی بات خوب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ اس گفتگو کے دوران میں انہوں نے مجھے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''مراد شاہ صاحب اور چھوٹے سرکار کو معلوم ہو چکا ہے کہ ہم جارج کی بہن ماریا کو اُٹھا کر یہاں سرنگ میں لے آئے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہمارا یہ فعل کافی سخت ہے اور ہم اس کی مذمت کرنے پر مجبور ہیں لیکن وقت اور موقع محل کے لحاظ سے یہ فعل ٹھیک بھی ہے کیونکہ ماریا کی وجہ سے کسی حد تک جارج وغیرہ کو لگام ڈالی جا سکتی ہے۔ چھوٹے سرکار اور مراد شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ ہم ماریا کو اپنے پاس رکھیں اور اس کے ذریعے جارج وغیرہ سے کچھ باتیں منوانے کی کوشش کریں۔ لیکن ہماری یہ کارروائی اس طرح ہونی چاہیے کہ یہ ہمارا اپنا ہی کام نظر آوے اور اس کا الزام نل پانی والوں پر بالکل دھرا نہ جا سکے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہام اس کام میں بے آسرا ہو دیں گے۔ ہمیں اندر خانے چھوٹے سرکار کی حمایت و ہمدردی حاصل رہے گی اور جس طرح ہو سکا، وہ ہماری مدد بھی کریں گے۔''

یہ بڑی غیر متوقع صورتِ حال تھی۔ بہرطور اس سے چھوٹے سرکار کی فہم و فہراست بھی سامنے آ رہی تھی۔ وہ اپنے بڑے بھائی سے کھلم کھلا ٹکر لیے بغیر اس کی ناانصافی و من مانی کا زور توڑنا چاہ رہا تھا۔

چوہان نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ چھوٹے سرکار حکم جی کی چالبازیوں کا مقابلہ حکمتِ عملی سے کرنا چاہ رہے ہیں اور اب بھی ان کی خواہش ہے کہ کھلم کھلا تصادم سے بچا جائے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ممکن ہے کہ کسی وقت انہیں ہمارے خلاف سخت رویہ اختیار کرنا پڑے لیکن اگر ایسا ہوا تو یہ صرف دکھاوے کے لیے ہوگا اور ہمیں اس سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''اس کا کیا مطلب ہے؟'' احمد نے پوچھا۔ ''کیا چھوٹے سرکار بھی ماریا کو چھڑوانے کے لیے ہم پر کسی طرح کا دباؤ ڈالیں گے؟''

''ہاں...... کوئی اس قسم کی صورتِ حال ہو بھی سکتی ہے۔'' چوہان نے کہا۔

چرواہے نریندر نے رازداری کے انداز میں دائیں بائیں دیکھا پھر اپنے کندھے سے لٹکی ہوئی گٹھڑی ہمارے سامنے رکھ دی۔ اس نے گٹھڑی کی گرہ کھولی۔ گٹھڑی کے اوپر جامن کے پتے، چوکر اور گڑ وغیرہ کی چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں تھیں۔ ان پوٹلیوں کے نیچے دو تین بڑی خاص چیزیں تھیں۔ ایک فوجی طرز کی طاقتور دوربین تھی۔ ایک اسنائپر گن تھی جس کو کھول کر تین چار ٹکروں میں رکھا گیا تھا۔ اس پر بھی چھوٹی ٹیلی اسکوپ لگی ہوئی تھی۔ ایک چھوٹا سا لکڑی کا بکس تھا۔ اس میں مرہم پٹی کا سامان تھا۔ کچھ ایلوپیتھک اور دیسی دوائیں بھی بکس میں موجود تھیں۔

نریندر سنگھ نے مقامی زبان میں چوہان سے کچھ کہا۔ چوہان نے اس کا ترجمہ کرتے ہوئے مجھے بتایا۔ ''نریندر بتا رہا ہے کہ چھوٹے سرکار اور مراد شاہ صاحب یہ چاہتے ہیں کہ ہم اب ماریا کے اغوا کو راز میں نہ رکھیں اور اس کی ذمے داری قبول کر لیں۔''

''اس کی وجہ؟'' میں نے پوچھا۔

''وجہ وہی ہے جو ہمارے ذہن میں بھی آئی تھی۔ زرگاں میں حکم جی نے سلطانہ کے والد اور بیمار بھائی کو پکڑ لیا ہے۔ وہ اس وقت جارج کی جیل میں ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی زرگاں کے مختلف علاقوں سے پچاس ساٹھ لوگ پکڑے گئے ہیں۔ ان پر جارج کے گھر کے سامنے مظاہرہ کرنے، گولی چلانے اور توڑ پھوڑ مچانے کا الزام ہے۔ یہ سب کے سب مسلمان ہیں۔ ان میں انور خاں کے تین چار رشتے دار بھی شامل ہیں۔ اگر ہم ان سب لوگوں کی جان بچانا چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ ایک ہی ہے۔ ہم اعلان کر دیں

کہ ماریا ہمارے پاس ہے اور اس کی زندگی تب ہی محفوظ رہ سکتی ہے جب حراست میں لیے گئے لوگوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ ہمیں حکم جی تک یہ پیغام پہنچانا ہوگا کہ لڑکی ہمارے پاس ہے اور اس کا کوئی ثبوت بھی دینا ہوگا؟“ احمد نے کہا۔

”بالکل...... اب یہ ضروری ہو گیا ہے۔“ انور خاں نے گفتگو میں حصہ لیا۔

”پیغام کس طرح پہنچایا جائے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کے لیے کوئی بندہ ڈھونڈنا ہوگا جو پیغام رسانی کر سکے اور اس کی جان کو بھی کوئی خطرہ نہ ہو۔“ انور خاں نے کہا۔

”کیا ہم اپنے اس ٹھکانے کو اب بھی خفیہ رکھیں گے؟“ اسحاق نے پوچھا۔

”ہمیں ایسا کرنا تو چاہیے لیکن میرے خیال میں اب ہم کر نہیں سکیں گے۔“ چوہان بولا۔ ”جب پیغام رسانی شروع ہوگی تو پھر اس ٹھکانے کو چھپایا نہیں جا سکے گا۔ ویسے بھی چھوٹے سرکار اور مراد صاحب کی طرف سے اطلاع ہے کہ حکم جی کے کارندے اس سرنگ کے آس پاس پہنچ چکے ہیں اور چپے چپے پر ہماری تلاش ہو رہی ہے۔ وہ لوگ کسی بھی وقت سرنگ کا کھوج لگا سکتے ہیں۔“

نریندر سنگھ اب جلدی جانے کی فکر میں تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک بارشی جھیل ڈوبل کے کنارے پر رہتا ہے اور اسی علاقے میں بھیڑ بکریاں چراتا ہے۔ اس نے کہا کہ اسے جیسے جیسے موقع ملے گا، وہ چھوٹے سرکار کا پیغام ان تک پہنچانے کی کوشش کرے گا۔

وہ کافی تناؤ بھری اور پُرجوش رات تھی۔ ماریا کی صورت میں ہمارے پاس ایک ایسا ٹرپ کا پتا آیا تھا جس سے ہم حکم جی جیسے شخص کے پسینے چھڑا سکتے تھے۔ چھوٹے سرکار اور مراد صاحب نے برملا ہمیں یقین دلایا تھا کہ زرگاں والے ماریا کی جان کا خطرہ کسی بھی صورت مول نہیں لیں گے۔ اب اسحاق کو بھی احساس ہو رہا تھا کہ اگر وہ ماریا کو مار ڈالتا تو یہ کتنا بڑا نقصان ہوتا۔ آدھی شب کے وقت لالٹینوں کی مدھم روشنی میں ہم ساتوں کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ اس میں آئندہ کا لائحہ عمل تیار کیا گیا۔ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ حکم جی تک یہ پیغام کس طرح پہنچایا جائے کہ ماریا ہمارے پاس ہے اور اس کے بدلے میں ہمارے مطالبے یہ ہیں۔ احمد نے اس سلسلے میں اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ کام میں کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ حکم جی اور جارج مجھے کوئی نقصان نا ہیں پہنچائیں گے

میرے پیچھے میری برادری کا ہاتھ ہے اور سب جانت ہیں کہ حکم جی کے سپاہیوں میں میری برادری کے لوگن خاص عہدوں پر ہیں۔“

”لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس پیغام رسانی کے لیے کوئی غیر جانبدار بندہ استعمال کیا جائے اور تم غیر جانبدار نہیں ہو۔“ چوہان نے کہا۔

”اس جنگل میں آپ کو ایسا غیر جانبدار کون ملے گا جو اچھی طرح سے ہمارا پیغام بھی پہنچا سکے؟“

اس سے پہلے کہ احمد اور چوہان میں تکرار شروع ہو جاتی، انور خاں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”پیغامبر چننے سے زیادہ ضروری یہ بات ہے کہ پہلے ہم اپنا مورچا مضبوط کر لیں۔ ہمارے پاس اتنا انتظام ہونا چاہیے کہ ہم اس لڑکی کے ساتھ آٹھ دس یا پندرہ بیس روز بھی اس سرنگ میں گزار سکیں۔“

”ہمارے پاس پانی اور خشک لکڑیوں کی کمی ہے۔ باقی چیزیں تو گزارے مافق موجود ہیں۔“ چوہان نے بتایا۔

”ٹھیک ہے۔ پانی اور لکڑی کا انتظام کیا جائے اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ ہم دہانے کا اچھی طرح جائزہ لیں اور اس جگہ کو ایک اچھے مورچے کی شکل دے دیں۔“ انور خاں نے کہا۔

کسی کو انور خاں کی بات سے اختلاف نہیں تھا۔ اگلے دو تین گھنٹے اسی انتظام و انصرام میں گزارے گئے۔ کچھ برتنوں اور چند بڑے شاپرز میں کچھ پانی جمع کیا گیا۔ اس کے علاوہ سرنگ کے دہانے پر اندر کی طرف لکڑی کے چند بڑے تنے رکھ کر ایک محفوظ آڑ بنائی گئی۔ اس آڑ میں کم از کم تین رائفل بردار پوزیشن لے سکتے تھے۔ یہاں سے نشیب میں بھی کافی آگے تک نگاہ رکھی جا سکتی تھی۔ اس سے پیچھے قریباً پچاس قدم کے فاصلے پر ایک اور مورچا بنایا گیا۔ ہنگامی حالت میں اسے دوسری دفاعی لائن کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ دوربین کے بہتر استعمال کے لیے دہانے سے باہر ایک آڑ تلاش کر لی گئی۔ اس مورچا بندی میں انور خاں نے اہم کردار ادا کیا۔ لڑائی بھڑائی کے معاملات میں اس کا تجربہ کافی وسیع لگتا تھا۔

رات آخری پہر ہم نے کچھ دیر کے لیے آرام کیا۔ ہم اپنے ساز و سامان سمیت اب دہانے کے قریب ہی قیام پذیر ہو گئے تھے۔ میں چوہان اور اسحاق سرنگ کی گہرائی میں تھے۔ میرے گہرائی میں رہنے کی وجہ وہی چپ والا معاملہ تھا۔ میری آنکھ ایک شور کی وجہ سے کھلی۔ یہ شور دہانے کی طرف سے سنائی دے رہا۔ گھوڑوں کی ٹاپیں تھیں اور گھڑسواروں کی بلند

آوازیں تھیں۔ لگتا تھا کہ وہ دہانے سے باہر چاروں طرف چکرا رہے ہیں۔ انور خاں دہانے کی طرف سے بھاگتا ہوا ہماری طرف آیا۔ اس نے آتے ساتھ ہی لالٹین بجھا دی اور ہیجانی لہجے میں بولا۔ ''یہ حکم جی کے لوگ ہی ہیں۔ میں نے آوازوں سے پہچان لیا ہے۔ ان کی تعداد چالیس پچاس سے کم نہیں ہے۔ یہ سب مسلح ہیں اور ان کے پاس بڑی ٹارچیں ہیں۔ نریندر سنگھ نے ٹھیک ہی کہا تھا، یہ لوگ جنگل کا چپا چپا چھان رہے ہیں۔''

اسحاق بھڑک کر بولا۔ ''میں نے جو بات کہی تھی وہ آپ لوگن کی سمجھ میں ناہیں آئی تھی۔ اب آپ نے دیکھ لیا نا کہ یہ لوگن یہاں پہنچ گئے ہیں۔''

''تم نے غلط کہا تھا اسحاق! اور تم اب بھی غلط کہہ رہے ہو۔'' چوہان نے پُر زور لہجے میں کہا۔ ''ان لوگوں کے یہاں پہنچنے کا تابش سے کوئی تعلق نہیں۔ خود کو خوامخواہ واہموں کا شکار نہ کرو۔ حکم جی کے کارندوں کی ٹولیاں ہر جگہ بھٹک رہی ہیں اس لیے یہاں بھی پہنچ گئی ہیں۔''

اسحاق نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر منہ بنا کر رہ گیا۔

دس پندرہ منٹ اسی طرح شدید تناؤ میں گزر گئے۔ حکم جی کے کارندے اس سرنگ کے دہانے تک نہیں پہنچ سکے لیکن وہ یہاں سے گئے بھی نہیں۔ وہ اس علاقے کے بارے میں اپنی پوری تسلی کر رہے تھے۔ آخر گھوڑوں کی بکھری بکھری ٹاپیں اور گھڑ سواروں کی آوازیں ایک جگہ جمع ہوئیں۔ آثار سے اندازہ ہوا کہ وہ لوگ اب آگے روانہ ہو رہے ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد وہ وہاں سے چل پڑے۔ گھوڑوں کی ٹاپیں دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگیں۔ چوہان نے سوالیہ نظروں انداز میں اسحاق کی طرف دیکھا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں اس سے پوچھ رہا ہو۔ اب کیا خیال ہے؟ حکم جی کے جادو کا زور ان گھڑ سواروں کو سرنگ کے اندر کیوں نہیں لایا؟

ظاہر ہے کہ اگر چوہان یہ سوال پوچھتا بھی تو اسحاق کے پاس اس کا جواب موجود نہیں تھا۔ انور خاں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''اب ہم کو فیصلہ کرنا ہے۔ ہم ان کو اپنے بارے میں بتانا چاہتے ہیں یا نہیں؟''

سب خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ یہ نازک فیصلہ تھا۔ خود کو عافیت سے نکال کر شدید خطرے میں ڈالنے والی بات تھی لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ بلکہ ہم اس حوالے سے پیغامبر بھیجنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ جب تک ہم اپنے پاس ماریا کی موجودگی کا اعلان نہ کرتے حکم جی اور جارج سے کوئی مطالبہ کیسے منوا سکتے تھے؟ انور خاں بولا۔ ''لگتا ہے کہ تم سب کے لیے یہ فیصلہ کافی مشکل ثابت ہو رہا ہے۔ چلو اگر تم چاہتے ہو تو سب

کی طرف سے میں ہی فیصلہ کیے دیتا ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی انور خاں نے اپنی رائفل کا رُخ دور دہانے کی طرف کیا اور اوپر تلے تین چار فائر کر دیے۔ رات کے سناٹے میں دھماکوں کی آواز جنگل میں دور تک گونجی۔ اس بات میں شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی کہ یہ آواز گھڑ سواروں کے جتھے تک بھی پہنچی ہو گی۔

''چلو......اب اپنی اپنی پوزیشن سنبھالو۔'' انور خاں نے پکار کر کہا۔

ہم سب دہانے کی طرف دوڑے اور اپنی اپنی طے شدہ جگہ پر بیٹھ گئے۔ فیروز چونکہ زخمی تھا اس لیے وہ اپنی رائفل کے ساتھ ماریا اور باروندا کے قریب موجود رہا۔ ماریا کے ہاتھ پاؤں بدستور بندھے ہوئے تھے اور وہ کسی شکار کیے ہوئے پرندے کی طرح کچی زمین پر پڑی تھی۔ پچھلے بیالیس گھنٹوں میں وہ اپنی تمام شان و شوکت، نفاست اور نخوت سمیت عرش سے فرش پر آ گئی تھی۔ اس کے دمکتے چہرے پر کیچڑ سوکھ کر سفیدی مائل ہو چکا تھا اور اس کے نازک پاؤں زخم زخم تھے۔ وہ یہ پاؤں ہلاتی بھی تھی تو سسک اُٹھتی تھی۔ احمد نے اس کے نیچے چٹائی بچھانا چاہی تھی مگر اسحاق نے سختی سے منع کر دیا تھا۔ وہ جارج کی اس خودسر بہن کو تھوڑی سی رعایت یا عزت دینے کو بھی تیار نہیں تھا۔

ہم دہانے پر پہنچے اور رائفلیں سونت کر تیار ہو گئے۔ ہمارے اندازے کے عین مطابق گھڑ سوار رُک گئے تھے اور اب واپس آ رہے تھے۔ جلد ہی ان کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور ان کی اپنی آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچنے لگیں۔ ''کون ہے یہاں......کون ہے؟'' ایک کڑک دار آواز گونجی۔

مجھے پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی۔ یہ موہن کمار ہی کی آواز تھی۔ وہ لوگ سرنگ کے اردگرد گھوم رہے تھے لیکن ابھی تک دہانہ ڈھونڈنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ انور خاں نے دلیرانہ قدم اُٹھاتے ہوئے اپنی ٹارچ روشن کی اور اس کی روشنی دہانے کی طرف پھینکی۔ اب موہن کمار اور اس کے گھڑ سواروں کے لیے دہانے کا کھوج لگانا مشکل نہیں رہا۔ وہ چاروں طرف سے سمٹ کر یوں دہانے کی طرف آئے جیسے مقناطیس کی طرف لوہا چون آتا ہے۔ اَن گنت ٹارچیں سرنگ کے دہانے کے گرد چمکنے لگیں۔

موہن کمار گرجا۔ ''کون ہو تم لوگ؟''

انور خاں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''کہنے کو تو ہم تمہارے باپ ہوتے ہیں لیکن لوگ ہمیں شہنشاہ کہتے ہیں۔''

تاریکی میں سے موہن کمار کی آواز اُبھری۔ ''اگر میں غلطی ناہیں کر رہا تو تم انور خاں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



ہو۔ میں یہاں اس کھوہ میں تمہاری آواز سن کر حیران ہوں۔"

"ابھی تمہیں اور حیران ہونا ہے موہن کمار! اتنی حیرت داخل ہونے والی ہے تمہارے دماغ کے اندر کہ تمہاری حیرت دانی ایک دم چوڑی ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ پھٹ بھی جائے۔" انور خاں ہر قسم کے تناؤ سے بالکل آزاد نظر آتا تھا۔ وہ دہانے پر اندر کی طرف لکڑی کے تنوں کے عقب میں کھڑا تھا جبکہ موہن کمار دہانے کے سامنے بیس تیس میٹر کی دوری پر تھا۔

"تم سامنے آؤ انور خاں اور مجھے بتاؤ کہ تمہارے ساتھ اور کون کون ہے؟"

"میرے ساتھ بڑے خاص لوگ ہیں موہن کمار! وہ سامنے آئیں گے تو تمہاری سٹی گم ہو جائے گی۔"

"پہیلیاں نہ بجھواؤ انور خاں! تم جانت ناہیں ہو کہ تم لوگن کے لیے حالات کتنے سنگین ہو چکے ہیں۔ تم نے غداری کی ہے، جس تھالی میں کھایا ہے اسی میں چھید کیا ہے۔ وہاں زرگاں میں جارج صاحب کی کوٹھی پر جو کچھ ہوا ہے، اس کے سب سے بڑے ذمے دار تم ہو۔ لیکن...... لیکن اگر تم خود کو قانون کے حوالے کر دو تو اب بھی تم سے رعایت ہو سکت ہے۔ حکم جی اب بھی تمہارے ساتھ نرمی کا معاملہ کر سکت ہے۔"

"نرمی کا معاملہ تو تمہارے حکم کو کرنا ہی پڑے گا اور رعایتیں بھی دینی پڑیں گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب تمہارے حکم جی اور جارج گورا کے ٹیٹوے ہمارے ہاتھوں میں ہیں۔ زیادہ زور لگائیں گے تو ان کی گردنیں کڑک ہو جائیں گی۔"

"تم کیا بک رہے ہو؟ ہوش میں تو ہو؟" موہن کمار نے پوچھا۔

انور خاں انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ "تمہارے گورا صاحب کی بہن ماریا اس وقت ہمارے قبضے میں ہے۔ اس کا جیون بس اسی صورت میں محفوظ رہے گا جب گورا اور حکم ہمارے حکم کے مطابق چلیں گے اور یہ خالی خولی دھمکی نہیں ہے موہن کمار! ہم ماریا کو مارنے کے لیے اتنے ہی تیار ہیں جتنے تم اپنی اگلی سانس لینے کے لیے تیار ہو اور میں تمہیں بتا دوں، اس سلسلے میں ہمیں آزمانے کی کوشش نہ کرنا۔ ماریا کی لاش کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا کچھ بھی نہیں۔"

آخری الفاظ کہتے کہتے انور خاں کی آواز میں عجیب درندگی در آئی۔ دہانے سے باہر ایک دم سناٹا چھا گیا۔ تاریکی میں ٹارچوں کی روشنیاں تو چمکتی رہیں لیکن کہیں کوئی حرکت نظر آئی اور نہ آواز سنائی دی۔

"کیا ہوا موہن کمار! سکتے میں چلے گئے ہو یا دل کا دورہ پڑ گیا ہے؟"

موہن کمار کی لرزاں آواز اُبھری۔ "تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ ماریا صاحبہ

تمہارے پاس ہیں؟"

"کیا ثبوت چاہتے ہو؟ اس کا ہاتھ کاٹ کر بھیجوں، ناک کاٹوں یا کچھ اور؟"

"تم...... تم اپنے لہجے کو بدلو انور خاں۔" موہن کمار نے شپٹائے ہوئے انداز میں کہا۔

"اب لہجے نہیں بدل سکتے موہن کمار! اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ اب حکم جی سے اور اس کے پالتو کتوں سے ہماری کھلی جنگ ہے۔"

ایک بار پھر دہانے سے باہر سناٹا چھا گیا۔ اسحاق آگے آیا اور گرجا۔ "موہن کمار! جا کر اپنے آقا کو بتا دے کہ اس کے پاپوں کا گھڑا ابھر چکا ہے۔ اب یہ گھڑا بیچ چوراہے پر ٹوٹے گا اور سارا سنسار دیکھے گا۔ اب اسے اور اس کے ٹولے کو بھاگنے کے لیے راستہ ناہیں ملے گا۔ ہم انہیں چن چن کر ماریں گے اور اس راجواڑے کو ان کے گندے وجود سے پاک کر دیں گے۔"

"لگتا ہے کہ تم سب نشے میں ہو اور اسی نشے کی حالت میں مارے جاؤ گے۔"

"ہم ہوش میں ہیں اور اب تم لوگوں کے ہوش میں آنے کا وقت ہے۔" انور خاں گرجا۔ "جو کچھ تم نے سلطانہ کے ساتھ کیا ہے، وہ ہم بھی جارج گورے کی بہن کے ساتھ کر سکتے تھے اور ایک بار نہیں بیسیوں بار کر سکتے تھے لیکن وہ بچی ہوئی ہے۔ ہاں...... اس کی جان شدید خطرے میں ہے اور یہ خطرہ تب ہی ٹل سکتا ہے جب حکم اور جارج غیر مشروط طور پر ہماری کچھ باتیں مانیں گے۔"

"تم بکواس کر رہے ہو۔ کہاں ہیں ماریا صاحبہ؟" موہن کی آواز تاریکی میں اُبھری۔

انور خاں نے اسحاق کو اشارہ کیا۔ وہ بپھرا ہوا گیا اور ماریا کو گھسیٹ کر دہانے کے قریب لے آیا۔ دہانے کے بالکل پاس پہنچ کر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ایک خم دار خنجر کی تیز نوک اچانک ماریا کے بازو میں اُتار دی۔ اس کے عریاں بازو میں خنجر کا انجکشن کارگر رہا۔ وہ بُری طرح چلائی اور 'ہیلپ...... ہیلپ' پکارنے لگی۔ اس کی یہ آوازیں یقیناً باہر کھڑے گھڑ سواروں تک بھی پہنچیں۔

انور خاں نے پکار کر کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اپنی میم صاحبہ کے پُرجوش نعرے تم نے اچھی طرح سن لیے ہوں گے۔ وہ یہاں بہت خوش ہیں اور اس طرح کے نعرے اکثر لگاتی رہتی ہیں، اگر تم چاہو تو اس طرح کے مزید نعرے بازی بھی تمہیں سنائی جا سکتی ہے۔"

چند لمحے تک گہرا سناٹا رہا پھر موہن کمار کے کسی ساتھی کی نہایت بوجھل آواز سنائی دی۔

"اگر یہ واقعی ماریا صاحبہ ہیں تو تم لوگن جانت ناہیں ہو کہ اپنے لیے کتنی بڑی مصیبت کو دعوت

دے چکے ہو۔ تم لوگن کی بدنصیبی پر ترس آ رہا ہے۔''

''یہ واقعی تمہاری میم صاحبہ ہی ہے۔'' انور خاں نے تاؤ دلانے والے لہجے میں کہا۔ ''اور عنقریب ہم اسے زمین پر بکری کی طرح لٹا کر کند چھری سے ذبح کرنے والے ہیں۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس سے پہلے تم ایک دفعہ اپنے والد صاحبان یعنی حکم جی اور جارج سے بات کر لو۔''

اسحاق نے ایک اور چرکہ ماریا کے بازو پر لگایا۔ وہ پھر دردناک انداز میں چلائی۔

''پلیز ہیلپ...... پلیز...... یہ مجھے مار ڈالیں گے۔''

یہی وقت تھا جب دو افراد اپنی میم صاحبہ کے لیے بیتاب ہو کر دہانے کی طرف بڑھے۔ انور خاں نے بے دریغ برسٹ چلایا۔ ان دونوں افراد کے قدموں کے آس پاس چنگاریاں بکھر گئیں۔ وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹے۔ انور خاں بے رحم لہجے میں دھاڑا۔ ''کسی دھوکے میں نہ رہنا موہن! ہم مرنے اور مارنے کے لیے بالکل تیار ہیں۔ اگر کوئی حماقت فرماؤ گے تو کل شام تلک تمہاری چتا کے پھول تیار ہو چکے ہوں گے۔''

''کک...... کیا چاہتے ہو تم؟'' موہن کمار کی مری مری آواز سنائی دی۔

''چاہتے تو بہت کچھ ہیں اور انسان کی چاہتیں کبھی پوری نہیں ہوتیں، لیکن فی الحال ہماری دو چار معصوم معصوم سی خواہشیں تمہارے حکم جی اور اس کے لعنتی چمچے جارج کو پوری کرنی ہوں گی۔''

''تم نے جو کچھ کہنا ہے سامنے آ کر کہو۔'' موہن کمار کا نامعلوم ساتھی غصیلی آواز میں بولا۔

''سامنے بھی آ جائیں گے۔ فی الحال ہمارے سروں پر خون سوار ہے۔ ہمارے متھے نہ ہی لگو تو اچھا ہے۔ اچھے بچوں کی طرح جو کہتے ہیں، وہ سنو اور اپنے دونوں والد صاحبان کو جا کر بتاؤ۔''

''جو بکواس کرنا چاہتے ہو جلدی کرو۔'' موہن کمار نے کہا۔

''ہم تمہیں صرف دو دن دیتے ہیں۔ سلطانہ کے والد اور بھائی کو پوری حفاظت کے ساتھ تل پانی پہنچا دو۔ ہمارے پاس پچاس ناموں کی ایک فہرست ہے۔ ان لوگوں میں سے زیادہ تر جارج گورا کی جیل میں ہیں۔ ان کو فوراً رہا کر کے یہاں ہمارے پاس پہنچایا جائے۔ زرگاں کے راج بھون میں ہونے والی ساری شرمناک رسمیں، خاص طور سے جشن بہار اور ساتویں کا جشن ختم کرنے کا فی الفور اعلان کیا جائے۔ جارج گورا کو فوری طور پر جیلر کے

عہدے سے ہٹایا جائے۔''

''مجھے پھر شک ہو رہا ہے کہ تم نشے میں ہو۔ تم اپنی اوقات میں رہ کر بات نہیں کر رہے ہو۔'' ایک بار پھر موہن کمار کی آواز اُبھری۔

''اپنی اپنی اوقات کا پتا ہم سب کو بہت جلد چلنے والا ہے۔ فی الحال تم بی بے بچے بنو اور جو کچھ تمہیں کہا گیا ہے اپنے بزرگ تک پہنچاؤ۔ بڑوں کے معاملے میں چھوٹے بچے بولیں تو ان کو مرغا بنا دیا جاتا ہے۔''

''ناموں کی فہرست کہاں ہے؟'' موہن کمار نے پوچھا۔

انور خاں نے فہرست نکال کر ہماری طرف دیکھا۔ ''کون جائے گا؟'' اس نے پوچھا۔

''میں جاؤں گا۔'' سب سے پہلے میں نے جواب دیا۔

اسحاق اور چوہان نے مجھے روکنا چاہا لیکن میں اپنا حوصلہ آزمانے پر تلا ہوا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے مجھے کوئی نیا نیا اختیار ملا ہے اور میں اس اختیار کو عمل میں لا کر اپنی بے جگری کو پرکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے انور خاں کے ہاتھوں سے ناموں والی فہرست لی اور سرنگ کے دہانے سے باہر نکل آیا۔ ایک عجب سنسنی کا احساس ہوا۔ میں جانتا تھا کہ میری طرف درجنوں رائفلیں اُٹھی ہوئی ہیں، بہت سی خونخوار نگاہیں مجھ پر مرکوز ہیں اور میرے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔ اس ہو سکنے اور نہ ہو سکنے کے درمیان کی کیفیت بڑی مزیدار تھی۔ میری نگاہوں میں عمران کا چہرہ گھومنے لگا۔ وہ بھی جب کوئی پُرخطر کام کرتا تھا، اس کے چہرے پر بھی ایسی ہی لذت آمیز کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ میں سینہ تان کر آگے بڑھا۔ رائفل میرے کندھے سے جھول رہی تھی۔ تاریکی میں سے ایک سایہ نکل کر میرے رُوبرو آیا۔ اپنے ڈیل ڈول اور شکل سے یہ کافی خطرناک شخص لگتا تھا۔ اس نے بھی اپنی رائفل کندھے سے لٹکا رکھی تھی۔ میں نے ناموں کی فہرست والا کاغذ اسے تھمایا اور انور خاں کی ہدایت کے مطابق کہا۔

''ہمارے چاروں مطالبے اس کاغذ کی پشت پر لکھے ہوئے ہیں۔''

اس شخص نے چھیننے والے انداز میں کاغذ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ میں نے انور خاں کی دی ہوئی ایک طلائی چوڑی اس کی طرف بڑھائی۔ ''یہ تمہاری میم صاحبہ کی نشانی ہے۔ جا کر اپنے بڑوں کو دکھا دینا۔''

اس شخص نے چوڑی مجھ سے لی اور ایک شعلہ فشاں نگاہ مجھ پر ڈال کر واپس چلا گیا۔

اس کی آنکھوں میں مجھے دیکھنے کے بعد بے پناہ حیرت اُمڈ آئی تھی۔ یقیناً وہ مجھے پہچانتا تھا اور اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ میں بھی انور خاں اور اسحاق وغیرہ کے ساتھ اسی سرنگ میں

پایا جاؤں گا۔

موہن کمار نے تاریکی میں سے پکار کر کہا۔ ''انور خاں! تُو آگ سے کھیل رہا ہے۔ اس سے تجھے ایک بُری موت کے سوا اور کچھ ناہیں ملے گا۔''

''ہم موت کے لیے بالکل تیار ہو کر آئے ہیں موہن! سمجھ لے کہ اپنے کفن اپنے سروں سے باندھے ہوئے ہیں اور اپنا کہا سنا معاف کرایا ہوا ہے۔ اگر قبریں نصیب ہو گئیں تو ٹھیک ہے، نہ بھی ملیں تو کوئی پروا نہیں لیکن ایک بات پتھر پر لکیر ہے موہنے! مرنے سے پہلے ہم تمہاری اس میم صاحبہ کو ذبح ضرور کریں گے۔''

اسحاق نے کہا۔ ''اور یہ مت سمجھنا موہنے کہ ہم سودے بازی کر رہے ہیں۔ ہم تو اس میم کا سر اُتارنے سے پہلے صرف حجت پوری کر رہے ہیں۔ یاد رکھ اگر ہمارے ان مطالبوں میں سے کسی مطالبے کا کوئی چھوٹا سا حصہ بھی تیرے حکم جی کو قبول ناہیں ہوا تو پھر یہ میم مرے گی اور یہ کوئی اچھی موت ناہیں ہووے گی۔''

اسحاق کے لہجے کی درندگی محسوس کر کے موہن کمار کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ انور خاں بولا۔ ''چلو اب پھوٹ جاؤ یہاں سے۔ اس میم کو بچانے کے لیے تم لوگوں کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور جاتے جاتے آخری بار سن لو۔ اگر زرگاں کی طرف سے یا نل پانی کی طرف سے ہمارے خلاف کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی گئی تو ہم دوسرا موقع نہیں دیں گے۔ اس معاملے کو فوراً انجام تک پہنچا دیں گے۔''

انور خاں نے نل پانی کا نام جان بوجھ کر لیا تھا۔ اس طرح وہ حکم جی وغیرہ کو باور کرانا چاہتا تھا کہ ماریا فرگوسن کے اغوا والے معاملے سے چھوٹے سرکار یا اس کے ساتھیوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسی دوران میں ماریا نے پھر واویلا شروع کر دیا۔ وہ انگلش اور گلابی اردو میں پتا نہیں کیا کچھ بول رہی تھی۔ اس کی آواز میں جھلاہٹ آمیز بیچارگی تھی اور کرب تھا۔ ڈاکٹر چوہان نے قریب جا کر اس کی بات سنی اور واپس آ کر انور خاں کو بتایا۔ ''وہ کہہ رہی ہے، میری ماں بلڈ پریشر کی مریضہ ہے۔ موہن کمار وغیرہ میری ماں کو میرے بارے میں کچھ نہ بتائیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنے لیے ٹوتھ پیسٹ، برش، صابن اور کپڑوں کا ایک جوڑا منگوانا چاہتی ہے۔''

اسحاق پھنکارا۔ ''کوئی ضرورت ناہیں حرامزادی کے لیے یہ چیزیں منگوانے کی۔ یہ اسی طرح رہے گی جس طرح ہم رہیں گے۔ ہاں...... ایک جوڑا منگوا سکتی ہے یہ۔''

انور خاں نے اسحاق کو نرمی سے سمجھایا۔ وہ نیم رضامند ہو گیا اور منہ بنا کر دوسری طرف

چلا گیا۔ انور خاں نے ماریا کا پیغام بلند آواز میں موہن کمار اور اس کے ساتھیوں تک پہنچا دیا۔

تاریکی میں موہن کمار اور اس کے تقریباً چار درجن ساتھیوں کا واضح ردِعمل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تاہم اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ ان میں سے کچھ لوگ جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ہم پوری طرح چوکس تھے۔ لکڑی کے تنوں کے پیچھے ہم نے پوزیشنیں لی ہوئی تھیں۔ انگلیاں رائفلوں کے ٹریگرز پر تھیں۔ اسحاق نے ہینڈ گرینیڈز والا تھیلا بھی ہمارے پاس رکھ دیا تھا۔ اس نے پانچ دس منٹ صرف کر کے مجھے بڑی اچھی طرح سمجھایا تھا کہ ہینڈ گرینیڈ کو کس طرح اور کس پچویشن میں استعمال کیا جاتا ہے۔ بہرحال ابھی تک مجھے یقین نہیں تھا کہ میں بوقتِ ضرورت اچھے طریقے سے اس بارودی گولے کو پھینک سکتا ہوں۔ اسحاق خود رائفل بدست ماریا کے سر پر موجود تھا۔ مجھے پتا تھا کہ خطرے کے وقت وہ ماریا کو شوٹ کرنے میں ایک سیکنڈ کی دیر نہیں لگائے گا۔ بلکہ اس بات کا اندیشہ تھا کہ وہ خطرے کے پوری طرح سامنے آنے سے پہلے ہی ماریا کی زندگی کا چراغ گل کر دے۔

وہ بڑے تناؤ کے لمحے تھے لیکن آخر وہ گزر گئے۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ ان چار درجن گھڑ سواروں میں سے دس پندرہ گھڑ سوار یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔ امکان تھا کہ موہن کمار بھی روانہ ہونے والوں میں شامل ہو گا۔ باقی افراد دہانے کے اردگرد پوزیشنیں سنبھالنے لگے۔ ان کی ٹارچوں کے روشن دائرے چاروں طرف حرکت کر رہے تھے۔

کچھ دیر بعد سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا۔ جنگل میں شب بیدار جانوروں کی آوازیں معدوم ہونے لگیں۔ دہانے کے اردگرد کے نشیب و فراز دھیرے دھیرے نمایاں ہو گئے۔ بظاہر دہانے کے اردگرد کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن ہم جانتے تھے، دو تین درجن مسلح افراد یہاں موجود ہیں اور ان کی رائفلوں کے رُخ اس دہانے کی طرف ہیں۔ بہرحال اب ان مسلح افراد کی جانب سے اچانک ہلا بولے جانے کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ اگر انہوں نے ایسا کچھ کرنا ہوتا تو اُجالا پھیلنے سے پہلے پہلے کرتے۔

ماریا کراہنے لگی۔ ''ہام کو بہت تکلیف ہوتا۔ ہام کا ہاتھ کھول دو۔''

''تاکہ تمہارے شیطانی دماغ کو پھر کوئی چالاکی دکھانے کا موقع مل سکے۔'' اسحاق نے اس کی پشت پر ایک ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا۔

وہ رونے لگی۔ انور خاں نے کہا۔ ''چلو اس کے ہاتھ آگے کی طرف باندھ دو۔ اس نے کھانا وانا بھی تو کھانا ہو گا۔''

اسحاق پہلے تو جز بز نظر آیا پھر اس نے ماریا کے ہاتھ پشت کی جانب سے کھول کر سامنے

کی طرف باندھ دیئے۔

''ہام کا منہ بہت کڑوا ہوتا ہے۔ ہام پیسٹ کرنا مانگتا۔'' وہ منمنائی۔

اسحاق پھنکارا۔ ''یہ تیرے پیو کا باتھ روم ناہیں ہے۔ یہ جنگل ہے۔ یہاں اگر تُو نے پیسٹ کرنی ہے تو پھر وہی کرنی ہوگی جو زرگاں کی ساری غریب آبادی کرتی ہے۔''

پاس ہی چولہے کی راکھ پڑی تھی۔ اسحاق نے اس میں سے چند کوئلے نکالے۔ انہیں ماریا کے سامنے رکھا پھر انہیں رائفل کے دستے سے پیس کر باریک کیا اور بولا۔ ''یہ ہے وہ پیسٹ جو ہم لوگن کرت ہیں۔ آج تُو بھی یہی کر۔''

وہ تعجب سے اسحاق کو دیکھنے لگی۔

''ایسے دیدے کیا پھاڑت ہے۔ چل انگلی پر لگا اس کوئلے کو اور دانت صاف کر۔'' ماریا اپنی جگہ بے حرکت بیٹھی رہی۔ اسحاق نے بھنا کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑے۔ اس کی ایک انگلی کو پسے ہوئے کوئلے میں لتھڑا اور یہ انگلی زبردستی اس کے منہ میں گھسا دی۔ ''چل کر یہ پیسٹ...... چل کر...... ناہیں تو منہ پھاڑ ڈالوں گا تیرا۔''

ماریا چلانے لگی۔ انور خاں نے مداخلت کر کے اسحاق کو پیچھے ہٹایا اور اسے گھور کر بولا۔ ''تم ایک ٹھیک کام بھی غلط طریقے سے کرتے ہو اور وہ غلط لگنے لگتا ہے۔'' پھر وہ ماریا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میم صاحبہ! یہ کوئلہ بڑے کام کی چیز ہے، اس کا رنگ کالا ہے تو کیا ہوا۔ ہر کالی چیز بُری نہیں ہوتی اور نہ ہر سفید چیز اچھی ہوتی ہے۔ آپ اس کو دانتوں پر مل کر دیکھیں۔ یہ آپ کی ولایتی ٹوتھ پیسٹ کی کمی کو بڑی حد تک پورا کرے گا؟''

''دس کول؟ واٹ نان سینس۔'' ماریا نے تیوری چڑھائی۔

''یہ نان سینس نہیں ہے میم صاحبہ! اس سے تو ہم لوگ بڑے کام لیتے ہیں۔ اس سے ہماری عورتیں برتن مانجھتی ہیں۔ کہیں زخم لگ جائے تو اس کو پیس کر خون بند کیا جاتا ہے۔ اس سے دانت چمکائے جاتے ہیں۔ کئی طرح کی دواؤں میں ڈالا جاتا ہے۔''

انور خاں نے اپنے مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں کافی کوشش کی لیکن ماریا دانت صاف کرنے پر راضی نہیں ہوئی۔ اس نے پانی سے بس چند کلیاں کرنے پر اکتفا کیا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ پچھلے تقریباً بارہ پہر سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا لیکن فی الوقت ہمارے پاس کھانے کے لیے خشک چنوں، مکئی کے بھٹوں اور گڑ وغیرہ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

جب کھانے کے نام پر یہ چیزیں ماریا کے سامنے رکھی گئیں تو اس نے ایک بار پھر ناک بھوں چڑھائی۔ وہ انگلش اور چائنیز کھانے کھانے والی لڑکی اس خشک راشن پر کیسے منہ مار سکتی

تھی۔ ''اب کھاتی کاہے ناہیں ہو؟'' اسحاق نے پھر آنکھیں نکال کر پوچھا۔

''یہ ہام ناہیں کھا سکتا۔''

''تمہارا تو باپ بھی کھائے گا۔'' اسحاق نے کہا اور زبردستی مکئی کا بھٹا اس کے ہاتھ میں دیا۔

اس نے بھٹا دور پھینک دیا اور چلائی۔ ''ناہیں کھائے گا...... ناہیں کھائے گا۔ ہام کو اکیلا چھوڑ دو۔'' اس کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹنے لگی تھیں۔

چند لمحے کے لیے لگا کہ اسحاق اس سے پھر مار پیٹ شروع کر دے گا مگر اسی دوران میں انور خاں نے معاملہ سنبھال لیا۔ اس نے کھانے پینے کی اشیاء ماریا کے سامنے سے ہٹا کر ایک طرف رکھ دیں۔ ''میم صاحبہ! جب تم کو زیادہ بھوک لگے گی تو یہی چیزیں ڈبل روٹی، کیک، پیسٹری اور فرائی انڈے سے زیادہ مزیدار لگیں گی۔ اگر یقین نہیں تو آزما کر دیکھ لینا۔'' پھر انور خاں نے اسحاق کو آنکھوں سے اشارہ کیا کہ وہ شانت رہے۔ یہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔

عجیب الوضع بارونڈا ابھی تک سرنگ کے اندرونی حصے میں موجود تھا۔ میں نے اندر جا کر اسے ناشتہ کرایا۔ اس کا نشہ ٹوٹا ہوا تھا اور وہ مسلسل شراب کی ڈیمانڈ کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ جلد از جلد اس کہنہ سال کشتی میں بھی واپس جانا چاہتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ جس طرح شراب کے لیے تڑپ رہا ہے، اسی طرح اس کشتی کے لیے بھی تڑپ رہا ہے۔ معلوم نہیں تھا کہ اس کشتی سے اس کا کیا ناطہ ہے۔ اس کے ساتھ میری ہمدردی صرف اتنی تھی کہ مجھے اس میں اپنے بچھڑے یار عمران کی ہلکی سی جھلک نظر آئی تھی۔ لیکن اب میں سوچ رہا تھا کہ کہیں میں نے اسے یہاں لا کر غلطی تو نہیں کی؟ وہ ان شرابیوں میں سے لگتا تھا جو نشے کے بغیر جاں بلب ہو جاتے ہیں۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو اس کا ذمے دار میں ہوتا۔ وہ لاغر اور بیمار نظر آتا تھا۔ اس کی جلد سیاہی مائل ہو چکی تھی۔

بارونڈا کو ناشتہ کرانے کے بعد میں سرنگ کے ایک گوشے میں تنہا بیٹھ گیا۔ میری بے چین روح پھر پر پھڑپھڑا رہی تھی۔ مجھے میرے اپنے یاد آ رہے تھے۔ میرے گلی کوچے...... میری دھوپ چھاؤں...... میرے موسم اور وہ چہرہ جو شاید میرے اب تک زندہ رہنے کا جواز تھا۔ میں اپنے ہاتھ سے ہولے ہولے اپنی گردن کے عقبی حصے کو سہلا رہا تھا۔ چوہان کو یقین تھا کہ مجھے قید کرنے والوں نے یہاں میرے جسم میں کچھ رکھا ہوا ہے۔ کچھ ایسا جو فوراً میری نشاندہی کرتا ہے اور میرے نگراں آندھی طوفان کی طرح مجھ تک آ پہنچتے ہیں۔ میرا اپنا خیال بھی اب گواہی دینے لگا تھا۔ چوہان کے خیال کی تائید کرنے لگا تھا۔ ورنہ وہ سب کچھ کیسے ہو

سکتا تھا جواب تک ہوا۔ میرا دل چاہا کہ میرے پاس کوئی تیز دھار چاقو ہو۔ میں ابھی اپنی گردن کے عقبی حصے کو چیر ڈالوں۔ وہ شے باہر نکال پھینکوں جو میرے پاؤں کی زنجیریں بنی ہوئی تھی۔ آزاد زمینوں تک پہنچنے تک کے لیے میری ہر کوشش کو ناکام کر دیتی تھی۔

ایک عجیب سی بے چینی کسی گاڑھے دھوئیں کی طرح میرے سینے میں بھرنے لگی اور میرا دم گھٹنے لگا۔ یہی وقت تھا جب میں نے جواں سال بھکشو ہمیش کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کا ٹوٹا ہوا بازو گلے میں جھول رہا تھا۔ اس کی مٹھی میں کوئی شے دبی ہوئی تھی۔ وہ ننگے پاؤں تھا۔ وہ دوستانہ انداز میں میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس نے مٹھی کھولی۔ اس میں چاندی کی ایک باریک سی زنجیر تھی۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ جاتے جاتے تمہاری بیوی سلطانہ نے دی تھی۔ کہتی تھی کہ میں تم تک پہنچا دوں۔"

ایک دم مجھے یاد آیا کہ چاندی کی یہ مہین سی زنجیر میں نے سلطانہ کے پاس دیکھی تھی۔ میں نے ہمیش سے پوچھا۔ "وہ یہ مجھے کیوں دے گئی ہے؟"

"اس کا پتا تو تمہیں ہوگا۔" ہمیش بولا۔ وہ کچھ دیر تک جواب طلب نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "وہ یہاں سے جاتے وقت بہت پریشان تھی۔ مسلسل رو رہی تھی اور دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے بھی پوچھا لیکن میں کیا بتاتا۔ مجھے خود پتا ناہیں تھا کہ تم، فیروزا اور اسحاق وغیرہ اچانک کہاں نکل گئے ہو۔ اس نے مجھے یہ زنجیر دی اور کہا کہ میں تمہیں دے دوں۔"

میں نے خاموشی سے زنجیر کُرتے کی جیب میں ڈال لی۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ اس زنجیر سے میرے اور سلطانہ کے تعلق کی کوئی یاد وابستہ ہے لیکن کیا "یاد" ہے؟ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ ہمیش کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ "وہ تمہیں بہت چاہت ہے مہروز! وہ ان عورتوں میں سے ہے جو جب شادی شدہ ہو جاوت ہیں تو پھر ان کا شوہر ہی ان کے لیے سب کچھ ہووت ہے۔ اس نے تمہاری رکھشا کے لیے بہت دُکھ جھیلے ہیں مہروز! اور اب بھی اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، وہ تمہارے جیون کی رکھشا کرتے ہوئے ہی ہوا ہے۔ اب اسے تمہارے سہارے اور پریم کی سخت ضرورت تھی لیکن افسوس کہ اب تم اس کے ساتھ ناہیں ہو۔"

"لیکن...... میں کیا کروں ہمیش! میں اس کے لیے ہمدردی تو رکھتا ہوں لیکن اسے اپنی بیوی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ میرے بس میں ہی نہیں ہے۔"

"مگر مہروز! اگر تم......"

"ایک منٹ ہمیش۔" میں نے ہمیش کی بات کاٹی۔ "مجھے میرے نام سے پکارو۔ میں مہروز نہیں تابش ہوں۔ اگر کوئی مہروز تھا بھی تو وہ بس ایک دھوکا تھا اور وہ دھوکا ختم ہو چکا ہے۔"

میرے حتمی لہجے کو محسوس کر کے ہمیش بجھ سا گیا۔ "ٹھیک ہے مہروز! ام...... میرا مطلب ہے تابش! تم اپنے اندر کے حالات کو بہتر سمجھتے ہو۔ اپنے بارے میں جو فیصلہ تم خود کرو گے، وہی اچھا ہوگا۔ میں نے تو بس ایک امانت تمہارے حوالے کرنی تھی۔"

اسی دوران میں دہانے کی طرف سے ماریا فرگوسن کے چلانے چنگھاڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ شاید کسی بات پر اسحاق سے پھر اس کی تکرار ہو گئی تھی۔ وہ بڑے غصیلے لہجے میں کچھ کہہ رہی تھی۔ بیچ بیچ میں اسحاق یا انور خاں کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ ہمیش بولا۔ "میرا خیال ہے، اب یہ جان گئی ہے کہ اس کی جان ہمارے لیے بہت قیمتی ہے۔ ہم اس کے ذریعے اپنی شرطیں منوانا چاہت ہیں۔ اس لیے فوری طور پر اس کی جان ناہیں لیں گے۔ اسی لیے اب یہ ہر بات پر اڑ رہی ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، حکم جی اور جارج وغیرہ اس کی رہائی کے لیے ہماری شرطیں ماننے پر آمادہ ہو جائیں گے؟"

"آشا تو ہے کہ ایسا ہو جائے گا۔ اصل میں یہ ایک بہت بڑا کام ہوا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ماریا کا یہاں پہنچ جانا۔ شاید تم لوگ جارج گورا کو مار بھی دیتے تو اسٹیٹ میں اتنا تہلکہ ناہیں مچتا جتنا اب مچے گا۔ بہت کھلبلی مچی ہوگی اور ابھی اور مچے گی۔ یہ نہ صرف جارج کی بہن ہے بلکہ اسٹیل کی چہیتی بیوی بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ ماریا کی ماں لندن میں ایک بہت بڑی جائیداد کی مالک ہے۔ اس جائیداد کی وجہ سے بھی اسٹیل صاحب نے اپنی بیوی کو آنکھ کا تارا بنا رکھا ہے۔ اپنوں کی بہت زیادہ محبت اور توجہ نے اس لڑکی کو بہت خودسر بنا رکھا ہے۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ یہ خود کو زمین کے شے ہی ناہیں سمجھتی۔ تمہیں وہ پگوڈا میں آگ لگنے والا واقعہ یاد ہے؟" ہمیش نے کہا۔

"نہیں...... مجھ کو کچھ یاد نہیں۔"

"تم بہت خاص باتیں بھی بھول چکے ہو۔ اس واقعے میں تمہاری جان بڑی مشکل سے بچی تھی۔ سب لوگن جانت ہیں کہ وہ آگ ماریا کی وجہ سے ہی لگی تھی۔"

"ماریا کی وجہ سے؟"

"ہاں...... یہ میم صاحبہ ایک روز پگوڈا کی سیر کے لیے گئی تھیں۔ ان کے گارڈز نے ان

کی آمد کے وقت پگوڈا کو زبردستی عام لوگن سے خالی کرایا۔عبادت کرنے والے کئی گھنٹے تک پگوڈا سے باہر دھوپ میں کھڑے رہے۔ وہ عبادت کا خاص دن تھا۔تمام بڑے گرو حضرات عبادت میں معروف تھے۔اس لیے جب ماریا پگوڈا میں آئی تو وہ اس کے استقبال کے لیے نہ آ سکے۔ پگوڈا کے خادموں نے ماریا کی موجودگی میں ایک دو تلخ باتیں بھی کہہ دیں۔ ماریا نے ان سب کا بہت بُرا منایا اور پانچ دس منٹ کے اندر پگوڈا سے واپس چلی گئی۔اس واقعے کے صرف دو دن بعد رات کے وقت اچانک پگوڈا کی سیڑھیوں والے حصے کی طرف زبردست آگ بھڑک اُٹھی۔ بہت سے لوگوں کو پورا وشواس ہے کہ یہ آگ ماریا نے ہی لگوائی تھی۔اس کا کوئی کارندہ پجاری کے روپ میں اندر آیا تھا اور چراغوں کے تیل والے پیپے اُلٹ کر انہیں آگ دکھا دی تھی۔اس آگ میں ہمارے ایک بہت پیارے گرو زوانی جل کر بھسم ہو گئے تھے۔تم دو بھکشوؤں سمیت آگ میں بُری طرح گھر گئے تھے۔ان دنوں تمہارے دونوں پاؤں رسّی کی ایک بیڑی میں رہتے تھے۔تم چل تو سکتے تھے لیکن بھاگ ناہیں سکتے تھے۔تمہیں یاد ہے جب میں نے تمہیں آوازیں دی تھیں اور کہا تھا کہ تم اپنا کمبل لپیٹو اور دوڑ کر آگ میں سے گزر جاؤ۔اس وقت میں بھول گیا تھا کہ تم دوڑ ناہیں سکو گے۔تمہیں یاد ہے؟''

''نہیں...... مجھے کچھ یاد نہیں اور تم مجھے یاد بھی نہ کراؤ۔ایسی باتیں سوچ کر میرا دماغ پھٹنے لگتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔میں ناہیں یاد کراتا لیکن میں تمہیں ماریا کی ہٹ دھرمی اور بے رحمی کے بارے میں بتا رہا ہوں۔اس لڑکی نے ایک چھوٹی سی غلطی کی سزا میں پگوڈا کے ایک حصے کو جلا کر خاکستر کروا ڈالا تھا۔کئی قیمتی نوادرات ضائع ہوئے۔ایک بزرگ پجاری کے پران چلے گئے اور تم سمیت تین بندوں کی جان شدید خطرے میں پڑ گئی۔ یہاں ایک بار پھر سلطانہ کی بات کرنی پڑ جاوت ہے۔ جب آگ لگنے کے بعد سب لوگن پگوڈا سے بھاگ گئے تھے اور کوئی بھی وہاں ناہیں ٹھہر سکا تھا، سلطانہ بھاگتی ہوئی وہاں پہنچی۔ مجھے وہ منظر آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔اس نے ایک کمبل بھگو کر اپنے گرد لپیٹا ہوا تھا۔وہ آگ کے درمیان میں کھڑی تھی اور پکار رہی تھی۔''اندر لوگ ہیں۔ان کی مدد کرو۔ان کو بچاؤ۔'' پھر میں نے ڈاکٹر چوہان کو دیکھا تھا۔اس نے بھی ایسے ہی ایک بھیگا ہوا کمبل اپنے گرد لپیٹ رکھا تھا۔سامنے والے دروازے کی طرف سے نکلنے والا راستہ آگ نے بالکل بند کر دیا تھا۔وہ دونوں آگ میں سے گزر کر پہلو والے دروازے تک پہنچے۔اس دروازے کو باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔انہوں نے کنڈی کھولی۔ دونوں بھکشو تو دوڑتے ہوئے آگ میں سے گزر گئے لیکن تم دوڑ ناہیں سکتے

تھے۔تمہیں سلطانہ اور چوہان نے اپنے درمیان رکھا اور کمبلوں میں چھپا لیا۔ چوہان کے کمبل کو آگ لگ گئی تھی۔ وہ تمہیں چھوڑنے پر مجبور ہو گیا لیکن سلطانہ تمہارے ساتھ چمٹی رہی اور تمہیں باہر نکال لائی۔ وہ ایک بہادر ماں کی بہادر بیٹی ہے تابش! اس روز اس نے ثابت کیا تھا کہ حوصلہ مندی اور جی داری صرف مرد کا ورثہ ہی ناہیں ہووت ہے۔ اس روز لوگن سلطانہ کی ہمت پر اش اش کر اُٹھے تھے۔''

ایک بار پھر سلطانہ کا اُجڑا اجڑا چہرہ میری نگاہوں میں گھومنے لگا اور مجھے محسوس ہوا کہ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔اس کے آنسو پونچھنا چاہتا ہوں لیکن وہ جا چکی تھی اور جاتے جاتے اپنے گلے کی چین مجھے دے گئی تھی۔خبر نہیں کہ ایسا کرنے سے اس کا کیا مطلب تھا۔شاید یہ چین میں نے ہی اسے دی ہو اور اس کے ساتھ کوئی وعدہ منسلک ہو اور وہ جاتے جاتے یہ وعدہ ختم کر گئی ہو۔

بھکشو ہمیش نے ماریا کی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔''یہ پورے زرگاں میں سب سے زیادہ نخرے والی میم مشہور ہے۔ چھوٹی چھوٹی غلطی پر اپنے ملازموں کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آوت ہے۔ پچھلے سال اس نے اپنی ایک ملازمہ کے ساتھ اس قدر مار پیٹ کروائی تھی کہ اس کی آنکھ ضائع ہو گئی تھی اور بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ملازمہ کا دوش صرف اتنا تھا کہ اس نے غلطی سے میم صاحبہ کے بستر پر اَن دھلی چادر بچھا دی تھی اور اسی سال عید سے پہلے اس نے ایک ملازم لڑکے کو چھ دن بھوکا پیاسا ایک کمرے میں بند رکھا تھا۔لڑکے کا دوش یہ تھا کہ اس نے ماریا کے پالتو افریقین طوطوں کو تکلیف پہنچائی تھی۔ وہ صرف چند گھنٹوں کے لیے ان کے پنجروں میں خوراک ڈالنا بھول گیا تھا۔شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ یہ لڑکا بعد میں کبھی کچھ کھا پی ناہیں سکا اور چند ہفتے بیمار رہ کر مر گیا۔''

''اس کے خلاف کسی نے آواز نہیں اُٹھائی؟''

''اسحاق کی بہن بھی تو زہر کھا کر مر گئی تھی۔ سب کو پتا تھا کہ وہ کیوں مری ہے۔اس کی موت پر بھی تو کسی نے آواز ناہیں اُٹھائی تھی لیکن جب آواز ناہیں اُٹھائی جاتی تو اس کا مطلب یہ تو ناہیں ہوتا نا کہ لوگن کے دلوں میں غم اور غصہ بھی ناہیں ہے۔ یہ اندر ہی اندر پلتا رہتا ہے، بڑھتا رہتا ہے اور پھر ایک روز اس کی طاقت اتنی زیادہ ہو جاوت ہے کہ کوئی شے بھی اس کا راستہ ناہیں روک سکتی۔''

یہ اَن پڑھ بھکشو اپنے سیدھے سادے انداز میں بڑی فلسفیانہ بات کر رہا تھا۔اس کی بات میں بہت وزن تھا۔ میں اپنا تجزیہ کرتا تو میری صورت حال بھی تو اس سے کچھ زیادہ

مختلف نہیں تھی۔ میں نے ایک عرصے تک بے پناہ دباؤ جھیلا تھا، بے پناہ جسمانی وذہنی اذیت برداشت کی تھی۔ مجھے ذلت وشرمندگی کے پانی میں غرق کردیا گیا تھا۔ میں اس پانی میں نیچے اور نیچے جاتا گیا لیکن آخر کار میرے پاؤں زمین سے چھو گئے اور میں اوپر اُبھرنا شروع ہو گیا۔ اس بھانڈیل اسٹیٹ کے کمزور لوگوں کے پاؤں بھی اب شاید زمین سے لگ گئے تھے۔ ان کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ اب وہ کہنہ قدروں کی دیواریں توڑ دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ایسی دیواریں توڑنے کے لیے قربانیاں دینا پڑتی ہیں اور شاید یہ قربانیاں دینے اور تکلیفیں برداشت کرنے کا موسم ہی تھا۔

میرا دھیان ایک بار پھر سلطانہ کی طرف چلا گیا۔ میرا دل اس کے لیے غم سے بھر گیا۔ اس کی نقرئی چین میری مٹھی میں دبی ہوئی تھی۔ مجھے لگا کہ یہ چین تپ گئی ہے اور میرے ہاتھ کو جلانے لگی ہے۔ میں نے چین پھر جیب میں ڈال لی۔

قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ انور خاں اور ڈاکٹر چوہان تھے۔ انور خاں نے بتایا۔ ”دہانے کے آس پاس چالیس سے کم بندے نہیں ہیں۔ انہوں نے پوزیشنیں لے رکھی ہیں اور پوری طرح چوکس ہیں۔“

”تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“ ہمیش نے پوچھا۔

”پریشانی کی بات یہ ہے کہ ہم فیروز کو جلد از جلد نل پانی پہنچانا چاہتے تھے تاکہ وہ چھوٹے سرکار کے سامنے موہن کمار وغیرہ کے خلاف گواہی دے سکے لیکن اب یہ ممکن نہیں۔ یہ لوگ کسی کو باہر نہیں جانے دیں گے اور اگر کوئی جائے گا بھی تو اسے یرغمال بنالیں گے۔“

”تو پھر کیا کرنا چاہیے؟“ میں نے پوچھا۔

”وقت کا انتظار۔“ انور خاں نے جواب دیا۔

”اگر تم سمجھتے ہو کہ میں اس سلسلے میں کسی طرح کی مدد کرسکتا ہوں تو میں تیار ہوں۔“ میں نے دل کی گہرائی سے پیشکش کی۔

انور خاں کا چہرہ چمک گیا۔ ”تمہارے اتنا کہنے سے ہی میرا حوصلہ ڈبل ہو گیا ہے لیکن ابھی کسی طرح کا رسک لینے کی ضرورت ہمیں نہیں ہے۔“

اچانک دہانے کی طرف سے ایک بار پھر ماریا کے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ چوہان نے کہا۔ ”وہ کیڑے مکوڑوں کی وجہ سے پریشان ہے۔ اب اس کے لیے یہاں کیڑے مار دوا کا انتظام کون کرے؟“

انور خاں یہ کہتے ہوئے اُٹھ گیا۔ ”میں جا کر دیکھوں، کہیں اسحاق اس سے پھر مار پیٹ

شروع نہ کردے۔“

رات کو ہم نے باری ٹھہرالی۔ آدھی رات تک فیروز، اسحاق اور ہمیش نے دہانے کی پہریداری کرنا تھی۔ میں نے بھی ان کے ساتھ شامل ہونا تھا۔ آدھی رات کے بعد ہم نے سو جانا تھا اور انور خاں، چوہان اور احمد نے پوزیشن سنبھال لینی تھی۔

پروگرام کے مطابق ہم آدھی رات تک جاگتے رہے۔ جنگل جانوروں کی آوازوں سے گونجتا رہا۔ ان آوازوں میں گاہے بگاہے لیپارڈ یعنی تیندوے کی دور افتادہ آواز بھی شامل ہو جاتی تھی۔ تاہم ہمیں ان آوازوں سے زیادہ انسانی آہٹوں سے خطرہ تھا۔ ہم پر شب خون مارا جانا خارج از امکان نہیں تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ حکم جی کے پاس خطرناک لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ ان میں رنجیت پانڈے جیسا شخص بھی شامل تھا۔ بڑے پگوڈا میں میڈم صفورا نے مجھے اس شخص کے بارے میں تھوڑا بہت بتایا تھا۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے جو پانچ نہایت خطرناک کمانڈوز بدھا کے نادر مجسمے کو پاکستان سے انڈیا واپس لانے کے لیے گئے تھے، ان کا سربراہ یہی رنجیت پانڈے تھا۔ وہ انڈین اسپیشل فورسز کا ایک سابقہ افسر تھا اور کہا جاتا تھا کہ وہ اپنے دشمنوں کے لیے موت کا دوسرا نام ہے۔

گاہے بگاہے دہانے کا گھیراؤ کرنے والوں کی مدھم آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچ جاتی تھیں۔ کبھی کوئی چاپ اُبھرتی تھی۔ کبھی کوئی رائفل کاک ہونے کی آواز کانوں میں پڑتی تھی۔ رات قریباً ایک بجے ہم نے انور، چوہان اور احمد کو جگا دیا۔ ان کی چٹائیوں پر ہم سونے کے لیے لیٹ گئے۔ ماریا بھی ایک طرف بندھی پڑی تھی۔ خبر نہیں کہ سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی۔ وہ ہٹ کی پکی نکلی تھی۔ ابھی تک اس نے کچھ بھی کھایا نہیں تھا۔ وہ شاید غنودگی کی حالت میں تھی۔ میں تھکا ہوا تھا، کچھ ہی دیر بعد سو گیا۔ میں کسی کے ہلانے سے جاگا۔ مجھے ہمیش نے جگایا تھا۔ وہ میرے پہلو میں لیٹا ہوا تھا۔ لالٹین بجھ چکی تھی اور اس حصے میں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ”کیا ہے؟“ میں نے ہمیش سے پوچھا۔

”وہ دیکھو...... میم صاحبہ کیا کر رہی ہے؟“ ہمیش نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

میں نے دیکھا اور چونک گیا۔ ماریا کا ہیولا صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ تاریکی میں رینگتی ہوئی اس تھیلے تک پہنچی تھی جس میں بھنے ہوئے چنے، گڑ اور بھٹے وغیرہ رکھے تھے۔ وہ تھیلے کو ٹٹول رہی تھی۔ ساتھ ساتھ چور نظروں سے دہانے کی طرف بھی دیکھ رہی تھی۔ پھر ہم نے آوازیں سنیں جن سے اندازہ ہوا کہ وہ چنے چبا رہی ہے۔ سچ کہتے ہیں کہ بھوک انسان کو بہت کچھ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

اگلی صبح انور خاں نے کھانا پکانے کے لیے ایک چولہا تیار کر لیا تھا۔ روٹی پکانے والا ایک توا بھی چوہان دیگر سامان کے ساتھ لے کر آیا تھا۔ انور خاں ایک ہر فن مولا شخص کی طرح تھا۔ وہ زبردست اسلحہ شناس تھا۔ اس نے میری کیچڑ زدہ بھیگی ہوئی رائفل کو بالکل ٹھیک ٹھاک کر دیا تھا۔ چرواہا نریندر سنگھ جو دور مار رائفل لے کر آیا تھا، وہ ٹکڑوں میں تھی۔ انور نے اسے بھی منٹوں میں جوڑ کر تیار کر لیا تھا۔ اس میں لیڈر شپ کی خصوصیات موجود تھیں۔ وہ لوگوں کو اکٹھا کرنا اور ان کے جھگڑے نمٹانا جانتا تھا۔ اب میں دیکھ رہا تھا کہ اسے کھانا پکانے میں بھی زبردست مہارت حاصل ہے۔ ہمیش نے آٹا گوندھا۔ انور خاں نے آلو کا سالن تیار کیا اور ساتھ زبردست پراٹھے بنائے۔

یہ معقول کھانا ہمیں کئی دنوں بعد نصیب ہوا اور یہ انور خاں ہی کی مرہونِ منت تھا۔ انور خاں نے ایک پراٹھا کچھ سالن اور دودھ ماریا کے سامنے بھی رکھا۔ ماریا کی آنکھوں میں بھوک چمک رہی تھی مگر اس سے پہلے کہ وہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتی، اسحاق اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے کھانا ماریا کے سامنے سے اُٹھا لیا۔ ”ہم اس کی سیوا کرنے اور اس کے سامنے کھانے کی ٹرے سجانے کے لیے اسے یہاں ناہیں لائے۔ یہ اپنا کھانا خود پکا دے گی بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ یہ پکا دے اور ہمیں بھی کھلا دے۔“

”چلو چھوڑو یار! ابھی تو کھانے دو اسے۔“ انور خاں نے پھر مداخلت کی۔

اسحاق جھنجلا گیا۔ ”انور بھائی! اگر تم نے اس طرح اس کتیا کے ناز نخرے دیکھنے ہیں تو پھر مجھ کو بولنا پڑے گا۔ میں یہ برداشت ناہیں کر سکتا۔ اس نے آج تک ہم کو اور ہماری عورتوں کو ذلیل و خوار کیا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ہم اب تک اس کو لٹکا کر اس کی گردن کو دو فٹ لمبا کر چکے ہوتے لیکن اگر ہم نے یہ ناہیں کیا تو پھر ہم اس کی مہمان نوازی بھی ناہیں کریں گے۔“

”لیکن اسحاق......“

”ناہیں انور بھائی۔“ اسحاق نے تیزی سے انور کی بات کاٹی۔ ”میں سچ کہوت ہوں، مجھ سے یہ سب برداشت ناہیں ہوتا۔ میرے دل پر آرے چل جاوت ہیں۔ مجھے اپنی بہن کا مرنا یاد آ جاوت ہے۔ میں اس کو گولی مار دوں گا اور خود کو بھی مار لوں گا۔“ اسحاق کے لہجے مین تپش بڑھتی جا رہی تھی۔

اس تپش کو محسوس کر کے انور خاں ایک دم مسکرا دیا۔ شاید یہ اس کی عادت تھی اور یہ بہت اچھی عادت تھی۔ جب صورتِ حال گمبھیر ہوتی تھی اور تناؤ بڑھ جاتا تھا تو وہ ایک دم مسکراتا تھا اور اپنا لب و لہجہ تبدیل کر لیتا تھا۔ اس کے ایسا کرنے سے لگتا تھا کہ پوری صورتِ حال اور

صورتِ حال کے سارے اسباب اچانک بدل گئے ہیں۔

انور خاں نے اپنی رائفل ایک طرف رکھی اور ماریا کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ اپنے سامنے سے کھانا اُٹھائے جانے پر سخت بھنائی ہوئی تھی۔ انور خاں نے اس کے ہاتھ کھول دیئے اور بولا۔ ”چلو......اس میں بُرائی ہی کیا ہے؟ اپنا کھانا تم خود بنا لو۔ کسی کا احسان لینا کون سی اچھی بات ہے۔“

احسان والی بات شاید ماریا کے دل کو لگی۔ ویسے بھی وہ پچھلے قریباً ساٹھ گھنٹے سے بھوکی تھی۔ رات کو اس نے تھوڑے سے چنے ضرور کھائے تھے لیکن یہ خشک چنے اس کے گلے میں پھنس گئے تھے اور وہ دیر تک کھانسنے کے بعد بے سدھ ہو کر لیٹ گئی تھی۔ اب نقاہت کے سبب اس کا رنگ لٹھے کی طرح سفید ہو چکا تھا اور ہاتھ پاؤں میں لرزش نظر آتی تھی۔ انور خاں نے اسے سہارا دے کر چولہے کے نزدیک پہنچایا اور گندھا ہوا آٹا اس کے قریب رکھ دیا۔ وہ سخت جھنجلائی ہوئی نظر آتی تھی۔ جیسے یہ ثابت کرنا چاہتی ہو کہ وہ اتنی ناکارہ نہیں۔ اپنا کام خود کر سکتی ہے۔ انور خاں نے چولہے میں آگ جلا دی۔ توا پہلے ہی اوپر رکھا ہوا تھا۔ ماریا اپنے لیے روٹی بنانے لگی۔ یہ عمل اس کی توقع سے زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ چار پانچ منٹ کی کوشش میں وہ پہلی روٹی بھی توے پر نہیں ڈال سکی۔ اس کے ہاتھ لتھڑ گئے اور بہت سا آٹا ضائع ہوا۔ بالآخر جو ایک روٹی اس نے توے پر ڈالی تھی، وہ عجیب نقشے کی تھی اور وہ بھی توے سے چپک کر رہ گئی۔ ایک دم ماریا جھلا کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے خشکے والی تھالی دور پھینک دی اور انگریزی میں سب کو صلواتیں سنانے لگی۔

اسحاق نے اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ ”حرامزادی! آج تک تُو پکی پکائی کھاتی رہی ہے۔ نوکروں کی فوج تیرے نخرے، چونچلے اُٹھانے کے لیے تیرے آگے پیچھے گھومتی رہی ہے۔ آج تجھے پتا چلا ہووے گا کہ تُو اس قابل ناہیں ہے کہ اپنے بل بوتے پر اپنا پیٹ بھی بھر سکے۔ لعنت ہے تیرے مال دولت پر۔“

وہ ایک بار پھر رونے لگی۔ شاید چیزیں اُٹھا اُٹھا کر بھی پھینکنا شروع کر دیتی لیکن اب وہ اسحاق کی شعلہ مزاجی سے ڈرتی بھی تھی۔ انور خاں نے اسحاق کو سمجھا بجھا کر پیچھے ہٹایا اور خود ایک روٹی پکا کر ماریا کو دی۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ نہیں کھائے گی لیکن کچھ ہی دیر بعد یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ وہ کھا رہی ہے۔ اس کے پاؤں بدستور زنجیر میں تھے۔

اسحاق تڑخ کر بولا۔ ”انور بھائی! آج تم نے اپنی من مانی کر لی ہے لیکن اس کے بعد ناہیں۔ یہ جب تک مرنے سے بچی ہوئی ہے، اپنا کام خود کرے گی۔ بلکہ اس کو ہمارے کام

بھی کرنے پڑیں گے۔ میں نے اس کی گردن کو ہمیشہ اکڑا ہوا دیکھا ہے۔ اگر یہ اب بھی اکڑی رہی تو پھر میں اس کو توڑ دوں گا۔ میں سچ کہتا ہوں، توڑ دوں گا۔''

اگلے روز دوپہر سے کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ زرگاں سے کچھ لوگ یہاں پہنچے ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ ان لوگوں میں حکم جی کا خاص مشیر گرومودان اور جارج گورا کا بہنوئی یعنی ماریا کا شوہر اسٹیل بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ بھاری مقدار میں اسلحہ اور تازہ دم سپاہی بھی موقع پر پہنچائے گئے تھے۔ ہمیں دہانے کے اردگرد تازی گھوڑے، بوکیر کتے اور ایک عدد جیپ بھی نظر آئی۔ یہ جیپ نہایت دشوار راستوں سے گزر کر پتا نہیں کیسے یہاں پہنچائی گئی تھی۔

ایک شخص نے دہانے کے سامنے آ کر اعلان کیا کہ گرومودان اور اسٹیل صاحب بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری طرف سے جو لوگ بات کرنا چاہتے ہیں، وہ باہر آ جائیں یا پھر ہمیں اندر آنے کی اجازت دی جائے۔

انور خاں اور چوہان وغیرہ نے مشورہ کیا۔ دونوں صورتوں میں خطرہ موجود تھا۔ بہتر تھا کہ درمیانی راستہ اختیار کیا جائے۔ فیصلہ ہوا کہ سرنگ کے دہانے سے پندرہ بیس گز آگے درختوں کے درمیان بات چیت ہو اور اس گفتگو کے دوران میں دونوں طرف سے کسی طرح کی کوئی کارروائی نہ کرنے کا عہد کیا جائے۔ دس پندرہ منٹ کے اندر شرائط طے ہو گئیں۔ فیصلہ ہوا کہ انور خاں یہیں سرنگ میں رہے گا جبکہ چوہان اور فیروز آگے جا کر بات کریں گے۔ فیروز زخمی تھا، اس کے باوجود وہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کے اندر جو آگ جل رہی تھی، اس نے اسے اضافی توانائی دے دی تھی۔

سہ پہر ہونے والی تھی۔ درختوں کے سائے طویل ہو رہے تھے۔ چوہان اور فیروز اپنی رائفلیں کندھوں سے لٹکائے باہر نکلے۔ دوسری طرف سے سرخ لباس میں گرومودان اور اسٹیل نمودار ہوئے۔ گرومودان چھوٹے قد کا فربہ اندام شخص تھا جبکہ اسٹیل چھریرے جسم اور نہایت اونچی ناک والا دراز قد انگریز تھا۔ سنگین صورت حال کے باوجود اسٹیل کے انداز میں بلا کا اعتماد تھا۔ وہ ان انگریزوں میں سے تھا جو جب تیسری دنیا کے ملکوں میں آتے ہیں تو نسلی برتری اور اپنی شان و شوکت کا احساس مستقل طور پر ان کے چہروں سے چپک جاتا ہے۔

وہ لوگ چند بلند قامت درختوں کے درمیان بیٹھ گئے اور بات چیت شروع ہوئی۔ یہ ایسی جگہ تھی کہ دونوں طرف کے رائفل بردار گفتگو کرنے والوں پر نظر رکھ سکتے تھے۔ انور خان اپنی پوزیشن پر بالکل چوکس تھا۔ اس کے ہاتھ میں طاقتور راسنائپر گن تھی اور انگلی لبلبی پر تھی۔ وہ کسی بھی گڑبڑ کی صورت میں ایک ثانیے کے اندر ایکشن لے سکتا تھا۔ اسحاق مسلسل ماریا کے

سر پر موجود تھا۔ ہمارے درمیان یہ طے تھا کہ اگر حکم جی کے کارندوں کی طرف سے کسی طرح کی کارروائی کی گئی تو ہم ماریا کو شوٹ کر دیں گے۔ انور خاں، احمد اور میں دہانے پر پوزیشنیں سنبھالے ہوئے تھے۔ ہم نے صورت حال پر عقابی نگاہ رکھی ہوئی تھی۔

درختوں کے نیچے ہونے والی گفتگو دس پندرہ منٹ ہی جاری رہ سکی۔ دونوں طرف برہمی نظر آ رہی تھی۔ اسٹیل بار بار ایک کاغذ چوہان کے سامنے لہرا رہا تھا اور بلند آواز میں بول رہا۔ دوسری طرف چوہان بھی ترکی بہ ترکی جواب دے رہا تھا۔ یہ گفتگو تلخ کلامی پر ہی ختم ہوئی۔ جب چوہان اور فیروز واپس آنے لگے تو گرومودان نے ایک تھیلا چوہان کو دیا۔ اس تھیلے میں ماریا کی ضروریات کا سامان تھا۔

''کیا ہوا؟'' انور خاں نے چوہان سے پوچھا۔

''ابھی ان میں بہت اکڑفوں ہے۔ دماغ درست ہونے میں ابھی کچھ ٹائم لگے گا۔''

''کیا کہتے ہیں؟'' انور خاں نے پوچھا۔

''وہ صرف ایک مطالبہ مان رہے ہیں۔ سلطانہ کے والد اور بیمار بھائی کو حفاظت کے ساتھ تل پانی پہنچانے پر تیار ہیں۔''

''اور جو پچاس بندوں کی فہرست دی تھی؟''

''ان کا کہنا ہے کہ ان میں سے بس پندرہ بیس ہمارے پاس موجود ہیں اور وہ ایسے لوگ ہیں جن پر سنگین قسم کے کیس ہیں۔ انہیں اس طرح چھوڑا نہیں جا سکتا۔''

''بکواس کرتے ہیں۔'' انور خاں پھنکارا۔ ''میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ پچاس کے پچاس لوگ حکم جی کے قبضے میں ہیں۔ ان کو اس وقت بدترین تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہو گا۔'' انور خاں نے چوہان سے پوچھا۔

''جارج گورا کو سزا دینے کے بارے میں کیا کہا گیا ہے؟''

''گرومودان کا کہنا ہے کہ جارج کے خلاف اگر ہمارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت اور گواہی ہے تو پیش کی جائے۔ اس کے خلاف اسی طرح کارروائی ہو گی جس طرح اسٹیٹ کے کسی عام بندے کے خلاف ہو سکتی ہے اور اگر الزام ثابت ہوئے تو پھر سزا بھی ملے گی۔''

انور خاں نے دانت پیس کر حکم جی اور اس کے مشیروں کو ایک غائبانہ گالی دی اور بولا۔ ''جس عورت کی عزت خراب کی جاتی ہے اس کی گواہی سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے اور پھر ایک دو نہیں، سیکڑوں لوگوں نے سلطانہ کو جارج کے گھر سے اُجڑی پجڑی حالت میں برآمد کیا ہے۔ اس سے بڑی گواہی اور کیا ہو گی؟ لیکن یہ لوگ جانتے ہیں کہ قانون کے محافظ بھی اپنے

ہیں، عدالت بھی اپنی اور قاضی بھی اپنے۔ یہ دن دہاڑے ہزاروں لوگوں کے سامنے بھی کسی کو ناحق قتل کریں گے تو پھر بھی کسی نہ کسی شق کی وجہ سے بچ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سینہ تان کر قانون کی بات کرتے ہیں۔ انہیں خبر نہیں کہ جب قانون، انصاف نہیں کرتا تو پھر کچھ اور راستے کھلتے ہیں، کچھ اور طرح کی عدالتیں لگتی ہیں اور شاید اب ایسی ہی عدالتیں لگیں گی۔'' انور خاں کی آواز طیش سے پھٹ رہی تھی۔

''تم نے آخر میں کیا کہا ہے؟'' اسحاق نے چوہان سے پوچھا۔

''میں نے انہیں چوبیس گھنٹے کی مہلت دی ہے اور میں نے کہا ہے کہ اس کے بعد ہم ماریا کی زندگی کی ضمانت نہیں دے سکیں گے۔''

''اس بیگ میں کیا ہے؟'' انور خاں نے پوچھا۔

چوہان نے کینوس کے بیگ کی زپ کھولی۔ یہ کافی بڑا بیگ تھا۔ اس میں ماریا کے استعمال کی چیزیں تھیں۔ ایک شال، کپڑوں کا ایک جوڑا۔ ٹوتھ پیسٹ، صابن، تولیہ، پرفیوم، شراب، بسکٹ، نیچے بچھانے کے لیے ایک خاص قسم کی میٹ اور اس طرح کی دیگر اشیا۔

اسحاق نے بھی یہ چیزیں دیکھیں اور اس کا چہرہ سرخی مائل ہو گیا۔ ''میں اسے یہ سب کچھ استعمال نا ہیں کرنے دوں گا۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔ ''یہ اسی طرح رہے گی جس طرح ہم رہیں گے۔ وہی کھاوے گی جو ہم کھاویں گے۔ یہ آسمان سے نا ہیں اُتری ہوئی۔ ہماری ہی طرح ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہے۔ میں یہ سب کچھ جلا دوں گا۔ اس کے سامنے جلا کر راکھ کر دوں گا۔'' وہ ایک دم بپھر گیا۔

اس نے تھیلا پکڑا اور جلتے ہوئے چولہے کی طرف بڑھا۔ انور خاں لپک کر گیا۔ ''کیا کرتے ہو اسحاق! کچھ ہوش کی بات کرو۔ یہ چیزیں کل ہمارے کام آ سکتی ہیں اور ان میں دوائیاں بھی ہیں۔ کیا پتا ہمیں اس لڑکی کے لیے ان دوائیوں کی ضرورت ہی پڑ جائے۔''

اس نے اسحاق کے ہاتھ سے بیگ لینا چاہا لیکن اسحاق نے نہیں چھوڑا۔ وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''پہلے تم کو وعدہ کرنا ہوگا انور بھائی! دواؤں کے علاوہ ان میں سے کوئی شے اس حرامزادی کے لیے استعمال نا ہیں ہووے گی۔''

''ٹھیک ہے، میں وعدہ کرتا ہوں۔'' انور خاں نے کہا اور تھیلا اسحاق سے لے لیا۔

ماریا ایک گوشے میں بیٹھی سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی۔ ماحول میں سخت تناؤ پایا جا رہا تھا۔ دہانے سے باہر حکم جی کے اہلکاروں کی نفری بہت بڑھ گئی تھی۔ اب ضرورت اس امر کی تھی کہ ہم بھی زیادہ چوکسی کا مظاہرہ کریں۔

اچانک شور سنائی دیا لیکن یہ شور دہانے کی طرف سے نہیں اندرونی حصے کی طرف سے تھا۔ وہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے میں باروندا کے زخموں پر مرہم وغیرہ لگا کر آیا تھا۔ اس کی اکلوتی ٹانگ کو انور نے دہرا کر کے زنجیر سے باندھ دیا تھا۔ اب یہ ٹانگ کھل نہیں سکتی تھی۔ میں نے اس کی دبلی پتلی پنڈلی کے زخم پر دوا لگانے کے لیے اس کی زنجیر کو تھوڑا سا ڈھیلا کیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ تھوڑی سی ڈھیل اس شخص کے لیے کافی زیادہ ثابت ہوگی اور وہ ایک ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔

ہم آوازوں کی سمت دوڑے۔ عجیب الخلقت باروندا ایک لکڑی کے سہارے تیزی سے ایک سمت دوڑا جا رہا تھا۔ احمد اس کے پیچھے تھا اور انگریزی میں پکار رہا تھا۔ ''رُک جاؤ۔ میں کہتا ہوں رُک جاؤ۔''

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے احمد نے باروندا کو دبوچ لیا۔ ہمارا خیال تھا کہ اب باروندا احمد کی گرفت میں بے بس ہو گیا ہے۔ احمد اسے آسانی سے سنبھال لے گا مگر ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ باروندا نے جنونی انداز میں چلاتے ہوئے زور مارا اور خود کو احمد کی گرفت سے چھڑا لیا۔ احمد لڑکھڑا کر پیچھے گیا اور دوبارہ باروندا کی طرف بڑھا۔ تب باروندا نے اپنی بیساکھی کو لاٹھی کی طرح استعمال کیا اور اس کی دھکیل سے ایک بار پھر احمد کو لڑکھڑانے پر مجبور کر دیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ احمد سے مقابلے پر آمادہ ہے۔ احمد کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ وہ ایک پروفیشنل لڑاکا تھا۔ وہ کراٹے میں الٰہ آباد کا چمپئن تھا اور کئی ایک اہم مقابلوں میں حصہ لے چکا تھا۔ اس کے لیے باروندا جیسے معذور مدقوق شخص پر غالب آنا قطعی مشکل نہیں تھا۔ اس نے بھنا کر کھڑے کھڑے ایک زوردار لات باروندا کے منہ پر رسید کی۔ وہ ڈکراتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ یوں لگا کہ اس کی ایک آدھ ہڈی ٹوٹ گئی ہوگی، مگر کچھ بھی تھا اس شخص کی سخت جانی ہم بدبودار کشتی میں دیکھ چکے تھے۔ میری اور اسحاق کی کئی سخت ضربات وہ بآسانی جھیل گیا تھا۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ وہ چوٹ کھا کر مُردہ چھپکلی کی طرح گرا ضرور لیکن پھر اپنے اکلوتے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ یہاں احمد سے اندازے کی غلطی ہوئی یا شاید اسے غلطی نہیں کہنا چاہیے۔ احمد کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو باروندا جیسے لاغر مدقوق شخص کے سامنے اسی طرح کا ردِعمل ظاہر کرتا۔ احمد نے تیزی سے آگے بڑھ کر باروندا کو گردن سے دبوچنا چاہا۔ باروندا نے اس کی ناف پر گھٹنے کی ضرب لگائی پھر اس کے جبڑے پر ایک کارگر مکا رسید کر کے دوبارہ بھاگ کھڑا ہوا۔

احمد کے لیے یقیناً یہ صورتِ حال سبکی اور طیش کا باعث تھی۔ وہ ایک مانا ہوا فائٹر تھا۔ وہ اپنی طرف سے اب تک اس لاغر شخص کو رعایت دیتا رہا تھا۔ اس نے جھپٹ کر باروندا کو ایک

بار پھر دبوچا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان دونوں میں زبردست جدوجہد شروع ہو گئی۔ آنے والے دو تین منٹ بے حد حیرت ناک تھے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہوا۔ لاغر بارونڈا نے نہ صرف احمد کا ڈٹ کر مقابلہ کیا بلکہ آخر میں اچانک اس کا پلڑا بھاری ہو گیا۔ اس نے بڑی تیزی سے احمد کے دو تین وار بچائے، پھر دفعتاً کراٹے کے ہی انداز میں گھوم کر لات چلائی۔ اس کی ایڑی احمد کی کنپٹی کے آس پاس کہیں لگی۔ اس سے پہلے کہ احمد اس ضرب سے سنبھل سکتا، اس کی بیساکھی نے ایک بار پھر لاٹھی کا کام کیا۔ اس کی بھرپور ضرب احمد کی پیشانی پر لگی، احمد پشت کے بل دیوار سے ٹکرایا اور تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا۔

اسحاق نے اپنی ٹرپل ٹو رائفل سیدھی کی اور صرف آٹھ دس فٹ کے فاصلے سے بارونڈا کو نشانے پر لے لیا۔ "خبردار...... شوٹ کر دوں گا۔" وہ چلایا۔

میں نے بھی رائفل بارونڈا کی طرف سیدھی کر لی۔ اس موقع پر وہ مزید "ایفی شینسی" دکھانے کی کوشش کرتا تو ہم یقیناً اس پر گولی چلا دیتے۔ جان سے نہ بھی مارتے تو زخمی ضرور کر دیتے۔ وہ ایک دم بیٹھ گیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر انگریزی میں دہائی دینے لگا۔

"مجھے شراب دو۔ نہیں تو میں مر جاؤں گا۔ میری موت کی ذمے داری تم پر ہو گی۔" پھر وہ سب کو مشترکہ گالیاں دینے لگا اور اس بات پر صلواتیں سنانے لگا کہ ہم اسے اس کے گھر سے نکال کر کیوں لائے ہیں۔

وہ اس خستہ حال سڑی ہوئی کشتی کو اپنا گھر قرار دے رہا تھا۔ انور خاں بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ بھی بارونڈا اور احمد کی لڑائی کے آخری مناظر دیکھ چکا تھا۔ ہم سب کی طرح اس کی آنکھوں میں تعجب تھا۔ انور اردو میں بولا۔ "یارو! اس کی ٹانگیں قبر میں لٹکی ہوئی ہیں پھر بھی اس نے احمد کو لمبا لٹا دیا ہے۔ اگر یہ خدائی خوار صحت مند ہوتا تو کیا کرتا؟"

انور خاں اس بات پر مجھ سے تھوڑا سا خفا بھی ہوا کہ میں نے مرہم پٹی کے وقت اس کی زنجیر تھوڑی سی ڈھیلی کر دی تھی۔ میں نے اپنی اس غلطی کو تسلیم کیا۔ بارونڈا کو دبوچ کر ہم نے ایک بار پھر اس کی اکلوتی ٹانگ کو دہرا کیا اور اسے زنجیر میں کسا۔ چونکہ ہم زیادہ تھے اس لیے بارونڈا کوئی خاص مزاحمت نہیں دکھا سکا۔ اسے دبوچتے وقت میں نے اس کے ہڈیوں بھرے جسم کی عجیب سی سختی کو محسوس کیا۔ مجھے لگا کہ اس کی ہڈیوں پر کسی انسان کی نہیں کسی بھینسے کی کھال منڈھی ہوئی ہے۔ سوکھی سڑی ہونے کے باوجود وہ جلد اپنے اندر عجیب سا کٹھور پن رکھتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ یہ بظاہر مدقوق و بیمار شخص کئی ایک سخت ضربات آسانی سے سہہ گیا تھا۔

احمد کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ ایک ہاتھ کے پنجے پر بھی گہری چوٹ آئی تھی۔ چوہان نے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ، میں تمہاری بینڈیج کر دوں۔"

احمد لنگڑاتا ہوا اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ بھی واضح طور پر حیران نظر آ رہا تھا۔ میں بھی ان کے ساتھ چل دیا۔

"یار! یہ کیا بلا ہے؟" چوہان نے پوچھا۔

"مجھے امید نا ہیں تھی کہ یہ اتنا سخت جان نکلے گا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ کسی وقت مارشل آرٹ کا ٹھیک ٹھاک کھلاڑی رہا ہے۔ دفاع اور حملے کی ہر باریکی کو سمجھتا ہے یہ۔" احمد کے لہجے میں بدستور حیرت موجزن تھی۔

"وہاں کشتی میں بھی اسحاق نے اسے بُری طرح مارا تھا۔" میں نے کہا۔ "دو چار ٹھوکریں میں نے بھی لگائی تھیں۔ لگتا تھا کہ ہم کسی جیتے جاگتے بندے کو نہیں، لکڑی کے پتلے کو مار رہے ہیں۔ اس وقت یہ سخت نشے میں تھا۔ ہم نے سمجھا تھا، شاید نشے کی وجہ سے یہ ساری چوٹیں جھیل گیا ہے۔"

"اس کا کوئی اتا پتا معلوم ہونا چاہیے۔ پھر ہی کوئی جانکاری ہو سکتی ہے۔ اس کے بارے میں۔" انور خاں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

انور خاں جب بھی بارونڈا کے بارے میں کوئی بات کرتا تھا یا اس کی طرف دیکھتا تھا تو مجھے لگتا تھا کہ وہ اس کے بارے میں کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاید وہ اس سے پہلے بھی بارونڈا کو کہیں دیکھ چکا تھا۔

ڈاکٹر چوہان نے احمد کی مرہم پٹی کر دی۔ احمد عجیب گومگو کی کیفیت میں تھا۔ ایک طرح کی شرمندگی بھی اسے محسوس ہو رہی تھی تاہم اس شرمندگی پر حیرت اور اُلجھن کے تاثرات غالب تھے۔

چوہان نے کہا۔ "اپنی شکل وصورت اور لہجے سے یہ شخص نیپال کا لگتا ہے لیکن جہاں تک میری جانکاری ہے۔ نیپالی تو مارشل آرٹس کے کوئی ایسے شوقین نہیں ہوتے۔"

"ڈاکٹر چوہان! مجھے آپ کی بات سے اتفاق نا ہیں۔" احمد نے کہا۔ "کھٹمنڈو وغیرہ میں، مَیں نے خود کک باکسنگ اور کراٹے وغیرہ کے بڑے بڑے کلب دیکھے ہیں اور پھر آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ جیکی جیسا خوفناک فائٹر جس نے یورپ تک تہلکہ مچایا تھا اور اسٹریٹ فائٹنگ میں ایشیائی چیمپئن مانا جاتا تھا، نیپال سے ہی تعلق رکھتا تھا۔"

مارشل آرٹس میں جیکی کا نام تو میں نے بھی سن رکھا تھا۔ لاہور میں جب گاہے بگاہے مجھ

پر مارشل آرٹ کا جنون سوار ہوتا تھا اور میں نئے سرے سے اپنے پرانے کلب میں جانا شروع کرتا تھا تو پھر مارشل آرٹ کی سرگرمیوں کے حوالے سے بہت سی خبریں میرے کانوں تک بھی پہنچا کرتی تھیں۔ پاکستان میں کیا ہو رہا ہے، کون کون سے بڑے کھلاڑی اُبھر کر سامنے آ رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مارشل آرٹس سے متعلق رسائل و جرائد بھی کلب میں آتے تھے جو معلومات میں اضافے کا سبب بنتے تھے۔

ہمارے درمیان کچھ دیر تک عجیب الخلقت بارونڈا کے بارے میں بات ہوتی رہی۔ پھر انور خاں نے ہمیں دہانے کی طرف بلا لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم اپنے مورچے سے زیادہ دور نہ جائیں اور وہ ٹھیک ہی کہتا تھا، حالات ہمیں اس کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ احمد بھی اپنی پوزیشن پر میرے برابر آ کر بیٹھ گیا لیکن وہ چپ چپ تھا۔ وہ واضح طور پر ہزیمت محسوس کر رہا تھا۔ فنِ حرب اس کی شناخت تھا اور آج ایک لاغر شخص نے اس فن میں اسے نیچا دکھایا تھا۔

شام کے وقت میں سرنگ کے عقبی حصے میں گیا تو یہاں دھپ دھپ کی آوازیں آئیں۔ آگے جا کر دیکھا تو احمد پسینے میں شرابور مشق میں مصروف تھا۔ دو دن پہلے اس نے ایک بیگ میں ریتلی مٹی بھر کر اسے سرنگ کی چھت سے لٹکا دیا تھا اور صبح کے وقت اس پر طبع آزمائی کرتا تھا لیکن آج وہ چونکہ تناؤ میں تھا اس لیے شام کے وقت بھی لگا ہوا تھا، میں اس کو سینڈ بیگ پر ککس برساتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کی ککس میں جان تھی۔ جو ضربات وہ سینڈ بیگ کو لگا رہا تھا، وہ واقعی ایک چمپئن کی ضربات نظر آتی تھیں۔ اس کا اسٹیمنا بھی قابلِ تعریف تھا۔

میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ میں بھی کراٹے میں دلچسپی رکھتا ہوں اور لاہور میں کئی سال تک ایک کلب سے منسلک رہا ہوں۔ ہم جب باتیں کر رہے تھے، تھوڑے ہی فاصلے پر موجود بارونڈا نے ایک بار پھر واویلا شروع کر دیا۔ وہ شکستہ آواز میں سب کو گالیاں دے رہا تھا اور اپنے لیے شراب طلب کر رہا تھا۔ انگریزی کے علاوہ وہ گاہے بگاہے نیپالی میں بھی بولنے لگتا تھا۔ اس کی نیپالی سننے کے بعد اب اس میں شک شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ وہ نیپال سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

میں اس کے قریب جا بیٹھا۔ وہ انگریزی میں بولا۔ ''اپنی یہ رائفل یہاں ...... یہاں میرے دل پر رکھو اور گولی چلا دو۔ میں اب جلدی مرنا چاہتا ہوں۔ شراب کے بغیر میرے لیے سانس لینا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ تم سب کے سب اپنے بال بچوں سمیت جہنم میں جاؤ گے۔ کیونکہ تم نے ایک بندے کو جیتے جی جہنم میں ڈال دیا ہے۔''

میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر ہولے سے کہا۔ ''تم تسلی رکھو۔ میں رات کو تمہارے لیے کچھ نہ کچھ کروں گا لیکن شور شرابا کرتے رہو گے تو پھر کچھ نہیں ہو سکے گا۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''تم شراب کی بات کر رہے ہو؟''

''کہا ہے نا آہستہ بولو۔'' میں نے اسے سرگوشی میں ڈانٹا۔

وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

رات کو پھر دوسرے پہر تک ہماری ڈیوٹی تھی۔ یعنی میں، فیروز، اسحاق اور ہمیش۔ ایک بجے کے قریب ہم سونے کے لیے لیٹ گئے۔ میرے پہلو میں ہمیش جلد ہی سو گیا لیکن میں جاگتا رہا۔ کچھ دیر بعد میں اُٹھا اور اس تاریک گوشے میں پہنچ گیا جہاں کینوس کا بڑا بیگ رکھا تھا۔ اسی بیگ میں آج ماریا فرگوسن کے لیے ضروری اشیاء آئی تھیں۔ ان ضروری اشیاء میں، مَیں نے اعلیٰ درجے کی شراب کی دو بوتلیں بھی دیکھی تھیں۔ میں نے بغیر کوئی آواز پیدا کیے ایک بوتل نکالی اور سرنگ کے اس عقبی حصے میں پہنچ گیا جہاں ایک چٹائی پر ایک بازو اور ایک ٹانگ والا بارونڈا دراز تھا۔ میرے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ اس لالٹین کی روشنی میں بارونڈا کسی کیچوے کی طرح حقیر اور بے جان نظر آ رہا تھا لیکن اس کیچوے کے اندر جو بجلی چمکتی تھی اس کا مشاہدہ آج سہ پہر ہم نے کیا تھا۔

مجھے دیکھ کر بارونڈا کی نقاہت بھری آنکھیں چمک اُٹھیں۔ پھر جب اس کی نگاہ میرے ہاتھ میں پکڑی بوتل پر پڑی تو وہ یوں اُٹھ کر بیٹھ گیا جیسے اسے کسی طاقتور اسپرنگ نے دھکیلا ہو۔ میں جانتا تھا کہ وہ بلانوش ہے اور اگر میں نے بوتل اسے تھمائی تو ہو سکتا ہے کہ وہ تھوڑی دیر میں ہی اسے ختم کر ڈالے۔ ''مجھے دو۔ میرا گلا خشک ہو رہا ہے۔'' وہ تڑپ کر بولا۔

''لیکن تمہیں صرف اتنی ہی پینی ہو گی جس سے تمہارا کام چل جائے۔ میرے پاس صرف ایک ہی بوتل ہے۔''

میں نے اسے گلاس میں ڈال کر دی۔ وہ اپنے اکلوتے ہاتھ سے غٹا غٹ چڑھا گیا اور ایک بار پھر کسی بھک مانگے کی طرح میلا کچیلا گلاس میرے سامنے کر دیا۔ میں نے دوبارہ اس کا گلاس بھرا۔ وہ یہ بھی سانس لیے بغیر پی گیا۔ تیسرے پیگ کے بعد اس کی طبیعت کچھ بحال ہو گئی۔ اس نے اپنا سر پیچھے کی طرف پھینک دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اسے نشہ چڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کے چہرے کا دایاں رُخ نظر آ رہا تھا۔ اسی رُخ میں عمران کے چہرے کی جھلک تھی۔ میں بے ساختہ اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ مجھے عمران کی مسکراہٹ یاد آئی۔ اس کی آواز، اس کے بالوں کا اسٹائل، میرا دل دُکھ سے بھر گیا۔ وہ جا چکا تھا۔ اس

خونی رات میں ڈیک نالے کے قاتل پانی نے اسے نگل لیا تھا۔ کچھ دن پہلے گھوڑا میں میڈم صفورا نے بھی یہی بتایا تھا کہ وہ عمران کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ یعنی وہ مجھے عمران کے بارے میں کوئی اچھی خبر نہیں سنا سکی تھی۔ لیکن پتا نہیں کیوں...... کسی وقت میرا دل پکار پکار کر یہ کہنے لگتا تھا کہ میں اسے ضرور دیکھوں گا۔ کم از کم ایک بار ضرور دیکھوں گا۔ کہیں نہ کہیں...... کسی نہ کسی جگہ، کسی چمکیلی صبح کو، کسی سرمئی شام کو یا کسی ویسی ہی تاریک رات کو جب اسے آخری بار دیکھا تھا۔ اس خیال کی کوئی بھی وجہ نہیں تھی لیکن یہ ایک دیوانی آس بن کر میرے دل میں پیوست رہتا تھا۔ رات کے اس پہر جب چارسُو خاموشی تھی، اس سرنگ سے باہر جنگل میں جانوروں کی آوازیں گونجتی تھیں اور کبھی کبھی دہانے کی طرف آسمانی بجلی کی چمک دکھائی دیتی تھی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے میرے دل کی کیفیت عجیب ہوگئی اور یہ کیفیت اکثر طاری ہو جاتی تھی۔ بچھڑنے والے اتنی شدت سے یاد آتے تھے کہ دل کی رگیں ٹوٹنے لگتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ جانکاہ خیال دل میں پیدا ہوتا تھا کہ میں واپس لوٹنے میں بہت دیر کر چکا ہوں۔ دو ڈھائی سال کا عرصہ میں نے مکمل بے خبری میں گزار دیا ہے، حالانکہ اس وقت کا ایک ایک لمحہ میرے لیے بے حد قیمتی تھا۔

میں جاگتا رہا۔ میری بیتابی بڑھتی رہی۔ میں اُٹھ کر سرنگ میں ٹہلنے لگا۔ جسم جیسے بخار میں پھنک رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ساری دیواریں توڑ کر سارے ناتوں سے منہ موڑ کر آندھی طوفان کی طرح یہاں سے نکل جاؤں۔ سامنے ہی وہ سینڈ بیگ جھول رہا تھا جس پر احمد ایکسر سائز کرتا تھا۔ اپنے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرنے میں اس سینڈ بیگ کے ساتھ مصروف ہوگیا۔ مارشل آرٹس کے حوالے سے میں نے جو کچھ سیکھ رکھا تھا، وہ میرے اندر موجود تھا۔ بس اس پر وقت کی گرد پڑی ہوئی تھی۔ میں نے سینڈ بیگ پر طبع آزمائی شروع کی تو جیسے وقت کی پڑی ہوئی گرد صاف ہونے لگی۔ سب کچھ تازہ ہوگیا اور میں محسوس کر رہا تھا کہ یہ تازگی کچھ اور طرح کی ہے۔ گئے برسوں میں بھی میں سینڈ بیگ کے ساتھ بہت وقت گزار چکا تھا لیکن آج کی ملاقات کچھ اور طرح کی تھی۔ اس ملاقات میں وہ بے پناہ حرارت بھی شامل تھی جو پچھلے چند ہفتوں میں میرے اندر پیدا ہوئی تھی۔ اس حرارت کے کچھ ماخذ تھے۔ اپنی ماں کا مرا ہوا چہرہ...... عمران کے سینے پر لگتا ہوا رائفل کا برسٹ...... سیٹھ سراج کا منحوس چہرہ...... اور پھر آخری منظر...... جو شاید اپنی تازگی کی وجہ سے سب سے زیادہ تکلیف دیتا تھا۔ جارج گورا کے بیڈ روم کا بند ہوتا دروازہ اور اس کے پیچھے اوجھل ہوتا سلطانہ کا زرد چہرہ۔

میں سینڈ بیگ پر اندھا دھند مکے اور ٹھوکریں برساتا چلا گیا۔ میری لگائی ہوئی ضربات

کی آواز سرنگ میں دور تک جا رہی تھی لیکن میرے ساتھیوں میں سے کوئی نہیں آیا۔ کچھ تو سو رہے تھے اور جو جاگ کر پہرا دے رہے تھے انہوں نے یہی سمجھا کہ شاید احمد اپنی ورزش میں مصروف ہے۔ میں جب ہانپ جاتا تو تھوڑی دیر کے لیے رُک جاتا۔ سانس بحال ہوتی تو پھر زور آزمائی شروع کر دیتا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے قریب اندھیرے میں موجود ہے اور مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا اور حیران ہوا۔ وہ بارونداتھا۔ وہ گھسٹتا ہوا یہاں پہنچا تھا اور نہ جانے کب سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ''تم یہاں؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ہاں...... اگر تم مجھے اپنی بوتل میں سے ایک بڑا پیگ اور پلا دو تو میں تمہیں تمہارے اس مارشل آرٹ کے بارے میں ایک بڑے کام کی بات بتاؤں گا۔'' وہ انگریزی میں بولا۔

''پہلے بتاؤ کہ تم یہاں کیسے پہنچے؟'' میں نے جیب سے چھوٹی ٹارچ نکال کر اس کا ننگ دھڑنگ جسم دیکھا۔ اس کی ٹانگ بدستور زنجیر میں جکڑی ہوئی تھی۔

''اس بات کو چھوڑو۔ پیاسا کنویں کے پاس پہنچ ہی جاتا ہے۔'' شراب پینے کے بعد اس کی آواز کی لڑکھڑاہٹ کافی کم ہوگئی تھی اور وہ قدرے توانا بھی نظر آتا تھا۔

''تم مجھے کام کی بات کیا بتاؤ گے؟ کیا تمہارا تعلق فائٹنگ آرٹ سے رہا ہے؟''

''بس تھوڑا بہت۔ کھٹمنڈو میں استاد کھلاڑیوں کو دیکھتا رہا ہوں۔ تم مجھے چند گھونٹ دو، میں تمہیں کچھ شاندار ٹپس دوں گا۔'' وہ للچانے والے انداز میں بولا۔

پتا نہیں کیوں میں اس سے ہمدردی محسوس کرتا تھا۔ عمران کی شباہت کی جھلک بھی ایک وجہ ہو سکتی تھی لیکن شاید اس کے علاوہ بھی کچھ تھا۔

میں نے اسے ایک درمیانے سائز کا پیگ اور دیا۔ یہ پیگ اس نے ذرا تحمل سے پیا اور خاصا مسرور نظر آنے لگا۔ اس کے اندر کی بے پناہ تلخی اور جھلاہٹ بھی قدرے کم نظر آنے لگی۔ وہ اپنے لنگوٹ کے اندر اپنی دبلی پتلی رانوں کو کھجاتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو...... جب تم مکا چلاتے ہو تو اس میں صرف اپنے بازو اور کندھے کی طاقت استعمال کرتے ہو۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ تم اپنی طاقت کا صرف چوتھا یا پانچواں حصہ استعمال کرتے ہو۔ تمہارے مکے میں تمہارے پورے جسم کی طاقت استعمال ہونی چاہیے۔ پاؤں سے لے کر سر تک پورے جسم کی۔''

وہ خود کو زمین پر کھسکاتا ہوا سینڈ بیگ کے پاس پہنچ گیا پھر اس نے مجھے سینڈ بیگ پر مکا چلا کر دکھایا۔ ''اس طرح۔'' وہ بولا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا تھا لیکن واقعی میں نے محسوس کیا کہ

اس کے کہنے میں کوئی بات ہے۔

اس نے جیسے ہانپ کر دیوار سے ٹیک لگالی۔ ذرا دیر کھانستا رہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے ماہرانہ انداز میں بولا۔ ”توازن...... فائٹنگ آرٹ میں توازن کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ میں تمہیں دیکھ رہا تھا۔ جب تم ضرب لگاتے ہو تو یہ تصور کر لیتے ہو کہ یہ ضرب تمہارے مقابل کو ضرور لگے گی۔ سینڈ بیگ کی حد تک تو یہ سوچ درست ہے لیکن جب تمہارا مدِمقابل متحرک ہوتا ہے تو پھر کوئی ضرب اس کو لگتی ہے، کوئی نہیں لگتی۔ تم جس انداز میں ضرب لگاتے ہو، وہ خطا ہونے کی صورت میں تمہارے توازن کو بُری طرح بگاڑ دے گی اور ہوشیار مدِمقابل اس سے فوراً فائدہ اُٹھائے گا۔“

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ شراب ملنے کے بعد وہ بالکل بدلا ہوا شخص نظر آتا تھا کہ یہ بُری شے اس کے جسم میں پہنچ کر اثر دکھا رہی تھی۔ وہ بڑے یقین سے بولا۔ ”اگر تم مقابلوں میں حصہ لیتے رہے ہو تو مجھے یقین ہے کہ تمہارے سر کے پچھلے حصے اور دائیں کندھے پر ضرور سخت چوٹیں آئی ہوں گی اور اس کی وجہ یہی توازن کی کمی ہے۔“

میں ایک دم سناٹے میں رہ گیا۔ بارونڈا نے یہ بات سو فیصد درست کہی تھی۔ کلب اور انٹر کلب مقابلوں میں اکثر میرے دائیں کندھے پر چوٹ لگ جاتی تھی۔ ایک ایسی ہی چوٹ کی وجہ سے ایک مرتبہ میں ایک فائنل مقابلے میں پہنچتے پہنچتے رہ گیا تھا۔ یہ کئی برس پرانی بات تھی۔

میں تعجب سے اس عجیب وضع مدقوق شخص کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”تم کہتے ہو کہ تم کھٹمنڈو میں استاد کھلاڑیوں کے مقابلے دیکھتے رہے ہو انہیں دیکھ دیکھ کر تمہیں خود بھی کھیلنے کا شوق پیدا ہوا ہوگا؟“

”ہاں...... کسی وقت میں خود بھی کھیلتا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”نیپال کے ایک کھلاڑی جیکی کا نام بہت مشہور ہوا تھا۔ ہمارے کلب میں ”انٹرنیشنل کراٹے پلیئرز“ کے ساتھ جیکی کی تصویر بھی لگی ہوئی تھی۔ کیا تم نے کبھی اس کو دیکھا؟“

”ہاں...... ہاں...... جیکی! وہ تو نیپال کا چمکتا ستارہ تھا۔ اس نے تھائی اور جاپانی فائٹرز کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ زبردست کھلاڑی...... زبردست کھلاڑی تھا۔“ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔

”اب وہ کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اب وہ نیپال چھوڑ چکا ہے۔ ویسے بھی اب وہ اس فیلڈ میں نہیں ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ وہ مارشل آرٹ کو خیر باد کہہ چکا ہے؟“

”نہیں......“ اس نے سر کو دائیں بائیں ہلایا۔ اس کے لمبے بال اس کے چہرے پر جھولنے لگے۔ ”جو شخص ایک بار سچے دل کے ساتھ مارشل آرٹ سے منسلک ہو جاتا ہے، وہ پھر کبھی بھی اسے مکمل طور پر نہیں چھوڑ سکتا۔ ناٹ ایٹ آل اور جیکی تو ایسا شخص ہے جس کے خون میں یہ آرٹ رچ بس چکا ہے۔ وہ اس کے علاوہ کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا۔ وہ بڑا انوکھا شخص ہے۔“

”اگر کوئی شخص اس سے ملنا چاہے تو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں...... میں تمہیں اس کا مکمل پتا بتا سکتا ہوں۔ یہ پتا...... یہ پتا شاید ہی کسی کو معلوم ہو لیکن اس کے لیے...... اس کے لیے...... تمہیں تھوڑی سی اور مہربانی کرنا پڑے گی۔“ اس نے دور کونے میں رکھی ہوئی واٹ 69 کی بوتل کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

”تم حد سے بڑھ رہے ہو۔“ میں نے کہا۔

وہ ہنسا اور چہرے کے جھاڑ جھنکاڑ بالوں میں سے اس کے میلے دانت جھلک دکھانے لگے۔ میں نے اسے پہلی بار ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ ”تم حد کی بات کر رہے ہو...... اور حد تو ابھی شروع بھی نہیں ہوئی لیکن مجبوری ہے، تم دو ڈبل پیگ اور دے دو تو میرا گزارہ ہو جائے گا۔“

”اسپرٹ نے تمہارا بیڑا غرق کر دیا ہے اور پیو گے تو تمہاری ہڈیاں بھی کھوکھلی ہو کر ٹوٹنے لگیں گی۔“

”یہی تو میں چاہتا ہوں کہ یہ ہڈیاں جلد ٹوٹنا شروع ہو جائیں۔“ اس نے بے پروائی سے کہا پھر بُری طرح کھانسنے لگا۔ کھانستے کھانستے دہرا ہو گیا۔ ”دیکھو...... میرا پہلا نشہ بھی غارت ہو رہا ہے۔ اگر میں دو پیگ اور لگا لوں گا تو میرا پہلا نشہ بھی بچ جائے گا اور میری آخری راتوں کی یہ رات بھی تھوڑی سی خوبصورت ہو جائے گی اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے بدلے میں تمہیں نیپال کے اکلوتے ”سپر اسٹار مارشل“ کا پتا بھی بتاؤں گا۔“ وہ شستہ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔

میں کچھ دیر سوچتا رہا، پھر میں نے بوتل اُٹھائی اور قریباً نصف گلاس بھر کر اس کے سوکھے سڑے ہاتھ میں تھما دیا۔ یہ گلاس اس نے غٹا غٹ چڑھانے کے بجائے گھونٹ لے لے کر پیا۔ اس کے نیم مُردہ چہرے پر عجیب سی تمتماہٹ آتی جا رہی تھی۔ حسبِ وعدہ مجھے دوسرا گلاس

بھی دینا پڑا۔ اب بوتل میں فقط تین چار انچ شراب ہی باقی رہ گئی تھی۔ بوتل میں نے ایک طرف چھپا دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ عام شرابیوں کی طرح ساتھ میں کچھ کھانے کے لیے بھی مانگے گا لیکن اس نے کچھ نہیں مانگا۔ شاید اس کی سانسوں کی ڈور بس شراب کے ساتھ ہی بندھی ہوئی تھی۔

وہ دوسرے گلاس میں سے نصف ''آگ'' اپنے اندر انڈیل چکا تو میں نے کہا۔ ''تم مجھے جیکی کے بارے میں کچھ بتانے جا رہے تھے۔''

''تم...... اس سے ملنا...... چاہتے ہو؟'' وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔

''ہوسکتا ہے کہ کسی وقت ایسا موقع آ ہی جائے۔''

وہ عجیب ترنگ آمیز آواز میں بولا۔ ''تم کہتے ہو کہ تمہارے کلب میں جیکی کی تصویر لگی ہوئی تھی، کیا تم اس تصویر کو غور سے دیکھا کرتے تھے؟''

''ہاں...... لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''میرا مطلب ہے کہ اگر کبھی جیکی تمہارے سامنے آئے تو تم اسے پہچان سکتے ہو؟''

''میرا خیال ہے کہ پہچان سکتا ہوں۔''

''لیکن میرا خیال ہے کہ تم دھوکا کھا جاؤ گے۔ وقت کے ساتھ چہرے بہت بدل جاتے ہیں۔''

''تم...... کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے بُری طرح چونک کر پوچھا۔

''میں کہتا ہوں کہ تم دھوکا کھا جاؤ گے۔ جیسے دوسرے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ جیکی ان کے سامنے ہوتا ہے لیکن وہ اسے پہچان نہیں سکتے۔'' لالٹین کی زرد روشنی میں وہ عجیب ڈرامائی انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے لگا کہ میرے بدن کا سارا خون تیز رفتاری سے میرے سر کی طرف دوڑ پڑا ہے۔ پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ میں ساکت نظروں سے بارونڈا کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ اس کے لمبے بالوں اور چہرے کے جھاڑ جھنکاڑ میں مجھے کچھ جانے پہچانے خدوخال نظر آئے۔

وہ اپنے بدنما دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے پُر درد انداز میں مسکرایا۔ ''ہاں...... میرے بتائے بغیر ہی ٹھیک جگہ پر پہنچ گئے ہو۔ جیکی تمہارے سامنے ہے۔ نیپال کا درخشاں ستارہ، ایشیائی چیمپئن، انٹرنیشنل کراٹے سپر اسٹار، اسٹریٹ فائٹنگ کا بادشاہ۔ ہاں...... ہاں سب کچھ میں ہی ہوں۔''

''لیکن...... یہ...... کیسے ہوسکتا ہے؟''

''یہ دنیا ہے۔ یہاں سب کچھ ہوسکتا ہے۔ جہاں حکم جی جیسے شیطان ہوں، جہاں جارج اور اسٹیل جیسے بھیڑیئے ہوں، وہاں سب کچھ ہوسکتا ہے لیکن تمہیں ان چکروں میں پڑنے کی ضرورت نہیں...... بالکل ضرورت نہیں۔''

میں ہکا بکا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے وہ مناظر یاد آئے جب اسحاق اور میں اسے بدبودار کشتی میں بُری طرح پیٹ رہے تھے اور وہ ہماری ضربوں کو حیران کن آسانی سے جھیل رہا تھا اور پھر یہاں اس سرنگ میں آج صبح کا واقعہ نگاہوں میں تازہ ہوا۔ جواں سال صحت مند احمد اس لاغر معذور کو دست بدست لڑائی میں زیر کرنے میں ناکام رہا تھا۔

وہ نشے کی ترنگ میں بولا۔ ''اگر تم مجھ سے آٹو گراف لینا چاہتے ہو تو تمہیں مایوسی ہوگی۔ دراصل میں بائیں بازو سے لکھتا تھا اور میرا بایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا ہے۔ ہاں...... اگر تم میرا انٹرویو لینا چاہو تو لے سکتے ہو۔ تم یہ انٹرویو کسی اخبار یا ٹی وی چینل کو دے کر بہت پیسے بنا سکتے ہو۔ جیکی کے آخری انٹرویو کے طور پر یہ بڑی شہرت پائے گا۔ ہاں...... میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

وہ ایک بار پھر کھانسنے لگا۔

میں نے اس کے برہنہ بازو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں تمہارے بازو پر تو تمہارا نام بارونڈا لکھا ہوا ہے۔''

''لیکن بارونڈا کے آگے ''جے'' بھی تو لکھا ہوا ہے۔ یہ جیکی کے لیے ہے۔ میرا پیدائشی نام بارونڈا ہے لیکن جس نام نے شہرت پائی وہ جیکی ہے۔''

میں حیرت آمیز تجسس سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس مشہور و معروف شخص سے میری ملاقات بھانڈیل اسٹیٹ کے اس جنگل کی اس زمین دوز سرنگ میں ہوگی اور اس حال میں ہو گی۔ یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا تمہارا بازو اور ٹانگ کاٹے گئے تھے؟''

''تو تمہارا کیا خیال ہے، میں نے شوقیہ انہیں اپنے جسم سے علیحدہ کر دیا تھا؟''

''لل...... لیکن...... میرا مطلب ہے کہ تم حکم اور جارج کا نام لے رہے ہو۔ کیا یہ کام انہوں نے کیا ہے؟''

''دیکھو دوست! میں نے دو پیگ کے بدلے میں تمہیں جو کچھ بتانے کا وعدہ کیا تھا وہ میں نے بتا دیا ہے۔ اگر تم کچھ اور پوچھنا چاہو گے تو پھر اس کے لیے تمہیں کچھ اور مہیا کرنی پڑے گی۔ ویسے بہتر تو یہی ہے کہ اس موضوع کو نہ چھیڑو۔ تمہارا دل دُکھے گا اور میرا تو بہت زیادہ دُکھے گا۔ دیکھو...... کتنی پیاری رات ہے، ہوا ٹھنڈی ہے۔ باہر سے جنگلی پھولوں کی

خوشبو بھی آ رہی ہے۔ یہ سنو...... یہ سنو...... کہیں دور شاید کوئی چیتا چہک رہا ہے۔''

میں خاموش رہا۔ وہ خود ہی بولا۔ ''تم کہو گے، چیتا چہکتا نہیں، چلاّتا اور چنگھاڑتا ہے لیکن مجھے تو اس وقت چہکتا ہی لگ رہا ہے۔ ہر شے خوبصورت ہے۔ یہ سرنگ بھی اب اتنی بُری نہیں لگ رہی۔ میرا خیال ہے کہ باہر چاند بدلیوں میں سے جھانک رہا ہوگا۔ کاش! میں اس وقت اپنے گھر میں ہوتا، اپنی کشتی میں...... کیا تم کسی طرح اپنی کشتی تک جانے میں میری مدد کر سکتے ہو؟ تم مجھے اپنے سارے ساتھیوں میں سے بہتر لگے ہو۔ تم میری زبان بھی سمجھتے ہو۔ شاید میرے دل کی زبان بھی کچھ کچھ تمہاری سمجھ میں آ رہی ہو۔ میں اپنی کشتی میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کسی بھی وقت کام ختم ہو سکتا ہے۔ میں اپنی کشتی میں مرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم مجھے میری کشتی اور میری شراب تک پہنچا دو تو میں...... تو میں......'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

شاید وہ کہنا چاہتا تھا کہ میں زندگی بھر تمہارا احسان مند رہوں گا لیکن پھر اسے خیال آیا ہوگا کہ ابھی وہ اپنی زندگی کے مختصر ترین ہونے کا ذکر کر چکا ہے۔

اچانک دہانے کی طرف سے بلند آوازیں سنائی دیں۔ ان میں نمایاں آواز انور خاں کی تھی۔ وہ چلاّنے والے انداز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ یہ خطرے کی گھنٹی تھی۔ میں نے بارونڈا کو وہیں سینڈ بیگ کے قریب چھوڑا۔ بوتل اور رائفل تھامی۔ قریباً پچاس ساٹھ میٹر کا فاصلہ طے کر کے میں تیزی سے دہانے پر پہنچ گیا۔ یہاں صورتِ حال واقعی تشویشناک تھی۔ انور خاں ایک بالکل بدلا ہوا شخص نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ سرتاپا ایک جنگجو پٹھان تھا۔ اس نے ماریا کو سر کے بالوں سے بُری طرح جکڑا ہوا تھا اور اپنی رائفل کی نال اس کے سر سے لگا رکھی تھی۔ وہ ماریا کو بالکل سرنگ کے دہانے پر لے آیا تھا۔ انور خاں اور ماریا دونوں کا رُخ باہر کی طرف تھا۔

انور خاں دھاڑ رہا تھا۔ ''پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں کہتا ہوں پیچھے ہٹ جاؤ۔ نہیں تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ ابھی ختم ہو جائے گا۔''

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ دہانے سے باہر حکم جی کے مسلح گارڈز نے پیش قدمی کی کوشش کی ہے۔ وہ دہانے کے عین سامنے قریباً پندرہ میٹر کی دوری پر دو بڑے پتھروں کے پیچھے پوزیشن لینے کی کوشش میں تھے۔

انور خاں نے ہوائی فائر کیا۔ اس کے ساتھ ہی ماریا کو دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ فائر کی آواز سے ماریا چلاّ کر رہ گئی۔ انور خاں گرجا۔ ''میں صرف پانچ تک گنوں گا تم لوگ

واپس نہیں گئے تو میں اسے گولی مار دوں گا۔''

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''ہم تم سے بات کرنا چاہتا ہیں۔''

''بات کرنا چاہتے ہو تو پہلے پیچھے جاؤ۔ ہم کوئی ہوشیاری نہیں چلنے دیں گے۔ میں پھر کہتا ہوں، ابھی تمہارے سامنے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔'' انور خاں کی آواز میں ایسی دھاڑ تھی کہ اردگرد کی ہر شے لرزتی محسوس ہوئی۔

ماریا دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ وہ دہشت زدہ آواز میں پکاری۔ ''خدا کے لیے پیچھے چلے جاؤ۔ یہ مجھے مار ڈالے گا۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا مگر انور خاں نے سنی اَن سنی کر دی۔ وہ بلند آواز میں وقفے وقفے سے بولا۔ ''ایک...... دو...... تین......''

ماریا پھر چلاّئی۔ ''چلے جاؤ...... واپس چلے جاؤ۔''

ہم نے صاف دیکھا کہ پتھروں کے پیچھے سے مسلح گارڈز اُٹھے اور اُلٹے قدموں چلتے پیچھے ہٹنے لگے۔ مدھم چاندنی میں ان کی موومنٹ اور ان کے ہاتھوں کا جدید اسلحہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

وہ جب تک نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئے انور خاں، ماریا کو دبوچے اپنی جگہ بالکل الرٹ کھڑا رہا۔ اس کے عقب میں احمد تھا۔ شور سن کر اسحاق اور فیروز بھی اُٹھ کر آ گئے تھے۔ ان سب کی رائفلوں کا رُخ باہر کی طرف تھا۔

دو چار منٹ بعد یہ ہنگامہ سرد پڑ گیا۔ انور خاں نے سب کو تفصیل بتائی کہ کس طرح اسے اور چوہان کو درختوں کے پیچھے حرکت محسوس ہوئی اور کس طرح وہ الرٹ ہوئے۔ ماریا کو دہانے سے ہٹا کر دوبارہ اس کی جگہ پر پہنچا دیا گیا۔ احمد پوری طرح چوکس اس کے سر پر کھڑا رہا۔

اس واقعے کے بعد کوئی بھی سونے کے لیے نہیں گیا۔ ڈاکٹر چوہان مسلسل ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائے اپنی پوزیشن پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہمیش نے خشک دودھ سے چائے بنائی۔ چائے پیتے ہوئے ہم باتوں میں مصروف رہے۔ ایک زبردست تناؤ کے بعد سب کے اعصاب قدرے پُرسکون تھے۔ میں نے انور خاں اور چوہان کو بتایا کہ مدقوق نیپالی بارونڈا دراصل کون ہے۔

میرے انکشاف نے سب کو حیران کیا پھر ایک دم انور خاں کے چہرے کے تاثرات بدلے۔ اس نے چائے کی پیالی ایک طرف رکھی اور دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے لرزاں آواز

میں بولا۔ ''اوہ خدایا...... اسی لیے میں بار بار سوچ رہا تھا کہ اس بندے کی شکل اور آواز کی وجہ سے کچھ یاد کیوں آ رہا ہے۔ اب میں سب کچھ جان گیا ہوں۔ سب کچھ جان گیا ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' چوہان نے پوچھا۔

''میں نے اس بندے کو دو سال تقریباً دو سال پہلے راج بھون میں دیکھا تھا۔ اس نے پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں بڑی چمک دار سیاہ جوتی تھی اور شاید ٹائی بھی لگا رکھی تھی۔ ہاں...... بہت اسمارٹ اور چاق و چوبند نظر آتا تھا۔ راج بھون کے بڑے ہال میں شاید کوئی پارٹی تھی۔ کافی لوگ جمع تھے۔ میں نے وہاں اس بندے کو پہلی بار دیکھا تھا۔ میں نے موہن کمار سے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ یہ ایک چیمپئن فائٹر ہے۔ جوڈو کراٹے کا بہت بڑا کھلاڑی ہے۔ ہاں...... مجھے سب کچھ یاد آ رہا ہے۔''

''اس کی راج بھون میں آمد کا مقصد کیا تھا؟'' چوہان نے ٹیلی اسکوپ سے نظریں ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے موہن کمار سے یہی سوال کیا تھا لیکن اسے پتا نہیں تھا۔ بعد میں موہن کمار کے بھائی نے بتایا تھا کہ جارج گورا صاحب کی بہن کو مارشل آرٹ وغیرہ سیکھنے کا شوق ہے۔ اس بندے کو بھاری معاوضہ دے کر اسی کام کے لیے یہاں بلایا گیا ہے۔ یہ جارج گورا صاحب کی بہن کو ٹریننگ دینے کے علاوہ حکم جی کے ذاتی گارڈز کے دستے کو بھی ٹریننگ دے گا۔ اس ٹریننگ کے لیے حکم جی اپنے گارڈز کے دستے میں سے ایک سو بندے چنیں گے۔ مجھے وہ ساری باتیں اب اچھی طرح یاد آ رہی ہیں۔''

چوہان نے ٹیلی اسکوپ ایک طرف رکھتے ہوئے بے حد حیران لہجے میں پوچھا: ''تمہارا مطلب ہے کہ یہ بندہ ماریا فرگوسن کو سکھشا دینے کے لیے یہاں آیا تھا؟''

''صرف ماریا کو سکھشا دینے کے لیے نہیں۔ حکم جی کے ذاتی گارڈز کو ٹرینڈ کرنے کے لیے بھی۔ اس بندے سے ان دونوں کاموں کا معاوضہ طے ہوا تھا۔ مجھے ٹھیک سے تو پتا نہیں لیکن اندازہ ہے کہ یہ بہت بھاری معاوضہ رہا ہوگا لیکن پھر......''

''پھر کیا؟'' چوہان نے پوچھا۔

''کچھ دن تو یہ بندہ راج بھون میں نظر آیا تھا پھر اچانک ہی اوجھل ہو گیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب زیادہ بارشوں کی وجہ سے بڑی ندی کے دو بند ٹوٹ گئے تھے اور اسٹیٹ میں زبردست سیلاب آ گیا تھا۔ نل پانی میں بھی کافی نقصان ہوا تھا۔ دونوں بھائیوں نے وقتی طور پر رنجشیں بھلا دی تھیں اور ایک دوسرے کے علاقے میں امدادی کاموں کے لیے رضا کار

بھیجے تھے۔ میں بھی ڈیڑھ دو ماہ تک دن رات مصروف رہا تھا۔ انہی دنوں میں یہ بندہ کہیں اوجھل ہوا تھا۔ بعد میں جب حالات ٹھیک ہو گئے تو میں نے ایک دو دفعہ موہن کمار سے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ واپس چلا گیا ہے۔''

چوہان نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''لیکن وہ واپس نہیں گیا تھا۔ وہ یہیں پر تھا اور بُری حالت میں تھا۔''

''ہاں...... یہ گہرا چکر معلوم ہوتا ہے۔'' انور خاں نے چائے کا گھونٹ بھر کر کہا۔ انور کسی داستان گو کی طرح ہمارے درمیان بیٹھا تھا اور ہم ہمہ تن اس کی طرف متوجہ تھے۔ پھر وہ ایک دم اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ یقین کرنا چاہتا ہوں کہ یہ وہی ہے۔''

انور خاں نے مجھے بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے ساتھ چل دیا۔ ایک نسبتاً کشادہ جگہ پر چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایسی ہی ایک کھردری چٹائی پر ماریا پہلو کے بل پڑی تھی۔ رات کے وقت اسحاق اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف موڑ کر نائیلون کی رسّی سے باندھ دیتا تھا۔ وہ اسے کسی طرح کی رعایت دینے کو تیار نہیں تھا اور اب ہم بھی سمجھ گئے تھے کہ ماریا رعایت کی مستحق نہیں ہے۔ فیروز کی ٹانگ پر گولی کا زخم اس کا ثبوت تھا۔ انور خاں میرے پہلو میں چلتے ہوئے بولا۔ ''اس بندے کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہم اسے پہلے سے جانتے ہیں۔''

''آپ بے فکر رہو۔'' میں نے کہا۔

ہم اس جگہ پر پہنچے جہاں بارونداکسی کیچوے کی طرح سمٹ سمٹا کر لیٹا ہوا تھا۔ وہ سو رہا تھا۔ اس کے منہ سے الکحل کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔

''اسے شراب کہاں سے ملی؟'' انور خاں نے پُر حیرت سرگوشی کی۔

''یہ وہ شراب ہے جو ماریا کے لیے آئی تھی۔'' میں نے بھی مدھم لہجے میں جواب دیا۔

لالٹین کی روشنی میں انور خاں نے قریب سے بغور باروندا کا چہرہ دیکھا اور پھر پیچھے ہٹ آیا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ انور کا مطلب تھا کہ یہ وہی ہے۔

ہم بغور اس کے کٹے ہوئے بازو اور ٹانگ کا جائزہ لیتے رہے۔ ٹانگ کو ران پر سے کاٹا گیا تھا۔ بمشکل چھ سات انچ ران، جسم کے ساتھ موجود تھی۔ بازو کہنی کے اوپر سے کٹا ہوا تھا۔ یہ دونوں زخم یقیناً ڈیڑھ دو سال پُرانے تھے۔ ٹانگ کا زخم تو بالکل مندمل ہو چکا تھا لیکن کہنی کے زخم کے ساتھ کوئی مسئلہ تھا۔ یہاں میلی کچیلی سی پٹی بندھی ہوئی تھی اور کسی دوا کی بُو بھی آتی

تھی۔

ہم خاموشی سے واپس لوٹ آئے۔ راستے میں انور خاں نے کہا۔ ''پتا چل رہا ہے کہ یہ حکم جی کے ظلم کا ایک اور شاہکار ہے۔ لیکن یہ اس حال تک پہنچا کیسے...... اور پچھلے دو سال میں رہا کہاں ہے؟''

میں نے کہا۔ ''یہ تھوڑا تھوڑا مجھ سے کھل رہا ہے۔ اگر کہیں سے شراب مل جائے تو میں اس سے سب کچھ اُگلوا سکتا ہوں۔''

''شراب کی ایک اور بوتل ماریا والے بیگ میں موجود ہوگی۔''

''ہوسکتا ہے اتنی سے کام نہ چلے۔ یہ بلانوش ہے۔ پانی کی طرح پی جاتا ہے۔''

''یہ تو اس کی حالت سے ہی ظاہر ہے۔ بہرحال اگر اور کی ضرورت پڑے تو ہم باہر سے بھی منگوا سکتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ ماریا کو چاہیے۔''

شام سے ذرا پہلے میں ایک بار پھر باروندا کے پاس جا بیٹھا۔ اس بار جانی واکر کی چم چم کرتی بوتل اور گلاس میرے پاس تھے۔ باروندا کا نشہ ٹوٹے اب کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ بوتل دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ میں اس کے لیے تھوڑا سا ہنٹر بیف بھی لایا تھا۔ یہ بیف بھی ماریا کے سامان میں ہی آیا تھا۔

کل والا عمل پھر شروع ہوا اور تین چار گلاس ''سیال آتش'' اپنے اندر انڈیلنے کے بعد باروندا جیکی پھر ترنگ میں آ گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک مُردہ مرتے مرتے پھر زندہ ہو گیا ہے۔ وہ پھر اپنی کشتی کو یاد کرنے لگا اور میری منت کرنے لگا کہ میں اس کی مدد کروں اور اسے واپس کشتی میں پہنچا دوں۔ اسے یہ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ہم اسے پکڑ کر یہاں کیوں لے آئے ہیں اور اس سے کیا چاہتے ہیں۔

میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ اسے یہاں پکڑ کر لانے والا میں ہوں کیونکہ اس کی صورت میں مجھے اپنے ایک بہت ''پیارے'' کی جھلک نظر آئی تھی۔ لیکن اگر میں اسے یہ بتاتا تو وہ مجھے اپنی مصیبت کا ذمے دار قرار دے سکتا تھا۔ لہٰذا میں اس حوالے سے خاموش رہا۔ میں نے اسے صرف اتنا بتایا کہ حکم کے غیر ملکی دوست جارج گورا نے ایک مسلمان لڑکی پہ ظلم کیا ہے۔ اس ظلم کے نتیجے میں زرگاں کے بہت سے لوگوں نے بغاوت کر دی ہے۔ ہم بھی ان باغیوں میں شامل ہیں اور پناہ کے لیے یہاں نل پانی کے نواح میں چھپے ہوئے ہیں۔

میری اس گفتگو کا باروندا پر اچھا اثر ہوا لیکن اگر میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ بھی اس حوالے سے کچھ بولے گا تو یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ لگتا تھا کہ اسے اپنی کشتی اور کشتی میں رکھی ہوئی شراب

کے علاوہ کسی شے سے کوئی غرض ہی نہیں ہے۔ اس کو ابھی تک اس سوال کا جواب بھی نہیں ملا تھا کہ ہم اسے یہاں کیوں لائے ہیں؟

میں نے اسے بتایا۔ ''تم بے ہوش ہو گئے تھے۔ ہمیں ڈر لگا تھا کہ کہیں اس بے ہوشی میں تمہاری جان نہ چلی جائے۔ ہم وہاں رُک بھی نہیں سکتے تھے۔ اس لیے ہمارے لیڈر انور خاں کو یہ مناسب محسوس ہوا کہ تمہیں ساتھ لے لیا جائے۔''

''بہت بُرا کیا۔ میں جتنی جلدی فارغ ہو جاتا اتنا ہی اچھا تھا۔'' وہ فارغ کو مرنے کے معنی میں استعمال کر رہا تھا۔ اس کے لہجے میں اُداسی تھی۔

''لگتا ہے تمہیں بھی حکم اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے بہت اذیت اُٹھانی پڑی ہے۔'' میں نے اسے اُکسایا۔

''نہیں...... کوئی اذیت نہیں۔'' وہ عجیب انداز میں مسکرایا۔ ''تم نے وہ مقولہ نہیں سنا...... محبت میں گزاری ہوئی چند گھڑیاں، بے محبت زندگی کے سو برسوں سے بہتر ہوتی ہیں۔ نہیں کوئی اذیت نہیں۔'' اس نے اپنا سر دائیں بائیں ہلایا تو اس کے بال چہرے پر جھولنے لگے۔

میں اس کے پاس بیٹھا رہا۔ باتیں کرتا رہا۔ وہ پیاز کے چھلکوں کی طرح تہ در تہ تھا۔ اس کے اندر جھانکنا آسان نہیں لگتا تھا۔ میں اسے گھیر گھار کر ایک پوائنٹ پر لایا لیکن وہ ایک دم پلٹا کھا گیا۔ شراب کے نشے میں ہاتھ لہرا کر بولا۔ ''چھوڑو ان باتوں کو۔ ایسی باتیں تو تم کسی کے ساتھ بھی کر سکتے ہو۔ دیکھو...... تمہارے سامنے ایک چیمپئن بیٹھا ہوا ہے۔ ایک سپر اسٹار انٹرنیشنل فائٹر۔ تم مارشل آرٹ میں دلچسپی رکھتے ہو اور میں تمہیں جو کچھ بتا سکتا ہوں، رُوئے زمین پر اور کوئی نہیں بتا سکتا۔ ہرگز نہیں بتا سکتا۔ مجھ سے فائدہ اُٹھا لو۔ میں اب زیادہ دیر رہنے والا نہیں ہوں۔''

وہ اپنے مرنے کی بات بڑے تواتر اور یقین سے کر رہا تھا۔

''تم اتنے مایوس کیوں ہو؟ تم اس قدر بیمار نہیں کہ زندگی کی طرف پلٹ ہی نہ سکو۔''

اس نے میری بات کو یکسر نظر انداز کر دیا جیسے سنا ہی نہ ہو۔ سامنے سینڈ بیگ کی طرف دیکھا رہا پھر بولا۔ ''مجھے کھڑا ہونے میں مدد دو گے۔''

میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کی ٹانگ انور خاں کی ہدایت کے مطابق بدستور زنجیر میں تھی اور گھٹنے سے مڑی ہوئی تھی۔ وہ سرگوشی میں بولا۔ ''میری یہ ٹانگ کھول دو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ کوئی ایسی حرکت نہیں کروں گا جس سے کسی کو نقصان پہنچے یا تمہیں شرمندگی ہو۔''

میں تذبذب کا شکار ہوگیا۔ اگر یہ چند روز پہلے کی بات ہوتی تو شاید میں ایسا رسک کبھی نہ لیتا لیکن اب دل و دماغ کی کیفیت کچھ اور تھی۔ مجھے خطرات ہیچ محسوس ہونے لگے تھے۔ اگر دل میں کوئی اندیشہ اُبھرتا بھی تھا تو میں خود کو سمجھاتا تھا۔ موت سے بڑھ کر تمہارے لیے کیا بُرا ہوگیا اور یاد رکھو کہ تم خود کو موت کے لیے آمادہ کر چکے ہو۔

میں نے جیکی کی زنجیر کھول دی۔ اس نے میرا سہارا چھوڑ دیا اور اپنی اکلوتی ٹانگ پر کھڑا ہوگیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں بیساکھی نما لکڑی تھی۔ اس نے اپنی مٹھی بھینچی اور عجیب انداز میں بولا۔ ''طاقت اس مٹھی میں نہیں، یہاں ہوتی ہے یہاں...... دماغ کے اندر...... اگر دماغ میں طاقت نہیں تو پھر یہ مٹھی چاہے ایک پہلوان کے جسم کا حصہ ہو، وہ کمزور ہی رہتی ہے۔ دوسری صورت میں مجھ جیسا لاغر آدمی بھی سینڈ بیگ مار کر مکا پھاڑ سکتا ہے۔ سس سوری...... مکا مکا کر سینڈ بیگ پھاڑ سکتا ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں مظاہرہ کر کے دکھا سکتا ہوں۔''

''دکھاؤ۔'' میں نے کہا۔

اس نے آہستہ آہستہ مٹھی بھینچی۔ جیسے انگلی کے ایک ایک جوڑ کو علیحدہ علیحدہ موڑ رہا ہو۔ پھر اس نے آنکھیں بند کیں۔ کچھ دیر تک اپنے خیالات کو مرتکز کرتا رہا۔ تب اس نے اپنی بیساکھی اور ٹانگ پر اُچھلتے ہوئے سینڈ بیگ کو مکا رسید کیا۔ سینڈ بیگ پھٹا تو نہیں لیکن ضرب اتنی زوردار تھی کہ وہ دور تک گیا اور واپس آیا۔

''ونڈرفل۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔ ''تمہاری جسمانی حالت کو دیکھتے ہوئے یہ ضرب کافی زوردار ہے۔''

''یہ ضرب میں نے اپنے جسم کی طاقت سے نہیں، دماغ کی طاقت سے لگائی ہے۔ میری ساری ذہنی توانائی اس ضرب میں لگی ہے اور جب ذہنی توانائی لگتی ہے تو جسمانی توانائی خود بخود لگتی ہے۔ چلو اب تم خود کوشش کرو۔''

اگلے چار پانچ منٹ میں، مَیں نے بار وندا جیکی کی ہدایات کے مطابق کچھ ضربیں لگائیں اور مجھے لگا کہ اس شخص کی باتوں میں وزن ہے۔

وہ بولا۔ ''آج میں تمہیں دو کام کی باتیں بتاتا ہوں۔ اگر تم ان کو یاد رکھو گے تو یہ عمر بھر تمہارے کام آئیں گی۔ بولو یاد رکھو گے؟''

''بالکل رکھوں گا۔'' میں نے کہا۔ مجھے اس شخص سے اب واقعی عقیدت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ چند دن میں مرنے والا ہے اور میں نے ان آخری دنوں میں اسے ایک ویرانے میں بہترین شراب فراہم کر کے اس کو مسرور کیا تھا۔

وہ بولا۔ ''انسان کے بنیادی خوف دو ہی ہوتے ہیں۔ ذہنی تکلیف اور جسمانی تکلیف۔ تم کسی خطرناک غنڈے سے دوبدو لڑتے کیوں نہیں ہو؟ تمہیں ڈر ہوتا ہے کہ وہ تمہیں مارے گا۔ تم پر کوئی ہتھیار استعمال کرے گا جس سے تمہیں تکلیف ہوگی۔ دوسرا خوف ذہنی تکلیف کا ہے۔ اگر وہ تمہیں مارے گا یا تم سے گالم گلوچ کرے گا یا تمہیں تھر تھر کانپنے پر مجبور کر دے گا تو لوگ یہ منظر دیکھیں گے اور تم شدید شرمساری کا شکار ہو جاؤ گے۔ اگر ہم ان دو بنیادی خوفوں پر کنٹرول کر لیں تو ہم کسی بھی بڑے سے بڑے خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو سکتے ہیں۔ بس ہم یہ طے کر لیں کہ ہم جسمانی تکلیف کو جھیلیں گے اور اگر کہیں شرمندگی اور پسپائی کا سامنا کرنا پڑا تو بھی جھیلیں گے۔''

''تمہاری باتیں دل کو لگ رہی ہیں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''اگر نہ لگیں گی تو یہ تمہارا ہی نقصان ہوگا۔'' وہ شانِ بے نیازی سے بولا۔ ذرا توقف کر کے اس نے گلاس میں بچی کھچی شراب اپنے اندر اُنڈیلی اور بولا۔ ''اب میں تمہیں جسمانی تکلیف کو برداشت کرنے کا ایک خاص الخاص گُر بتاتا ہوں۔ اس گُر کو سمجھ لو گے تو دھیرے دھیرے جسمانی تکلیف تمہارے جسم سے دور ہو جائے گی۔ تمہیں درد نہیں ہوگا یا ہوگا تو بہت کم ہوگا۔ تم ایک نئے انسان بن جاؤ گے۔ ذرا سوچو اگر انسان کو درد نہ ہو تو وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا۔''

ایک دم مجھے پھر وہ کشتی والا منظر یاد آ گیا۔ اسحاق نے جیکی کو دیوانہ وار مارا تھا اور اس نے بس ایک دو بار کراہنے کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔ کیا واقعی...... اسے بھی درد نہیں ہوتا؟ جیکی میں میری دلچسپی ایک دم بڑھ گئی۔ جیکی نے جو دونوں باتیں کی تھیں، وہ میرے دل کو لگی تھیں اور اب اس کی یہ تیسری بات بھی جیسے دل میں کھب گئی تھی۔

وہ ابھی تک لنگوٹ میں تھا۔ مجھے اس کا سارا جسم لالٹین کی روشنی میں دکھائی دے رہا۔ اس کے رگ پٹھوں اور سوکھی سڑی جلد میں عجیب سی سختی تھی۔ وہ کہنے لگا۔ ''اگر میں نے تمہیں سب کچھ آج ہی بتا دیا تو تم کل کس تشریف میں شوق لاؤ گے۔''

''شاید تم کہنا چاہتے ہو کہ کس شوق میں تشریف لاؤ گے؟''

''ہاں...... ہاں...... یہی کہنا چاہ رہا ہوں۔ کبھی کبھی میں فقرے میں لفظ اُلٹے بول جاتا ہوں۔ تم خود ہی ٹھیک کر لیا کرو۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ باقی بات کل ہوگی اور اگر تم 69 ہی کی ایک بوتل لا سکو تو کیا بات ہے۔''

''چلو میں وعدہ کرتا ہوں کہ کل تمہارے لیے وہی لاؤں گا جو کہا ہے لیکن اپنی بات

ادھوری نہ چھوڑو۔ مجھے اُلجھن رہے گی۔“

”آہ ادھوری بات۔“ اس نے عجیب لہجے میں کہا۔ ”باتیں تو کبھی مکمل نہیں ہوتیں اور نہ کام مکمل ہوتے ہیں۔ ایک کے بعد دوسری خواہش پھر تیسری۔ انسان کو کہیں نہ کہیں رُکنے کے لیے تیار رہنا چاہیے اور جہاں سے آگے نہ جاسکے وہاں خوشی سے رُک جائے۔ باقی کی خواہشوں کو دل سے نکال دے۔“

میں نے کہا۔ ”تم ایک چمپئن فائٹر ہو لیکن تمہاری باتیں فلاسفروں جیسی ہیں۔ لگتا ہے کہیں گہری چوٹ کھائی ہے تم نے۔“

”تم مجھے کریدنے کی کوشش کر رہے ہو۔ مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں اور شراب کے بغیر تو بالکل بھی پسند نہیں۔“ وہ مسکرایا تو اس کے میلے دانت نمایاں ہوگئے۔

اس کا مطمع نظر سمجھتے ہوئے میں نے بوتل کی باقی شراب بھی اس کے حوالے کر دی۔ اس نے بوتل کو ندیدوں کی طرح اپنے سینے سے لگالیا۔ میں نے اس کی اکلوتی ٹانگ پھر سے زنجیر میں باندھ دی تھی۔ مجھے اس سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا تاہم میں انور خاں کی ناراضگی مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

تھوڑی سی اور پی کر وہ پوری ترنگ میں آگیا۔ میرے پوچھے بغیر ہی بولا۔ ”مجھے اسی جرم کی سزا ملی ہے جو بہت عام ہے۔ جو ہمیشہ سے بہت عام رہا ہے۔ جس کو کوئی روک سکا ہے نہ روک سکے گا۔ مجھے پیار ہوگیا تھا۔ ایک دم...... بہت تیزی سے...... بالکل طوفانی پیار......“

”کس سے؟“

”جس سے نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“

”یہی تو بات ہے۔ پیار وہیں ہوتا ہے جہاں نہیں ہونا چاہیے۔“

”کون لڑکی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ وہ سوال ہے جس کا جواب کوئی بھی سچا عاشق نہیں دیتا۔“

”حکم کے خانوادے سے تھی؟“

”یہی سمجھ لو۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”وہی جو ہوتا آیا ہے۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن سنبھال نہیں سکا۔ میں نے خود کو بہت سمجھایا کہ تم ایک ٹیچر کی حیثیت سے اس اسٹیٹ میں آئے ہو، تمہیں اس

کے لیے بہت معاوضہ دیا گیا ہے۔ عزت اور آسائش دی گئی ہے۔ یہ کام نہ کرو۔ یہ لوگ جتنے مہربان ہیں، اتنے ہی سخت بھی ہیں۔ بہت ظالم بن جائیں گے لیکن تمہیں پتا ہے نا، ہونی ہو کر رہتی ہے۔“

”میرے دماغ میں ایک سوال پیدا ہو رہا ہے اگر تم بُرا نہ مناؤ تو پوچھوں؟“

”تم نے شراب پلا کر میری رات کو رنگین کیا ہے۔ پوچھو۔“

”کہیں یہ وہی لڑکی تو نہیں جسے تم سکھشا دینے کے لیے یہاں اسٹیٹ میں آئے تھے؟ میرا مطلب ہے کہ جارج کی بہن ماریا فرگوسن؟“

”تم فاؤل پلے کر رہے ہو۔ میں نے کہا ہے نا، کوئی بھی سچا پیار کرنے والا اپنے محبوب کا نام زبان پر نہیں لاتا۔“

”چلو ٹھیک ہے، میں نہیں پوچھتا۔ لیکن تمہارا پیار کس قسم کا تھا؟“

”یہ وہ پیار تھا جو آندھی کی طرح اُٹھتا ہے اور طوفان کی طرح دماغ پر اور دل پر چھا جاتا ہے۔ اس میں ہر طرح کی طلب اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔ یہ پیار کرنے والوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔ کہیں پاؤں نہیں جمنے دیتا۔ کچھ سمجھنے میں نہیں آنے دیتا۔ ہم بھی راج بھون میں بس دو چار ملاقاتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر قریب آ گئے تھے کہ لگتا تھا برسوں کے شناسا ہیں۔ چند گھڑیاں بھی ایک دوسرے کے بغیر گزارنا مشکل ہوگیا تھا۔“

”وہ بہت خوبصورت تھی؟“

”مجھے اس کا پتا نہیں لیکن وہ میرے لیے دنیا کی خوبصورت ترین لڑکی تھی اور میں اس کے لیے محبوب ترین شخص۔ اس کی منگنی ہو چکی تھی۔ اس کا ہونے والا شوہر اسے چاہتا تھا اور شاید وہ بھی اسے ناپسند نہیں کرتی تھی لیکن میں نے تمہیں بتایا ہے نا، یہ وہ تیز بہاؤ والا پیار تھا جو کہیں پاؤں نہیں جمنے دیتا۔ میں بھی راج بھون میں رہ رہا تھا۔ ہمارے پاس ایک دوسرے کو دیکھنے اور ملنے کے بہت سے مواقع تھے۔ ایک دن میں نے اس سے کہا۔ ”ہمارا راز بہت جلدی کھل جائے گا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوگا، وہ بہت بُرا ہوگا۔“ مگر اس نے ہنس کر ٹال دیا اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ایک دن اس کے پتا نے ہمیں دیکھ لیا اور پھر پتا نہیں کس طرح یہ بات اور بھی کئی لوگوں تک پہنچ گئی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ وہ ہندو تھی اور جہاں تک میری جانکاری ہے انہی دو چار لوگوں کی فیملیاں راج بھون میں رہتی ہیں جو حکم کے قریبی مشیروں اور مصاحبوں میں شامل ہیں۔“

"تم مجھے شرلاک ہومز کا دیسی ایڈیشن لگ رہے ہو۔ اسی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں سے نتیجے نکالتے ہو۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ مجھے تھوڑا بہت بتا دو تا کہ مجھے نتیجے نکالنے کے لیے مغز ماری نہ کرنی پڑے۔"

"بتا تو رہا ہوں۔"

"میرا مطلب ہے کہ اس لڑکی کے بارے میں کچھ بتاؤ، وہ کون تھی؟"

"اب وہ کسی اور کی ہے، اس کے بارے میں بات کرنا اچھا نہیں لگتا۔"

"تم نے خود ہی کہا ہے کہ پھر یہ بات پھیل گئی تھی اور کئی لوگوں تک پہنچ گئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ کوئی ایسا راز نہیں رہا۔"

"تم ہوشیار واقع ہوئے ہو۔ وکیلوں کی طرح بحث کر لیتے ہو۔ لیکن تم یہاں اس منحوس اسٹیٹ میں کیسے آ پھنسے ہو اور مجھے لگتا ہے کہ تم انڈین بھی نہیں ہو۔ کیا تم انڈین ہو؟"

"نہیں..... پاکستانی..... بس کچھ حادثات نے یہاں پہنچا دیا ہے۔"

"اوہ..... ونڈرفل..... پاکستانی۔" وہ خوش ہو کر بولا۔ اس نے مجھ سے مصافحہ کیا۔

"نیپال اور پاکستان میں بہت کچھ مشترک ہے۔ ہم دنیا کی بلند ترین چوٹیوں کے "مالک" ہیں۔ ایورسٹ، کے ٹو، نانگا پربت، ملکہ پربت اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔ ہمارے ہاں دنیا کے بہترین قدرتی مناظر اور پہاڑی سلسلے ہیں۔ ہم نے بہت اچھے کھلاڑی پیدا کیے ہیں اور پھر ایک اور بات ہم دونوں ملکوں کو ایک بڑا زبردست ہمسایہ بھی ملا ہے۔ بہت محبت کرنے والا، بہت ہمدرد اور امن پسند ایسا ہمسایہ ہو تو پھر جنت میں جانے کے لیے مرنے کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔ دنیا ہی بہشت بن جاتی ہے۔" وہ حسبِ عادت طنزیہ لہجے میں بات کر رہا تھا۔

کچھ دیر وہ اس موضوع پر بات کرتا رہا۔ پھر میں نے اسے یاد دلایا کہ ہم موضوع سے ہٹ رہے ہیں۔ وہ مجھے اپنی محبوبہ کے بارے میں کچھ بتانے جا رہا تھا۔

اس نے ایک گہری سانس لی تو اس کے سینے کی پسلیاں نمایاں تر ہو گئیں۔ لالٹین کی زرد روشنی میں اس کا سایہ سرنگ کی کھردری دیوار پر جھول رہا تھا، جیسے سائے نے جیکی سے بھی زیادہ پی رکھی ہو اور اسے بیٹھنا مشکل ہو رہا ہو۔ جیکی نے کہا۔ "تم وعدہ کرو کہ کم از کم میرے مرنے تک یہ بات اپنے تک ہی رکھو گے۔"

میں نے کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی بھی یہ بات کسی تک نہیں پہنچاؤں گا۔"

وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔ "وہ جارج کی بہن ماریا کی گہری سہیلی شکنتلا ہے۔ میری شاگرد تو ماریا تھی لیکن دھیرے دھیرے شکنتلا بھی مجھ سے سکھشا لینے لگی تھی۔ اس کے بال بہت لمبے تھے، وہ ہمیشہ ساڑھی پہنتی تھی۔ میں نے ایک دن اس سے کہا۔ جوڈو کراٹے سیکھنے کے لیے ساڑھی سے اچھا لباس اور کوئی نہیں ہے۔ بس اس میں ایک خرابی ہے کہ ساڑھی والی پلیئر کراٹے کھیلتے ہوئے کسی کو کک نہیں مار سکتی، صرف فلائنگ کک مار سکتی ہے کیونکہ فلائنگ کک میں دونوں ٹانگیں اکٹھی ماری جاتی ہیں۔ میری بات سمجھ کر وہ بہت ہنسی۔ ہنستے ہوئے اس کے دانت یمن کے موتی دکھائی دیتے تھے۔ اگلے روز وہ ماریا کی طرح ٹراؤزر پہن کر آئی۔ وہ ماریا کی طرح سنجیدہ نہیں تھی۔ بس شغل کے لیے آ جاتی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہم دونوں کے درمیان ایک ایسا "لنک" بنا کہ باقی ساری باتیں، سارے لوگ پس منظر میں چلے گئے۔ بس ہم دونوں رہ گئے اور ہماری پیاسی نظریں جو ہر پل ایک دوسرے کو تلاش کرتی تھیں۔ شکنتلا کے پتا اشوک ساہنی حکم جی کے خاص مشیر تھے۔ ایک دوسرے اہم مشیر رام گوپال کے ساتھ عرصے سے ان کی خاموش جنگ چل رہی تھی۔ اشوک ساہنی اس جنگ میں اپنے حریف کو نیچا دکھانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہیں اس سے بہتر طریقہ کوئی اور نہیں مل سکتا تھا کہ وہ شکنتلا کو حکم جی سے بیاہ کر اس کے سسر بن جائیں۔ اشوک ساہنی کی خوش قسمتی یہ تھی کہ شکنتلا اپنے الہڑ پن اور خوبصورتی کی وجہ سے حکم جی کو پسند تھی۔ درحقیقت اشوک ساہنی نے اپنے منصب اور رُتبے کو بڑھانے کے لیے ہی یہ فیصلہ کیا تھا ورنہ شکنتلا اپنے ہونے والے شوہر سے قریباً دس بارہ برس چھوٹی تھی اور اس سے پہلے بھی شوہر صاحب کی کئی بیویاں اور رکھیلیں وغیرہ تھیں جن میں اس کی چہیتی اور منہ چڑھی بیوی رتنا دیوی بھی شامل تھی۔"

بات کرتے کرتے جیکی کو کھانسی کا دورہ پڑا اور اس کا پورا ڈھانچا دہل کر رہ گیا۔ میں نے اسے پانی پلانا چاہا لیکن اس نے شراب کی طرف ہاتھ بڑھایا اور دو گھونٹ لے کر قدرے شانت ہو گیا۔

کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے سلسلہ کلام جوڑا اور بولا۔ "مجھے یہ ماننا چاہیے کہ اس معاملے میں زیادہ پیش قدمی میری طرف سے ہی ہو رہی تھی۔ شکنتلا پہلے تو بچنے کی کوشش کرتی رہی لیکن پھر وہ بھی بے بس ہو گئی۔ یہ بڑی حیران کن کروٹ تھی۔ بے شک اس کی "بے جوڑ شادی" ہو رہی تھی اس کے باوجود وہ حکم جی کو ناپسند نہیں کرتی تھی۔ اپنے ماتا پتا کی پسند کو وہ اپنی پسند سمجھتی تھی۔ اس کے نزدیک حکم جی ایک روحانی شخصیت بھی تھے جن کی عزت، تکریم اور خوشی کا خیال رکھنا سب کا فرض تھا۔ لیکن دوسری طرف وہ بے پناہ طاقت سے میری محبت

کے مقناطیس کی طرف بھی کھنچتی چلی جا رہی تھی۔ یہ سب کچھ ڈیڑھ دو ماہ کے اندر اندر ہی ہوا تھا۔"

جیکی نے چند لمحے توقف کیا اور اپنی نشیلی آنکھوں سے ماضی میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"وہ چاندنی رات تھی۔ بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ میں نے شکنتلا کو راج بھون کی چھت پر بلایا تھا۔ ہم سنگِ مرمر کی جالیوں والی ایک برساتی میں ایک دوسرے کی بانہوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے میں اس مہ جبیں پر جھکا ہوا تھا، اس کے لمبے بال سنگِ مرمر کے چبوترے پر دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ وہاں کسی کی آمد کا امکان نہیں تھا لیکن اچانک ہم پر بجلی سی گر پڑی۔ ہم نے اشوک ساہنی صاحب کو دیکھا۔ اپنی بیٹی کو اس حالت میں دیکھ کر وہ سکتے میں رہ گئے پھر ایک دم گھومے اور خاموشی سے نیچے چلے گئے۔ شکنتلا کی بُری حالت تھی۔ وہ اپنی اوڑھنی کو درست کرتے ہوئے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس بات کا پتا ہمیں کئی دن بعد چلا کہ اشوک ساہنی صاحب کو آگاہ کرنے والی شکنتلا کی انگریز سہیلی ماریا ہی تھی۔ اس نے یار مار کا کردار ادا کیا تھا۔

شکنتلا پر پابندیاں لگا دی گئیں۔ ہمارے ملنے کے راستے بند ہو گئے۔ ہم جو چند گھڑیاں بھی ایک دوسرے کے بغیر نہیں گزار سکتے تھے، ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ گئے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ہمارا ملنا ممکن نہیں اور اگر میں ایک ٹیچر اور ٹرینر کی حیثیت سے یہیں اسٹیٹ میں رہا تو میری جان کے ساتھ ساتھ شکنتلا کی زندگی کو بھی شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا اور یہ مجھے ہرگز منظور نہیں تھا۔ میں نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جلد ہی کسی طرح شکنتلا کو بھی اس فیصلے کے بارے میں معلوم ہو گیا۔ وہ بہت روئی تھی۔ ان دنوں اس کا دودھیا گلابی رنگ سرسوں کی طرح زرد ہو چکا تھا۔ میں اس سے آخری بار ملنا چاہتا تھا اور شاید وہ بھی آخری بار ملنا چاہتی تھی۔ ہمارے درمیان ایک آخری ملاقات طے ہوئی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ وہی کپڑے پہن کر آئے جن کپڑوں میں، مَیں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ اپنی ایک سہیلی کی بیمار والدہ کی عیادت کے بہانے کوشلی چلی گئی۔ شاید تمہیں پتا ہی ہو کوشلی، زرگاں کی ایک نواحی آبادی ہے۔ یہاں سے جنگلی علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔"

"نہیں...... میں اس بارے میں نہیں جانتا۔"

"شکنتلا وہاں پہنچی اور میں بھی حکم جی کے "نائٹ واچرز" سے بچ بچا کر وہاں پہنچ گیا۔ مجھے یاد ہے، وہ پورے چاند کی رات تھی۔ چاند کبھی نکل آتا، کبھی بدلیوں میں چھپ جاتا تھا۔ ہم ایک باغیچے میں ملے تھے۔ وہاں مولسری اور رات کی رانی کے پھول تھے۔ کچنار اور نیم

کے گھنے پیڑوں میں ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں سما گئے۔ وہ ٹوٹ کر روئی اور میری آنکھیں بھی تربتر ہو گئیں۔ اس نے کہا مجھے بھولنا نہیں۔ میں بھی جہاں ہوں گی، تمہیں یاد کروں گی۔ تمہارے لیے پرارتھنا کروں گی۔ صبح شام کے بدلتے رنگوں میں، نئے موسموں میں اور تہواروں میں تمہاری صورت میری نگاہوں کے سامنے رہے گی۔ میں نے کہا۔ میں دل میں ایک کانٹا لے کر یہاں سے جا رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں یہ زخم ہمیشہ رستا رہے گا۔ مجھے بہت خون رُلائے گا۔ بس یہ دعا کرنا کہ یہ ناسور بن کر مجھے زندہ درگور نہ کر دے۔

ہم نے وہ سب باتیں کیں جو جدا ہو جانے والے پریمی کسی آخری ملاقات میں ایک دوسرے سے کرتے ہیں لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ وہاں کچھ اور فیصلہ ہو چکا تھا۔ جب شکنتلا آخری بار میرے گلے لگ کر چلی گئی اور میں بھی رُخ موڑ کر دوسری طرف روانہ ہو گیا، مجھے لگا کہ وہ رُک گئی ہے اور مڑ کر مجھے دیکھ رہی ہے۔ میں مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن شک اتنا شدید تھا کہ مجھے دیکھنا پڑا۔ ہاں...... وہ واقعی رُک گئی تھی اور دیکھ رہی تھی۔ کچنار، نیم اور مولسری کے پیڑوں کے درمیان وہ چاندنی میں نہائی ہوئی کھڑی تھی اور کوئی آسمانی مخلوق لگ رہی تھی۔ کوئی اپسرا یا پھر کوئی داستانی شہزادی...... جس نے مڑ کر دیکھا تھا اور پتھرا گئی تھی اور وہی نہیں میں بھی پتھرا گیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر ایک دوسرے کی طرف لپکے اور دوبارہ لپٹ گئے۔ وہ جیسے میرے جسم کا حصہ بن گئی، میرے اندر پیوست ہو گئی۔ میں نے ٹوٹے ہوئے دلفگار لہجے میں کہا۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا شاکن۔ وہ ہچکیاں لے کر روتے ہوئے بولی۔ تو پھر مجھے یہاں سے لے چلو۔ کہیں بہت دور...... جہاں کوئی میری خبر نہ پا سکے۔

اور پھر وہ ہوا جو ہم نے سوچا بھی نہیں تھا، جو ہمارے سان گمان میں بھی نہیں تھا۔ ہم جو ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے منہ موڑنے کے لیے آئے تھے، ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اس باغیچے سے نکل گئے۔ اسی حالت میں جس حالت میں تھے۔ ہم گھنے جنگل میں گھس گئے۔ اندھا دھند بھاگتے رہے اور چلتے رہے۔ ہمیں لگ رہا تھا کہ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اسی طرح دنیا کے دوسرے کنارے تک جا سکتے ہیں۔ میں جب شکنتلا سے ملنے کوشلی میں آیا تھا تو میں نے احتیاط کے طور پر ایک پسٹل اپنے کپڑوں میں رکھ لیا تھا۔ اب خطرناک جنگل میں یہی پسٹل ہمارے پاس واحد ہتھیار تھا۔ مگر عجیب بات تھی، کوئی خوف نہیں تھا۔ ہم ایک دوسرے کے گلے لگ کر بآسانی موت کو گلے لگا سکتے تھے۔ سچ کہتے ہیں کہ پیار دیوانہ ہوتا ہے۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی ماضی میں جھانکتی ہوئی آنکھیں جیسے پیار کی دیوانگی کو دیکھنے لگیں۔ میلے کچیلے لنگوٹ میں وہ ننگ دھڑنگ بیٹھا تھا۔ اس کے سر اور داڑھی کے جھاڑ جھنکاڑ بال اسے کسی تارک الدنیا سادھو کے روپ میں پیش کر رہے تھے۔ اب وہ شراب کے لیے زیادہ بیتابی بھی نہیں دکھا رہا تھا، اس کا مطلب تھا کہ وہ پورے سرور میں ہے۔ دہانے کی طرف سے ماریا کے کھانسنے کی مدھم آواز سنائی دی۔ وہ شاید سو رہی تھی۔ بارونداجیکی کو ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ اس کی کہانی کا ایک اہم کردار ماریا اسی سرنگ میں اس کے ساتھ موجود ہے۔

''کیا تمہارا پیچھا نہیں کیا گیا؟'' میں نے لالٹین کی لو ذرا اونچی کرتے ہوئے پوچھا۔

وہ مسکرایا۔ ''نہیں کیا گیا اور اگر کیا بھی جاتا تو دو چار آدمی تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ میرے پاس پسٹل تھا اور اس کی کوئی تین درجن گولیاں تھیں۔ میں نے بہت سا مارشل آرٹ گھول کر پیا ہوا تھا اور میرے بدن میں بجلیاں کوندتی تھیں۔ میں دو چار بندوں کی ہڈیاں تو خالی ہاتھ بھی توڑ سکتا تھا۔ ہم آدھی رات تک جنگل میں بھاگتے رہے اور پھر اس ندی پر پہنچ گئے جو ''کیچے'' کے پاس سے گزرتی ہے۔ وہاں گھاٹ پر بہت سی چھوٹی بڑی کشتیاں موجود تھیں۔ ایک نئی نکور کشتی مجھے اچھی لگی۔ اس کے اوپر سائبان تھا اور اس کا نیلا رنگ چمکیلا تھا۔ ملاح اور مچھیرے اپنی جھونپڑیوں میں سو رہے تھے۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا، اس خاموشی میں بس کبھی کبھی لہریں کشتیوں سے ٹکراتی تھیں اور مدھم آواز پیدا ہوتی تھی۔ کشتی کے اندر بہت سے پھل اور کھانے پینے کی اشیاء لدی ہوئی تھیں۔ کشتی کا مالک ایک اشرف نامی نوجوان تھا۔ وہ الصباح یہ سامان لے کر یہاں سے روانہ ہو رہا تھا۔ اسے اسٹیٹ ہی کی ایک جاگیر زہرہ آباد تک جانا تھا۔ ہم نے نوجوان سے معقول کرایہ طے کیا اور اسے کہا کہ وہ ہمیں بھی زہرہ آباد لے جائے لیکن شرط یہ تھی کہ وہ ابھی رات کے اندھیرے میں روانہ ہو گا۔ وہ مان گیا۔ ہم اس کے ساتھ ندی کے بہاؤ پر چل دیئے۔ نوجوان سمجھ گیا تھا کہ ہم پریمی جوڑا ہیں اور کہیں پناہ کے لیے گھوم رہے ہیں۔ اس نے ہمیں آفر کی کہ اگر ہم کچھ دن کے لیے اس کی اس کشتی میں رہنا چاہیں تو رہ سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہم اسے معقول کرایہ دے دیں۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر ہم ابھی اور اسی وقت اس سے یہ کشتی خریدنا چاہیں تو پھر؟ پہلے تو وہ نہیں مانا لیکن جب میں نے اسے کشتی کی قیمت سے قریباً ڈھائی گنا زیادہ رقم آفر کی تو اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس نے کرنسی نوٹوں کو لالٹین کی روشنی میں ایک ایک کر کے بڑے دھیان سے دیکھا اور پھر ایک جگہ کشتی کے تالوں کی چابیاں ہمارے حوالے کر کے نیچے اُتر گیا۔ اس کا سارا سامان بھی کشتی کے اندر ہی رہا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ صبح کے ملگجے اندھیرے میں کہیں گم ہو گیا۔

اب یہ خوبصورت کشتی ہماری تھی۔ ہم ایک بانس نما چپو کی مدد سے اسے جس طرف چاہے لے جا سکتے تھے اور ہم تاریک جنگل میں اسے بہت دور تک لے گئے۔ پھر ندی میں سے ایک اور شاخ پھوٹی۔ یہ شاخ ہمیں تیزی سے اپنے ساتھ بہاتی ہوئی ایک نامعلوم مقام پر لے گئی۔ یوں لگتا تھا کہ یہاں ہمارے اور جنگلی حیات کے سوا اور کوئی نہیں اور نہ ہی کوئی کبھی یہاں پہنچا ہے۔ یہاں پانی پر ہزارہا کنول تیرتے تھے۔ ان پھولوں کے درمیان آبی پرندوں کی مستیاں تھیں۔ جنگل سے موروں کی ''میں آؤں...... میں آؤں'' سنائی دیتی تھی اور شاخوں پر رنگ برنگے طوطے چہکتے تھے۔ ہم نے کشتی کو ایک خاموش کنارے پر ٹھہرا دیا۔''

ذرا توقف کر کے بارونداجیکی نے دو گھونٹ لیے۔ اس کی آنکھوں میں یادوں کے خوش رنگ جگنو چمک رہے تھے۔ وہ بولا۔ ''میں ان دنوں شراب نہیں پیتا تھا۔ ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا لیکن مجھے اتنا نشہ تھا جو اس واٹ 69 کی دس بوتلیں ایک ساتھ پی لینے سے بھی نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہو سکتا اور اس نشے کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اس میں خوشبو تھی، آنسو تھے اور ان آنسوؤں کی نمی سے خوشیوں کی کلیاں چٹکتی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ جگہ قدرت نے روزِ ازل سے ہمارے لیے ریزرو کر رکھی تھی۔ ہماری محبت کے لیے...... ہمارے ملن کے لیے۔ ہم زمان و مکاں...... کے احساس سے بالکل بے نیاز ہو کر ایک دوسرے میں کھو گئے۔ ہجر کی بے رحم سختیوں نے طلب کی شدت کو انتہا پر پہنچایا تھا اور اب طلب کی اس انتہا نے سرشاری اور کیف کا ایک جہاں آباد کر دیا۔ ہم یوں ملے کہ پیار کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ ہاں میرے دوست! کبھی زمین اس طرح دیوانہ وار آسمان سے نہ ملی ہو گی، اور نہ کبھی تابڑ توڑ بارش نے اس طرح صحراؤں کو جل تھل کیا ہو گا۔ میں شاعر نہیں ہوں لیکن کبھی کبھی میرا دل چاہتا تھا کہ ان روز و شب کے بارے میں شاعری کروں...... اگر میں ایسا کر سکتا تو وہ شاعری بے مثال ہوتی۔ وقت اسے مٹا سکتا اور نہ بھلا سکتا۔''

بارونداجیکی کی گدلی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ وہ کچھ دیر کے لیے جیسے ان روز و شب میں کھو گیا۔ ان لمحوں میں وہ واقعی ایک چمپئن فائٹر کم اور ایک شاعر زیادہ نظر آیا۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔ میں چاہتا تھا کہ نشہ اُترنے سے پہلے پہلے وہ اپنی کہانی ختم کر لے۔

اس نے گہری سانس لی اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ''ہم اس کشتی میں پورے سات روز رہے۔ شکنتلا کے شباب نے مجھے سیراب کر دیا اور میری انوکھی محبت کی شدت نے اسے ہر فکر بھلا دی۔ ہم نے کشتی کا کچھ سامان تو چرندوں پرندوں کو تحفے کے طور پر پیش کر دیا

تھا اور کچھ کشتی کے ایک گوشے میں سمیٹ دیا تھا۔ ہم کشتی کے چھوٹے سے ڈیک کو سونے کے لیے استعمال کرتے تھے اور تیز بارش کے وقت بیسمنٹ میں چلے جاتے تھے۔ وہاں نیچر کے سوا ہمیں دیکھنے والا اور کوئی نہیں تھا اور کبھی کبھی لگتا تھا کہ نیچر بھی ہماری ہم مزاج ہو گئی ہے۔ ایک دن سرخ بالوں والا ایک بہت بڑا ریچھ ندی میں اُتر آیا اور کشتی کی طرف بڑھا۔ میں نے پستول نکال لیا لیکن وہ کچھ دیر تک ہمارا جائزہ لینے کے بعد واپس چلا گیا۔ ایک رات پانی میں تیرنے والا ایک سانپ ہمارے ساتھ کشتی پر موجود رہا لیکن اس نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ خوراک کی خوشبو مختلف چرندوں کو ہمارے قریب لے آتی تھی اور ہم انہیں مایوس نہیں کرتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ہم تا دیر محفوظ نہیں رہ سکتے۔ ہمیں تلاش کرنے والے اس جنگل میں ہر طرف پھیلے ہوں گے اور وہ بہت جلد اس دور افتادہ گوشے تک بھی پہنچ جائیں گے۔ شکنتلا بھی یہ جانتی تھی لیکن ہم ان باتس کے بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ ہم نے طے کر رکھا تھا کہ جب وقت آئے گا، دیکھا جائے گا۔ شکنتلا چاہتی تھی کہ اگر ایسا وقت آ گیا تو میں اپنے ہاتھ سے اسے گولی مار دوں۔ لیکن میں اسے زندہ رکھنا چاہتا تھا، زندہ دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے طور پر ایک پلان بنا رکھا تھا اور میں نے اس سے وعدہ لے رکھا تھا کہ اگر بُرا وقت آ گیا تو وہ میری ایک بات ضرور مانے گی۔

اور پھر ایک رات وہ بُرا وقت آ گیا تھا۔ ہم دونوں کشتی میں لیٹے تھے۔ تاریک آسمان پر تاروں کی بساط بچھی ہوئی تھی۔ ہم سوچ رہے تھے کہ کیا اس کشتی کو چھوڑ کر جنگل میں راستہ بنانے کی کوشش کرنا ٹھیک رہے گا؟ اچانک کچھ آوازیں ہوا پر تیر کر ہم تک پہنچیں۔ یہ پانی پر چپو پڑنے کی آوازیں تھیں، کچھ لوگ بلند آواز میں بول رہے تھے۔ پھر میں نے دور نیم تاریکی میں تین کشتیوں کو دیکھا۔ یہ لوگوں سے بھری ہوئی تھیں۔ کشتیوں کی بناوٹ دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ یہ حکم جی کے لوگ ہیں اور ہمیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں آ پہنچے ہیں۔ ابھی وہ کچھ فاصلے پر تھے، میرے ذہن میں جو پلان تھا میں اس پر عمل کر سکتا تھا۔ اب شاید تمہیں میری بات سن کر حیرانی ہو لیکن میں تمہیں جو بتا رہا ہوں سچ بتا رہا ہوں۔"

"مجھے یقین ہے۔" میں نے کہا۔

وہ اپنی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی کھجاتے ہوئے بولا۔ "میں ایک دم شکنتلا پر پل پڑا۔ میں نے اس کے کپڑے پھاڑ دیئے، اس کے منہ پر زوردار طمانچے مارے، اس کے جسم کو نوچ لیا۔ وہ گر پڑی۔ وہ حیرت اور صدمے سے گنگ تھی۔ بس وہ اتنا ہی کہہ پا رہی تھی جیکی...... جیکی...... میں نے اسے اوندھا کیا اور اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے۔ چند دن پہلے جنگل میں

بھاگنے کے دوران میں اس کے بازوؤں پر زخم آئے تھے، یہ زخم پھر رسنے لگے۔ میں نے اس کا منہ چومتے ہوئے کہا۔ "شکنتلا! مجھے معاف کر دینا۔ زندگی میں پہلی اور آخری بار تم سے کچھ مانگ رہا ہوں۔ مجھے انکار نہ کرنا اور تم نے وعدہ بھی کر رکھا ہے کہ انکار نہیں کرو گی۔"

"اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ روتے ہوئے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "وہ لوگ پہنچ رہے ہیں۔ ہم کو پکڑ لیا جائے گا۔ دونوں کو سزا ملنے سے بہتر ہے کہ کوئی ایک بچ جائے۔ میرا بچنا تو بہت مشکل ہے لیکن تم بچ سکتی ہو۔ میری خاطر شاکن...... صرف میری خاطر...... تم نے ان لوگوں سے یہ کہنا ہے کہ تم اپنی مرضی کے ساتھ نہیں آئی ہو۔ میں تمہیں زبردستی لایا ہوں۔ پلیز شاکن! انکار نہ کرنا۔"

وہ سرتاپا احتجاج بن گئی۔ وہ دلدوز انداز میں کراہی۔ "میں ایسا نہیں کر سکتی...... کبھی نہیں کر سکتی۔"

"میں نے اس کے خون آلود ہونٹوں کو اپنی ہتھیلی کے ساتھ سختی سے ڈھانپ دیا۔ میں نے اسے بولنے ہی نہیں دیا۔ میں نے اسے اپنے سر کی قسم دی اور اسے لاچار کر دیا، ہاں...... میرے دوست! اسے لاچار کر دیا۔"

جیکی کی آنکھوں میں اب مسرت کے جگنو بجھ چکے تھے، واقعے کی مناسبت سے اب اس کے چہرے سے گہرا اندوہ جھلک رہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ہمیں پکڑ لیا گیا۔ مجھے کشتی پر ہی گرا لیا گیا۔ وہ درجنوں لوگ تھے۔ میں جانتا تھا کہ مزاحمت بیکار ہے۔ انہوں نے میرا پسٹل چھین لیا۔ مجھے اس بری طرح زدوکوب کیا کہ میری ٹانگ کی ہڈی تین جگہ سے ٹوٹ گئی اور ناک منہ سے خون جاری ہو گیا۔ میں وہیں کشتی پر ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔

ہوش آیا تو خود کو زرگاں کی بدنام جیل میں پایا۔ اس جیل کا انچارج جارج گورا جیسا سفاک شخص تھا۔ مجھے ایک زمین دوز کال کوٹھڑی میں رکھا گیا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ میرا رابطہ فقط ایک شخص سے ہوتا تھا۔ یہ مجھے کھانا پہنچاتا تھا اور پھر خالی برتن لے جاتا تھا۔ میرے جسمانی زخم مجھے دن رات تڑپاتے رہتے تھے۔ پھر ایک دن مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ جارج گورا بہ نفسِ نفیس میری کوٹھڑی میں آیا۔ اس نے کہا۔ "موت کی سزا تیرے جرم کے مقابلے میں بہت معمولی ہے۔ تجھے مر مر کر جینا ہو گا۔" جارج کے ساتھ وہ شخص بھی تھا جو آج کل ماریا کا شوہر ہے۔ سرجن اسٹیل بریرے۔ وہ کہنے کو سرجن ہے لیکن فطرت میں بے رحم قصاب ہے۔ اس کے پاس ایک بڑا میڈیکل باکس بھی تھا۔ مجھے ایک انجکشن دیا گیا اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو میرا بایاں بازو اور دائیں

ٹانگ جسم کے ساتھ موجود نہیں تھے۔ مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ واقعی یہ مر مر کر جینے جیسا تھا۔ میرا فن میری زندگی تھا اور مجھے اس فن سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا گیا تھا۔ میں اس کال کوٹھڑی میں چھ مہینے تک زندگی اور موت کے درمیان لٹکتا رہا۔ مجھے اَن گنت جسمانی و ذہنی اذیتیں جھیلنا پڑیں۔ یہاں تک کہ میں جاں بلب ہو گیا۔ مجھے رات کے وقت انتہائی تیز بخار ہونے لگا، اس کے علاوہ میرے بازو کا زخم بھی ٹھیک ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ ایک رات سخت بے ہوشی کی حالت میں مجھے جیل کے شفا خانے میں پہنچایا گیا۔ میں اس شفا خانے میں قریب ایک ماہ رہا۔ یہاں سیکیورٹی کا وہ انتظام نہیں تھا جو جیل میں تھا۔ میرے پہرے پر صرف دو افراد ہوتے تھے۔ وہ دونوں ہندو تھے۔ وہ دیوالی کی رات تھی۔ زبردست آتش بازی کی وجہ سے کچھ ہوائیاں شفا خانے کے اندر آ گریں اور شفا خانے کے ایک حصے میں آگ بھڑک اُٹھی۔ بھگدڑ مچ گئی۔ میرے دونوں پہریدار تہوار کی وجہ سے اندا دھند پیئے ہوئے تھے۔ میں نے ان کی مدہوشی اور آتشزدگی کا فائدہ اُٹھایا اور ایک خطرناک کوشش کر کے شفا خانے سے نکل گیا۔"

اس نے ایک بار پھر توقف کر کے میری طرف دیکھا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بولا۔ "اگر تفصیل میں جاؤں گا تو یہ روداد طویل ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ فرار کے بعد میں تین ماہ تک ایک مہربان پارسی عورت کے گھر میں چھپا رہا۔ وہ گھر میں شراب تیار کرنے کا کام کرتی تھی۔ وہیں پر مجھے شراب کی لت بھی لگی۔ وہیں پر مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ شکنتلا اب کس حال میں ہے۔ کیا تم جاننا چاہو گے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا؟"

"کیوں نہیں۔"

"وہ حکم کی پتنی نہیں بن سکی لیکن پھر بھی حکم نے اسے چھوڑا نہیں۔ وہ حکم کی پسند تھی اور وہ اس کے ساتھ "سونے" کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔"

"میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔"

جیکی کے چہرے پر عجیب طنزیہ مسکراہ پھیل گئی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ "حکم جیسے لوگ ارادے کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔ وفاداری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے اور یہ وفاداری ہوتی ہے اپنی حرص اور خواہش کے ساتھ۔ اپنے اعلیٰ مقصد تک پہنچنے کے لیے ایسے لوگ وہ ہر نیک کام کر گزرتے ہیں جو ان کے بس میں ہوتا ہے۔ جو کچھ ہو چکا تھا اس کے بعد حکم، شکنتلا کو اپنی پتنی کا درجہ تو نہیں دے سکتا تھا لیکن وہ اس کے پُرکشش جسم سے یکسر محروم ہونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کی خوبصورتی اور اس کی بے مثال زلفوں کا اسیر تھا۔ اس نے

ایک درمیانی راستہ نکالا۔ شکنتلا کے ڈرے سہمے پتا اشوک ساہنی کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی بیٹی کو "فیری" بنا دے۔ فیری بننے کا مطلب سمجھتے ہو تم؟"

"نہیں...... مجھے اس بارے میں کچھ زیادہ پتا نہیں۔"

"حکم اور اس کے حواریوں نے اپنے عوام کی دنیا اور عاقبت سنوارنے کے لیے بڑا اعلیٰ انتظام کیا ہوا ہے۔ شاید تم نے ساتویں کے جشن کے بارے میں سنا ہو؟ اس عالیشان جشن کے موقع پر راج بھون کے بڑے "پاکیزہ" قسم کے انتظامات کیے جاتے ہیں۔ یہ انتظامات درحقیقت حکم اور اس کے درویش صفت دوستوں کی خوشی کے لیے ہوتے ہیں۔ یہ درویش صفت لوگ اسٹیٹ کی بہتری کے لیے دن رات محنت کرتے ہیں، اپنا خون جلاتے ہیں۔ اگر یہ ساتویں کے جشن کے موقع پر آٹھ نو روز شراب وغیرہ پیتے ہیں اور لڑکیوں کے ساتھ تفریح وغیرہ کر لیتے ہیں تو ایسا کیا بُرا کرتے ہیں؟ اور یہ سب کچھ بڑے شفاف طریقے سے ہوتا ہے بھئی۔ پرانے زمانے سے یہ ریت چلی آ رہی ہے۔ جشن کے موقع پر راجواڑے میں سے سات رنگوں کے مطابق سات لڑکیاں چنی جاتی ہیں۔ انہیں فیریاں یا اردو میں پریاں کہا جاتا ہے۔ یہ فیریاں پھر راج بھون کے اندر ہی رہتی ہیں۔ انہیں اُٹھنے بیٹھنے کے آداب سکھائے جاتے ہیں۔ فنون کی تعلیم دی جاتی ہے جن میں ظاہر ہے کہ ناچ گانے اور موسیقی وغیرہ کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ پُرانے زمانے کا تو پتا نہیں لیکن آج کل یہ فیریاں حکم کی رکھیلیں ہی سمجھی جاتی ہیں۔ وہ ان میں سے کسی کو بھی اپنے یا اپنے قریبی دوستوں کے تصرف میں لا سکتا ہے۔ اب شکنتلا بھی ایک فیری کی حیثیت سے حکم کے حرم میں داخل ہو چکی ہے۔ اب اس کی زندگی راج بھون کی اونچی دیواروں کے پیچھے ہمیشہ کے لیے گم ہے۔"

اپنی اندرونی تلخی کو کم کرنے کے لیے اس نے تھوڑی سی مزید "سیال آگ" اپنے معدے میں اُتاری اور اپنا سر سرنگ کی کھردری دیوار سے ٹکا دیا۔

میں نے پوچھا۔ "تم اس مچھیرے کی کشتی تک کیسے پہنچے؟ کہیں یہ وہی کشتی تو نہیں......"

"ہاں...... یہ وہی کشتی ہے۔" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ "اسی کشتی میں، مَیں نے اپنی زندگی کے بہترین سات آٹھ روز گزارے تھے۔ یہ کشتی اب پُرانی ہو چکی ہے لیکن اس کے ایک ایک نشیب و فراز پر، ہر ہر انچ پر میری محبت کی یادگاریں ہیں۔ اس کی حسین سرگوشیاں چھپی ہوئی ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری دن گزارنے کے لیے میں نے یہ کشتی ڈھونڈ لی ہے۔ میں اس کشتی میں مرنا چاہتا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو سکا...... ایسا نہ ہو سکا دوست تو میں اپنی زندگی کی ایک بہت بڑی راحت سے محروم ہو جاؤں گا یہ محرومی مجھے مر کر بھی چین سے نہیں رہنے دے

گی۔اسی لیے تو کہتا ہوں، میری مدد کرو۔ مجھے واپس پہنچا دو۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی آواز میں التجا کا رنگ آ گیا۔

میں نے پوچھا۔'' کیا تم نے کبھی اس اسٹیٹ سے بھاگ جانے کی کوشش نہیں کی؟''

'' مجھے لگتا ہے کہ تم یہاں کے جغرافیے اور حالات سے زیادہ واقف نہیں ہو۔ اس اسٹیٹ کو تین طرف سے ایک چوڑے پاٹ والی بہت تیز رفتار ندی نے گھیر رکھا ہے۔اس ندی کے ساتھ ساتھ نگرانی کا سخت انتظام ہے۔ چوتھی طرف یہ جنگل ہے۔ اس طرف سے بھی اسٹیٹ کے بارڈر کو تقریباً ''سیل'' کر دیا گیا ہے۔ویسے بھی میرے جسم کی حالت تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔اس آدھے جسم کے ساتھ میں کہاں تک بھاگ سکتا تھا۔ جب میں پارسی عورت ہوشن کے پاس تھا، میرے دل میں کئی بار آئی کہ ہوشن کی پناہ چھوڑ کر کسی طرف نکل جاؤں۔ ہوشن نے بڑا حوصلہ کر کے مجھے پناہ تو دے دی تھی لیکن وہ ڈرتی بھی رہتی تھی۔ اس کے ڈر کی وجہ یہ وہم ہی تھا کہ حکم جی کے خاص قیدی اس گرفت سے نہیں نکل سکتے اور وہ جہاں بھی چلے جائیں، ان کو کھوج لیا جاتا ہے۔شاید تم نے بھی یہ بات سنی ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔میرے سینے میں سرد لہر سی دوڑ گئی تھی۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ میں بھی ان خاص قیدیوں میں سے ایک ہوں اور مجھے بھی ایک جدید ''جادو'' کے ذریعے اس اسٹیٹ کے اندر جکڑ لیا گیا ہے۔

باروندا جیکی نے کہا۔''اسے حکم کے روحانی کرشموں میں سے ایک کرشمہ کہا جاتا ہے لیکن اس کی اصل حقیقت سے کوئی بھی واقف نہیں۔ کیا تم جادو ٹونے اور عملیات وغیرہ پر یقین رکھتے ہو؟''

''رکھتا بھی ہوں...... اور نہیں بھی...... اس معاملے میں بہت سے لوگوں کی طرح درمیان درمیان میں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''بہر حال میں تمہیں اپنی محسنہ ہوشن کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ ہر وقت خوفزدہ رہتی تھی کہ کسی دن اس کے گھر کے دروازے پر حکم کے بے رحم ہرکاروں کی دستک ہو جائے گی۔ وہ بیچاری بیمار رہنے لگی تھی۔ پھر ایک روز میں نے بڑی خاموشی سے اس کا گھر چھوڑ دیا۔ میرے پاس دو تین ہفتوں کی خوراک موجود تھی اور ایک دیسی ساخت کا پستول بھی تھا۔ میں کئی روز تک جنگل میں چھپا رہا۔ پھر میری ملاقات چند مچھیروں سے ہوئی۔ میں ان کے پاس رہنے لگا۔ سب سے بڑا مسئلہ زبان کا تھا۔ میں نیپالی اور انگریزی کے سوا کچھ بول نہیں سکتا تھا۔ وہ یہ زبان نہیں سمجھتے تھے۔ بس اشاروں سے گزارہ ہوتا تھا۔ میں بیمار رہتا تھا۔ بازو کا زخم

مسلسل رہتا تھا۔شراب میری سخت ضرورت بن چکی تھی۔ بہر حال مجھے زندگی سے کوئی گلہ نہیں تھا اور نہ اب ہے۔ میں سو سال زندہ رہ کر بھی شاید وہ کچھ حاصل نہ کر پاتا جو میں نے اس ستائیس اٹھائیس سال کی زندگی میں حاصل کر لیا ہے۔ شکنتلا کے ساتھ گزارے ہوئے دن میرا قیمتی سرمایہ ہیں۔ان دنوں کی خوبصورت یادوں کے سہارے میں جیتا رہا ہوں اور ان یادوں کے سہارے ہی اب مرنا بھی آسان لگ رہا ہے۔ان مچھیروں کے ساتھ رہتے ہوئے میرے دل میں یہ خواہش جاگی تھی کہ میں اس نیلی کشتی کو ڈھونڈوں جس میں، مَیں نے شکنتلا کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ اس سلسلے میں ایک مقامی شخص نے بھی میری مدد کی۔ آخر میں کامیاب ہوا۔ مجھے وہ کشتی مل گئی۔ مچھیروں کے ساتھ رہتے ہوئے میں کام بھی کیا کرتا تھا۔ میرے پاس کچھ رقم جمع تھی اور پستول بھی تھا۔ میں نے یہ سب کچھ کشتی کے موجودہ مالک ملاح سیوک رام کو دے دیا اور اس سے اجازت لے لی کہ میں جب تک زندہ ہوں، اس کشتی میں رہوں گا اور وہ مجھے کھانا اور شراب دیتا رہے گا۔ وہ میری حالت دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔اس نے اقرار کر لیا۔تو یہ ہے میری کہانی......''

آخری الفاظ ادا کرتے کرتے جیکی کی سانس پھول گئی اور آواز پھر سے لڑکھڑانا شروع ہو گئی۔ دراصل اب اس کا نشہ ذرا دھیما پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ نشے کے بغیر اس کی وہی حالت ہو جاتی تھی جو کسی نارمل شخص کی نشے میں دھت ہو کر ہو سکتی ہے۔ وہ کسی لاغر کیچوے کی طرح پیوند زمین ہو جاتا تھا اور اس کی آواز ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھی۔

اس کی کہانی متاثر کن تھی۔ مجھے اس کہانی نے شاید اس لیے بھی زیادہ متاثر کیا کہ میں خود بھی دل کا روگی بن چکا تھا۔ثروت میری محبت تھی اور وہ مجھ سے بہت دور چلی گئی تھی۔ پچھلے دو ڈھائی سالوں میں پلوں کے نیچے سے نہ جانے کتنا پانی بہہ چکا تھا۔ یہاں سلطانہ مجھے اپنی بیوی بتاتی تھی۔ وہ ایک دلیر لڑکی تھی۔ اس میں کچھ انوکھی باتیں موجود تھیں۔ جیسے یہ کہ وہ کبھی زیور نہیں پہنتی تھی۔ شاید وہ زیور کو عورت کے لیے غلامی و محکومی کی علامت سمجھتی تھی۔ وہ میری زندگی کی خاطر عارضی طور پر جارج گورا کے ہاتھوں بے بس تو ہو گئی تھی لیکن جہاں تک میں اسے سمجھا تھا، وہ ظلم سہہ کر بھول جانے والوں میں سے نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اسے جب بھی موقع ملے گا وہ کچھ کر کے رہے گی۔

چند منٹ تک میرے اور باروندا جیکی کے درمیان اس کی روداد کے بارے میں سوال جواب ہوئے۔ تب میں نے ایک بار پھر اسے سابقہ موضوع کی طرف لانا چاہا۔ میں نے اس کی جلد کو چھوتے ہوئے کہا۔''جیکی! تم ایک مختلف شخص ہو۔ تمہارے جیسے چمپئن فائٹر کو ایسا ہی

ہونا چاہیے تھا۔"

"تم...... کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"تمہارے اندر جسمانی تکلیف سہنے کی بے پناہ گنجائش ہے۔ اس بیمار حالت میں بھی تم برداشت کے معاملے میں بے مثال ہو۔ تم اس بارے میں مجھے بھی کچھ بتانے جا رہے تھے لیکن پھر درمیان میں تمہاری یہ دلچسپ روداد آ گئی۔"

اس نے نفی میں انگلی ہلائی۔ "میں مرنے والا ضرور ہوں لیکن میری یادداشت زیادہ کمزور نہیں ہوئی۔ میں اب بھی تمہیں بتا سکتا ہوں کہ الزبتھ ٹیلر کے چوتھے شوہر کا نام کیا تھا اور پرل ہاربر کی بندرگاہ پر کس تاریخ کو حملہ ہوا تھا۔" اس نے چند لمحے توقف کیا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میں نے تمہیں بتانے کا وعدہ ضرور کیا تھا لیکن آج نہیں کل...... کل تم پھر میرے لیے شراب اور ہنٹر بیف کا ایک "پیس" لاؤ گے۔ ہم یہاں اس سینڈ بیگ کے قریب اطمینان سے بیٹھیں گے اور مارشل آرٹ کے بارے میں بات کریں گے۔"

میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔

اگلے روز میری آنکھ دس گیارہ بجے کے قریب کھلی۔ سرنگ کے دہانے پر ایک بار پھر ہنگامہ برپا تھا۔ انور خاں اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ دوسری طرف دہانے کے باہر سے کسی اور شخص کے بولنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ یہ شخص حکم کے اہلکاروں میں سے تھا اور انور خاں سے زوردار مکالمہ کر رہا تھا۔

اس مکالمے سے پتا چلا کہ انور خاں اور چوہان وغیرہ نے ماریا کے وارثوں کے اٹھارہ گھنٹے کی جو دوسری مہلت دی تھی۔ وہ بھی اب ختم ہو گئی ہے۔ انور خاں چنگھاڑ رہا تھا۔ "ہم سمجھ گئے ہیں۔ یہ گھی سیدھی انگلیوں سے نکلنے والا نہیں۔ تم ہمارے پاس اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں چھوڑ رہے کہ اس حرامزادی کو زندگی اور موت کے درمیان لٹکا دیں اور یہ بس اب ہونے ہی والا ہے۔"

دوسری طرف سے بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ "میں تمہیں پھر پیشکش کرتا ہوں۔ تم مسٹر اسٹیل اور گرومودان کو اپنے پاس ضمانت کے طور پر رکھو لیکن میم صاحبہ کو چھوڑ دو۔ اس کے بعد ہم سارا معاملہ بات چیت کے ذریعے طے کر سکتے ہیں۔"

"ہم تمہارے کہنے سے پہلے ہی میم صاحبہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کر چکے ہیں لیکن یہ ایک ٹکڑے میں تمہارے پاس نہیں آئے گی۔ تھوڑی تھوڑی کر کے آئے گی۔" انور خاں نے زہرناک لہجے میں کہا۔ "پہلے اس کے ہاتھوں کی انگلیاں آئیں گی۔ پھر پاؤں کی...... پھر کوئی

اور ٹکڑا۔"

"تم خود کو مسلمان کہتے ہو؟" بھاری بھرکم آواز والے نے کہا۔

"ہاں...... ہم مسلمان ہیں...... اور اسی لیے اس کی عزت بچی رہی ہے۔ ورنہ یہ بھی مختار راجپوت کی بیٹی کی طرح تاراج ہو چکی ہوتی۔ باقی رہی اس کے ٹکڑوں کی بات...... تو انصاف تو یہی کہتا ہے۔ کان کے بدلے کان...... آنکھ کے بدلے آنکھ۔ اس کتے جارج نے اپنی جیل میں کتنے لوگوں کو اعضاء کا کاٹ کر بے کار کیا ہے؟ آج اس کی بہن کو تھوڑا سا بدلہ چکانا ہو گا۔"

ماریا کے شوہر سرجن اسٹیل کی لڑکھڑاتی آواز اُبھری۔ "دیکھو...... تم لوگ اپنے لیے بدترین انجام کو Choose کر رہا ہے۔ ہم تمہارا ڈیمانڈ مان رہا ہے۔ سلطانہ کے بھائی اور فادر کو چھوڑا جا رہا ہے۔ ہام نے آج تمہارا یہ ڈیمانڈ بھی مانا کہ جن 50 لوگوں کا لسٹ تم نے دیا، اس میں سے 5 لوگوں کو ریلیز کر دیا جائیں گا لیکن باقی لوگوں میں سے کچھ تو ایسا ہے جو ہماری کسٹڈی میں ناہیں اور دو چار ایسا ہے جن پر بہت سخت کیس ہے۔"

"کیس تو تم پر بھی بہت سخت ہے اسٹیل صاحب۔" اسحاق بھر کر دھاڑا۔ "ایسے کیسوں کے بدلے تمہاری اپنی پتنی کو دس بار بھی پھانسی دی جائے تو کم ہے اور مجھے لگ رہا ہے کہ یہ زیادہ دیر زندہ رہنے والی ناہیں ہے۔ بس اب گھنٹوں کی ناہیں، منٹوں کی بات ہے۔"

"پانڈے! میری بات سنو۔" گرومودان نے اپنے کسی ساتھی کو پکارا۔

"آ رہا ہوں سر۔" پانڈے نے جواب دیا۔ یہ بھاری آواز والا وہی تھا جو انور سے مکالمہ کر رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں جھما کا سا ہوا۔ مجھے یاد آ گیا کہ مجھے یہ نام میڈم صفورا نے بتایا تھا۔ ایک لہر سی میرے جسم میں دوڑ گئی۔ یہ رنجیت پانڈے، غالباً حکم کا وہی اہلکار تھا۔ جسے دشمنوں کے لیے عزرائیل کہا جاتا تھا اور وہ یہاں پہنچ چکا تھا۔

○......❖......○

میں نے پانڈے کی بس ایک ہی جھلک دیکھی اور وہ بھی عقب سے۔ وہ درختوں کے ایک جھنڈ سے نکلا اور چھلانگ لگا کر ایک نشیب میں اوجھل ہوگیا۔ وہ خاصا تنومند تھا۔ اس نے پینٹ اور چمک دار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ وہ غالباً گرومودان سے تبادلۂ خیال کرنے کے لئے نشیب میں اُترا تھا۔ عین ممکن تھا کہ ماریا کا شوہر سرجن اسٹیل بھی وہیں موجود ہو......

اس تبادلۂ خیال کا نتیجہ پانچ دس منٹ بعد سامنے آ گیا۔ پانڈے کی بھاری بھرکم کرخت آواز ایک بار پھر درختوں کے عقب سے اُبھری۔ وہ بلند آواز میں بولا۔ ''انور خاں! ہم نا ہیں چاہت کہ تم کسی طرح کی حماقت کرو اور اس کے نتیجے میں سب کچھ برباد ہو جائے۔ گرومودان خون خرابے سے بچنے کے لئے ہر حد تک جانا چاہت ہیں۔ تم نے پچاس لوگن کی جولسٹ دی ہے، ان میں سے آدھے تو ہمارے پاس آ گئے ہیں لیکن باقیوں کا کچھ پتا نا ہیں۔ ہم اس سلسلے میں تھوڑی سی مزید کوشش کرتے ہیں، تم بھی اپنے اندر کچھ لچک پیدا کرو۔ میرا خیال ہے کہ ہم کل دو پہر تک تم لوگن کو کوئی حتمی جواب دے سکیں گے۔''

''اور میرا خیال ہے کہ تم صرف وقت گزاری کر رہے ہو۔'' انور خاں نے بلند آواز میں جواب دیا۔ ''تمہاری فطرت دھوکا ہے پانڈے...... اور تم اس کے خلاف نہیں چل سکتے ہو۔ مگر میں تمہیں ایک بات صاف صاف بتا دوں۔ ہمیں تو مرنا ہی ہے لیکن یہ میم صاحب بھی زندہ تمہارے ہاتھ نہیں آئے گی۔ یہ میرا تم سے اور اسٹیل...... مودان وغیرہ سے وعدہ ہے۔'' انور کی آواز میں حد درجے کی تپش تھی۔

سرجن اسٹیل کی لڑکھڑاتی آواز اُبھری۔ ''ہام ماریا کا لائف بچانا چاہتا اور اس کے ساتھ تمہارا سب کا لائف بھی بچانا چاہتا۔ ہام ہوپ کرتا ہے کہ کچھ طے ہو جائے گا۔ ہام کی طرف

سے پرامس ہے کہ کل دو پہر تک کسی طرح کا کوئی کارروائی نا ہیں ہوگا۔ تم لوگ بھی خود کو COOL رکھو۔''

انور خاں...... سرجن اسٹیل اور پانڈے کے درمیان اس حوالے سے دو چار منٹ بات ہوئی پھر انور خاں کل دو پہر کا مزید وقت دینے کو تیار ہو گیا۔

یہ بڑی سخت قسم کی اعصابی جنگ تھی۔ ہر ہر پل جیسے سُولی پر گزر رہا تھا۔ دونوں طرف سخت تناؤ موجود تھا۔ ایسی صورت حال میں کامیاب فریق وہی ہوتا ہے جو اعصاب کو ٹوٹنے سے بچائے رکھتا ہے اور اندازہ ہوتا تھا کہ انور خاں اس بات کو بڑی اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اس کے دل و دماغ میں جو کچھ بھی چل رہا تھا مگر اس نے اپنے چہرے کی بشاشت قائم رکھی ہوئی تھی۔ گفتگو کے آخر میں انور خاں نے ماریا کے لئے تین بوتل شراب کا مطالبہ بھی کیا۔ یہ مطالبہ میرے کہنے پر ہی کیا گیا تھا۔ ان لوگوں نے اسی وقت شراب کی سربمہر بوتلیں اندر سرنگ میں بھجوا دیں۔

گفتگو ختم ہوئی تو میں نے انور خاں سے پوچھا۔ ''یہ پانڈے وہی ہے جو انڈین سکیورٹی فورس میں افسر تھا اور اب یہاں حکم کے لئے کام کرتا ہے؟''

''وہی ہے حرامی......'' انور نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''اس کے یہاں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حکم اور جارج وغیرہ دونوں راستے کھلے رکھنا چاہتے ہیں۔ بات چیت کا...... اور کسی اچانک کارروائی کا بھی۔ پانڈے اور اس کے ساتھی ایسی اچانک کارروائی کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ خاص طور سے یہ پانڈے کسی لومڑی کی طرح چالاک اور بھیڑیے کی طرح خطرناک ہے۔ ہمیں اب پہلے سے کہیں زیادہ ہوشیار رہنا ہوگا۔''

اسحاق نے کہا۔ ''میری تو رائے ہے کہ دستی بموں میں سے دو چار بم اس خبیث ماریا کی کمر سے بھی باندھ دیئے جائیں اور پانڈے وغیرہ کو بھی بتا دیا جائے کہ ماریا کس حال میں ہے۔''

''چلو اس بارے میں بھی سوچ لیتے ہیں۔'' انور خاں نے کہا پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا۔ ''لیکن ماریا ہے کہاں؟''

اسحاق بولا۔ ''وہ اُدھر بیٹھی اپنی روٹی پکا رہی ہے۔ میں نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ یہاں ڈبل روٹی اور کیک پیسٹری نا ہیں ملیں گی...... روٹی ہی ملے گی اور یہ روٹی بھی اسے خود پکانا ہووے گی۔''

میں نے دیکھا کہ سرنگ کے خم پر جہاں عارضی باورچی خانہ بنایا گیا تھا، وہاں سے

دھواں اُٹھ رہا تھا۔ میں نے جا کر دیکھا اور یقین ہو گیا کہ بھوک انسان سے سب کچھ کروا سکتی ہے۔ سفید فام ماریا کے پاؤں زنجیر میں بندھے ہوئے تھے لیکن ہاتھ آزاد تھے۔ چولہے میں لکڑیاں جل رہی تھیں اور اوپر توا رکھا تھا۔ ماریا جس نے شاید کبھی تنکا پکڑ کر بھی دہرا نہیں کیا ہو گا، اپنے لئے روٹی پکا رہی تھی۔ پچھلے دو تین دن میں اسے کافی مشق ہو گئی تھی۔ توے پر ایک گول روٹی نظر آ رہی تھی۔

اسحاق میرے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ وہ بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ میم جی کو کافی تجربہ ہو گیا ہے۔ اب ان پر کچھ اور ذمے داری ڈال دینی چاہئے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''بھئی، یہ سارا دن بیٹھ کر ہمیں گھورنے کے سوا اور تو کچھ کرتی نا ہیں۔ ہم چھ سات بندوں کے لئے اگر چودہ پندرہ روٹیاں اُتار دیا کرے گی تو کون سی قیامت آ جاوے گی؟ اس کی اپنی روٹی بھی ہضم ہو جایا کرے گی۔''

ماریا، اسحاق کی بات مکمل سمجھ گئی تھی لیکن سنی اَن سنی کر گئی۔ اس کے چہرے کی سرخی سے ظاہر تھا کہ اس کا پارا چڑھ رہا ہے لیکن وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔ وہ ایک اسمارٹ اور صحت مند جسم رکھتی تھی۔ کل بارونداجیکی سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک وقت میں جوڈو کراٹے بھی سیکھتی رہی ہے۔ معلوم نہیں کہ جوڈو کراٹے میں اسے مہارت تھی یا نہیں مگر اس کے ڈیل ڈول اور تاثرات سے دکھائی دیتا تھا کہ وہ بوقتِ ضرورت سخت قسم کی جدوجہد کر سکتی ہے۔ بہرحال، ابھی تو اونٹ پہاڑ کے نیچے آیا ہوا تھا اور وہ خود کو قطعی بے بس محسوس کر رہی تھی۔

ہمیں اپنے قریب دیکھ کر وہ جھلاہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ اس نے روٹی اُتار کر ایک طرف رکھی اور سالن گرم کرنے کے لئے توا اُتارنا چاہا۔ جب وہ توا اُتار رہی تھی، وہ ایک دم لڑھک گیا اور گھوم کر اس کے پاؤں پر آیا۔ وہ چلا اُٹھی...... اور پھر ''او گاڈ...... او گاڈ'' کی گردان کرنے لگی۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ توے نے اس کے سفید گلابی پاؤں کو آتشیں بوسہ دیا تھا اور انگلیوں سے اوپر کی ساری جگہ سرخ نظر آ رہی تھی۔ ماریا کی آوازیں سن کر چوہان اور ہمیش بھی وہاں آ گئے۔

چوہان نے اس کا متاثرہ پاؤں دیکھ کر کہا۔ ''ماریا کے بیگ میں ایک دواؤں والا شاپر پڑا ہے، وہ لے کر آؤ۔''

ہمیش بیگ کی طرف بڑھا۔ ماریا ایک دم بھڑک کر انگریزی میں بولی۔ ''مجھے نہیں چاہئے دوا۔ مجھے نہیں چاہئے تمہاری ہمدردی۔ مجھے مر جانے دو۔ مجھے زہر کا کوئی انجکشن لگا دو

تاکہ میری جان چھوٹ جائے۔''

اسحاق پھنکارا۔ ''تم ابھی سے گھبرا گئی ہو میم جی! ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے؟ ابھی پورا پورا حساب کتاب ہونا ہے اور جو کچھ ہوا ہے یہ تو ''حساب'' کا عشرِ عشیر بھی نا ہیں۔ بس ایک چھوٹی سی مثال سن لو۔ جس ملازم لڑکے کو تم نے طوطوں کو خوراک نہ دینے کی پاداش میں بھوکا مار دیا تھا، یہ اس کی ایک گھنٹے کی بھوک پیاس کا بدلہ بھی نا ہیں ہے۔''

اس مرتبہ وہ گلابی اردو میں بولی۔ ''اسی لئے تو ہام تم سے کہتا ہے کہ ہام کو مار ڈالو۔ تمہارا سارا ہی بدلہ ایک بار میں پورا ہو جائے۔''

''موت اتنی آسان نا ہیں ہے میم جی۔'' اسحاق پھنکارا۔ ''میں نے اپنی بہن کو ایک ایک سانس کے لئے تڑپتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کے ہونٹ نیلے ہو گئے تھے، اس کا پورا جسم نیلا پڑ گیا تھا۔ کیا تم نے کبھی ہانپی ہوئی پیاسی چڑیا کو دیکھا ہے؟ وہ اسی طرح سانس لیوت تھی اور وہ تھی بھی تو ایک چھوٹی سی چڑیا کی طرح...... تمہارے بھائی کی شکرہ آنکھوں نے اسے شکار کے لئے چنا...... اور پھر اس کے بے رحم پنجوں نے اس کے جسم کو لہولہان کر ڈالا۔ وہ اس کے پنجوں سے نکلنے کی کوشش کرتے کرتے جیون کی ریکھا ہی پار کر گئی۔ ہاں، میں نے اسے مرتے دیکھا ہے اور میں جانت ہوں کہ جان دینا آسان نا ہیں۔''

اسحاق کے لہجے میں اتنی آگ تھی کہ چاروں طرف انگارے برستے محسوس ہوئے......

ماریا اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ اسحاق پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ شاید اسے اندیشہ تھا کہ وہاں کھڑا رہا تو طیش کے دریا میں بہہ جائے گا اور وہ اس طیش کی وجہ سے پٹ جائے گی۔

انور خاں آگے بڑھا اور اس نے ماریا کو بہ مشکل آمادہ کیا کہ وہ اپنے پاؤں پر دوا لگوا لے۔ وہ برے برے منہ بنا رہی تھی۔ میں اس کے قریب چوکس کھڑا تھا۔ رائفل میرے کندھے سے جھول رہی تھی اور میری انگلی ٹریگر کے آس پاس تھی۔ ماریا کے ہاتھ فی الحال کھلے ہوئے تھے اور یہ امر خارج از امکان نہیں تھا کہ وہ طیش کے عالم میں کسی پر جھپٹ پڑتی۔ پچھلے چند دن میں ہمیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ اس لڑکی کی طرف سے ہر وقت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

سرنگ کے دور افتادہ کونے سے بارونداجیکی کا واویلا سنائی دے رہا تھا۔ وہ نشے کے بغیر تڑپ رہا تھا اور اس کی وہی تلخی اور جھلاہٹ واپس آ چکی تھی جس کا مشاہدہ ہم نے کشتی میں کیا تھا۔

احمد نے آ کر مجھ سے کہا۔ ''تابش بھائی! تمہارا یار بہت بے چین ہووت ہے۔ وہ کہوت ہے، میں مرنے والا ہوں۔ اگر میں پیاسا مر گیا تو تم سب جہنم میں جاؤ گے۔''

''وہ جس طرح کا پانی مانگ رہا ہے، وہ دے کر بھی تو ہم جہنم میں ہی جائیں گے۔'' چوہان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

انور خاں بولا۔ ''اس کی پیاس ذرا بڑھنے دو، پھر وہ اندر کی باتیں بتانے پر مجبور ہوگا۔''

میرا اپنا خیال بھی یہی تھا کہ شام تک اس کی تڑپ ذرا بڑھ جائے تو پھر اسے ''مہیا'' کی جائے۔ اندر جیکی کا واویلا تھا اور باہران کتوں کی آوازیں تھیں جو پانڈے اور اسٹیل کے ساتھ یہاں پہنچے تھے۔

شام ہونے سے پہلے ہی میں ایک بار پھر باروندا جیکی کے پاس تھا۔ آج وہ خلافِ معمول دراز ہونے کے بجائے ٹیک لگا کر دیوار کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنا سر جھکا کر اپنے گھٹنے پر رکھا ہوا تھا اور کسی گہری سوچ میں غرق دکھائی دیتا تھا۔ ''جیکی!'' میں نے کہا۔ اس نے میری آواز نہیں سنی اور بے حرکت بیٹھا رہا۔

''جیکی......جیکی!'' میں نے دہرایا لیکن صورتِ حال جوں کی توں رہی۔

یکا یک مجھے اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں وہ عدم آباد ہی روانہ نہ ہو گیا ہو۔ میں نے اسے جھنجوڑا تو اس میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے ایک دم چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں گہری سرخ تھیں۔ وہ جیسے اپنے اردگرد سے بالکل بے خبر تھا۔ اس کے چہرے پر گہری جھلاہٹ اُبھری۔ وہ نہایت تلخ لہجے میں بولا۔ ''تم کہاں سے آ گئے ہو؟ کیوں ڈسٹرب کیا ہے مجھے؟ دفع ہو جاؤ......دفع ہو جاؤ۔''

''تم مجھے پہچان نہیں رہے ہو۔ میری طرف دیکھو۔ میں تابش ہوں۔''

''تابش ہو تو میں کیا کروں؟'' اس پر بدستور جھلاہٹ سوار تھی۔

''دیکھو، میں یہ کیا لایا ہوں۔'' میں نے وہسکی کی چم چم کرتی بوتل لالٹین کے رخ پر رکھ کر اسے دکھائی۔ اس کی تلخی ایک دم کم ہو گئی۔

اس نے آنکھیں موند کر دو تین گہری سانسیں لیں پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں بہت دور گیا ہوا تھا......وہ میرے بہت پاس تھی۔ ہم اس خاموش پانی کے کنارے پر تھے اور وہاں سیکڑوں کنول کھلے ہوئے تھے۔ تم نے......سارا طلسم توڑ دیا......'' شاید وہ مایوس لہجے میں کچھ اور بھی کہتا مگر پھر اس کی نظر بوتل پر پڑ گئی۔ اس کے خشک ہونٹوں پر پیاس نمایاں ہونے لگی۔

''تم کس طلسم کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''محبت کے طلسم کی!'' اس نے رواں انگریزی میں کہا۔ ''جب میں بہت تنہا ہوتا ہوں......دکھ کی آخری حدوں کو چھو رہا ہوتا ہوں، وہ میرے پاس چلی آتی ہے۔ اسی لباس میں جس میں، مَیں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا......اور اسی لباس میں جس میں وہ سات آٹھ روز میرے ساتھ کشتی پر رہی تھی۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتے ہیں اور سرسبز جنگل میں پانی کے ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ وہ اپنا سر میرے کندھے سے ٹکا دیتی ہے۔ ہنستی ہے اور سرگوشیاں کرتی ہے۔ پھر وہ اپنا وزن میری بانہوں پر ڈال کر لہراتی ہے۔ اس کے بال بہت لمبے ہیں......وہ کسی سیاہ آنچل کی طرح ہوا میں جھومتے ہیں اور مچلتے ہیں۔ اس کے رخساروں پر کرنیں موتی بکھیرتی ہیں اور اس کی شربتی آنکھوں پھولوں اور تتلیوں کے سارے رنگ اُتر آتے ہیں۔ وہاں فطرت کے سوا ہمیں کوئی نہیں دیکھتا اور فطرت بھی ہماری ہم مزاج ہو جاتی ہے۔ رات کی پھیلتی ہوئی چادر میں ہم اپنی کشتی کے اندر چلے جاتے ہیں اور اتنا قریب ہو جاتے ہیں کہ......محبت کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہتا......''

''مجھے افسوس ہے دوست کہ میں نے تمہیں تمہارے تصور سے دور کر دیا۔'' میں نے معذرت کے لہجے میں کہا۔

''نہیں نہیں۔ اس کو تصور مت کہو۔ یہ تو حقیقت سے اتنا قریب ہوتا ہے کہ میں اس کے جسم اور لباس کی خوشبو اپنے آس پاس محسوس کرتا ہوں...... جیسے اب۔ میں اسے سونگھ سکتا ہوں۔ میں اسے سونگھ رہا ہوں۔'' اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر کے اپنی سانس اندر کی طرف کھینچی۔

شاید وہ اس بارے میں کچھ دیر مزید بات کرتا لیکن اب شراب کو اپنے سامنے دیکھ کر اس سے صبر کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہی روز والا عمل پھر شروع ہوا۔ میں وہ سیالِ آتش، گلاس میں بھر بھر کر اسے دیتا رہا اور وہ یہ تلخ بدبو اپنے گلے میں اُتارتا رہا۔ آخر اس کا نشہ پختہ ہونا شروع ہو گیا۔ اس کی آواز کی لڑکھڑاہٹ اور ناتوانی ختم ہونے لگی۔ مدقوق چہرے پر برسنے والی ازلی جھلاہٹ کی جگہ ایک طرح کے سکون نے لے لی۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، ایک بار پھر اپنی کشتی کو یاد کرنے لگا۔ وہ جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا، تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ اب یہاں کی صورتِ حال کو بھی کسی حد تک سمجھ رہا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ ہم حکم اور جارج کے باغیوں کی حیثیت سے یہاں اس سرنگ میں پھنسے ہوئے ہیں۔

جلد ہی میں گفتگو کا رخ کل والے موضوع کی طرف موڑنے میں کامیاب ہو گیا اور یہ

حقیقت ہے کہ مارشل آرٹ کے حوالے سے اس نامور کھلاڑی کی باتوں نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ یہ ''ماسٹر کھلاڑی'' عام لوگوں کی طرح جسمانی تکنیک اور داؤ پیچ کے بجائے ذہنی کیفیت اور دماغی توانائی پر زور دیتا نظر آتا تھا۔

وہ بیساکھی کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ سینڈ بیگ ہمارے سامنے تھا۔ وہ ایک بار پھر مختلف ٹپس دینے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ مجھے عملی مشق بھی کرا رہا تھا۔ میں دنگ رہ گیا۔ وہ مجھے وہ باتیں بتا رہا تھا جو آج تک کسی نے نہیں بتائی تھیں۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ اس شخص کی بے پناہ صلاحیتیں مجھ پر آشکار ہو رہی تھیں۔ یہ بظاہر لاغر و حقیر شخص میرے لئے دیکھتے ہی دیکھتے غیر معمولی ہو گیا اور میں خود کو اس کے سامنے ایک دم بونا محسوس کرنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''جیکی! آپ نے کل ''درد'' کے بارے میں بات کی تھی۔ وہ کیا طریقہ ہے جس سے ہم درد کو کم سے کم محسوس کر سکتے ہیں؟''

وہ ذرا ہانپ گیا تھا اور اسے ہلکی ہلکی کھانسی بھی ہونا شروع ہو گئی تھی۔ وہ دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا پھر بولا۔ ''درد بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ ہمیں اتنا ہوتا نہیں جتنا ہم اسے محسوس کرتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''اسے سمجھنے کے لئے میں تمہیں ایک مثال دیتا ہوں۔ میڈیکل کی تعلیم یہ ثابت کرتی ہے کہ اگر کسی شخص کو بے ہوش کئے بغیر یا اسے سن کئے بغیر اس کا پیٹ چاک کر دیا جائے اور اس کی انتڑیاں وغیرہ اُٹھا کر باہر رکھ دی جائیں اور کچھ کو مہارت سے کاٹ واٹ بھی دیا جائے تو وہ شخص آسانی سے برداشت کر سکتا ہے...... اور اس کا درد ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتا لیکن عملی طور پر ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ جس شخص کے ساتھ ایسا ہو گا، وہ روئے چلائے گا اور نشتر کی ہر ہر حرکت پر آسمان سر پر اُٹھا لے گا اور عین ممکن ہے کہ بے ہوش ہی ہو جائے۔ اس سے کیا بات سمجھ میں آتی ہے؟''

''...... کہ وہ درد کی وجہ سے نہیں، خوف کی وجہ سے بے ہوش ہوتا ہے۔''

''ہاں، خوف کی وجہ سے اور اس غلط احساس کی وجہ سے کہ اسے بہت درد ہو رہا ہے...... ہماری عام زندگی میں بھی یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ حقیقت میں ہمیں درد اتنا نہیں ہو رہا ہوتا جتنا ہم اسے محسوس کر رہے ہوتے ہیں۔ بات تمہاری سمجھ میں آ رہی ہے؟''

''ہاں...... کچھ کچھ۔''

''ہم عام طور پر جانوروں کو بہت سخت جان سمجھتے ہیں...... اور وہ ہوتے بھی ہیں۔ ہم

دیکھتے ہیں کہ ایک کتا ٹانگ کی ٹوٹی ہوئی ہڈی کے ساتھ گلیوں میں پھرتا رہتا ہے۔ کسی شکاری جانور کے پاؤں میں کانٹا چبھ جاتا ہے اور ایک بڑا زخم بن جاتا ہے لیکن وہ اسی حال میں بھاگ دوڑ کرتا رہتا ہے۔ ایک مادہ ہرن کسی کی مدد کے بغیر بچے کو جنم دیتی ہے اور خود ہی کوشش کر کے اسے اپنے جسم سے علیحدہ بھی کرتی ہے۔ ان سب جانوروں کو بھی درد ہوتا ہے لیکن وہ صرف اور صرف درد کو محسوس کرتے ہیں۔ ان میں اتنی صلاحیت ہی نہیں ہوتی کہ وہ درد کے ساتھ اپنے خدشوں، واہموں اور ذاتی احساسات کو بھی نتھی کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آسانی سے بڑے سے بڑے درد کو جھیل لیتے ہیں۔''

''آپ چاہتے ہیں کہ درد کو ذہن پر سوار نہ کیا جائے؟''

''نہیں...... میں اس سے زیادہ چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ درد کی گہرائی میں اُترا جائے۔ اس کو پرکھا جائے کہ اصل میں وہ کتنا ہے۔ اس میں کیا دم خم ہے۔ اس کی حقیقی نوعیت کیا ہے۔ جب ہم یہ سب کچھ جان لیں گے تو آدھے سے زیادہ درد تو ویسے ہی ختم ہو جائے گا...... جو میں کہہ رہا ہوں تم اس کو فالو کر رہے ہو؟''

''ہوں۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

اچانک اس نے بیٹھے بیٹھے اپنی بیساکھی نما لاٹھی زور سے میرے کندھے کے قریب دے ماری۔ میرا بازو جھنجھنا اُٹھا۔ میں تکلیف کی شدت سے ایک طرف کو جھک گیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنا کندھا تھام لیا۔

وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''تم نے اس ضرب کو ویسے ہی لیا ہے جس طرح عام لوگ لیتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ انہیں بڑے زور سے لاٹھی ماری گئی ہے اور انہیں پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ لاٹھی لگنے سے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اس سے ہڈی بھی ٹوٹ سکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔'' اس نے چند لمحے کھانس کر گلا صاف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو...... اب میں تمہیں دوبارہ چوٹ لگاتا ہوں۔ تم باقی ساری باتیں اپنے ذہن سے نکال دینا۔ پوری یکسوئی کے ساتھ صرف یہ محسوس کرنا کہ تمہیں تکلیف کتنی ہوئی ہے اور تمہارا دماغ اس تکلیف کو کس طرح محسوس کر رہا ہے۔ صرف اور صرف تکلیف پر دھیان رکھنا، باقی کسی چیز پر نہیں۔''

مجھے ہدایات دینے کے بعد اور ذہنی طور پر تیار کرنے کے بعد، اُس نے ایک بار پھر زور سے لاٹھی گھما کر میرے دوسرے بازو پر ماری۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ ایک بار پھر درد کی لہر میرے بازو سے اُٹھ کر دماغ کی طرف گئی۔ میں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ اس

مرتبہ درد بہت کم ہوا اور میں اسے آسانی سے برداشت بھی کر گیا۔

''کیسا لگا؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ تو ایک میجک کی طرح ہے۔''

''میجک تو تمہارے اندر ہی ہے۔ اس مرتبہ تم درد کی گہرائی میں اُترے ہو اور اسے اتنا ہی محسوس کیا ہے جتنا وہ اصل میں ہے۔'' جیکی نے کہا اور ایک بار پھر بوتل کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

اس بندے میں کوئی بات تھی۔ وہ کوئی روحانی شخص تو نہیں تھا لیکن مارشل آرٹ کے حوالے سے اس میں کچھ نہ کچھ انوکھا پن پایا جاتا تھا۔

درد کی گہرائی میں اُتر کر اس کی حقیقی شدت کو پرکھنے والی بات میں نے پہلے بھی کہیں سنی یا پڑھی تھی۔ کسی پیرا سائیکولوجسٹ نے کہا تھا کہ اگر کوئی شخص اپنے دانت یا گردے وغیرہ کے درد پر اپنی سوچ کو مرکوز کر لے اور اس کی اصل کیفیت کو جانچنے کی کوشش کرے تو یہ درد کم ہونے لگتا ہے۔

درد پر غالب آنے کے موضوع پر باروندا جیکی نے مجھے کئی باتیں بتائیں۔ یہ باتیں دل میں کھب رہی تھیں اور دماغ انہیں قبول کر رہا تھا...... اور ان باتوں کی سچائی کی گواہی خود جیکی بھی تو تھا۔ میں نے اس کے جسم میں برداشت کی غیر معمولی کیفیت دیکھی تھی۔

وہ شراب کا تلخ گھونٹ بھر کر بولا۔ ''ان باتوں کو یاد رکھو گے تو یہ تمہاری زندگی کو تبدیل کر دیں گی۔ درد پر غلبہ پانے کی کوشش جاری رکھو گے تو آہستہ آہستہ یہ بالکل تسخیر ہو جائے گا۔ تمہیں عام لوگوں کے مقابلے میں دسواں حصہ درد ہو یا شاید اس سے بھی کم اور جب یہ ایسا ہو جائے گا، کئی نہایت مشکل کام تمہارے لئے مشکل نہیں رہیں گے۔''

اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''جیسا کہ میں نے تمہیں کل بتایا تھا، جسمانی درد کے علاوہ بس ایک چیز اور ہوتی ہے جو ہمارے لئے لڑائی بھڑائی والے کاموں کو مشکل بناتی ہے...... اور وہ ہے بے عزتی کا احساس۔ ہمیں ڈر ہوتا ہے کہ اگر مسابقت کے عمل میں ناکامی اور توہین ہمارے حصے میں آئی تو کیا ہوگا؟ اگر ہم کوشش کر کے اس دوسرے احساس پر بھی غلبہ پا لیں تو پھر ہم کسی بھی جگہ، کسی بھی وقت...... بے خطر ہو کر مبارزت کے میدان میں کود سکتے ہیں۔''

وہ میرے لئے بڑی یادگار رات تھی۔ مارشل آرٹ کا انٹرنیشنل اسٹار باروندا جیکی میرے ساتھ تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اب زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکے گا۔ میرے سلوک کی وجہ سے وہ

مجھ پر مہربان تھا۔ وہ مجھے کچھ خاص الخاص باتیں بتانا چاہ رہا تھا، سمجھانا چاہ رہا تھا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ میں اس کی ان باتوں سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھا سکوں گا یا نہیں لیکن اسے یہ اطمینان ضرور تھا کہ وہ دل کی باتیں دل ہی میں لے کر نہیں جا رہا۔

''درد'' کے حوالے سے باروندا جیکی جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ اچھوتا اور انوکھا تھا۔ اس کی باتیں میرے دل و دماغ کے اندر گہرائی میں پیوست ہو رہی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ کوئی خاص چیز ہے جو جیکی مجھے بتا رہا ہے...... یا کوئی جادو، یا سحر یا کوئی ایسا نادر عمل جو زمین و آسمان کی وسعتیں میرے سامنے کھول سکتا ہے۔ وہ درد کی نفی چاہتا تھا اور جب درد کی نفی ہو جائے اور درد کامل یعنی موت کی نفی ہو جائے تو پھر اور کون سی چیز ہے جو بندے کا راستہ روک سکتی ہے۔

یہ بارشوں کا موسم تھا۔ سرنگ سے باہر شاید بارش ہو رہی تھی۔ مٹی کی سوندھی خوشبو اندر تک آ رہی تھی اور اس خوشبو کے ساتھ ساتھ کبھی ہلکی سی گرج بھی سنائی دیتی تھی۔

جیکی رواں انگریزی میں بولا۔ ''بارش ہو رہی ہے...... یہی موسم ہوتا ہے پینے کا۔ کیا آج تم مجھے اجازت دو گے کہ میں یہ بوتل ختم کر لوں؟''

''میں آپ کے لئے بڑی مشکل سے مہیا کر رہا ہوں۔ اگر اسے آج ہی ختم کر لو گے تو کل کیا کرو گے؟''

''کل نہ ہی آئے تو کتنا اچھا ہے۔ سب کچھ آج ہی ختم ہو جائے...... اسی برستی بارش میں، اسی ہلکی ہلکی خنکی میں...... لیکن...... نہیں...... میں اپنی کشتی سے باہر مرنا نہیں چاہتا۔ اگر ایسا ہوا تو میں اپنی زندگی کی آخری خوشی سے محروم ہو جاؤں گا۔ میں مر کر بھی چین نہیں پا سکوں گا۔''

کشتی کا خیال آتے ہی وہ ایک بار پھر بے چین ہو گیا۔ اس کے اندر جیسے کچھ پھڑ پھڑانے لگا۔ وہ یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کا اضطراب اس کے ہڈیوں بھرے چہرے سے عیاں تھا۔ مجھے لگا جیسے وہ میرے جیسی کیفیت سے ہی دوچار ہے۔ میرے ساتھ بھی تو اکثر ایسا ہی ہوتا تھا۔ ایک دم میرے سینے میں دھواں بھر جاتا تھا۔ میں اس راجواڑے سے نکل کر اپنی سرزمین پر، اپنی پسندیدہ فضاؤں میں پہنچنے کے لئے بے قرار ہو جاتا تھا۔ شاید ہر پابند و مجبور شخص جب یادوں کے دھارے پر بہتا ہے تو ایسے ہی اپنے پر پھڑ پھڑاتا ہے۔

وہ کچھ دیر تک مجھ سے باتیں کرتا رہا پھر نیم دراز ہو گیا۔ خنکی محسوس ہو رہی تھی اور اس کے جسم پر ایک لنگوٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا لیکن لگتا تھا کہ اس کا جسم ہر قسم کی سختی کو سہہ سکتا

ہے۔اس نے آنکھیں بند کر لیں......تب وہ اپنی ترنگ میں کچھ گنگنانے لگا۔ پہلے اس کی آواز بالکل مدھم تھی، کچھ دیر بعد قدرے بلند ہوگئی۔ یہ کوئی نیپالی گیت تھا۔ میری سمجھ میں الفاظ تو نہیں آرہے تھے لیکن طرز دلکش تھی۔ جیسے سوچ کی کرنوں سے ماضی کی برف پگھل رہی ہو اور یادوں کے جھرنے بہہ رہے ہوں۔

وہ گنگناتا رہا......پھر اس کی آواز دوبارہ مدھم ہوگئی اور وہ دھیرے دھیرے سو گیا۔

اگلی صبح ایک بالکل غیر متوقع بات ہوئی۔ انور خاں کی دی ہوئی ڈیڈ لائن ختم ہونے سے پہلے ہی رنجیت پانڈے درختوں کے جھنڈ میں پہنچا اور اس نے بہ آوازِ بلند پکار کر انور خاں سے کہا کہ وہ بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔

انور خاں نے کہا۔ ''بات چیت بہت ہو چکی ہے۔ اب ہمیں صرف یہ بتاؤ کہ تمہیں مطالبات منظور ہیں یا نہیں؟''

''یہی بتانے کے لئے کچھ لوگ یہاں آئے ہیں۔'' پانڈے کی پاٹ دار آواز آئی۔

''کون آیا ہے؟'' انور خاں نے پوچھا۔

''میں ہوں مراد شاہ......نل پانی سے۔'' ایک گونجتی ہوئی آواز اُبھری۔

ایک دم میرے ذہن میں روشنی سی چمکی۔ مجھے یاد آیا کہ یہ نام میں نے چرواہے نریندر سنگھ اور انور وغیرہ کی گفتگو میں سنا تھا۔ معلوم ہوا تھا کہ نل پانی میں، مَیں مراد شاہ کی حیثیت چھوٹے سرکار کے مشیر خاص اور دست راست کی ہے اور اب یہی مراد شاہ یہاں بات چیت کے لئے موجود تھا۔

''السلام علیکم شاہ صاحب! ہمیں امید نہیں تھی کہ ہم یہاں آپ کی آواز سنیں گے۔'' انور خاں نے بلند آواز میں کہا۔

''اور مجھے بھی امید نہیں تھی کہ مجھے یہاں آ کر اس طرح تم سے بات کرنی پڑے گی۔''

''دیکھ لیں شاہ صاحب! یہاں ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ کوئی بھی راج بھون کے ستم سے محفوظ نہیں رہا۔ وہاں نل پانی میں سلطانہ نے آپ کے سامنے دہائی دی تھی کہ اگر اسے واپس زرگاں بھیجا گیا تو اس کی جان اور عزت کو شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا اور دیکھ لیں شاہ صاحب......ویسا ہی ہوا ہے۔''

''یہ تو تمہارا بیان ہے انور خاں! اصل حقیقت تو تحقیق کے بعد ہی سامنے آئے گی...... اگر واقعی کسی نے قانون توڑا ہے تو اس کو قانون کے مطابق سزا ملنی چاہئے لیکن تم اور تمہارے ساتھی جو کچھ کر رہے ہیں، یہ کہاں کا انصاف ہے؟ تم ایک بے گناہ لڑکی کو پکڑ کر یہاں لے

آئے ہو۔ اس کو اذیت دے رہے ہو۔ یہ صورتِ حال کسی کے لئے کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں۔ اس طریقے سے انصاف کرنے کی ریت چل پڑی تو پھر یاد رکھو کہ کسی کی جان اور عزت محفوظ نہیں رہے گی۔'' مراد شاہ کا لہجہ سخت تر ہوتا جا رہا تھا۔

مجھے چرواہے نریندر کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ چھوٹے سرکار کو ہمارے خلاف رویہ اختیار کرنا پڑے گا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ انہوں نے واقعی سخت رویہ اپنا لیا ہے۔

انور خاں نے کہا۔ ''شاہ صاحب! ہم نے انصاف اور قانون کا دروازہ بہت کھٹکھٹا لیا، اب ہم اور برداشت نہیں کر سکتے۔ اب پانی سر سے گزر گیا ہے جی۔ اب اینٹ کا جواب پتھر سے اور پتھر کا گولی سے ملے گا۔ یہی ہمارا فیصلہ ہے۔''

''اگر تمہارا یہ فیصلہ ہے تو پھر ہمارا فیصلہ بھی سن لو۔'' مراد شاہ کی غصیلی آواز اُبھری۔ ''ہم کو اس معاملے میں حکم جی کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہونا پڑے گا اور اگر تم لوگ اپنی ہٹ پر قائم رہے تو ہم نے جن لوگوں کو نل پانی میں پناہ دی ہے، وہ بھی ہماری پناہ میں نہیں رہیں گے۔''

''تو آپ بھی ظلم کے آگے جھکنا شروع ہو گئے ہیں...... میں اسے موقع پرستی کہوں یا کچھ اور؟''

''تم ہر حد توڑ رہے ہو انور خاں! تمہیں اس کے لئے پچھتانا پڑے گا۔''

''ہم تو یہ سمجھے تھے شاہ صاحب کہ آپ حق کا ساتھ دینے کے لئے آئے ہیں۔ آپ ہماری بات سنیں گے اور دوسروں کو بھی سمجھائیں گے۔''

''میں اب بھی تمہاری بات سننے کو تیار ہوں لیکن اس کے لئے تمہیں پہلے مسز اسٹیل کو چھوڑنا ہوگا۔''

''آپ پہلے ہماری پوری بات سن لیں۔ اس کے بعد بھی اگر آپ نے ہمیں قائل کر لیا تو میں خود اور اپنے سارے ساتھیوں کی طرف سے بھی عہد کرتا ہوں کہ ہم اس لڑکی کو چھوڑ دیں گے۔''

کچھ دیر اس بارے میں بات ہوئی، پھر طے ہوا کہ مراد شاہ ہم سے بات کرنے کے لئے اور ماریا کو صحیح سلامت دیکھنے کے لئے سرنگ کے اندر آئے گا۔ رنجیت پانڈے، شاہ صاحب کے ساتھ ایک اور شخص کو بھی بھیجنا چاہتا تھا لیکن انور خاں اور اسحاق نے سختی سے منع کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد مراد شاہ اندر آ گیا۔ مراد شاہ درمیانہ قد اور درمیانی عمر کا بارعب...... شخص تھا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی میں کچھ بال سفید بھی نظر آتے تھے۔ اس نے سفید شلوار قمیص اور واسکٹ پہن رکھی تھی۔ اسے دیکھ کر انور خاں کی آنکھوں میں معنی خیز چمک آ گئی۔ مراد شاہ کی آنکھوں میں بھی دوستانہ چمک تھی۔ بہر حال، ماریا بھی یہاں موجود تھی، اس کے سامنے شاید مراد شاہ محتاط رہنا چاہتا تھا۔

سرنگ کے ایک علیحدہ گوشے میں انور خاں، فیروز، چوہان اور مراد شاہ کے درمیان بات چیت ہوئی۔ میں بھی وہاں چلا گیا۔ مراد شاہ نے کہا۔ ''میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ سب سے پہلے وہ کام کرو جو سب سے ضروری ہے۔ اس گواہ کو یہاں لاؤ جو ہارون کے قتل کے سلسلے میں گواہی دینا چاہتا ہے۔''

انور خاں نے فیروز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ یہ ہے...... آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔''

مراد شاہ نے اپنی بھاری پلکیں اُٹھائیں اور غور سے فیروز کو دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی سفید قمیص کے نیچے سے ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکال لیا۔ یقیناً یہ ٹیپ ریکارڈر، بیٹری سیل سے چلتا تھا۔ میں حیران رہ گیا۔ اب ساری پلاننگ سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہاں آ کر مراد شاہ نے ایک تیر سے دو شکار کئے تھے۔ ایک تو سرجن اسٹیل وغیرہ کو یہ باور کرایا تھا کہ وہ ماریا کے اغوا کو قابلِ مذمت سمجھتے ہیں اور اس مسئلے کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف وہ فیروز کا وہ بیان بھی لینا چاہ رہے تھے جو چھوٹے سرکار کے سامنے سلطانہ کو بے گناہ ثابت کر کے موہن کمار کو اپنے ہی دیرینہ ساتھی کا قاتل ثابت کر سکتا تھا۔

مراد شاہ نے ٹیپ ریکارڈر آن کیا اور فیروز سے پوچھا۔ ''تم مقتول ہارون کو کیسے جانتے ہو؟''

''میں اس کو نہ جانوں گا تو اور کس کو جانوں گا؟ وہ میرے بچپن کا دوست تھا۔ ہم اکٹھے جوان ہوئے، ہم نے اکٹھے ''حکم'' کی ملازمت کی۔ وہ گھڑ سوار محافظوں میں شامل تھا، میں راج بھون میں کام کرتا تھا لیکن ہم ہر دکھ سکھ میں شریک تھے۔ میں سوچ بھی نا ہیں سکت تھا کہ ایک دن ہارون کو اس کے اپنے ہی ساتھی ''حکم'' کے کہنے پر جان سے مار ڈالیں گے۔ انہوں نے صرف سلطانہ کو پھنسانے کے لئے اتنا بڑا اپرادھ کیا۔ میں ہر جگہ اور ہر وقت اس حرامزادے موہن کے خلاف گواہی دینے کو تیار ہوں۔''

''تم نے ہارون کو قتل ہوتے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا تھا؟''

''لیکن آپ کو یاد رکھنا چاہئے کہ تب تک میں حکم کا باغی نا ہیں بنا تھا بلکہ حکم کے خاص ملازموں میں شامل تھا۔ جو لوگ ہارون کے قتل میں موہن کے ساتھ شامل تھے، میں نے اپنے کانوں سے ان کی باتیں سنی ہیں اور اس قتل کی ساری تفصیل جانی ہے۔''

زخمی فیروز اور مراد شاہ کے درمیان چار پانچ منٹ تک سوال جواب ہوئے اور فیروز کا مکمل بیان ریکارڈ ہو گیا۔

مراد شاہ کے چہرے پر اطمینان کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ بولا۔ ''یہ بیان بڑا کارآمد ثابت ہو گا۔''

انور خاں نے کہا۔ ''آپ ہمیں اس صورتِ حال کے بارے میں کیا مشورہ دیتے ہیں؟ ہم نے ان لوگوں کو آج دو پہر ایک بجے تک کا الٹی میٹم دیا ہے۔''

مراد شاہ نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر بات بنتی ہے تو مان لینی چاہئے۔ صورتِ حال ایسی ہے کہ کسی بھی وقت معاملہ بگڑ سکتا ہے۔ جو کچھ بھی ہے، ماریا عورت ذات ہے۔ اس کے یرغمال بنائے جانے کی وجہ سے تل پانی میں بھی کچھ لوگ تشویش ظاہر کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں حکم جی اور جارج کی حمایت بڑھ بھی سکتی ہے۔''

''لیکن لوگوں کو سلطانہ والا معاملہ بھی تو نظر آنا چاہئے...... اور اب تو فیروز کے بیان کے بعد بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ سلطانہ کے معاملے میں سراسر ظلم ہوا ہے۔''

''وہ ساری باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں۔'' مراد شاہ نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔ ''لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تم لوگوں نے بھی ایک عورت کو ہی یرغمال بنایا ہے اور یہ عورت...... سلطانہ والے معاملے میں نردوش ہے۔''

''مگر وہ بہت سے دوسرے معاملوں میں نردوش نا ہیں ہے۔ ہرگز نا ہیں ہے۔'' اسحاق بھڑک کر بولا۔ ''یہ ظالم عورت ہے اور اس کا بھائی اس سے بڑھ کر ظالم ہے۔ وہ میری بہن کا قاتل ہے اور اس طرح کے کئی ظلم اس گھرانے کے کھاتے ہیں۔ ہم اپنے کسی مطالبے سے پیچھے نا ہیں ہٹیں گے۔ اگر یہ لوگن نا ہیں مانیں گے تو پھر یہ میم قتل ہووے گی اور بہت برے طریقے سے ہووے گی۔''

''لیکن اس کے بعد کیا ہو گا؟'' مراد شاہ نے قدرے برہم انداز میں کہا۔ ''تم سب لوگوں کو تو مار ہی دیا جائے گا۔ اس کے بعد تم سے رشتہ ناتا رکھنے والوں پر بھی بڑا سخت وقت آئے گا۔ بہت خون بہے گا۔''

انور خاں نے گہری سانس لی اور اس کے چہرے پر وہی ہلکی سی آسودگی پھیل گئی جو ایک دم کشیدہ ماحول کو تبدیل کر دیتی تھی۔ وہ ہولے سے بولا۔ ’’لیکن میرا خیال ہے شاہ صاحب...... یہ لوگ ماریا کی موت کا خطرہ کسی صورت مول نہیں لیں گے۔ انہیں مطالبات ماننے ہی پڑیں گے۔‘‘

’’اپنی جگہ تم بالکل ٹھیک سوچ رہے ہو۔‘‘ مراد شاہ بولا۔ ’’جارج اور اس کے بہنوئی اسٹیل اور ان کے ساتھیوں کو ماریا کی موت کسی طور بھی قبول نہیں ہوگی لیکن زرگاں میں ہی کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک ماریا اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی وہ پچاس بندے رکھتے ہیں جن کو تم رہا کرانا چاہتے ہو۔ یہ لوگ کوئی بھی ایسی چال چل سکتے ہیں جس سے سب کچھ ختم ہو جائے۔‘‘

انور خاں کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ بہر حال، وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا۔

’’آپ کن لوگوں کی بات کر رہے ہیں؟‘‘

’’میں گرد مودان وغیرہ کی بات کر رہا ہوں۔‘‘ مراد شاہ نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ’’گرد مودان اور دیگر گرواندر خانے جارج گورا سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہیں۔ خاص طور سے جب سے پگوڈا میں آگ والا واقعہ ہوا ہے۔ یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ زرگاں میں پگوڈا کے بڑے پجاریوں اور جارج کے کارندوں میں چپقلش چلتی رہتی ہے۔‘‘

’’آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟‘‘ انور خاں نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔

’’میرے نزدیک گرد مودان اور رنجیت پانڈے کی یہاں موجودگی ایک خاص مطلب رکھتی ہے۔ جہاں تک گرد مودان کو میں جانتا ہوں، وہ ایک بہت ہی گہرا بندہ ہے۔ اس کے اندر جھانکنا بہت زیادہ مشکل ہے۔ وہ بندے کو شیشے میں اُتارنے کا فن جانتا ہے۔ رنجیت پانڈے سے بھی اس کی دوستی ہے اور رنجیت پانڈے تو ویسے بھی بکاؤ شخص ہے۔ جو اس کی مطلوبہ قیمت دے دے، وہ اس کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو سکتا ہے۔‘‘

’’آپ کا مطلب ہے کہ گرد مودان اور پانڈے یہاں کوئی اپنا کھیل کھیل سکتے ہیں؟‘‘ فیروز نے پوچھا۔

’’یہ ناممکن بھی نہیں ہے۔ یہاں اسٹیٹ کی سیاست میں سب کچھ چلتا رہا ہے اور اب بھی چل رہا ہے۔‘‘

’’لیکن...... شاہ صاحب...... ماریا کا شوہر اسٹیل یہاں خود موجود ہے۔ موہن کمار جیسے لوگ بھی ہیں۔ کیا وہ گرد مودان کو کوئی چال چلنے دیں گے؟‘‘

’’میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ضرور ہی کوئی چال کھیلی جائے گی، میں صرف ایک امکان بتا رہا ہوں۔ فرض کرو اگر ایسا نہیں بھی ہے تو بھی رنجیت پانڈے تو یہاں موجود ہے نا...... اور جہاں یہ خبیث موجود ہوتا ہے، وہاں کوئی نہ کوئی مار دھاڑ تو ضرور ہوتی ہے۔ اس بندے کے تو خمیر میں ہی خون اور بارود شامل ہے۔ اس کی عیاری بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔‘‘

مراد شاہ نے اپنی آواز مزید دھیمی کی اور بولا۔ ’’میری یہ بات ذہن میں رکھ لو...... جب تک پانڈے یہاں موجود ہے، تم کسی معاملے کو بھی آسان نہیں لے سکتے۔ تمہیں ہر سیکنڈ اپنے کان اور اپنی آنکھیں کھلی رکھنا پڑیں گی۔ یہ کوئی نہ کوئی کارستانی ضرور کرے گا۔‘‘

’’تو کر لے کارستانی۔ اس کی جو کارستانی بھی ہوگی، وہ میم کے جیون کی قیمت پر ہووے گی۔‘‘ اسحاق آتش بار لہجے میں بولا۔

دو چار منٹ تک مراد شاہ سے ہماری بات چیت مزید جاری رہی۔ پھر وہ باہر چلا گیا۔ اس گفتگو کا اختتام اس امر پر ہوا کہ انور خاں نے اپنی دی ہوئی ڈیڈ لائن کل رات آٹھ بجے تک بڑھا دی۔

○......❖......○

مراد شاہ نے جو کچھ کہا تھا، اس نے ہمیں مزید چوکس کر دیا۔ رنجیت پانڈے کی عیاری اور سفاکی کی جو کہانیاں میں سن چکا تھا، اس کے بعد اسے قریب سے دیکھنے کی خواہش میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ عمران مجھے ہر بات پر یاد آتا تھا۔ پانڈے کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی بار بار یاد آیا۔ پانڈے جیسے خطرناک ترین لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا عمران کا شوق تھا۔ اگر عمران یہاں ہوتا تو شاید وہ پانڈے کا بہترین حریف ثابت ہوتا۔ وہ رات میں نے پھر باروندا جیکی کے ساتھ گزاری۔ اس کے ساتھ وقت گزارنا اب مجھے اچھا لگتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ میرا روحانی استاد ہے۔ وہ مجھے مارشل آرٹ کے حوالے سے کچھ ایسی باتیں بتا رہا تھا جو مجھے کسی کتاب میں نہیں مل سکتی تھیں، نہ کوئی شخص انہیں اپنے تجربے کا حصہ بنا سکتا تھا۔ خاص طور سے وہ مجھے جسمانی درد برداشت کرنے کے حوالے سے جو کچھ بتا رہا تھا، وہ نایاب تھا۔

یہ اس رات دو ڈھائی بجے کی بات ہے۔ جیکی سے ملاقات کے بعد میں دہانے کے قریب واپس آ گیا تھا اور ہمیش کے برابر لیٹ گیا تھا۔ میں غنودگی کی حالت میں تھا، جب اچانک مجھے ایک نامانوس بو محسوس ہوئی۔ یہ اسپرٹ...... جیسی...... کوئی تیز اثر بو تھی۔ دفعتاً میرے ذہن میں کھلبلی سی مچ گئی۔ ایک اندیشہ خوفناک انداز میں چنگھاڑتا ہوا میرے دماغ

میں گھس آیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ الفاظ ذہن میں گونجے جو آج صبح مراد شاہ نے یہاں سرنگ میں ہمارے سامنے کہے تھے۔ اس نے رنجیت پانڈے کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ پانڈے یہاں موجود ہو اور وہ نچلا بیٹھا رہے۔ مراد شاہ نے وارننگ دی تھی کہ ہمیں اس کی طرف سے بہت زیادہ چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔

میں تیزی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا اور لالٹین کی لو اونچی کی۔ ہمیش بھی اُٹھ بیٹھا تھا اور نتھنے پھیلا کر بو کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''یہ کیسی بو ہے؟ کہیں کوئی گیس وغیرہ تو ناہیں؟'' وہ پریشان لہجے میں بولا۔

''ماریا کہاں ہے؟'' میں نے بلند آواز میں پوچھا۔

ماریا اپنی جگہ پر نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے رائفل اُٹھائی اور اس کا سیفٹی کیچ ہٹا لیا۔ ذہن میں یہ خیال برق کی طرح کوندا تھا کہ کہیں سرنگ کے اندر کوئی گیس وغیرہ تو نہیں چھوڑی گئی۔ دہانے کی طرف سے دوڑتے قدموں کی آواز آئی پھر چوہان بھی رائفل بدست وہاں آن موجود ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بڑی ٹارچ تھی۔

''یہ بو کیسی ہے؟'' اس نے بھی وہی سوال کیا۔

اسی دوران میں سرنگ کے ایک گوشے سے شوں شوں کی مدھم آواز آئی۔ اسحاق بھی جاگ گیا تھا۔ وہ اس تاریک گوشے کی طرف لپکا اور چند سیکنڈ بعد ماریا کو کھینچتا ہوا روشنی میں لے آیا۔ ''حرامزادی...... اُلو کی پٹھی...... تو خود چین سے رہوت ہے نہ ہمیں رہنے دیوت ہے۔'' اس نے اسے دھکا دے کر فرش پر گرا دیا۔

ماریا کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ان بندھے ہوئے ہاتھوں میں ایک ٹن اسپرے تھا۔ اسپرے کی اسی بوتل سے نکلنے والے کیمیکل کی بو نے ہم سب کو بری طرح چونکایا تھا۔ یہ کھودا پہاڑ نکلا چوہا والی صورت حال تھی۔ یہ ایک مچھر مار ٹائپ کا اسپرے تھا جو ماریا کے سامان کے ساتھ یہاں آیا تھا۔

''یہ کیا کر رہی تھی؟'' اسحاق نے اسے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

''ہام یہاں ناہیں رہ سکتا۔ یہاں بہت زیادہ کیڑا ہے۔ ہر طرح کا Insects ہے۔ ہام کا ہاتھ پاؤں سوج گیا۔'' وہ طیش میں بولی۔

''تم یہیں رہو گی جہاں ہم سب رہتے ہیں۔ تم آسمان سے ناہیں اُتریں۔ ہماری ہی طرح گوشت پوست سے بنی ہوئی ہو۔'' اسحاق پھنکارا۔

''ہام سے ناہیں رہا جاتا۔'' وہ کراہی۔

''تم سے رہا جاوے گا۔ جس طرح تم کو روٹی پکانا آ گئی ہے، مٹی کے پیالے میں پانی پینا آ گیا ہے اور کوئلے سے دانت صاف کرنا آ گئے ہیں، اسی طرح تم کو رہنا بھی آ جاوے گا۔'' اسحاق نے مچھر مار اسپرے اس کے ہاتھوں سے چھین کر دور پھینک دیا۔

''ہام یہاں ناہیں رہے گا۔ چاہے تم ہام کو شوٹ کر دے۔'' وہ دھاڑی اور اس نے سرنگ کے عقبی حصے میں جانے کی کوشش کی۔

اسحاق اور احمد نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ اسحاق نے اسے دو طمانچے مارے اور گھسیٹتا ہوا واپس لے آیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی جیب میں سے گراری دار چاقو نکال کر کھول لیا تھا۔ وہ پھنکارا۔ ''اگر اپنے باپ کی ہے تو اب قدم اُٹھا کر دکھا۔ سیدھا تیرے جگر میں یہ چاقو نہ ڈال دیا تو میرا نام اسحاق ناہیں۔''

اسحاق کے لہجے میں کچھ ایسی آتش تھی کہ ماریا کا جوش و خروش ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔

احمد بولا۔ ''بہتر تو یہ ہے کہ اس کے پاؤں میں ڈھیل نہ چھوڑی جاوے۔ رات کے وقت پاؤں کس کر باندھ دیئے جاویں تا کہ یہ چل ناہیں سکے۔''

''اب کوئی حرکت کرے گی تو ایسا ہی کرنا پڑے گا۔'' اسحاق نے کہا۔

اسی دوران میں ماریا نے پھر چلانا شروع کر دیا۔ وہ اچھل رہی تھی۔ کبھی دائیں ہو رہی تھی، کبھی بائیں۔ اس کے پاؤں پر سے کوئی چھپکلی گزر گئی تھی۔ چند سیکنڈ کے لئے وہ ڈانس کرنے والی کیفیت میں نظر آئی۔ پھر وہ جیسے اچھل کر ایک پتھر پر چڑھ گئی۔ اس پتھر کے اردگرد تھوڑا سا پانی جمع تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ یہاں کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رہے گی لیکن یہ پتھر چھوٹا سا تھا۔ اس پر بس کھڑا ہی ہوا جا سکتا تھا اور وہ کھڑی رہی۔ اس کی آنکھوں میں طیش آمیز بے بسی تھی۔

''بالکل ٹھیک ہے۔ اسی طرح کھڑی رہو اور کھڑی کھڑی اکڑ جاؤ۔'' اسحاق نے کہا اور پاؤں پٹختا ہوا دہانے کی طرف چلا گیا۔

وہ کھڑی رہی اور غصے میں بڑبڑاتی رہی۔ وہ نہایت قیمتی جینز اور شرٹ میں تھی۔ یہ لباس اس کے سامان کے ساتھ ہی آیا تھا۔ اب یہ کپڑے مٹی اور کیچڑ میں لت پت ہو چکے تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ جارج گورا کی بہن نے ڈیڑھ دو ہزار ڈالرز کا لباس پہن رکھا ہے۔ اس کے بال جو اغوا کی رات ریشم کی طرح ملائم اور سلک کی طرح چمک رہے تھے، اب گھونسلے کی شکل اختیار کر چکے تھے اور اس گھونسلے کے نیچے اس کی صورت بھی اجڑی بجڑی دکھائی دیتی تھی۔ وہ بالکل عام لڑکی نظر آنے لگی تھی۔ مجھے عمران کی کہی ہوئی ایک بات یاد آ گئی۔ ایک روز

میڈم کی چھوٹی بہن میڈم نادیہ کے نازنخرے دیکھ کر اس نے کہا تھا......اس لڑکی کی چمک دمک میں پچھتر فیصد حصہ اس کی دولت اور حیثیت کا ہے۔ اگر یہی نادیہ کسی کھوتی ریڑھی پر بیٹھ کر جھگیوں میں سے نکلے تو اس کے مقابلے میں اس کی کھوتی زیادہ خوب صورت نظر آئے اور یہ کوئی نادیہ کی بات ہی نہیں ہے، اکثر امیر کبیر لڑکیاں خوب صورتی میں بس کھوتی کے آس پاس ہی ہوتی ہیں۔ میں نے کہا تھا......بھئی، یہ تو امیر کبیر لڑکیوں کے ساتھ زیادتی ہے۔ وہ جھٹ بولا تھا......اور میں سمجھتا ہوں یہ کھوتیوں کے ساتھ زیادتی ہے۔ گدھا برادری اس کا برا مان سکتی ہے لیکن میں سب امیر لڑکیوں کی بات تو نہیں کر رہا۔ بس ایکسٹرا ماڈرن اور فیشن زدہ بیبیوں کا ذکر کر رہا ہوں۔

عمران کی کہی ہوئی باتیں ایسے ہی میرے کانوں میں گونجتی رہتی تھیں۔ وہ جب بھی یاد آتا تھا، اپنے ساتھ میرے لئے ندامت و پشیمانی کا ایک بہت بڑا ریلا لاتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں اس کا قاتل ہوں اور ہزار ہا ملامتی نگاہیں میری طرف اُٹھی ہوئی ہیں۔

صبح جب ہم ناشتا کر رہے تھے، ایک عجیب واقعہ ہوا۔ دہانے سے کچھ فاصلے پر کتوں کا شور سنائی دیا۔ یہ وہی کتے تھے جو حکم جی کے اہلکاروں کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ ان کی آوازیں اکثر و بیشتر سنائی دیتی رہتی تھیں لیکن آج یہ آوازیں دہانے کے عین سامنے قریباً ساٹھ ستر میٹر کی دوری سے آ رہی تھیں۔ انور خاں، احمد اور میں اپنی اپنی پوزیشن پر بیٹھے تھے۔ اچانک میں نے انور خاں کو چونکتے دیکھا۔ اس کی نگاہ دور جنتر اور کیکر کے درختوں پر مرکوز تھی۔ ہم نے دیکھا، دیوہیکل بوگیر کتے تیزی سے کسی چیز کا پیچھا کر رہے ہیں۔ ان کا رخ دہانے کی طرف ہی تھا۔ وہ جس چیز کا پیچھا کر رہے تھے، وہ کوئی چھوٹا جانور تھا جو تیزی سے پینترے بدل رہا تھا۔

دفعتاً ہمیں اندازہ ہو گیا کہ کتے سیدھے سرنگ کی طرف ہی آ رہے ہیں۔ یہ بڑی خطرناک صورتِ حال تھی۔ ''اوہو...... یہ کیا ہو رہا ہے؟'' انور خاں کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

اس کی انگلی ٹریگر پر تھی لیکن وہ فیصلہ ہی نہیں کر سکا کہ گولی چلائے یا نہیں اور جب انور خاں خود فیصلہ نہ کر سکا تو ہم کیسے کرتے؟ قریباً نصف درجن خوں خوار کتے سماعت شکن شور برپا کرتے سیدھے سرنگ میں گھس آئے۔ وہ جس چیز کا تعاقب کر رہے تھے، اس کی ہلکی سی جھلک ہم نے دیکھی۔ وہ جنگلی ہرن کا ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ وہ سیدھا سرنگ کے اس قدرتی چیمبر میں گھسا جہاں ہم نے بستر بچھا رکھے تھے۔ شکاری کتے اس پر جا پڑے، وہ بری طرح

زخمی ہوا۔ ہمیں اس کا پھٹا ہوا پیٹ نظر آیا۔ اس حالت میں وہ گھوما اور ہماری پوزیشنوں کی طرف آیا۔ اب ہمارے لئے بے حرکت رہنا مشکل تھا۔ میری اور انور خاں کی رائفلوں سے ایک ساتھ شعلے نکلے۔ دو کتے قلابازیاں کھا کر گرے۔ باقی کتوں نے ننھے سے جانور کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ ماریا چند فٹ کے فاصلے پر تھی اور دیوانہ وار چلا رہی تھی۔ سرنگ میں ایک دم کہرام مچ گیا تھا۔

اور یہی وقت تھا جب دہانے کے عین سامنے فائرنگ شروع ہو گئی۔ افراتفری کا فائدہ اُٹھا کر حکم کے مسلح اہلکاروں نے ہلا بول دیا تھا۔

''گولی چلاؤ۔'' انور دہانے کی طرف رخ کر کے دھاڑا۔

میں نے دیکھا، دو افراد جھک کر بھاگتے ہوئے دہانے کے عین سامنے پہنچ گئے تھے۔ وہ جدید رائفلوں سے فائرنگ بھی کر رہے تھے۔ میں نے احمد کو گولی کھا کر گرتے دیکھا۔ ایک دوسری گولی چوہان کے کندھے میں لگی اور رائفل اس کی گرفت سے چھوٹ کر دور جا گری۔ یہاں انور خاں کی مہارت اور اس کے اعتماد کی داد دینا پڑتی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس دوسرا موقع نہیں ہے۔ اگر اس کا نشانہ خطا گیا تو حملہ آور بھاگتے ہوئے سرنگ گھس آئیں گے۔ اس نے اپنی اسنائپر گن سے یکے بعد دیگرے دو فائر کئے۔ قریباً بیس میٹر کی دوری پر دونوں حملہ آوروں کے سروں میں گولیاں لگیں اور وہ اپنے ہلارے میں دور تک لڑھک گئے۔ یہ واقعی بڑے خطرناک لمحے تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، دونوں حملہ آوروں نے جدید بلٹ پروف جیکٹس پہن رکھی تھیں۔ اگر ان کے سروں میں گولی نہ لگتی تو وہ اندر آنے میں کامیاب ہو جاتے۔

دو افراد کے گر جانے سے پیچھے آنے والوں کی حوصلہ شکنی ہوئی۔ انہوں نے سیدھا دہانے کی طرف آنے کے بجائے دائیں بائیں پوزیشن لے لی۔ فیروز زخمی ہونے کے باوجود ہمارے ساتھ مل کر فائرنگ کر رہا تھا۔ چند گولیاں اس کے سر کو چھوتی ہوئی گزریں تو اس نے اپنی پوزیشن تبدیل کرنی چاہی۔ یہ فیصلہ غلط نکلا۔ دہانے کے عین سامنے سے وہ ''ہٹ'' ہو گیا۔ میں نے اسے سینے پر گولی کھا کر مردہ ہرن کے اوپر گرتے دیکھا۔ دو شکاری کتے تو سرنگ سے باہر نکل گئے تھے۔ دو تین سرنگ کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے تھے اور ان کی آوازوں سے ایک پُر ہول گونج پیدا ہو رہی تھی۔

اسحاق نے ماریا کو زمین پر گرا کر رائفل کی نال اس کی پیشانی سے لگا دی تھی۔ وہ کسی بھی لمحے اسے شوٹ کر سکتا تھا لیکن پھر یہ ہنگامہ جس طرح اچانک شروع ہوا تھا، اسی طرح آناً فاناً

ختم ہو گیا۔ فائرنگ ختم گئی۔ کتوں کی دور افتادہ آوازوں کے سوا کوئی آواز باقی نہ رہی۔

ہم اپنی پوزیشنوں پر پوری طرح چوکس تھے۔ ہم نے انگلیاں ٹریگر پر رکھی ہوئی تھیں اور دہانے کے سامنے ہونے والی چھوٹی سے چھوٹی حرکت کا نوٹس لے رہے تھے۔

اسحاق دھاڑا۔ ''یہ اس طرح ناہیں مانیں گے۔ اس حرامزادی کے ٹکڑے کر کے باہر بھیجنا شروع کرو اور پہلا ٹکڑا میں کرتا ہوں، ابھی کرتا ہوں۔'' اس نے اپنا خوفناک پھل کا گراری دار چاقو نکال لیا۔

انور خاں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں لیکن دو منٹ ٹھہر جاؤ۔

فائرنگ ختم گئی تھی پھر بھی خطرہ موجود تھا۔ میں اور ہمیش نیچے جھک کر دوڑتے ہوئے فیروز کے پاس پہنچے۔ گولی اس کی چھاتی پر بائیں طرف لگی تھی۔ وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ ہم نے اسے اُٹھا کر فائرنگ کی رینج سے ہٹایا اور ایک چٹائی پر لٹا دیا۔ چوہان حالانکہ خود بھی زخمی تھا تاہم وہ دوڑتا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔ ہم نے فیروز کو پانی پلایا جو اس کی باچھوں سے بہہ گیا۔

''کچھ ہو سکتا ہے؟'' میں نے لرزاں آواز میں چوہان سے پوچھا۔

اس نے ہولے سے نفی میں سر ہلا دیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے چہرے پر شدید کرب تھا۔

فیروز کی نگاہیں ہم پر جمی تھیں۔ یہ نگاہیں زندہ تھیں لیکن بتدریج بے جان ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ احمد کی طرف دیکھ کر بہت نحیف اور شکستہ آواز میں بولا۔ ''اگر...... کبھی...... اکبر سے ملاقات ہو تو...... اسے بتا دینا...... میری ماں مسلمان تھی...... میں مسلمان ماں کا بیٹا ہوں۔''

احمد نے اشک بہاتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فیروز کی آنکھیں تارا ہو گئیں۔ ہم نے اس کے چہرے پر کپڑا ڈال دیا......

اسحاق قریباً تیس فٹ کے فاصلے سے فیروز کی موت کا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کا غیظ و غضب انتہا کو پہنچ گیا۔ وہ چنگھاڑنے لگا اور ماریا کو زدوکوب کرنے لگا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اسحاق کا ہاتھ کسی نے نہیں روکا۔ صدمے نے سب کو جکڑ رکھا تھا...... اگر ذرا گہرائی سے دیکھا جاتا تو فیروز کی موت میں ماریا بھی حصے دار تھی۔ چند دن پہلے اس نے فیروز پر گولی چلائی تھی جو اس کی ٹانگ میں لگی تھی۔ آج لڑائی کے دوران میں اسی زخمی ٹانگ کی وجہ سے فیروز تیزی سے حرکت نہیں کر پایا تھا۔ بہرحال، یہ بات تو اٹل حقیقت تھی کہ آج اس کا وقت پورا ہو

تھا۔ پندرہ منٹ پہلے جو ناشتا اس نے کیا تھا، وہ آخری تھا۔

اگلے دو تین منٹ میں جو کچھ ہوا، وہ اتنا اچانک اور تیز رفتار تھا کہ کوئی اس کا راستہ نہ روک سکا...... اور شاید ڈاکٹر چوہان کے علاوہ کوئی اس کا راستہ روکنا چاہتا بھی نہیں تھا۔ ماریا کے لئے اب کسی کے دل میں ہمدردی کی رمق موجود نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور وہ زمین پر اوندھی پڑی تھی۔ اسحاق نے بے رحمی سے اس کے دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت جڑ سے کاٹ ڈالی تھی۔ اب ماریا چلا رہی تھی اور اس کے ہاتھ کا زخم تیزی سے خون اُگل رہا تھا۔ اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو چکا تھا۔

اسحاق نے جنونی انداز میں کٹی ہوئی انگلی ماریا کی آنکھوں کے سامنے لہرائی اور پھنکارا۔ ''...... ہاں یہی انگلی تھی نا جس سے تُو نے فیروز پر گولی چلائی تھی۔ یہی تھی نا؟ یہ انگلی ہے ہی کاٹے جانے کے قابل...... یہی ہم جیسے غریبوں پر گولی چلاوت ہے...... ہمیں اپنے اشاروں پر نچاوت ہے...... ہم...... ہم اب ایسی ساری انگلیوں کو کاٹ دیویں گے۔''

چلا چلا کر ماریا کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ اچانک اس پر غشی طاری ہو گئی۔ پتا نہیں کہ ایسا تکلیف کے سبب ہوا تھا یا کٹی ہوئی انگلی دیکھنے کے بعد اس کے حواس نے اس کا ساتھ چھوڑا تھا۔

اسحاق نے کٹی ہوئی خون آلود انگلی انور خاں کے سامنے پھینکی۔ ''انور بھائی! یہ پہلا چھوٹا سا نذرانہ بھیجو اس حرامزادی کے پِتی کو...... اور ساتھ ہی بتاؤ اس کو کہ یہ ایک چھوٹی سی جھلکی ہے اس فلم کی جو ابھی ان کو دیکھنی ہے۔'' اسحاق کے لہجے سے آگ برس رہی تھی۔

میں نے انگلی کو دیکھا۔ جب یہ جسم کے ساتھ تھی تو خوب صورت لگتی ہو گی، اب علیحدہ ہو کر کریہہ المنظر ہو گئی تھی۔ جڑ کی طرف سے اس کے ساتھ تھوڑی سی کھال لٹک رہی تھی۔ ناخن لمبا تھا اور اس پر گلابی پالش لگی ہوئی تھی۔ اس کے گرد ایک مکھی چکرا رہی تھی، شاید بیٹھنے کے لئے مناسب جگہ ڈھونڈ رہی تھی۔ مجھے لگا کہ اسحاق نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ بااختیار اور طاقتور طبقے کی اسی انگلی نے اس کرۂ ارض پر زندگی کو دہشت زدہ کر رکھا ہے۔ یہ انگلی ٹریگر دباتی ہے...... پورے پورے ملک...... اور پورے پورے خطے خاک و خون میں لتھڑ جاتے ہیں۔ حالتِ امن میں بھی یہ انگلی ایک خوفناک دھمکی کی صورت ٹریگر پر دھری رہتی ہے اور خلقِ خدا کی ناتوانی سے خراج وصول کرتی رہتی ہے۔

ڈاکٹر چوہان کے کندھے پر گولی لگی تھی۔ تاہم اطمینان کی بات یہ تھی کہ گولی کندھے کا گوشت چیر کر نکل گئی تھی۔ چوہان نے اپنے زخم کو دوسرے ہاتھ سے دبایا ہوا تھا تا کہ خون کا زیادہ اخراج نہ ہو۔ احمد کو گولی کے بجائے کارتوس کا موٹا چھرا لگا تھا۔ یہ چھرا اس کے بازو کے

اندر ہی تھا۔ تکلیف کے آثار اس کے چہرے پر صاف نظر آتے تھے۔ اگلے پانچ دس منٹ میں دونوں زخمیوں کی مرہم پٹی کی گئی۔ اگر ان میں ماریا کو بھی شامل کر لیا جاتا تو زخمیوں کی تعداد تین تھی۔ فیروز کی چادر سے ڈھکی ہوئی لاش ہمارے سامنے تھی اور یہ لاش ہم سب کے ذہنوں میں چنگاریاں بکھیر رہی تھی۔ اب واقعی کچھ کر گزرنے کو دل چاہتا تھا۔

حکم کے جن دو گارڈز کو انور خاں نے دہانے کے عین سامنے اپنے باکمال نشانے سے ٹھنڈا کیا تھا، وہ وہیں ساکت پڑے تھے۔ انہیں انور نے قریباً بیس میٹر کی دوری سے نشانہ بنایا تھا لیکن وہ چونکہ برق رفتاری سے دہانے کی طرف آ رہے تھے، اس لئے گولی کھانے کے بعد بھی وہ لڑھکے تھے اور دہانے سے مزید قریب ہو گئے تھے۔ ان کی عمریں پچیس اور تیس سال کے درمیان تھیں۔ ان کے پاس چھوٹے بیرل والی جدید رائفلیں تھیں۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ دونوں نے بلٹ پروف جیکٹیں پہن رکھی ہیں۔

اسحاق اور ہمیش نے دونوں مردہ کتوں کو ٹانگوں سے گھسیٹ کر سرنگ کے عقبی حصے میں پھینک دیا۔ یہ ہاؤنڈ نسل کے قد آور کتے تھے اور میں انہیں زرگاں میں دیکھ چکا تھا...... ایسے ہی خوں خوار کتوں نے مجھ پر جارج گورا کی کوٹھی میں حملہ کیا تھا۔ کتوں کے ساتھ ساتھ ہرن کے بچے کا کٹا پھٹا جسم بھی وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا، یہ سارا واقعہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھا اور حقیقت یہی ہے کہ اگر انور خاں اپنی دور مار رائفل سے بروقت دو ٹھیک نشانے نہ لگاتا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس سارے واقعے کے دوران میں عجیب الخلقت بارونداجیکی ہم سے قریباً سو میٹر دور سرنگ کے عقبی حصے میں موجود رہا تھا اور اس کی طرف سے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں ہوا تھا...... وہ اس دوران میں سو رہا تھا۔

انور خاں کے کہنے پر اسحاق نے فوری طور پر ایک پرچہ لکھا۔ اس پرچے کا مختصر مضمون کچھ اس طرح تھا۔ ”لگتا ہے کہ یہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔ یہ پہلا تحفہ تم کو ارسال کر رہے ہیں۔ یہ تمہاری میم صاحبہ کی انگلی ہے۔ یہ سب سے چھوٹا ٹکڑا ہے جو تم وصول کر رہے ہو۔ اس کے بعد جو ٹکڑا بھی آئے گا، وہ اس سے بڑا ہو گا۔ تمہارے پاس ہمارے مطالبوں کی منظوری کے لئے فقط ایک گھنٹے کی مہلت ہے۔ اس کے بعد میم صاحبہ کی باقی چار انگلیاں تمہارے پاس پہنچیں گی اور پھر پورا پنجہ پیش خدمت کیا جائے گا۔ تم لوگوں نے ثابت کیا ہے کہ تم کسی رعایت کے حق دار نہیں ہو۔ اگر تم گولی کی زبان میں فیصلہ چاہتے ہو تو پھر ایسے ہی سہی۔ اب ہمارے مطالبوں میں ایک مطالبہ اور شامل کر لو۔ ہم اب نل پانی جانا نہیں چاہتے۔ ہمیں راجواڑے سے نکلنے کے لئے محفوظ راستہ چاہئے اور تمہاری یہ میم تب تک ہمارے ساتھ رہے گی جب تک ہم راجواڑے سے نکل نہیں جاتے۔“

انور خاں نے ماریا کی انگلی ایک مومی کاغذ میں لپیٹی پھر اس کے ساتھ اسحاق کا لکھا ہوا پرچہ رکھا۔ ان دونوں چیزوں کے ساتھ ایک پتھر رکھنے کے بعد انہیں ایک کپڑے میں لپیٹ کر اوپر سے باریک ڈوری باندھ دی۔

انور خاں نے اپنی پوزیشن کے عقب سے پانڈے کو بلند آواز میں پکارا اور کہا۔ ”پانڈے! تیری منحوس صورت یہاں دیکھ کر ہی ہم سمجھ گئے تھے کہ اب میم زندہ نہیں بچے گی۔ تیری بدمعاشی کا تیرے انگریز دوستوں کو بڑا اچھا صلہ ملنے والا ہے۔ اپنی حماقت کا یہ پہلا انعام قبول کرو۔“ اس کے ساتھ ہی انور خاں نے پورے زور سے بازو گھما کر ڈوری میں بندھا ہوا پارسل درختوں کے جھنڈ کی طرف پھینک دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ جھنڈ کے عقب سے پانڈے کی گرج دار آواز اُبھری۔

”کھول کر دیکھ لے۔ امید ہے، جو کچھ بھی ہے تجھے پسند آئے گا۔“ انور خاں نے کہا۔

کچھ دیر بعد درختوں کے عقب سے پانڈے کا ایک ساتھی برآمد ہوا۔ اس نے پہلے ہمیں اپنے خالی ہاتھ دکھائے اور پھر محتاط قدموں سے پارسل کی طرف بڑھا۔ پارسل اُٹھا کر وہ واپس گھنے درختوں میں اوجھل ہو گیا۔

اگلا ایک گھنٹا بے حد تناؤ بھرا تھا۔ بہر حال، اب ہم مخالف فریق کو مزید رعایت دینے کے لئے بالکل تیار نہیں تھے۔ اسحاق بھی بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ جو الٹی میٹم ہم نے دیا ہے، اس سے ایک سیکنڈ بھی آگے نہیں بڑھنا چاہئے اور حقیقت یہی تھی کہ فیروز کی لاش اُٹھانے کے بعد اب ہمارے دلوں میں رحم کی کوئی رمق باقی نہیں رہی تھی۔ چوہان اور احمد زخمی ہو چکے تھے، اپنے ساتھی ماجد کی موت کا صدمہ ہم چند دن پہلے جھیل چکے تھے۔ اب اگر ہمارے ساتھ یہی سب کچھ ہونا تھا تو پھر جارج گورے کی اس گوری بہن کو بھی زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

وہ اب ہوش میں آ چکی تھی اور دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی انگلی کے زخم سے خون کا اخراج روکنے کے لیے چوہان نے وہاں خاص طریقے سے پٹی باندھ دی تھی...... پھر بھی خون کے قطرے مسلسل گر رہے تھے۔ ماریا نے بھی شاید اب محسوس کر لیا تھا کہ اس کے بچنے کا امکان کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خوف منجمد ہو گیا تھا اور اس کی ساری تن فن ایک خوف آمیز مایوسی کے پیچھے چھپ گئی تھی۔

الٹی میٹم کا ایک گھنٹا مکمل ہونے میں آٹھ دس منٹ باقی تھے جب جھنڈ کے عقب سے پھر پانڈے کی آواز اُبھری۔ وہ بیٹری سے چلنے والے میگافون کے ذریعے بول رہا تھا۔ اس

نے کہا۔ ''اسٹیل اور موہن کمار تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''اب بات چیت کا وقت گزر چکا ہے۔ ہمیں ہاں یا نہ میں جواب چاہئے۔'' انور خاں گرجا۔ ''اور ایک بات اچھی طرح دماغ میں بٹھا لو پانڈے! ہم یہاں مرنے کے لئے بالکل تیار ہو کر آئے ہیں۔ ہمارے ساتھ کوئی چالاکی کرو گے تو اس کا انجام بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا...... ہم نے جو کہہ دیا ہے، وہ کہہ دیا ہے۔ اب ہم ایک سیکنڈ اور نہیں دیں گے۔ ٹھیک دس منٹ بعد اسٹیل کی پتنی کا دوسرا ٹکڑا اس کے پاس پہنچ جائے گا۔ ٹھیک دس منٹ بعد......''

اسحاق ایک تیز دھار تلوار نکال لایا تھا۔ اس نے صاف سیدھے لہجے ماریا فرگوسن کو بتا دیا کہ وہ اس کا ہاتھ لینا چاہتا ہے اور وہ خود کو اس کے لئے تیار کر لے۔

''توم ہام کو ایک ہی دفعہ مار کیوں ناہیں دیتے؟ ہام کو گولی مار دو۔'' وہ کربناک انداز میں چلائی۔

''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ موت اتنی آسانی سے ناہیں آوت ہے۔ ایک ایک سانس کے لئے تڑپنا پڑت ہے۔ جس طرح ململ کے گیلے کپڑے کو کانٹے دار جھاڑیوں پر ڈال کر کھینچا جائے تو وہ تار تار ہووت ہے...... اسی طرح نکلتی ہے جان۔ میں نے سب کچھ دیکھا ہوا ہے اپنی آنکھوں سے......'' وہ ہیجانی لہجے میں بولتا چلا گیا۔

''آچھا...... ہام کو دہانے پر لے جاؤ...... ہام ایک آخری بار...... اپنے ہسبینڈ سے بات کرنا مانگتا۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

اس نے اسحاق کی انگارہ آنکھوں میں سب کچھ پڑھ لیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اگلے دو تین منٹ میں اس کا ہاتھ کلائی پر سے الگ ہونے والا ہے۔

اسحاق نے سوالیہ نظروں سے انور خاں کی طرف دیکھا۔ انور خاں نے سر کے اشارے سے اسحاق کو مشورہ دیا کہ وہ ماریا کی بات مان لے۔

چند منٹ بعد ماریا ایک بار پھر دہانے پر تھی۔ اس کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ دونوں پاؤں میں بھی زنجیر تھی۔ اس زنجیر میں بس اتنی گنجائش تھی کہ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھا سکتی تھی۔ اس کے عین عقب میں اسحاق موجود تھا۔ اس کی ٹرپل ٹو رائفل کی نال دریا کی کمر سے بس ڈیڑھ دو فٹ کی دوری پر تھی۔

دہانے پر پہنچ کر ماریا نے دل فگار لہجے میں پکار بلند کی۔ وہ اب انگریزی میں بول رہی تھی۔ اس نے اسٹیل کو مخاطب کر کے کہا۔ ''یہ لوگ میرا ہاتھ کاٹ رہے ہیں۔ اب تم کس بات کا انتظار کر رہے ہو؟ کیا تم اس بات کے لئے تیار ہو گئے ہو کہ میں ٹکڑوں میں یہاں سے باہر

نکلوں؟''

''ایسا ہرگز نہیں ہے ماریا...... لیکن جو کچھ ہمارے بس میں نہیں، وہ ہم کیسے کر سکتے ہیں؟ جو بندے یہ مانگ رہے ہیں، ان میں سے کچھ ہمارے پاس موجود ہی نہیں ہیں۔ اگر یہ ان بندوں کی جگہ کوئی تاوان وغیرہ لینا چاہیں تو ہم تیار ہیں...... لیکن وہ بندے کیسے پیدا کر سکتے ہیں؟''

''تم جھوٹ بولتے ہو۔'' ہماری طرف سے چوہان نے گرج کر انگریزی میں کہا۔ ''یہ سب تمہاری سیاست ہے لیکن یہ سیاست تمہیں بہت مہنگی پڑنے والی ہے۔ گرو موادان وغیرہ کا تو کچھ نہیں جائے گا لیکن تم اپنی بیوی کو بچا نہیں سکو گے۔''

ماریا ایک بار پھر چلائی۔ ''اسٹیل! ان لوگوں کا ایک ساتھی مر گیا ہے۔ یہ اب کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اگر تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تو بھائی جارج کو یہاں بلا لو۔ اگر وہ یہاں ہوتے تو شاید اب تک کوئی حل نکل آتا۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے ماریا کی آواز شدت جذبات سے بیٹھ گئی۔ وہ دل دوز انداز میں رونے لگی۔

اسحاق اور ہمیش اسے کھینچتے ہوئے سرنگ میں واپس لے آئے۔ اس کے رونے کی آواز آخر تک سنائی دیتی رہی۔ اس واقعے کے فقط پانچ چھ منٹ بعد حالات نے ایک حیران کن پلٹا کھایا۔ اسحاق، ماریا کا ہاتھ کاٹنے کے لئے بالکل تیار ہو چکا تھا اور ہم میں سے بھی کوئی ایسا نہیں تھا جو اسے بظاہر اس سفاک عمل سے روکنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ فیروز کی بے گور و کفن لاش ہمارے سامنے تھی اور اس کی دید نے ہمارے سینوں میں انگارے رکھے تھے۔ یہ کھلی جنگ تھی اور جنگ میں سب کچھ روا ہوتا ہے اور ماریا تو ویسے بھی فیروز کی موت میں حصے دار تھی۔

اچانک میگا فون پر سرجن اسٹیل کی آواز اُبھری۔ ''انور خاں! توم کہاں ہے؟''

انور اطمینان سے بولا۔ ''میں اپنی جگہ پر موجود ہوں اور اپنے فیصلے پر بھی قائم ہوں۔''

''ٹھیک ہے انور خاں...... ہام تمہارے مطالبوں کو مان رہے ہیں۔ توم اب کسی طرح کا کارروائی ناہیں کرے گا۔'' اسٹیل کی آواز میں شکست خوردگی اور پسپائی نمایاں تھی۔

''اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ بھی کوئی چال ناہیں ہے؟'' اسحاق کی آواز میں دھاڑ تھی۔

''تم پھر کسی حیلے سے اپنے شکاری کتے ہماری طرف روانہ کر سکت ہو...... یا وہ تمہارا پالتو پانڈے کوئی اور حرکت کر سکت ہے۔''

''اب ایسا کچھ ناہیں ہوگا...... توم لوگوں کی تسلی کے لئے ہام اپنے گارڈز کو سو میٹر پیچھے لے جا رہے ہیں۔ ہام ہوپ کرتا کہ توم کی طرف سے بھی کوئی ایسا ویسا موومنٹ ناہیں ہوگا۔''

اگلے ایک گھنٹے میں واقعی اس امر کے واضح ثبوت نظر آئے کہ مخالف فریق نے ہمت ہار دی ہے اور اب وہ ماریا فرگوسن کی بخیریت رہائی چاہتے ہیں۔ درحقیقت ہم اس ساری کارروائی کے مشکل ترین مرحلے سے گزر چکے تھے اور مشکل ترین مرحلہ وہی تھا جب پانڈے نے شکاری کتوں والی خوفناک چال چلی تھی۔ یقیناً ہرن کے بچے کو پلاننگ کے تحت دہانے کے سامنے چھوڑا گیا تھا۔ کتے ہرن کے پیچھے لپکے تھے۔ یہ بات سامنے کی تھی کہ ہرن جان بچانے کے لئے بھاگے گا تو سرنگ کے دہانے کی طرف آئے گا۔ اگر وہ دائیں بائیں ہونے کی کوشش کرتا تو بھی "حکم" کے اہلکار اسے ذرا کر اس کا رخ دہانے کی طرف کر سکتے تھے۔ بہرحال جو ہوا، وہ منصوبہ ساز کے منصوبے کے عین مطابق تھا۔

پانڈے اور اس کے مسلح ساتھیوں نے دہانے کے اردگرد سے اپنی پوزیشنیں ہٹا لی تھیں۔ باقی لوگ بھی کافی فاصلے پر چلے گئے تھے۔ ان کے گھوڑے اور کتے وغیرہ بھی اب دہانے کے قریب دکھائی نہیں دیتے تھے لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ دہانے کی طرف سے غافل ہو گئے ہوں۔ انہوں نے ہماری حرکات و سکنات پر مکمل نظر رکھی ہوئی تھی۔ کم از کم دو ٹیلی اسکوپس کے چمکتے ہوئے شیشے مجھے اب بھی دکھائی دے رہے تھے۔

ماریا کا درد سے برا حال تھا۔ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتی تھی وہاں کانٹا چبھنے کو بھی باقاعدہ ایک تکلیف کا نام دیا جاتا ہے اور اس کانٹے کو نکالنے کے لئے آپریشن تھیٹر کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ یہاں اس کی پوری انگلی جڑ سے کاٹ دی گئی تھی۔ اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو چکا تھا۔ ہونٹ نیلے پڑ رہے تھے۔ ڈاکٹر چوہان نے اسے ایک پین کلر انجکشن دیا اور انفیکشن سے بچانے والا ایک کیپسول بھی کھلایا...... وہ پھر بھی مسلسل ہائے وائے کرتی رہی۔

گیارہ بجے کے قریب ہمیں اپنا دوست چرواہا نریندر سنگھ دہانے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے اپنے سر کا صافہ کھول رکھا تھا تاکہ ہم اسے دور ہی سے اچھی طرح پہچان لیں۔ دہانے کے عین سامنے آ کر وہ زور سے بولا۔ "آپ لوگوں کے لئے میرے پاس ایک چٹھی ہے، کیا میں آگے آ کر دے سکتا ہوں؟"

اس نے یہ الفاظ مقامی زبان میں ادا کئے تھے۔ انور خاں نے اس سے کہا۔ "اگر تمہارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے تو آ جاؤ۔ اگر ہتھیار ہے تو اسے وہیں رکھ دو......"

انور خاں نے بھی یہ الفاظ اسی علاقائی زبان میں کہے تھے۔ یہ زبان میری اور چوہان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

اس نے اپنی چھوٹی سی کلہاڑی کمر سے نکال کر وہیں ایک درخت کی جڑ میں رکھ دی اور آگے بڑھ آیا۔ وہ ہم سے کوئی شناسائی ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہمارے مخالف فریق کی طرف سے ہماری جانب روانہ کیا گیا ہے۔

اس نے ایک چٹھی نکال کر انور خاں کے ہاتھ میں تھما دی۔ یہ سرجن اسٹیل کی طرف سے تھی اور انگلش میں لکھی گئی تھی۔ چوہان نے چٹھی پڑھی۔ اس کا ترجمہ کچھ اس طرح تھا۔

"......ہم تمہارے مطالبات کو من و عن تسلیم کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اب تمہاری طرف سے ماریا کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ تمہارے مطلوبہ لوگوں کو لانے کے لئے آدمی زرگاں روانہ کئے جا چکے ہیں۔ وہ کل شام تک واپس آ جائیں گے۔ سلطانہ کا والد اور بھائی بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ اگر تم لوگ انہیں یہاں بلوانا چاہتے ہو تو بتا دو...... لیکن اگر براہ راست تل پانی پہنچانا چاہتے ہو تو یہ بھی ہو سکتا ہے۔ تمہارا کوئی بندہ خود تل پانی جا کر اس بات کی تصدیق کر سکتا ہے کہ وہ لوگ وہاں پہنچ گئے ہیں۔ اگر تم لوگ اسٹیٹ سے نکلنا چاہتے ہو تو بھی ہم تمہیں محفوظ راستہ دینے کے لئے تیار ہیں۔

اب ہمارے درمیان معاملات طے ہیں۔ اس لئے ہم امید کرتے ہیں کہ تم ماریا کی صحت اور آرام کا پورا خیال رکھو گے۔ اگر تم مناسب سمجھو تو ہماری طرف سے ایک ڈاکٹر آ کر ماریا کی مرہم پٹی کر دے۔ اگر تم لوگوں کو خوراک یا کوئی اور ضروری چیز درکار ہے تو ہمیں بتاؤ، ہم مہیا کرنے کے لئے تیار ہیں۔

...... حالات میں بہتری کا خواہاں اسٹیل بریرے۔"

یہ خط خوش آئند تھا۔ سب کے چہرے چمک گئے۔ درحقیقت اب اس سارے معاملے کو سات آٹھ روز گزر چکے تھے۔ مسلسل تناؤ نے سبھی کے اعصاب کو متاثر کیا تھا۔ ایسے حالات میں اتنا زیادہ وقت گزارنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص کہے کہ وہ تھکا نہیں اور اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی تو وہ غلط کہے گا۔ دلیری سے موت کا سامنا کرنا اور بات ہے...... مسلسل موت اور زندگی کے درمیان معلق رہنا اور بات۔

انور نے نریندر سے پوچھا کہ چٹھی بھیجنے والوں سے اس کا رابطہ کیسے ہوا؟

اس نے بتایا کہ اس کے پاس ہمارے لئے ایک اور پیغام بھی ہے اور یہ مراد شاہ وغیرہ کی طرف سے ہے۔ وہ اس امید پر دہانے کے آس پاس موجود تھا کہ شاید اسے کوئی ایسا موقع مل جائے کہ وہ یہ پیغام ہم تک پہنچا سکے۔ یہ امید پوری ہوتی نظر نہیں آتی تھی...... لیکن پھر واہگرو کی طرف سے کرپا ہو گئی اور جو کام ناممکن نظر آتا تھا، ممکن ہو گیا۔ اسے درختوں میں

بکریاں چراتے دیکھ کر خود صاحب لوگوں نے اپنے پاس بلایا اور یہ چٹھی دے کر ہماری طرف روانہ کر دیا۔

زیندر سنگھ کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ پانڈے وغیرہ زیندر کو اندر بھیج کر شاید یہ بھی جاننا چاہ رہے تھے کہ اندر کا نقشہ کیا ہے اور دہانے کے آس پاس کتنے لوگ موجود ہیں۔

انور خاں نے زیندر سے پوچھا کہ مراد شاہ کا پیغام کیا ہے؟

زیندر کے تاثرات بدل گئے۔ محسوس ہوا کہ اس کے پاس ہمیں بتانے کے لئے کچھ خاص باتیں ہیں۔ اس نے دھیمے لہجے میں جلدی جلدی انور خاں کو مقامی زبان میں جو کچھ بتایا، اس کا مطلب کچھ یوں تھا۔

...... ماریا کے اغوا نے پوری اسٹیٹ میں کھلبلی مچا دی ہے۔ ہر طرف بس اسی بارے میں بات ہو رہی ہے۔ زرگاں میں اونچے طبقے کے لوگوں میں سخت خوف و ہراس پایا جاتا ہے۔ خاص طور سے جو انگریز یہاں موجود ہیں، وہ سخت خوف زدہ ہیں۔ ان کی عورتیں گارڈز کے بغیر باہر نہیں نکلتیں۔ گھروں پر بھی سخت پہرے بٹھا دیئے گئے ہیں۔ عام لوگ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر جارج گورا صاحب کی بہن اغوا ہو سکتی ہے تو اور کون محفوظ ہے۔

زیندر سنگھ نے بتایا کہ اس کے علاوہ وہ زرگاں میں ایک اور طرح کی چپقلش بھی پیدا ہو گئی ہے۔ وہاں جن لوگوں کے ہاتھ میں اختیار ہے، وہ اندر خانے دو حصوں میں بٹ گئے ہیں۔ کچھ کا تو خیال ہے کہ ماریا کی جان بچانے کے لئے انور خاں اور اس کے ساتھیوں کے سارے مطالبے مان لئے جائیں اور کسی طرح کا خطرہ مول نہ لیا جائے...... لیکن کچھ لوگ اسے بہت بڑی شکست سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس طرح باغی ذہن رکھنے والے لوگوں کے حوصلے بڑھیں گے۔ ویسے بھی چالیس پچاس خطرناک ترین لوگوں کو یوں چھوڑ دینا بہت نقصان کا کام ہوگا اور بعد میں اس کے نتائج بہت برے نکلیں گے۔

''حکم کا اپنا رویہ کیا ہے؟'' انور نے زیندر سے پوچھا۔

زیندر نے مقامی زبان میں کہا۔ ''مجھے جو کچھ بتایا گیا ہے، وہ یہی ہے کہ حکم جی خود بھی بندوں کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔'' پھر وہ انکشاف کرنے والے لہجے میں بولا۔ ''مراد شاہ نے مجھے آپ لوگوں کے لئے یہ پیغام دیا ہے کہ حالات اتنے اچھے نہیں جتنے نظر آ رہے ہیں بلکہ بہت زیادہ خراب ہیں۔ ظاہری طور پر شاید یہ لوگ کچھ نرمی دکھا رہے ہوں مگر اندرون خانہ ایک زبردست حملے کا پورا پروگرام بن چکا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس حملے میں ماریا کے ساتھ ساتھ آپ سب لوگوں کو بھی ختم کر دیا جائے ......اس حملے کی تیاری کے لئے رنجیت پانڈے اور اس

کے تین درجن ساتھی یہاں موجود ہیں۔ انہیں تیاری کے لئے کچھ وقت چاہئے، اسی لئے وہ نرمی دکھا رہے ہیں اور یہ چٹھیاں وغیرہ بھیج رہے ہیں۔''

میں نے دیکھا کہ انور خاں اور چوہان وغیرہ کے چہروں پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ واقعی یہ ایک تشویشناک اطلاع تھی۔

چوہان نے زیندر سنگھ سے پوچھا۔ ''مراد شاہ صاحب اس سلسلے میں کیا مشورہ دیتے ہیں؟''

جواب میں زیندر سنگھ بولا۔ ''شاہ صاحب اور چھوٹے سرکار کے بندوں نے زرگاں میں خفیہ طور پر جو جانکاریاں اکٹھی کی ہیں، ان سے پتا چلا ہے کہ پچاس بندوں کی لسٹ میں سے قریباً چالیس پینتالیس بندے ایسے ہیں جنہیں ''حکم جی'' کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑے گا۔ اس بارے میں آپ لوگوں کو جو کچھ بھی بتایا جا رہا ہے وہ صرف اور صرف وقت گزارنے کے لئے ہے۔ شاہ صاحب نے کہا ہے کہ آپ لوگوں کے جو زیادہ سے زیادہ مطالبے مانے جا سکتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ سلطانہ بی بی کے والد اور بیمار بھائی کو چھوڑ دیا جائے......اور آپ لوگوں کو نل پانی جانے یا پھر اسٹیٹ سے نکلنے کے لئے راستہ دے دیا جائے۔ شاہ صاحب نے آپ لوگوں کو مشورہ دیا ہے کہ سلطانہ بی بی کے والد اور بھائی کو نل پانی بھجوا دیں اور خود اسٹیٹ سے نکلنے کا راستہ لے لیں۔ اس سے بڑھ کر ان لوگوں نے اور کچھ نہیں دینا...... چاہے اس کے لئے کوئی بھی قیمت چکانی پڑے۔''

انور خاں نے زیندر سنگھ سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، ہم اس بارے میں مشورہ کرتے ہیں اور کوئی فیصلہ لیتے ہیں۔''

''اور اس چٹھی کا جواب؟'' زیندر نے پوچھا۔

''اس کا جواب بھی ہم کچھ دیر بعد دیں گے۔''

زیندر نے مقامی زبان میں انور خاں سے گفتگو جاری رکھی اور کہا۔ ''انہوں نے ڈاکٹر کے بارے میں خاص طور سے پوچھا ہے کہ کیا وہ میم جی کے لئے کوئی ڈاکٹر بھیج دیں؟''

اسحاق چمک کر بولا۔ ''کوئی ضرورت ناہیں۔ ان کو بتاؤ کہ ڈاکٹر ہمارے پاس موجود ہے...... بلکہ ہم سب ڈاکٹر ہیں اور اس کا بہت اچھا علاج کر سکت ہیں۔''

زیندر سنگھ ہم سے اجازت لے کر واپس چلا گیا۔

یہ ایک بدلی ہوئی صورت حال تھی۔ ہمیں اندر کی رپورٹ ملی تھی اور یہ خاصی تشویشناک تھی۔ زرگاں کی محلاتی سازشوں کی وجہ سے ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ ایک گروہ ماریا

کی زندگی کی پروا کیے بغیر مہم جوئی کر سکتا تھا۔ ہم نے آپس میں مشورہ کیا۔ آدھ پون گھنٹے تک بحث ہوئی۔ اسحاق اور احمد وغیرہ تو اس پر تیار نہیں تھے کہ اپنے دوستوں کی رہائی کے مطالبے سے پیچھے ہٹ جائیں مگر ڈاکٹر چوہان اور انور خاں کا خیال تھا کہ بدلی ہوئی صورتِ حال میں حکمتِ عملی سے کام لینا پڑے گا۔ انور خاں موت سے ڈرنے والا شخص نہیں تھا لیکن وہ مستقبل قریب کے حالات کو بھی ذہن میں رکھ رہا تھا۔ یہ بات طے تھی کہ اگر یہ معاملہ خون خرابے پر ختم ہوتا اور ماریا بھی ماری جاتی تو پھر زرگاں کے مسلمان رہائشیوں پر قیامت ٹوٹ پڑنا تھی۔ حکم جی وغیرہ اس واقعے کو بہانہ بنا کر بہت ظلم کر سکتے تھے۔

آخر میں انور خاں نے اس بحث کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''یارو! ہم اس وقت جنگ جیسی حالت میں ہیں اور جنگ میں کبھی وقت کے مطابق تھوڑا سا پیچھے بھی ہٹنا پڑتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ شکست ہوگئی۔ میری رائے میں مراد شاہ صاحب نے جو اندر کی رپورٹ ہم تک پہنچائی ہے، وہ بڑی اہم اور قیمتی ہے۔ ہمیں اس سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔''

''لیکن اگر ہم اپنے دوسرے مطالبوں سے پیچھے ہٹیں گے تو وہ لوگن اور بھی شیر ہو جاویں گے۔'' اسحاق نے کہا۔

''میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہوگا۔'' چوہان نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''بیچ میں مسئلہ تو ان پچاس بندوں کا ہی ہے جن کو ہم چھڑانا چاہتے ہیں۔ جب یہ مسئلہ نہیں ہوگا تو پھر حکم جی ''ایکشن والا خطرہ'' کسی صورت مول نہیں لے گا۔ اس پر جارج گورا وغیرہ کی طرف سے بھی زبردست دباؤ پڑ جائے گا کہ اس معاملے کو خون خرابے کے بغیر حل کیا جائے۔''

''ہاں، یہ بات تو سمجھ میں آدت ہے۔'' احمد نے کہا۔ ''اگر ہم اپنے اس مطالبے کے پیچھے ہٹ جاوت ہیں...... اور پھر بھی حکم اور پانڈے وغیرہ کھون کھرابے کا سوچتے ہیں تو جارج اور اس کے سیکڑوں ساتھی ایک دم قیامت برپا کر دیویں گے۔''

اس موضوع پر پانچ دس منٹ مزید بات ہوئی۔ آخر ایک حتمی فیصلہ کر لیا گیا طے ہوا کہ اسٹیل وغیرہ کو ان کی چٹھی کا جواب دیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ وہ سب سے پہلے سلطانہ کے والد اور بھائی کونل پانی پہنچائیں، اس کے بعد ہم بھی اپنی مانگوں پر نظرِ ثانی کریں گے۔ ان کو شروع میں یہ عندیہ دیا جائے کہ اگر پچاس کے پچاس لوگ رہا نہیں کیے جا سکتے تو ان میں سے جتنے لوگ جارج کی جیل میں موجود ہیں، ان کو چھوڑ دیا جائے اور یہاں پہنچایا جائے۔ اس فیصلے پر اسحاق سمیت سب نے اتفاق کیا۔ تاہم اسحاق کی رائے تھی کہ اسٹیل اور اس کے ساتھیوں نے کل شام تک سارے مطالبے ماننے کا جو وعدہ کیا ہے، اس کے پورا

ہونے کا انتظار کر لیا جائے۔

کچھ بحث و تمحیص کے بعد اسحاق کی یہ بات مان لی گئی۔ حالانکہ اس وعدے کے پورا ہونے کے امکانات کم ہی تھے۔ فیروز کو نہلائے بغیر ایک چادر میں لپیٹا گیا۔ انور خاں نے باقاعدہ اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ پھر سرنگ کے اندر ہی اسے ایک نیم پتھریلی قبر میں دفن کر دیا گیا۔ سب کی آنکھیں نم ناک تھیں۔ دونوں کتوں کی لاشوں کو سرنگ کے عقبی حصے میں پہلے سے موجود ایک گڑھے میں پھینک کر مٹی ڈال دی گئی۔ پانڈے کے ساتھی اپنے دونوں ساتھیوں کی لاشیں اُٹھا کر لے گئے۔

رات کو دہانے پر اپنی ڈیوٹی دینے کے بعد میں پھر بارونداجیکی کے پاس پہنچا اور وہاں اس کے ساتھ دو ڈھائی گھنٹے گزارے۔ شراب پینے کے بعد اس کی توانائیاں عود کر آتی تھیں اور وہ کافی حد تک صحت مند دکھائی دینے لگتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ میرا بے حد مشکور بھی ہو جاتا تھا۔ وہ بڑی دل جمعی سے مجھے مارشل آرٹ کے داؤ پیچ سے آگاہ کر رہا تھا۔ میری دلچسپی دیکھ کر اس کے اندر جیسے یہ شدید خواہش پیدا ہوگئی تھی کہ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ بتائے اور میں اس کے بتائے ہوئے کو ''فالو'' بھی کروں۔ اس نے کئی بار کہا تھا کہ وہ میرے اندر ایک آگ دیکھ رہا ہے اور اگر یہ آگ جلتی رہی تو میں کافی کچھ حاصل کر لوں گا اور وہ شاید ٹھیک ہی کہہ رہا تھا...... میں خود محسوس کرتا تھا کہ میرے اندر کچھ روشن ہو چکا ہے اور اس روشنی کی ابتدا اسی رات ہوئی تھی جس رات سلطانہ نے میرے لئے بہت کچھ دیا تھا۔

مجھے سکھلانے کے دوران میں جیکی چھوٹے چھوٹے وقفے بھی لیتا تھا۔ ان وقفوں میں وہ وسکی کے گھونٹ لیتا، کھانستا اور ہنٹر بیف چبانے کی کوشش کرتا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی پرانی یادیں بھی تازہ کرنے لگتا۔

جس رات کا میں ذکر رہا ہوں، اس رات جنگل میں خوب بارش بھی ہوئی۔ بجلی چمکتی رہی، بادل گرجتے رہے۔ بھیگی ہوئی نباتات کی خوشبو ہوا کے ساتھ سرنگ میں چکراتی رہتی۔ اس ماحول نے جیکی کا نشہ دوآتشہ کر دیا۔ وہ اپنا من پسند نیپالی گیت گنگنانے لگا۔

...... ہم نے اگلے روز شام تک سرجن اسٹیل اور پانڈے وغیرہ کا وعدہ ایفا ہونے کا انتظار کیا۔ ہمارے اندیشے کے عین مطابق ان لوگوں نے ایک بار پھر عذرِ لنگ کا سہارا لیا۔ پانڈے نے میگا فون کے ذریعے ہمیں بتایا کہ بارش کی وجہ سے رات کو کافی راستے بند ہو گئے ہیں۔ جنگل میں سات آٹھ میل کا علاقہ ایسا ہے جہاں سفر ممکن نہیں رہا۔ لہٰذا جیل سے یہاں پہنچنے والوں کی آمد میں ایک دو روز کی تاخیر ہو سکتی ہے۔

بات کی تہ تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ مراد شاہ اور چھوٹے سرکار کی طرف سے جو اطلاعات ہم تک پہنچی تھیں، وہ بالکل درست ثابت ہو رہی تھیں۔ ہم سے وعدے کئے جا رہے تھے اور اس طرح زیادہ سے زیادہ وقت حاصل کیا جا رہا تھا۔

اسحاق اور احمد بہت برہم تھے۔ وہ ذہنی طور پر مرنے مارنے کے لئے بالکل تیار تھے۔ خاص طور سے اسحاق تو یہی چاہتا تھا کہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹا جائے۔ چاہے نتیجہ کچھ بھی نکلے۔

بہرحال، طے شدہ پروگرام کے مطابق اسحاق کو بھی ہماری بات ماننا پڑی۔ چوہان نے انگریزی میں خط لکھا...... اور اس میں اسٹیل وغیرہ کو یہ عندیہ دیا گیا کہ اگر وہ لوگ فوری طور پر سلطانہ کے والد اور بھائی کو گونگے ہاشم سمیت تل پانی پہنچا دیں...... تو ہم باقی کے مطالبات میں کچھ لچک پیدا کر سکتے ہیں۔

یہ خط ایک بار پھر میں ہی لے کر گیا۔ میں نے پچھلے چند دنوں میں انڈین سیکیورٹی فورسز کے سابق افسر رنجیت پانڈے کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا لیکن اس مرتبہ بھی مجھے ناکامی ہوئی۔ رنجیت پانڈے کی جگہ ایک سانولا سا فربہ اندام شخص خط لینے کے لئے آگے آیا۔ اس کی آنکھیں نشے سے سرخ تھیں اور وہ حکم کے سپاہیوں کی مخصوص وردی میں تھا۔ میں نے تل پانی میں چھوٹے سرکار یعنی اجیت رائے کے محافظ بھی دیکھے تھے۔ ان کی وردیاں سبز رنگ کی تھیں۔ جنگل میں یہ وردیاں جیسے سبز گرد و پیش کا حصہ ہی بن جاتی تھیں۔ حکم کے سپاہیوں کی وردیوں میں سبز اور خاکی رنگ تھا۔

خط دینے کے بعد میں واپس آ گیا۔ اگلے چوبیس گھنٹے پھر انتظار اور تناؤ کے تھے۔ دونوں طرف خاموشی تھی لیکن یہ ایسی خاموشی تھی جسے کسی بھی لمحے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس خاموشی کی دھند میں رنجیت پانڈے جیسا شخص بھی موجود تھا۔

دوسرے روز صبح دس بجے کے قریب پانڈے نے ہی ہمیں میگافون کے ذریعے اطلاع دی کہ ہمارا مطالبہ پورا کر دیا گیا ہے۔ سلطانہ کے والد، بھائی اور ملازم ہاشو بخیریت تل پانی میں چھوٹے سرکار کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ اگر ہم اس کی تصدیق کرنا چاہیں تو ہم میں سے کوئی ایک شخص تل پانی جا کر واپس آ سکتا ہے۔

انور خاں تصدیق کئے بغیر کیسے مان سکتا تھا؟ خصوصاً ایسی صورت میں کہ اطلاع دینے والا پانڈے تھا۔

مشورے کے بعد طے ہوا کہ ہم میں سے احمد سرنگ سے باہر جائے گا اور تصدیق کر

کے ہمیں اطلاع دے گا۔ تل پانی کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ احمد ڈیڑھ دو گھنٹے کے اندر بہ آسانی واپس آ سکتا تھا۔ میرے دل میں آئی کہ میں بھی رضاکارانہ طور پر احمد کے ساتھ چلا جاؤں۔ اس طرح میں تل پانی میں سلطانہ سے مل سکتا تھا اور اس بچے سے بھی جسے میرا خون کہا جا رہا تھا۔ میں سلطانہ کو تسلی تشفی بھی دے سکتا تھا مگر پھر میں نے ارادہ بدل دیا۔ میں جس منزل کا راہی نہیں تھا، اس منزل کی طرف جانے سے کیا حاصل تھا؟ مجھے سلطانہ کی طرف نہیں کسی اور کی طرف جانا تھا۔ وہ جو ایک روز، بغیر کچھ بتائے، بغیر کچھ کہے، خاموشی سے منہ موڑ کر چلی گئی تھی...... سمندر پار جا بیٹھی تھی...... ان گلی کوچوں کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ گئی تھی...... جہاں ایک چپے پر ہماری یادوں کے گلشن کھلے ہوئے تھے۔ ہاں، میری منزل وہی تھی۔ اس کے سوا کوئی بنت حوا میری زندگی میں نہیں آ سکتی تھی۔ اگر سلطانہ آئی تھی تو وہ میرے ہوش و حواس میں نہیں آئی تھی۔ اس کے ساتھ بیتا ہوا وقت میرے ذہن کی سلیٹ پر سے بالکل صاف ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی قربانیوں کے بارے میں سنا تھا۔ ان جانکاریوں کی وجہ سے میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی تو موجود تھی لیکن کسی بھی درجے کی محبت نہیں تھی۔

احمد، انور خاں کی ضروری ہدایات کے ساتھ سرنگ سے روانہ ہو گیا۔ اس کے لئے پانڈے نے گھوڑا فراہم کیا اور ایک محافظ بھی ساتھ بھیجا۔ احمد کی واپسی دو گھنٹے سے پہلے ہی ہو گئی۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو گیا کہ وہ مثبت خبر لایا ہے۔ اس نے آ کر بتایا۔

''سب ٹھیک ہے انور بھائی! میں سلطانہ بی بی کے والد اور بھائی سے مل کر آیا ہوں۔ وہ بالکل خیریت سے ہیں۔ سلطانہ بی بی کے بیمار بھائی کو چارپائی اور گھوڑا گاڑی پر سفر کرا کے تل پانی پہنچایا گیا ہے۔''

''تل پانی میں کیا حالات ہیں؟'' چوہان نے پوچھا۔

''سلطانہ بی بی کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر لوگوں میں سخت غم و غصہ پایا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجرموں کو ہر صورت سزا ملنی چاہئے۔ اگر حکم اور اس کے لوگن ناہیں دیتے تو پھر اس سزا کی ذمے داری چھوٹے سرکار کو لینی چاہئے۔''

انور خاں نے احمد سے سرنگ کے اردگرد کے حالات دریافت کئے۔

احمد اپنے زخمی بازو کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''باہر ہمارے اندازے سے کہیں زیادہ لوگن موجود ہیں۔ میرے کھیال میں تو ان کی تعداد ڈھائی تین سو سے کم ناہیں ہووے گی۔ وہ دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ دوربینیں لے کر درختوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ ہر طرف ان کے گھوڑے گھاس پر منہ مارتے نظر آوت ہیں۔ ان کے پاس ہر طرح کا اسلحہ ہے۔ ٹیلوں کے

ساتھ ساتھ ان کی چھولداریاں ہیں اور خچر وغیرہ بندھے ہوئے ہیں۔"

"ظاہر ہے کہ میم صاحبہ کا معاملہ ہے۔ اگر ساری فوج بھی یہاں بھیج دی جاتی تو حیرانی کی بات نہیں تھی۔" چوہان نے کہا۔

انور خاں نے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "چلو، پہلا مرحلہ تو طے ہوا۔"

"اب کیا کرنا ہے؟" احمد نے پوچھا۔

"اب ان کو دوسرا پیغام بھیجتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم مزید یہاں نہیں رک سکتے۔ وہ ہمارے مطلوبہ بندے یہاں پہنچا دیں۔ اگر سارے نہیں آ سکتے تو اتنے پہنچا دیں جتنے کا انہوں نے اقرار کیا ہے...... یعنی پچیس افراد۔"

"لیکن وہ اتنے بھی نہیں پہنچائیں گے۔" بھکشو ہمیش نے کہا۔

"نہیں پہنچائیں گے لیکن کچھ نہ کچھ تو بتائیں گے نا۔ فی الوقت وہ جو بھی دیں، ہمیں مان لینا چاہئے...... کیا خیال ہے؟" آخری الفاظ کہتے ہوئے انور خاں نے چوہان کی طرف دیکھا۔

چوہان نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔

اس بار خط لکھنے کے بجائے چوہان اور انور خاں نے براہِ راست بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہماری طرف سے چوہان اور احمد باہر نکلے۔ ان کی طرف سے سرجن اسٹیل اور گرو مودان آئے۔ درختوں کے جھنڈ میں قریباً آدھ گھنٹا بات چیت ہوئی۔ ہماری توقع اور اندیشے کے عین مطابق وہ لوگ فوری طور پر صرف سات بندے دینے کے لئے آمادہ ہوئے۔ یہ زیادہ اہم بندے نہیں تھے۔ یہاں بھاگتے چور کی لنگوٹی والا محاورہ صادق آ رہا تھا۔ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔ معاملہ طے ہو گیا۔ چوہان اور احمد واپس آ گئے۔

چوہان نے بتایا۔ "کل دوپہر تک سات بندے یہاں پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد ہم ماریا سمیت یہاں سے نکل سکیں گے اور نل پانی کی طرف روانہ ہوں گے۔"

"ماریا آخر تک ہمارے ساتھ رہے گی؟" ہمیش نے پوچھا۔

"نہیں...... اسٹیٹ کی حدود سے دو میل پیچھے ماشی پور کے قریب ہمیں ماریا کو چھوڑنا پڑے گا۔ اس کے بدلے سرجن اسٹیل یا گرو مودان میں سے کوئی ایک ہماری تحویل میں آ جائے گا۔ وہ تب تک ہمارے ساتھ رہے گا، جب تک ہم کسی محفوظ مقام تک نہیں پہنچ جاتے۔"

"یہ دھوکا ہے۔ کوئی چال ہے۔" اسحاق نے چیخ کر کہا۔ "میں آپ سب کو بتا دیوت

ہوں، ہم تب تک ہی بچے ہوئے ہیں جب تک یہ چھوکری ہمارے ساتھ ہے۔ جس وقت یہ ہمارے ہاتھ سے نکلی، ہم مارے جاویں گے۔ میں کسی صورت ایسا ناہیں ہونے دوں گا۔ یہ تب ہی رہا ہووے گی جب ہم یہاں سے نکلیں گے۔" اسحاق کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

انور اسے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "دیکھو، ہم ماریا کے بدلے جو کچھ لے رہے ہیں، وہ بھی کچھ کم خاص نہیں ہے۔ سرجن اسٹیل یا پھر گرو مودان۔ ماریا کی طرح ان دونوں کے جیون کا رسک لینا بھی ان لوگوں کے لئے آسان نہیں ہوگا...... اور پھر تب تک ہم ویسے بھی اسٹیٹ سے تقریباً نکل چکے ہوں گے۔"

اسحاق بدستور نفی میں سر ہلاتا رہا۔ بہرحال، انور خاں اور چوہان اسے سمجھانے میں لگے رہے۔ آدھ گھنٹے بعد وہ اسے بمشکل راضی کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

○......❖......○

سہ پہر کے دو بج چکے تھے۔ اب ہمیں کل دوپہر تک زرگاں سے رہا ہونے والے سات بندوں کی آمد کا انتظار کرنا تھا۔ اس کے ساتھ یہاں سے نکلنے کی تیاری بھی کرنا تھی۔

احمد نل پانی سے ہو کر آیا تھا۔ میں اس سے سلطانہ اور بالو وغیرہ کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ احمد خود بھی بھانپ گیا کہ میں اس سے سلطانہ کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ کھانے کے بعد ہم ایک الگ جگہ جا بیٹھے۔ احمد نے بتایا۔ "وہ ابھی تک سخت صدمے میں ہے۔ کچھ کھاتی پیتی ناہیں۔ نہ ہی بچے کو دودھ پلاتی ہے۔ بس گم صم بیٹھی رہوت ہے یا پھر رونا شروع کر دیوت ہے۔ چھوٹے سرکار کی ہدایت پر ایک ڈاکٹر اس کا علاج کر رہا ہے۔ میں اس سے ملا ہوں۔ وہ بتا رہا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بہتر ہو جاوے گی۔"

"تم خود بھی اس سے ملے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، میں گیا تھا۔ وہ عبدالغنی کے گھر میں ٹھہری ہوئی ہے۔ وہ میاں بیوی اس کا بہت خیال رکھ رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر وہ پھر رونے لگ گئی۔ اس نے مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھا۔ تمہاری چوٹوں کے بارے میں پوچھا۔ مجھے بہت تاکید کی کہ میں تمہارا بہت کھیال رکھوں...... اس کے دل میں تمہارے لئے وہی پریشانی ہے جو ایک بہت پیار کرنے والی بیوی کے دل میں ہو سکت ہے۔"

"اس نے اپنے بارے میں کوئی بات نہیں کی؟"

"ناہیں تابش بھائی! میرا کھیال ہے کہ وہ اپنا سارا دکھ درد اپنے دل میں چھپائے بیٹھی ہے۔ جیسا ساگر اوپر سے شانت ہووے ہے، پر اندر طوفان پلے ہے۔ سلطانہ بی بی کے اندر

بھی بہت کچھ چل رہا ہے۔ اب پتا نا ہیں، اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔"

"تم نے اسے بتایا کہ ہم یہاں سے نکلنے کی تیاری کر رہے ہیں؟"

"نا ہیں، میں یہ بتاتا تو وہ زیادہ غمگین ہو جاتی۔ وہ اوپر اوپر سے کچھ بھی کہے لیکن کوئی بھی بیوی اس طرح اپنے شوہر کو ہمیشہ کے لئے کھونا نا ہیں چاہتی اور سلطانہ تو ایسی شوہر پرست بیوی ہے جس نے......"

وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ شاید اس کے ذہن میں آیا تھا کہ وہ یہ باتیں پہلے بھی کئی بار مجھ سے کہہ چکا ہے۔

میں نے احمد سے مشورہ مانگتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے...... ایسا کیا طریقہ ہوسکتا ہے کہ وہ جلد سے جلد نارمل ہو جائے؟ اس بات کو سمجھ لے کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس میں اس کا اپنا کوئی قصور نہیں؟"

اس سے پہلے کہ احمد جواب میں کچھ کہتا، اسحاق نے اشارے سے ہمیں اپنی طرف بلایا۔ وہ ہمیں کوئی خاص چیز دکھانا چاہ رہا تھا۔

ہم اُٹھ کر اس کی طرف گئے۔ وہ ہمیں دہانے سے کچھ فاصلے پر اس جگہ لے آیا جہاں ہم سوتے تھے۔ "یہ دیکھو۔" اسحاق نے ایک طرف اشارہ کیا۔

ہم دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ماریا جو پچھلے تقریباً اٹھارہ گھنٹے سے پتھر پر چڑھی بیٹھی تھی تاکہ کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رہے...... اب تھک ہار کر زمین پر لیٹ گئی تھی اور سو رہی تھی۔

اسحاق زہریلے لہجے میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ "حرامزادی کہوت تھی مجھے بیڈ چاہئے، گدا چاہئے۔ اب دیکھو، پتھروں پر سو رہی ہے۔"

"سیانے ٹھیک ہی کہوت ہیں کہ وقت سب کچھ سکھا دیوت ہے۔" احمد نے تائید کی۔

"ایک دو ہفتے اور ہمارے ساتھ رہی تو اسے کانٹوں پر بھی سونا آ جاوے گا۔" اسحاق نے کہا۔

واقعی یہ دیکھنے والا نظارہ تھا۔ خوشبودار کمروں میں مچھر دانیاں لگا کر آرام دہ بستروں کا لطف لینے والی، سخت ناہموار زمین پر پڑی تھی۔ اس کا قیمتی لباس سرنگ کی مٹی سے لتھڑا ہوا تھا۔ اپنے لباس کی طرح وہ خود بھی بے ترتیب تھی۔ ہاتھ کہیں، پاؤں کہیں تھا۔ میں نے دہانے کی طرف سے آنے والی مدھم روشنی میں دیکھا، اس کی گوری چٹی پنڈلی پر ایک چھوٹا لال بیگ رینگ رہا تھا۔ یہی زندگی اور زندگی کی بوالعجبی ہے۔

اگلے روز سہ پہر ڈھائی تین بجے کے قریب وہ ساتوں افراد زرگاں سے آ گئے جن کا ہم

انتظار کر رہے تھے۔ ان کی عمریں بیس اور ستائیس اٹھائیس سال کے درمیان تھیں۔ داڑھیاں بڑھی ہوئیں، سر اور چہرے کے بال جھاڑ جھنکاڑ کی صورت میں تھے۔ ان کی شکلوں سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک بامشقت قید گزار کر آ رہے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک کے جسم اور چہرے پر زخموں کے نشان تھے۔ وہ انور خاں، احمد اور اسحاق وغیرہ کے ساتھ بڑی گرم جوشی سے ملے۔ کئی ایک کی آنکھوں میں آنسو بھی چمک گئے۔

ایک پارسی کے سوا یہ سب کے سب مسلمان تھے۔ ان میں سے صرف ایک شخص قتل کا مجرم تھا، باقی سب جرمِ بے گناہی کا شکار تھے۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ انہوں نے حکم یا جارج کی کسی زیادتی کے خلاف آواز اُٹھائی تھی۔ کسی سرکاری اہلکار کے دستِ ستم کو روکنے کی کوشش کی تھی یا ایسا ہی کوئی اور گناہ کیا تھا۔ انور خاں نے مجھ سے اور چوہان سے ان سب کا تعارف کرایا۔ ان میں سے ایک حجام تھا، دوسرا ایک ماہر قفل گر تھا۔ یہ سب افراد اپنی اس آزادی کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ رہے تھے اور قدرت کی نیرنگی پر حیران تھے۔

سب سے پہلے انہیں کھانا کھلایا گیا۔ ہمارے پاس بس گزارے لائق خوراک تھی۔ زیادہ تر خشک راشن یعنی چنے، بھٹے، ہنٹر بیف اور بسکٹ وغیرہ ہی تھے۔ قیدیوں نے یہ چیزیں ندیدوں کی طرح کھائیں۔ اندازہ ہوا کہ اپنی طرف قید کے دوران میں وہ معقول خوراک سے یکسر محروم رہے ہیں۔

ان میں سے جو شخص حجام تھا، وہ مجھے بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ زرگاں میں وہ میرے بال تراشتا رہا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کا حمام اسی محلے میں ہے جہاں مختار راجپوت اور ان کی بیٹی سلطانہ رہتے ہیں۔ اس کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ اکثر سلطانہ خود مجھے اپنے ساتھ لے کر آتی تھی اور جب تک میرے بال تراشے جاتے تھے، وہ میرے پاس ہی بیٹھی رہتی تھی۔ میں چونکہ پوری طرح صحت مند اور چوکس نہیں تھا، وہ سائے کی طرح میرے ساتھ لگی رہتی تھی۔ عبدالرحیم نامی یہ حجام اس بات پر ششدر بھی تھا کہ میں اسے کیوں پہچان نہیں پا رہا ہوں۔ چوہان اسے ایک طرف لے گیا، غالباً صورتِ حال سے آگاہ کر رہا تھا......

ان قیدیوں سے ہمیں اپنے اردگرد کے حالات کے بارے میں بھی کئی باتیں معلوم ہوئیں۔ ہم رات تک تیاری میں لگے رہے۔ خشک راشن تھیلوں میں رکھا گیا۔ فالتو ایمونیشن کو پولیتھین میں لپیٹ کر کینوس کے دو بڑے بیگوں میں اس طرح سنبھالا گیا کہ وہ بارش وغیرہ سے محفوظ رہے۔ رائفلوں کو صاف کر کے بالکل تیار کر لیا گیا۔ مکمل ترتیب بنائی گئی کہ ہمیں کس

فارمیشن میں یہاں سے نکلنا ہے۔ ہنگامی صورتِ حال سے کس طرح نمٹنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ انور خاں میں یقیناً قائدانہ صلاحیتیں تھیں۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی تفصیل وقت سے پہلے ہی طے کر رہا تھا۔ یہ سوچ کر خوشی بھی ہو رہی تھی کہ اس تنگ و تاریک سرنگ میں یہ ہماری آخری رات ہے۔ اس کے علاوہ ایک طرح کی سنسنی بھی رگ و پے میں جاگی ہوئی تھی۔ ہم جانتے تھے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد حالات ہمارے لئے ایک دم خطرناک ہو جائیں گے۔ آنے والے ایک دو روز میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ماضی قریب میں ایسے حالات مجھے اعصاب زدہ کر دیا کرتے تھے۔ میں خطرے کی آمد سے پہلے ہی اس کے بارے میں اتنا سوچتا تھا کہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتا تھا مگر اب صورتِ حال مختلف تھی۔ حالات کی سنگینی مجھ پر اثر انداز نہیں ہو رہی تھی۔ میں خود کو اس پُر جوش گروپ کا حصہ محسوس کر رہا تھا۔ اپنے ساتھیوں کی طرح میں بھی لڑنے مرنے کے لئے تیار تھا۔ میرا جوش یوں اور بھی بڑھ گیا تھا کہ ہم جو کچھ کرنے جا رہے تھے، وہ میری خواہش کے عین مطابق تھا۔ میری سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ میں کسی طرح اس ''جادونگری'' سے نکل جاؤں۔ بے شک اس راجواڑے نے ایک جادونگری ہی کی طرح مجھے کئی بر... سے اپنے حصار میں جکڑا ہوا تھا۔ اب میرے لئے ایک سبب پیدا ہو گیا تھا۔ میں ایک ایسی جماعت کا حصہ بن گیا تھا جو یہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔ یا یوں کہہ لیں کہ اس جماعت کے پاس یہاں سے نکلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ دوسری طرف ہمیں روکنے والوں کے پاس بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ہمیں یہاں سے نکل جانے دیں۔

یہ بات اب ہر شک و شبہے سے بالاتر ہو چکی تھی کہ میرے جسم میں ایک الیکٹرانک چپ موجود ہے جو مجھے اس راجواڑے کی حدود میں پابند رکھے ہوئے ہے۔ یہ چپ اب بھی میرے جسم میں موجود تھی۔ میرے صیادوں کو اب بھی فوراً معلوم ہو سکتا تھا کہ میں اس اسٹیٹ میں کہاں ہوں اور کس طرف جا رہا ہوں لیکن اب میں جس جماعت کا حصہ تھا، وہ اسے روک نہیں سکتے تھے۔ اگر وہ روکتے تو پھر زبردست خون خرابے کے حالات پیدا ہو سکتے تھے۔

جو بات چیت ہوئی تھی، اس میں چوہان نے پانڈے وغیرہ سے تین خچر بھی طلب کئے تھے۔ ہمیں دو خچر اور ایک گھوڑا دیا گیا۔ یہ تینوں جانور رات آٹھ نو بجے ہی سرنگ میں پہنچ گئے۔ ہمیں ان کو سامان برداری کے لئے استعمال کرنا تھا۔ حسبِ معمول رات کے پہلے حصے میں جن افراد کی ڈیوٹی تھی...... ان میں، مَیں بھی شامل تھا۔ ڈیوٹی سے فارغ ہو کر میں نے دس پندرہ منٹ تک چٹائی پر لیٹ کر کمر سیدھی کی اور پھر شراب کی نصف بوتل لے کر باروندا جیکی کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہاں اس کے لئے ایک چٹائی بچھا دی گئی تھی اور لالٹین رکھ دی گئی

تھی۔ وہ تنہائی میں خوش رہتا تھا اور ہم بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ علیحدہ رہے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ نیند سے بیدار ہوتے ہی اس میں شراب کی طلب بیدار ہو جاتی تھی اور یہ طلب شام تک بڑھتی چلی جاتی تھی۔ شام کے بعد یہ طلب عروج پر پہنچ جاتی تھی اور وہ واویلا شروع کر دیتا تھا۔ ہمیں جہنمی ہونے کی بشارتیں سناتا...... خود کو کوستا اور ان حالات کو بھی جو اسے پیاسا مارنے پر تلے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ہم باروندا کو اس کی طلب کے مطابق شراب فراہم نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے لئے تو اس سرنگ کے اندر ہی ایک چھوٹی سی فیکٹری لگائے جانے کی ضرورت تھی۔

میں باروندا جیکی کے ٹھکانے پر پہنچا تو چونک گیا۔ وہ اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا اور نہ ہی اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے سینڈ بیگ کی طرف دیکھا، وہ بھی اکیلا ہی جھول رہا تھا۔ لالٹین کی لو اونچی کر کے دائیں بائیں دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ میرے ذہن میں آیا تھا کہ شاید وہ کسی حاجت کے لئے کسی کونے کھدرے کی طرف رینگ گیا ہے۔

اگلے دو چار منٹ کے اندر میری پیشانی پر پسینا آ گیا۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ اس کی اکلوتی ٹانگ گھٹنے پر سے موڑ کر زنجیر سے باندھ دی جاتی تھی اور صبح کے وقت ہی بس ایک دو گھنٹے کے لئے کھولی جاتی تھی...... یا پھر کسی وقت رات کو جب وہ مجھے فائٹنگ آرٹ کے داؤ پیچ سکھاتا تھا، میں کچھ دیر کے لئے اس کی ٹانگ کھول دیتا تھا۔ رات آٹھ نو بجے میں خود ہی اسے کھانا دینے کے لئے یہاں آیا تھا، تب بھی اس کی ٹانگ بندھی ہوئی تھی۔ اگر وہ اسی بندھی ہوئی ٹانگ کے ساتھ رینگ کر کہیں جاتا تو زیادہ دور نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے اسے دو چار آوازیں دیں پر اسے سرنگ کی ذیلی شاخوں میں ڈھونڈنا شروع کیا۔

میری آوازیں سن کر ہمیش اور احمد بھی ٹارچ کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔

''کیا ہوا تابش؟'' احمد نے پوچھا۔

''جیکی نظر نہیں آ رہا۔'' میں نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔

وہ دونوں بھی میرے ساتھ تلاش میں شریک ہو گئے۔ ہم نے زمینی شہادت ڈھونڈنے کی بھی کوشش کی۔ ایک دو جگہ ننگے پاؤں کے نشانات نظر آئے۔ یہ زیادہ پرانے نہیں تھے۔ ان کے ساتھ بیساکھی نما لکڑی کا نشان بھی موجود تھا۔ تو کیا باروندا جیکی کسی طرح اپنی زنجیر کھولنے میں کامیاب ہو گیا تھا؟ اپنے اکلوتے ہاتھ سے وہ کس طرح ایسا کر پایا تھا؟ جلد ہی دیگر ساتھیوں تک بھی یہ خبر پھیل گئی کہ جیکی غائب ہے۔

سب دہانے کے قریب اکٹھے ہو گئے۔ چوہان نے کہا۔ ''یہ تو سوچا نہیں جا سکتا کہ وہ

باہر نکل گیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ دہانے کی طرف سے ہی نکل سکتا تھا۔"

"مطلب ہے کہ وہ سرنگ کے اندر ہی کہیں چھپا ہوا ہے۔" اسحاق نے کہا۔

"ایک اور بات بھی تو ہو سکتی ہے۔" انور خاں نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

"وہ کیا؟" چوہان نے پوچھا۔

"سرنگ سے نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ...... جو اب تک ہماری نظر سے اوجھل رہا ہو۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے انور بھائی۔" اسحاق اُلجھن زدہ لہجے میں بولا۔ "تم جانتے ہی ہو، یہاں پہنچنے کے دوسرے ہی روز ہم نے چپا چپا دیکھ لیا تھا۔"

"لیکن ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم ہر جگہ پہنچے تھے اور سو فیصد تسلی کر لی تھی۔"

کسی نے انور کی اس بات کا جواب نہیں دیا۔ ہاں ایک طرح کی سنسنی سب نے محسوس کی۔ اگر واقعی سرنگ سے نکلنے کا کوئی اور راستہ موجود تھا تو پھر اس راستے سے سرنگ میں داخل بھی ہوا جا سکتا تھا اور یہاں ہمارے دشمنوں میں پانڈے جیسا نہایت عیار اور گھاگ شخص بھی موجود تھا۔

انور خاں، چوہان اور اسحاق تو اپنی پوزیشنوں پر موجود رہے اور باقی ایک بار پھر جیکی کو ڈھونڈنے میں لگ گئے۔ میں اپنی جگہ کچھ ندامت بھی محسوس کر رہا تھا۔ جیکی سے زیادہ تر میرا ہی رابطہ رہتا تھا۔ اس کی بندش کو چیک کرنا بھی میری ہی ذمے داری تھی۔ اسحاق اور انور خاں وغیرہ کا خیال تو شروع میں یہ تھا کہ مجھے اسے یہاں لانا ہی نہیں چاہئے تھا لیکن بعد میں جب انہیں جیکی کی مکمل کہانی معلوم ہوئی تھی، وہ بھی اس سے ہمدردی محسوس کرنے لگے تھے۔

رات آخری پہر تک سرنگ کی بھول بھلیوں میں اس کی تلاش جاری رہی پھر ہم تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ اب ہماری روانگی کا وقت بھی قریب آ رہا تھا۔ انور خاں کا خیال تھا کہ ہم اجالا ہوتے ہی یہاں سے نکل جائیں۔ جانوروں پر سامان رات کو ہی باندھ لیا گیا تھا۔ باقی تیاری بھی مکمل تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اب ہم جیکی کی مزید تلاش جاری نہیں رکھ سکیں گے۔

O......❖......O

چھ بجے کے لگ بھگ ہم سرنگ سے نکل آئے۔ مطلع صاف تھا۔ گرد و پیش اوس میں نہائے ہوئے تھے۔ سرنگ چھوڑتے ہوئے میں نے الوداعی نظروں سے اس کے اندر جھانکا۔ یہاں گزارے ہوئے دن بڑے سنسنی خیز تھے...... تناؤ سے پُر اعصاب شکن۔ یہاں کئی ایک انوکھے واقعات ہوئے تھے جن میں شکاری کتوں کا اچانک سرنگ میں گھس آنا اور پھر اندھا دھند فائرنگ کا شروع ہو جانا بھی شامل تھا۔ ہم اپنے قریبی ساتھی فیروز کی قبر بھی اسی سرنگ کی

ویران تاریکی میں چھوڑے جا رہے تھے...... اور پھر سب سے بڑھ کر باروندا جیکی تھا۔ وہ ایک معمے کی طرح ہمارے سامنے آیا تھا اور ایک معمے کی طرح اوجھل ہو گیا تھا۔ اس کا یوں اچانک اوجھل ہو جانا میرے دل و دماغ کو تہ و بالا کر رہا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے پاس اب یہاں رکنے کا وقت نہیں تھا۔ ورنہ جیکی کو ہم کسی صورت چھوڑ کر نہ جاتے۔ انور خاں کے نزدیک اب بھی نوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ جیکی کہیں سرنگ کی بھول بھلیوں میں ہی موجود ہوگا۔ جونہی وہ اپنے اردگرد کے حالات بہتر دیکھے گا، یہاں سے نکل جائے گا لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل اس بات کو نہیں مان رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ کسی طرح یہاں سے نکل چکا ہے لیکن اگر واقعی ایسا ہوا تھا تو کیا وہ اس خطرناک جنگل کو پار کر کے واپس اس ندی تک پہنچ سکتا تھا؟ اس سوال کا جواب زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ نہتا تھا، معذور تھا اور نشے کے بغیر اتنا کمزور تھا کہ کسی بھی وقت، کسی حادثے کا شکار ہو سکتا تھا......

میرا دل اس کے لئے غم سے بھر گیا۔ عمران مجھ سے جدا ہوا تھا تو وہ شخص بھی جدا ہو گیا جس میں عمران کی ہلکی سی جھلک نظر آتی تھی؟

ایک ٹھنڈی سانس لے کر میں اس قافلے کا حصہ بن گیا جو اس سرنگ سے نکل کر گھنے درختوں میں داخل ہو رہا تھا۔ اس مختصر قافلے موجود افراد ایک خاص ترتیب سے باہر نکلے تھے اور انور خاں کی ہدایت کے مطابق یہ ترتیب ہر صورت میں برقرار رکھی جانی تھی۔

سب سے آگے وہ گھوڑا تھا جس پر خوراک کا سامان لدا تھا۔ اس کے عقب میں چوہان، ہمیش اور احمد تھے۔ ان کے پیچھے ماریا تھی جس کے عین عقب میں اسحاق تھا۔ ماریا کے دائیں بائیں بھی دو افراد موجود تھے۔ اس کے پیچھے وہ باقی پانچوں افراد ایک نیم دائرے کی شکل میں تھے جنہیں زرگاں سے رہا کرایا گیا تھا۔ ان میں سے کسی کے پاس آتشیں ہتھیار تو نہیں تھا تاہم انور خاں نے ان میں سے چار بندوں کو تلواروں سے مسلح کر دیا تھا۔ ان لوگوں کے عقب میں انور خاں اور میں تھے۔ ہم دونوں نے دو سامان بردار خچروں کی رسیاں بھی تھام رکھی تھیں۔ ان خچروں پر چٹائیاں، برتن اور اضافی ایمونیشن وغیرہ بار کیا گیا تھا۔ ہر بندے کو اپنی ڈیوٹی معلوم تھی اور یہ بھی معلوم تھا کہ ہنگامی صورت حال میں انہیں کیا کرنا ہے۔ جیسا کہ ترتیب سے ظاہر ہے، مایا اس مختصر قافلے کے عین درمیان میں تھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر باندھے جانے چاہئے تھے مگر انگلی کٹنے کی وجہ سے اس کا ہاتھ زخمی تھا اس لئے انور نے تھوڑی سی رعایت کی تھی اور ہاتھ سامنے کی طرف بندھوائے تھے۔ اسحاق نے ایک بڑے سائز کی چادر اس کے جسم کے گرد لپیٹ دی تھی۔ وہ اس چادر کے اندر ڈگمگاتی ہوئی سی چل رہی تھی۔

اس کے چہرے پر تلخی اور جھلاہٹ کے آثار صاف محسوس کئے جا سکتے تھے۔

ہم روانہ ہوئے تو حسبِ پروگرام اسٹیل، پانڈے اور ان کے دیگر ساتھی ہمارے پیچھے چل دیئے۔ اپنی ''کمٹمنٹ'' کے مطابق انہوں نے ہم سے کافی فاصلہ رکھا تھا۔ یہ ایک محفوظ فاصلہ تھا۔ یہ لوگ ہمارے پیچھے اور دائیں بائیں موجود تھے۔ ان میں سے زیادہ تر گھڑسوار تھے۔ ان کی سبز اور براؤن وردیوں کی جھلک ہمیں چاروں طرف دکھائی دے رہی تھی۔ ان کی تعداد کسی طرح بھی ڈھائی سو سے کم نہیں تھی۔ ان کے پاس جدید ترین اسلحہ بھی موجود تھا۔ یہ لوگ چاہتے تو سیکنڈوں میں ہمیں بھون کر رکھ سکتے تھے لیکن ہمارے پاس ماریا ایک اہم مہرے کے طور پر موجود تھی۔ وہ اس اسٹیٹ میں ایک اہم ترین شخصیت تھی اور اس کی زندگی کے لئے رسک لینا آسان نہیں تھا۔

''ہمیں کتنا فاصلہ طے کرنا ہوگا؟'' میں نے اپنے پہلو میں چلتے انور خاں سے پوچھا۔

''میلوں میں تو ٹھیک سے نہیں بتا سکوں گا لیکن اندازہ ہے کہ یہ دو دن کا سفر ہوگا۔ ہم پرسوں دوپہر تک اسٹیٹ کی حد سے نکل جائیں گے۔''

''اسٹیٹ کی حد سے نکلنے کے بعد ہماری پناہ گاہ کہاں ہوگی؟''

''اسٹیٹ سے باہر جو مقامی لوگ آباد ہیں، وہ حکم وغیرہ کے سخت خلاف ہیں۔ یہ زیادہ تر جاٹ اور راجپوت برادریاں ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو نیپالی علاقے سے آ کر یہاں آباد ہوئے ہیں۔ حکم اور چھوٹے سرکار کے گارڈز کے ساتھ اکثر ان کی جھڑپیں چلتی رہتی ہیں۔ یہ لوگ ہمیں فوراً پناہ دے دیں گے۔''

''کیا ہم انہیں مطمئن کر سکیں گے کہ ہم واقعی حکم کے باغی ہیں اور ہمیں پناہ دی جانی چاہئے؟''

''یہ سب کچھ ڈاکٹر چوہان کرے گا۔ وہ انہی لوگوں میں سے ہے۔ شاید تمہیں چوہان کی روداد کا پورا پتا نہیں ہے۔''

''پورا کیا، مجھے تھوڑا پتا بھی نہیں ہے۔ اس نے صرف اتنا بتا رکھا ہے کہ وہ الٰہ آباد میں رہتا ہے۔ وہاں حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ اسے بھاگ کر اسٹیٹ میں آنا پڑا اور یہاں پناہ لینا پڑی۔''

انور بولا۔ ''حقیقت میں چوہان ایک دیہاتی کاشت کار کا بیٹا ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر محنت مزدوری تک ہی محدود رہتے ہیں مگر چوہان قابل نکلا۔ نہ صرف یہ گاؤں سے شہر گیا بلکہ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بھی بن گیا۔ الٰہ آباد میں اس کا کلینک تھا اور مریضوں کی لائن لگی رہتی تھی۔ انہی

مریضوں میں چوالیس پینتالیس سال کی ایک ہندو عورت ہیما بھی تھی۔ یہ بیوہ تھی اور کافی پراپرٹی کی مالک تھی۔ اس کے بیٹے نافرمان تھے اور اس کوشش میں تھے کہ ماں سے پراپرٹی اپنے نام کروا لیں۔ ہیما اپنے علاج کے دوران میں چوہان پر بے پناہ اعتماد کرنے لگی۔ یہاں تک کہ اس نے بیٹوں اور بہوؤں کے خوف سے اپنی پراپرٹی کے کاغذات چوہان کے پاس رکھوا دیئے۔ یہ صورتِ حال ہیما کے بیٹوں کو کسی طور قبول نہیں تھی۔ وہ ڈاکٹر چوہان کی جان کے دشمن ہو گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہیما کی ایک بہو نے اپنی ساس پر بدچلنی کا الزام لگا دیا...... اور کہا کہ اس کی ساس اپنا دھرم بدل کر نوجوان ڈاکٹر سے بیاہ رچا لے گی۔ ہیما کے بیٹوں نے چوہان کو قتل کرنے کی کوشش کی اور اس معاملے میں پولیس کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ چوہان کے خاندان برادری والے بھی بپھر گئے۔ خدشہ پیدا ہو گیا کہ لڑائی ہو جائے گی۔ چوہان نے سمجھ داری دکھائی اور لوگوں کو خون خرابے سے بچانے کے لئے چپ چاپ اسٹیٹ میں آ گیا۔ اب یہ قریباً ڈھائی برس سے یہیں پر ہے۔''

چوہان کے بارے میں جاننے کی خواہش کافی دیر سے میرے دل میں تھی۔ آج انور خاں کے ذریعے یہ خواہش پوری ہو گئی تھی۔ میں نے اس روداد کے حوالے سے انور خاں سے کئی سوالات پوچھے۔ جو کچھ انور کو معلوم تھا، اس نے بتایا۔ ساتھ ساتھ ہمارا سفر بھی جاری رہا۔

میں نے انور سے پوچھا۔ ''اب چوہان اسٹیٹ سے باہر جا رہا ہے اور اپنے لوگوں میں واپس پہنچ رہا ہے۔ کیا اب اس کے لئے خطرہ نہیں ہوگا؟''

''اسٹیٹ سے باہر حالات کافی بدل گئے ہیں۔'' انور خاں نے جواب دیا۔ ''ہیما کے لالچی بیٹے ایک دوسرے سے ہی لڑ پڑے ہیں۔ ایک قتل ہو گیا ہے اور دوسرا جیل میں سڑ رہا ہے۔ ایک بہو اپنے کسی یار کے ساتھ بھاگ گئی ہے...... اور یہ وہی ہے جس نے اپنی ساس پر الزام لگایا تھا۔ سارا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ ہیما نے اپنی زیادہ تر پراپرٹی بیچ دی ہے اور گورکھپور چلی گئی ہے۔''

ہم بظاہر تو باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے مگر اطراف پر ہماری گہری نظر تھی۔ ایک عجیب سی سنسنی بھی رگ و پے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اور انور خاں سب سے پیچھے تھے۔ اگر خدانخواستہ کسی طرح کی کوئی کارروائی ہوتی تو سب سے پہلے ہم ہی نشانہ بنتے۔ عقب سے قافلے کے تحفظ کی ذمے داری بھی ہم پر ہی تھی۔

دوپہر ایک بجے کے قریب ہم نے ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ ہمارے رکتے ہی ساتھ چلنے والے حکم کے دو ڈھائی سو اہلکار بھی رک گئے۔ ہم نے کھانا وغیرہ کھایا۔ چوہان نے اپنی اور

احمد کی مرہم پٹی کی۔ ہمیش کے ٹوٹے ہوئے بازو کی بھال بھی چوہان باقاعدگی سے کر رہا تھا۔ دیکھا جاتا تو ہم میں سے زیادہ تر زخمی تھے۔ اگر ڈاکٹر چوہان ساتھ نہ ہوتا تو ہماری حالت کافی ابتر ہوتی۔ اس لحاظ سے دیکھا جاتا تو ڈاکٹر چوہان اس قافلے کا اہم ترین بندہ تھا۔

ہمارا سفر گھنے جنگل کا تھا۔ کہیں کہیں راستہ زیادہ دشوار ہو جاتا تھا۔ ایسے میں تلوار بردار افراد آگے چلے جاتے تھے اور کہیں کہیں سے شاخوں کو کاٹ کر راستہ بناتے تھے۔ تلواریں ایک سرلائے کے ساتھ شاخوں سے ٹکراتیں۔ ایسے ہی سرلائے ہمارے اردگرد بھی سنائی دیتے۔ یہ پانڈے اور اس کے ساتھی ہوتے تھے جو ہماری ہی طرح راستہ بنانے کی کوشش کر رہے ہوتے تھے۔ جنگل میں شیشم، کیکر، جنتر اور کچنار کے درختوں کی بھرمار تھی اور جنگلی جانوروں کی دور افتادہ آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ ایک دو جگہ ایسے نشان بھی نظر آئے جن کے بارے میں کہا گیا کہ یہ تیندوے کے ہیں۔ ان نشانوں کی وجہ سے قافلے میں سنسنی کی لہر محسوس کی گئی۔

چلتے چلتے ایک جگہ ماریا کو اچانک ٹھوکر لگی۔ اس کی بائیں جانب چلنے والے شخص نے بے ساختہ اسے تھاما اور گرنے سے بچایا۔ یہ وہی پارسی تھا جو سات افراد کے ہمراہ جارج کی جیل سے رہا ہو کر آیا تھا۔ حالانکہ اس نے ماریا کی مدد کی تھی مگر ماریا نے اس پر ناک بھوں چڑھائی۔ شاید اسے کوفت ہوئی تھی کہ ایک نیچ کالے نے اسے چھوا ہے۔

''ہام سے دور رہو۔'' وہ چیخ کر بولی۔

''معافی چاہت ہوں میم جی۔'' پارسی گڑبڑا کر رہ گیا۔

''اب اس کو ہاتھ مت لگانا۔ چاہے گر کر اس کے تھوبڑے کا بھرتا بن جاوے۔'' اسحاق نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

ماریا اس رسی کی طرح تھی جو جل جاتی ہے لیکن اس کے بل نہیں جاتے۔ پچھلے چند دن میں وہ بہت خوار ہوئی تھی...... اس کے باوجود اس کی اکڑفوں برقرار تھی۔ اس کی نظروں سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ اپنے اردگرد کے لوگوں کو حقارت سے دیکھ رہی ہے...... غالباً نسلی تعصب بھی اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

ہمارا سفر جاری رہا۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ درختوں کی گھنی شاخوں سے سورج کی کرنیں چھن چھن کر آتی تھیں۔ کسی وقت ہلکی سی تمازت بھی محسوس ہونے لگتی تھی۔ ایک جگہ عجیب سا واقعہ ہوا۔ ہمیں اپنے اردگرد مختلف جنگلی جانوروں کی موجودگی کا احساس مسلسل ہو رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کم کم ہی دکھائی دیتے تھے۔ بس کسی وقت ہلکی سی جھلک نظر آ جاتی تھی۔

اردگرد کے درختوں پر بندر اور ان کے بچے بھی اچھلتے کودتے دکھائی دیتے تھے۔ ان کی باریک آوازیں جنگل میں دور تک گونجتی تھیں۔ ایک بڑے چھتنار درخت کے نیچے سے گزرتے ہوئے دفعتاً ایک جسیم بندر ماریا پر آن گرا۔ بالکل جیسے بجلی سی چمک جاتی ہے۔ بس اتنا ہی دکھائی دیا کہ اس نے ماریا کے ہاتھوں سے کوئی شے چھینی ہے...... پھر وہ جتنی تیزی سے آیا تھا، اتنی ہی تیزی سے واپس شاخوں پر چلا گیا۔ ماریا چلاتی ہوئی بائیں طرف ایک شخص پر گری۔ دونوں لڑھک کر ایک بارشی گڑھے میں چلے گئے۔ دو تین رائفلیں بندر کی طرف سیدھی ہوئیں مگر وہ زقند لگا کر شاخوں میں اوجھل ہو گیا۔ ماریا بدحواسی میں جس شخص سے ٹکرائی یہ وہی پارسی تھا جسے اس نے سہ پہر کے وقت برا بھلا کہا تھا۔ اب پارسی اوپر سے پھر پھسل کر میم صاحبہ کے اوپر جا گرا۔ اسحاق اور احمد نے اسے کھینچ کر اُٹھایا، پھر ماریا کو گڑھے سے باہر نکلنے میں مدد دی۔ پارسی ریان اور ماریا دونوں کیچڑ میں لت پت تھے۔

قافلہ رک گیا تھا۔ قافلے کے ساتھ ہی وہ دو ڈھائی سو افراد بھی رک گئے جن کی کمان پانڈے اور اسٹیل وغیرہ کے پاس تھی۔ پانڈے کے ایک ساتھی نے آگے آ کر استفسار کیا کہ کیا ہوا ہے۔ انور خاں نے اسے واقعے سے آگاہ کیا۔ ماریا کے چہرے اور لباس سے کیچڑ وغیرہ صاف کیا گیا۔ وہ اپنے گھر میں ہوتی تو شاید اس طرح سڑے ہوئے کیچڑ میں لتھڑ جانے کے بعد کئی گھنٹے واش روم کے اندر ہی گزارتی لیکن یہاں اسے بس ایک بالٹی پانی ہی میسر آ سکا۔ پارسی ریان کو اتنا بھی نہیں ملا۔ کچھ دیر بعد جب قافلہ پھر روانہ ہوا تو ہم نے اس شریر بندر کو دوبارہ دیکھا۔ وہ ایک شاہ بلوط کی بلند شاخوں پر بیٹھا بسکٹ کھا رہا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں بسکٹ کا ڈبا تھا۔ وہ ماریا سے یہی چھین کر لے گیا تھا۔ ماریا اب کچھ شرمندہ شرمندہ سی نظر آ رہی تھی۔ شاید اسے بھی احساس تھا کہ جس شخص کے صرف ہاتھ لگانے پر وہ برہم ہو گئی تھی، اس کے ساتھ اسے باقاعدہ بغل گیر ہونا پڑا تھا۔

میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''لگتا ہے میم جی اب کچھ شرما رہی ہے۔''

انور خاں نے گہری سانس لے کر بولا۔ ''ان گوری چمڑی والوں کو شرم کم ہی ہوتی ہے۔ ہاں، تم یہ کہہ سکتے ہو کہ شرمندہ ہو رہی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ان لوگوں کی مشینری میں وہ پرزے ہی نہیں ہوتے جن سے شرم آتی ہے یا غیرت شیرت جاگتی ہے۔''

ہم مدھم آواز میں باتیں کرتے چلتے رہے۔ باتیں کرتے ہوئے بھی انور خاں عقابی نظروں سے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی حیثیت ٹیم کے اس کپتان کی سی تھی جو ہمہ وقت فیلڈ پر گہری نظر رکھتا ہے اور ہر نقل و حرکت کو نوٹ کرتا ہے۔

رات کو درختوں کے درمیان ایک کشادہ جگہ پر ڈیرا ڈالا گیا۔ درختوں کی شاخوں سے لالٹینیں لٹکا دی گئیں۔ دو عارضی چولہے بنائے گئے۔ راستے میں شکار کیے گئے گوشت کو بھونا گیا۔ نہایت سنگین صورتِ حال کے باوجود اس قیام نے لطف دیا۔ جنگلی جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کی مداخلت سے محفوظ رہنے کے لئے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے الاؤ روشن کر دیئے گئے۔ کھانا کھانے کے بعد میں کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹا تو سر پر تاروں بھرا آسمان تھا۔ ایک دم مجھے باروندا جیکی پھر یاد آ گیا۔ وہ کہاں چلا گیا تھا؟ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ بھی اتنی جلدی کھو جائے گا۔ اس خطرناک جنگل میں وہ اکیلا کس طرح ''سروائیو'' کرے گا؟ یہ سوال ایک تیر کی طرح میرے سینے میں پیوست تھا۔

چند دنوں کے ساتھ میں جیکی نے مجھے بہت کچھ دیا تھا اور اس میں سب سے اہم، درد کے حوالے سے وہ فلسفہ تھا جس نے میرے دل کی گہرائی کو چھوا تھا۔ وہ درد کے ساتھ انوکھے طریقے سے نمٹنا جانتا تھا اور اس نے یہ جانکاری بڑے تفصیلی انداز میں مجھ تک پہنچائی تھی۔ مجھے لگا جیسے اس معاملے میں بھی عمران نے ہی میری مدد کی ہے۔ اگر مجھے جیکی میں اپنے بچھڑے یار کی جھلک نظر نہ آتی تو میں اسے کشتی سے اُٹھا کر کہاں لاتا...... اور اگر وہ نہ آتا تو پھر...... اس کی باتیں بھی وہیں کشتی میں اس کے ساتھ رہ جاتیں......

مجھے لگا کہ مجھ سے بچھڑنے کے باوجود عمران قدم قدم پر میری مدد کر رہا ہے۔ کبھی کسی ڈھنگ سے، کبھی کسی روپ میں...... وہ ہمہ وقت میرے ساتھ تھا۔ اس کی معنی خیز باتیں، اس کی جاں بخش مسکراہٹ، اس کی جادوئی جھپکی...... سب کچھ میرے ساتھ تھا اور پھر اس کی آواز، اس کا وہ انقلاب آفریں جملہ جس نے میری ناتوانیوں و نامرادیوں کی راکھ میں سے ایک نئے انسان کو وجود دیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ''مرنا تو میں بھی چاہتا ہوں لیکن میں اپنی موت کی ذمے داری خود پر لینا نہیں چاہتا۔ اس لئے خطرات سے ٹکراتا ہوں اور بدترین حالات کا پیچھا کرتا ہوں۔'' اور پھر اپنا پسندیدہ فقرہ دہرایا تھا۔ ''جو ڈرتا ہے تو مرتا ہے اور مرتا ہے تو ڈرتا کیا۔''

وہ رات خیریت سے گزری۔ ہم نے رات کو تین حصوں میں تقسیم کر کے باری باری پہرا دیا اور آرام بھی کیا۔ اگلی صبح اجالا ہونے کے ساتھ ہی ہم پھر روانہ ہو گئے۔ ہمارے روانہ ہوتے ہی ہمارے اردگرد موجود ڈھائی سو افراد بھی حرکت میں آ گئے۔ ہمیں پتا چلا تھا کہ گرد مودان ان لوگوں میں موجود نہیں تاہم پانڈے، اسٹیل اور موہن کمار وغیرہ ساتھ ہی ہیں۔ جارج کی جیل سے رہا ہونے والے قیدیوں میں حجام عبدالرحیم بھی تھا۔ آج وہ میرے اور انور خاں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ ہمیں زرگاں کی اس بدنام جیل کے بارے میں بتا رہا تھا۔

میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا۔ ''میں حکم کے ایک سپاہی کو استرا مارنے کے جرم میں پکڑا گیا تھا۔ میرے استرے سے وہ بری طرح گھائل ہوا تھا۔ وہ میرے پاس ایک مسلمان بوڑھے کو لایا تھا۔ اس بوڑھے پر حکم کا کوئی افسر ناراض تھا۔ سپاہی نے مجھ سے کہا کہ میں بوڑھے کی داڑھی اور سر کے بال مونڈ دوں۔ میں نے انکار کیا۔ وہ سخت غصے میں آ گیا۔ اس نے مجھے گالی دی۔ میں نے اس کی گردن پر استرا مارا اور بھاگ گیا۔ دو دن بعد مجھے نل پانی کے راستے میں پکڑ لیا گیا۔''

''کب سے جیل میں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''تین سال سے اوپر ہو گئے تھے جی۔ مگر ایسے لگت ہے کہ تین صدیاں بیت گئی ہیں۔ اس سے تو اچھا تھا کہ پھانسی ہی دے دیتے۔ وہاں جیل میں بڑی کڑی مشقت لی جاوت ہے۔ بات بے بات ذلیل کیا جاوت ہے۔ جارج صاحب کے ہرکارے مار مار کر کھال ادھیڑ دیوت ہیں یہ ہرکارے قیدی عورتوں پر بھی ہر طرح کا ظلم ڈھاوت ہیں۔ وہاں کوئی کسی کی فریاد سننے والا ناہیں۔'' عبدالرحیم نے اپنی قمیص اُٹھا کر پشت دکھائی۔ یہاں ہنٹر کی مار کے انمٹ نشان موجود تھے۔ جس طرح گھوڑوں کی پیٹھ کو داغا جاتا ہے اسی طرح عبدالرحیم کی پیٹھ کو بھی داغا گیا تھا...... یہ عبدالرحیم کا نمبر تھا......R88۔

عبدالرحیم، جارج کی جیل کے لرزہ خیز واقعات سناتا رہا۔ یوں لگتا تھا کہ اس جیل کے قیدیوں کی زندگی و موت کلی طور پر جارج اور اس کے اہلکاروں کے ہاتھ میں تھی۔ اگر زرگاں میں کہیں قانون کا تھوڑا بہت گزر ہے بھی...... تو اس جیل میں نہیں۔

سہ پہر تک حبس رہا لیکن پھر ایک دم بادل گھر کر آ گئے۔ شمالی افق پر ایک کالی سیاہ گھٹا نظر آئی۔ آثار سے ظاہر تھا کہ زبردست بارش شروع ہونے والی ہے۔ ہمیں تھوڑے ہی فاصلے پر ایک پرانی چوکی نظر آ رہی تھی۔ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی چوکیاں ہمیں جنگل میں کئی جگہ ملی تھیں۔ یہ دو تین کمروں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ ان کی دیواریں موٹی اور کھڑکیوں میں آہنی سلاخیں لگی تھیں۔ ان چوکیوں کی چھتیں لکڑی کی تھیں۔ وزنی شہتیر اور بالے وغیرہ کی۔ شہر میں اتنی مہنگی چھتیں ڈالنے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن یہ جنگل تھا، یہاں لکڑی کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اگر یہ لوگ چاہتے تو دیواریں بھی اسی قیمتی لکڑی کی بنا سکتے تھے۔ ان چوکیوں میں سے اکثر چھتیں گر چکی تھیں اور اندر خودرو گھاس اُگی ہوئی تھی، تاہم دو چار چوکیاں سلامت بھی نظر آئی تھیں۔

انور خاں نے بتایا تھا کہ دس پندرہ سال پہلے تک بھانڈیل اسٹیٹ کی حد ان چوکیوں

تک ہی تھی لیکن بعد میں اسٹیٹ کی حد بڑھالی گئی اور نئے بارڈر پر نئی چوکیاں بنالی گئیں۔ یہ پرانی چوکیاں بے کار ہو گئیں یا ان کو گودام وغیرہ کی شکل دے دی گئی۔

ہمیں کچھ فاصلے پر ایسی ہی ایک بوسیدہ چوکی نظر آ رہی تھی۔ انور خاں رک گیا۔ اس نے ساتھیوں کی طرف مشورہ طلب نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''ابھی پڑاؤ کا وقت تو نہیں ہے لیکن لگتا ہے کہ موسم خراب ہونے والا ہے۔ اگر ہمیں کھلے میں بارش نے گھیر لیا تو مصیبت ہو جائے گی۔ پانڈے اور اس کے ہرکاروں کے پاس تو چھولداریاں وغیرہ ہیں، ہم کیا کریں گے؟''

چوہان نے بھی افق پر پھیلتی ہوئی تاریکی کو دیکھا اور بولا۔ ''اس چوکی کو اندر سے دیکھ لیتے ہیں۔ اگر یہ رات گزارنے کے قابل ہے تو یہاں رک جاتے ہیں۔''

دیگر ساتھیوں نے بھی تائید کی۔ ہم نے چوکی کا اندر سے جائزہ لیا، چھتیں سلامت تھیں۔ جھاڑ جھنکاڑ موجود تھا لیکن اسے معمولی کوشش سے صاف کیا جا سکتا تھا۔ ہم نے رکنے کا فیصلہ کر لیا۔

...... ہمارا یہ فیصلہ درست ہی ثابت ہوا۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر بارش شروع ہو گئی۔ سہ پہر چار بجے کا وقت تھا لیکن اندھیرا چھا گیا۔ بجلی چمکنے لگی اور بادل دہاڑنے لگے۔ ہمارے ساتھ اسٹیل...... پانڈے اور ان کے ساتھیوں کو بھی رکنا پڑا تھا۔ موسم کے تیور دیکھتے ہوئے انہوں نے بڑی تیزی سے چھولداریاں اور خیمے وغیرہ لگائے تھے۔

جنگل کی بارش کا آہنگ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ گرد و پیش ایک تاریک دھند لکے میں چھپ جاتے ہیں اور آواز سے لگتا ہے کہ کہیں ایک بہت بڑا آبشار گر رہا ہے۔ چوکی کی چھت کہیں کہیں سے ٹپک رہی تھی، وہاں برتن رکھ دیئے گئے تا کہ زمین گیلی نہ ہو۔ کھڑکیاں مضبوطی سے بند کر دی گئیں۔ خنکی ایک دم ہی بڑھ گئی تھی۔ چوکی کے اندر سے ہی کاٹھ کباڑ جمع کر کے آگ روشن کر لی گئی۔ جانوروں کو چھت مہیا نہیں کی جا سکتی تھی لہٰذا ان پر سے سامان اُتار لیا گیا۔ پانڈے اور اس کے دو ڈھائی سو اہلکاروں نے چوکی کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

چوہان نے دونوں خچروں اور گھوڑے پر سے سامان اُتروایا۔ اس کی آواز آئی۔ ''انور خاں! صرف دو لالٹینیں ہیں۔ باقی دو لگتا ہے کہ راستے میں کہیں گر گئی ہیں۔''

''چلو جو ہیں انہیں تو روشن کراؤ۔'' انور خاں نے کہا۔

''ان میں سے بھی ایک میں بس تھوڑا سا تیل ہے۔ ایک دو گھنٹے ہی جلیں گی۔''

''ٹارچ وغیرہ سے کام چلا لیں گے۔'' انور نے تسلی دی۔

ماریا تھک کر چُور ہو گئی تھی...... اور سونا چاہتی تھی۔ چوہان نے اس کے زخمی ہاتھ کی پٹی بدلی اور ایک چھوٹے کمرے میں اس کے لئے چٹائی بچھا دی۔ حسبِ معمول اس کے پاؤں میں زنجیر ڈال کر تالا لگا دیا گیا۔ مزید احتیاط کے طور پر کمرے کو بھی باہر سے مقفل کر دیا گیا۔

چوکی میں داخل ہونے کا واحد راستہ سامنے کی طرف سے تھا۔ برآمدے میں چوکور ستونوں کی اوٹ میں دو رائفل برداروں کے بیٹھنے کے لئے جگہ بنی ہوئی تھی۔ ستونوں کے اندر باقاعدہ سوراخ تھے جن میں رائفل کو ''پوزیشن'' کیا جا سکتا تھا اور ارد گرد نگاہ بھی رکھی جا سکتی تھی۔ ایک مورچا انور نے اور دوسرا اسحاق نے سنبھال لیا۔ اپنے سفر کے اس آخری مرحلے میں ہم کسی طرح کی کوتاہی کرنا نہیں چاہتے تھے۔

بارش مسلسل جاری تھی۔ چوکی کے سامنے ایک چھوٹی سی آبی گزرگاہ بن گئی تھی جس میں تیز رفتار پانی بہہ رہا تھا۔ میرے اندر کی کیفیت پھر عجیب ہو رہی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ جیکی ہو، سینڈ بیگ ہو اور رات کا وہ آخری پہر ہو۔ میں جیکی کی ہدایت کے مطابق سینڈ بیگ پر ننگے ہاتھوں سے حملہ کروں اور اس وقت تک مکے برساتا رہوں جب تک میرے ہاتھوں کی کھال چھل نہ جائے اور خون میری کہنیوں تک نہ پہنچنے لگے۔ پتا نہیں کیوں اب دھیرے دھیرے جسمانی چوٹیں مجھے تکلیف کے ساتھ ساتھ مزہ بھی دینے لگی تھیں۔ کھانا کھانے کے بعد تھکاوٹ نے اثر دکھایا اور جلد ہی سب سو گئے۔ صرف وہ جاگتے رہے جنہیں شروع رات میں ڈیوٹی دینی تھی۔ یعنی انور خاں اور اسحاق۔

رات کسی وقت میری آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ ایک لالٹین بجھ چکی تھی۔ صرف ایک لالٹین کی مدھم روشنی جھلک دکھا رہی تھی۔ میں نے کسی کو اُٹھ کر دروازے کی طرف جاتے دیکھا۔ ''کون؟'' میں نے پوچھا۔

پارسی ریان کی مدھم آواز آئی۔ ''میں ہوں۔ پیشاب کرنے جاوت ہوں۔''

میں نے پھر سر تکیے سے ٹکا دیا...... اور سو گیا۔ دوبارہ آنکھ کھلنے کی وجہ، پاؤں میں اُٹھنے والی ٹیس تھی۔ شاید کسی کیڑے مکوڑے نے کاٹا تھا۔ میں نے اُٹھ کر پاؤں کو جھاڑا اور پھر لیٹ گیا۔ تب مجھے دوبارہ ایک سایہ حرکت کرتا دکھائی دیا۔ ''کون؟'' میں نے پھر استفسار کیا۔

یہ پارسی ریان ہی تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ گرم چادر لینے گیا تھا۔

بارش کے ساتھ اب تیز ہوا بھی چلنا شروع ہو گئی تھی۔ پانی کی بوچھاڑیں کھڑکیوں کے چوبی تختوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ موسم نے ایک دم کروٹ لے لی ہے اور ٹھنڈ شروع ہو گئی ہے۔ میں نے قریب لیٹے ڈاکٹر چوہان سے وقت پوچھا اور پھر سو گیا۔ ابھی

ہماری ڈیوٹی شروع ہونے میں قریباً دو گھنٹے باقی تھے۔

پتا نہیں کہ اس بار میں کتنی دیر سویا رہا۔ یکا یک مجھے لگا کہ چھت ایک دھماکے سے مجھ پر آن گری ہے اور ہر طرف قیامت برپا ہو گئی ہے۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ چھت تو اپنی جگہ موجود تھی لیکن اس کے علاوہ کچھ بھی اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ میں نے چوہان، احمد اور ہمیش کو چلاتے ہوئے سنا۔ وہ بدحواسی میں برآمدے کی طرف لپک رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ ایک بار زور سے بجلی چمکی۔ ایک سیکنڈ کے لئے تاریک جنگل روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گیا۔ برستی بارش میں میری نگاہ سب سے پہلے جس چیز پر پڑی، وہ ماریا تھی۔ وہ اندھا دھند چھولداریوں کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ اس کے جسم پر صرف شرٹ اور انڈر ویئر تھا۔ اس کی لمبی ٹانگیں تیزی سے حرکت کر رہی تھیں اور بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ میں نے یہ سارا منظر ایک سلاخ دار کھڑکی میں سے دیکھا۔

ایک سیکنڈ بعد سب کچھ تاریکی میں ڈوب گیا مگر تب تک میں اپنی انگلی رائفل کے ٹریگر تک پہنچا چکا تھا۔ میں نے ماریا کی رخ پر یکے بعد دیگرے چار فائر کئے۔ ان میں سے کم از کم ایک گولی ضرور ماریا کو لگی۔ چالیس پچاس فٹ کی دوری سے مجھے اس کے چلانے کی آواز آئی۔ چوکی کے دروازے کی طرف بھی زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ سارا جنگل دھماکوں اور للکاروں سے گونج رہا تھا۔ احمد پکار رہا تھا۔ ''انور بھائی! میں چھت پر جا رہا ہوں۔''

انور خاں نے اسحاق کو مخاطب کر کے بلند آواز میں کہا۔ ''اسحاق! کھڑکی کے پاس۔''

اسی دوران میں بجلی نے چمک کر پھر نشیب و فراز کو روشن کیا۔ مجھے ماریا کی فقط ایک جھلک نظر آئی۔ اسے کسی نے سہارا دے رکھا تھا۔ وہ تناور درختوں کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔ میں نے رائفل کو کھڑکی میں رکھ کر پھر دو تین فائر کیے۔ ایک برسٹ سلاخ دار کھڑکی کے بالکل پاس دیوار سے ٹکرایا۔ اَن گنت چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ مجھے ایک دم نیچے جھکنا پڑا۔

صورتِ حال بڑی نازک ہو گئی تھی۔ وہ کام ہو گیا تھا جسے بدترین کہا جا سکتا تھا۔ ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ کیسے نکلی تھی؟ کس وجہ سے نکلی تھی؟ یہ سب کچھ سوچنے کا وقت نہیں تھا...... فی الحال تو ہم مسلح افراد کے گھیرے میں تھے اور اگلے چند منٹ میں ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

میں جھک کر چلتا ہوا دوسری کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں انور خاں کی ہدایت کے مطابق اسحاق موجود تھا اور مسلسل فائر کر رہا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ شریک ہو گیا۔ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ میں اس طرح مورچا بند ہو کر کسی لڑائی میں حصہ لے رہا تھا...... ٹریگر پر

انگلی کو حرکت دینا، رائفل کے جھٹکے کو برداشت کرنا، مخالف سمت سے آنے والی گولی کے خطرے کو محسوس کرنا...... یہ سب کچھ میرے لئے نیا تھا۔

قریباً سات آٹھ منٹ تک زوردار فائرنگ ہوئی۔ پھر ایک دم یہ سلسلہ ٹھہر گیا۔ غالباً ہمارے مخالفین کوئی حکمتِ عملی سوچ رہے تھے۔ وہ ہمیں مارنے یا زندہ پکڑنے کی بہترین پوزیشن میں تھے اور...... غالباً...... انہیں کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ وہ کس طرح کم سے کم جانی نقصان کرا کے ہمیں بے بس کر سکتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں ہمیں بس ایک معمولی سا فائدہ حاصل تھا اور وہ یہ کہ ہمارے مخالفین کھلی جگہ پر تھے جبکہ ہم اس چوکی میں مورچا بند تھے لیکن یہ مورچا بندی ایک طرح سے نقصان دہ بھی تھی۔ یہ عمارت ہمارے لئے چوہے دان بن سکتی تھی۔ اگر یہ دو ڈھائی سو افراد ہم تیرہ چودہ بندوں کو مارنے پر ہی تل جاتے تو پھر وہ اس چوکی کو راکھ کا ڈھیر بنا سکتے تھے۔

''یہ ہوا کیسے؟'' میں نے لرزتی آواز میں اسحاق سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ...... اس حرامی کتے کی وجہ سے۔'' اسحاق نے کہا اور بڑی ٹارچ کا روشن دائرہ سلاخ دار کھڑکی سے باہر پھینکا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ کھڑکی سے تیس چالیس فٹ کی دوری پر ایک لاش اوندھی پڑی نظر آئی۔ یقیناً یہ پارسی ریان کی لاش تھی۔ میں نے اسے اس کے کپڑوں سے پہچانا۔

یہ کیا ہوا؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''یہ اس حرامزادی کے ساتھ ہی بھاگ رہا تھا۔ انور بھائی نے اسے گولی ماری ہے۔''

''لیکن...... لیکن وہ تو دوسری طرف بھاگی ہے......؟''

''ہاں، یہ اس طرف آیا تھا...... وہ چھولداریوں کی طرف گئی تھی......''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا یار...... وہ تو تالے میں تھی۔ اس کے پاؤں میں بھی زنجیر تھی......؟''

''تالے کھولنے والا یہ کتا بھی تو ہمارے ساتھ ہی تھا۔'' اسحاق نے نفرت سے کہا اور ٹارچ کی روشنی ایک بار پھر ریان کی لاش کی طرف پھینکی۔

میرا جسم سنسنا کر رہ گیا۔ جب یہ ساتوں قیدی جارج کی جیل سے رہا ہو کر سرنگ میں آئے تھے تو انور خاں نے ان سب کا تعارف کرایا تھا۔ پارسی ریان کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ یہ ایک ماہر قفل ساز ہے۔ اب صورتِ حال کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہ سانحہ اس پارسی ریان کی وجہ سے ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ آج رات میں نے دو بار اس کی مشکوک نقل و

حرکت بھی دیکھی تھی لیکن سوال یہ تھا کہ ریان نے ایسا کیا کیوں؟

میں نے یہی بات اسحاق سے پوچھی تو وہ ایک طرف تھوک کر بولا۔ ''ابھی ٹھیک سے تو پتا نا ہیں...... لیکن لگت ہے کہ اس کو روٹی گوشت کی خماری چڑھی ہے۔''

''روٹی گوشت کی خماری؟''

''ہاں، تین سال سے کنجر جیل میں پڑا ہوا تھا۔ اب پیٹ بھر کر کھانا ملا...... عورت دیکھی تو حرامی کے اندر کا جنگلی سور جاگ پڑا۔''

میں ٹپٹا کر رہ گیا۔ اب بات پوری طرح میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ اگلے دو چار منٹ میں سب کچھ کھل گیا کہ کیا ہوا ہے۔

اسحاق کے کہنے پر میں اس چھوٹے کمرے کی طرف گیا جہاں ماریا کو حفاظت کی غرض سے بند کیا گیا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا، کمرے کے دروازے کا آہنی قفل کھلا ہوا تھا۔ اندر وہ زنجیر بھی کھلی پڑی تھی جو رات کے وقت ماریا کے پاؤں میں ڈالی جاتی تھی۔ زنجیر کے چھوٹے لاک کو بھی ایک آہنی تار کے ذریعے کھولا گیا تھا۔ چٹائی پر ماریا کی نیلی جینز پڑی تھی اور بالائی جسم کا زیر جامہ پڑا تھا۔ کمرے کا یہ نقشہ وہ ساری کہانی سنا رہا تھا جو یہاں گہری تاریکی میں وقوع پذیر ہوئی تھی۔

اسی دوران میں انور خاں بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے تیزی سے موقع کا جائزہ لیا اور یقیناً اسے بھی وہ سب کچھ سمجھ میں آ گیا جو مجھے آیا تھا۔ اس نے کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کو ٹھوکر ماری اور ریان کو غائبانہ صلواتیں سنائیں۔ میں نے انور خاں کو بتایا کہ رات پہلے پہر کس طرح ریان پیشاب کرنے اور چادر لینے کے بہانے حرکت کرتا نظر آیا تھا۔

انور خاں بولا۔ ''خبیث نے سب کچھ پلاننگ کے ساتھ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کل شام جو دو لالٹینیں گم ہوئی تھیں، وہ بھی اسی نے کہیں گرائی ہوں گی...... یا آس پاس کہیں چھپا دی ہوں گی۔''

یقیناً یہاں جو کچھ ہوا تھا، ماریا اور ریان کی باہمی انڈر اسٹینڈنگ سے ہوا تھا۔ انور خاں نے پرسوں جو الفاظ کہے تھے وہ میرے کانوں میں گونج گئے۔ اس نے کہا تھا...... ان گوری چمڑی والوں میں شرم کم ہی ہوتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ان لوگوں کی مشینری میں وہ پرزے ہی نہیں ہوتے جن سے شرم آتی ہے......

تو کیا یہاں بھی اسی انتہا درجے کی ''بے شرمی'' نے کام دکھایا تھا؟ آزادی حاصل کرنے کے لئے ماریا نے اپنا آپ اس شخص کے حوالے کر دیا تھا جس کے ساتھ چھو جانا بھی اسے کل

تک گوارا نہیں تھا۔ یقیناً ایسا ہی ہوا تھا۔ پارسی ریان نے یہاں سے نکلنے میں ماریا فرگوسن کی مدد کی تھی، تاہم اس مدد کی بھرپور قیمت بھی وصول کی تھی۔ عین ممکن تھا کہ ماریا کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے اس وقت تک ماریا کے پاؤں ہی نہ کھولے ہوں جب تک اپنا مطلب پورا نہ کر لیا ہو۔ وہ ماسٹر قفل ساز و قفل شکن تھا اور اس نے جو دو ''آخری قفل'' کھولے تھے، انہوں نے اس پر مسرت کا در وا کیا تھا اور موت کا بھی۔

انور خاں کے ایک کان سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی پوری سائیڈ نیلی ہو رہی تھی۔ ''یہ کیا ہوا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''جس وقت ماریا یہاں سے بھاگی، اس کے ہاتھ میں پختہ اینٹ تھی۔ اسحاق سو گیا تھا لیکن میں جاگ رہا تھا لیکن میری ساری توجہ بھی باہر کی طرف تھی۔ یہ گمان ہی نہیں تھا کہ اندر سے بھی کوئی خطرہ ہو سکتا ہے۔'' انور نے کان کا خون پونچھتے ہوئے کہا۔

یہی وقت تھا جب اوپر تلے دو فائر ہوئے اور پھر ایک برسٹ چلا۔ قریبی سیڑھیوں سے کوئی لڑھکتا ہوا نیچے آیا اور عین انور خاں کے قدموں میں گرا۔ یہ احمد تھا جس نے تھوڑی دیر پہلے چھت پر پوزیشن سنبھالی تھی۔ اس کا کندھا خون سے سرخ نظر آ رہا تھا۔ یہ وہی بازو تھا جس پر پانچ دن پہلے دوطرفہ فائرنگ میں اسے کارتوس کا موٹا چھرا لگا تھا۔

میں نے احمد کو سنبھالا، انور خاں دوڑتا ہوا اپنی پوزیشن پر واپس پہنچ گیا اور جوابی فائرنگ کرنے لگا۔ ایک بار پھر اندھا دھند گولیاں چلنے لگیں۔ دھماکوں سے قرب و جوار گونج رہے تھے، ہر طرف شعلوں کا رقص تھا۔ میں، چوہان اور اسحاق بھی پوری توانائی سے اس جوابی فائرنگ میں شریک ہو گئے۔ مخالف فریق کا پلڑا واضح طور پر بھاری تھا۔ ہماری ایک گولی کے جواب میں درجنوں گولیاں آ رہی تھیں۔

انور خاں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ ورنہ مارے جائیں گے۔''

''لیکن انہوں نے گھیرا ڈالا ہوا ہے۔'' چوہان کی ہانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''گھیرا توڑ کر نکلنا ہوگا۔ ورنہ کچھ نہیں ہو سکے گا۔'' انور خاں کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

''ہاں، تخت یا تختہ اگر کچھ نا ہیں کریں گے تو بے موت مارے جاویں گے۔'' اسحاق نے اپنی رائفل سے ایک طویل برسٹ چلاتے ہوئے کہا۔

میں نے دھیان سے دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ اسحاق کے قدموں میں ایک بندے کی لاش پڑی تھی۔ یہ ان ساتوں افراد میں سے ایک تھا جو جیل سے رہا ہوئے تھے۔ یقیناً اسے دوطرفہ

فائرنگ میں گولی لگی تھی۔ یہ واقعی نازک ترین گھڑیاں تھیں۔ ماریا کو اپنے ہاتھ سے کھونے کے بعد ہم ایک دم موت کے منہ میں آ گئے تھے۔ یہاں رہتے تو موت تھی، باہر نکلتے تو بھی موت تھی۔ بچ نکلنے کے امکانات بہت کم تھے۔

تو کیا آخری وقت آ گیا ہے؟ میں نے بے حد درد سے سوچا۔ اس بارشی رات میں، اس گھنے جنگل کے کسی نامعلوم حصے میں...... ان تابڑ توڑ برستی گولیوں کے درمیان میری زندگی کا خاتمہ ہونے والا ہے؟ کیا کبھی میرے پیاروں کو معلوم ہو سکے گا کہ میں کہاں اور کس حالت میں موت کے سفر پر روانہ ہوا تھا؟ کیا کبھی کوئی میرے آخری لمحوں کے بارے میں جان سکے گا؟ چند لمحوں کے لئے...... صرف چند لمحوں کے لئے میرے اندر مایوسی اور ناتوانی اُبھری لیکن پھر فوراً ہی عمران کا تصور اندھیرے سے برآمد ہوا اور مسکراتا ہوا میرے سامنے آن کھڑا ہوا، اس کی شبیہہ ان لمحوں میں بالکل واضح اور روشن تھی۔ اس پر حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے رخساروں کی اُبھری ہوئی دلکش ہڈیاں، اس کی ٹھوڑی کا گڑھا، اس کے چمکتے ہوئے ہموار دانت، اس نے آگے بڑھ کر میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور مخمور لہجے میں بولا۔ ''آنکھیں بند کر کے کود جاؤ جگر...... زیادہ سے زیادہ موت ہی ملے گی نا اور موت تو ہماری محبوبہ ہے۔ وہ ہمارے آگے آگے بھاگتی ہے۔ ہم نے اس کے پیچھے بھاگنا سیکھ لیا ہے......''

میرے رگ و پے میں نئی توانائی سی بھر گئی۔ میں نے وہ سارے لمحے یاد کئے جن میں، میں نے دل کی گہرائی سے خودکشی کا سوچا تھا...... یہاں جو کچھ بھی ہونے والا تھا، خودکشی سے تو بہتر ہی تھا۔

انور خاں اپنے ساتھیوں کو آخری ہدایات دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف آمیز دلیری تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جو کچھ وہ کرنے جا رہا ہے، اس کی زندگی کے امکانات بہت کم ہیں...... لیکن اب اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اسحاق نے ایک جھٹکے سے دستی بموں والا وہ تھیلا کھول دیا جو اب تک ہمارے سامان کا حصہ رہا تھا۔ انور خاں نے دو دستی بم اپنی واسکٹ کی جیبوں میں ٹھونس لئے، ایک ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دیگر ساتھیوں نے بھی ایک ایک، دو دو بم لے لئے۔ یہ عام دستی بموں کی طرح گول بم نہیں تھے، ان کی شکل لمبوتری تھی۔ یہ پرانی طرز کے لیکن بڑے طاقتور بم تھے۔ ان کی شکل ''آئس کریم کون'' سے ملتی جلتی تھی۔ انور خاں نے بتایا تھا کہ انہیں ''اسٹک بم'' کہا جاتا ہے...... چند روز پہلے انور خاں مجھے یہ بم استعمال کرنے کا طریقہ تفصیل سے بتا چکا تھا لیکن اس حوالے سے میری عملی مشق صفر تھی۔ بہرطور ایک دستی بم میں نے بھی لے لیا۔

انور خاں نے آخری ہدایات دیتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ ہے تم سب کے سامنے ہے۔ ہم بری طرح گھر چکے ہیں، جتنی دیر کریں گے اتنا ہی مزید پھنستے جائیں گے۔ ہم خود کو بچانے کی آخری کوشش کرتے ہیں۔ ہم چوکی کے عقبی دروازے کو ایک دم کھول کر نکلیں گے۔ سب سے آگے میں رہوں گا۔ ہم پوری رفتار سے دوڑیں گے اور گھنے درختوں میں روپوش ہونے کی کوشش کریں گے۔ یہ بات ہمارے حق میں جاتی ہے کہ اس وقت ان لوگوں کے پاس بوگیر کتے نہیں ہیں۔''

اسحاق بولا۔ ''ہو سکتا ہے کہ ہم ایک دوجے سے بچھڑ جاویں۔ کوئی ایسی جگہ ٹھہرا لو، جہاں ہم اکٹھے ہو سکیں۔''

''میرے ذہن میں ایسی کوئی جگہ نہیں۔'' انور نے فوراً جواب دیا۔ ''جو ساتھیوں سے علیحدہ ہو جائے، وہ اپنے طور پر جان بچانے کی کوشش کرے......''

ابھی انور خاں کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ گولیوں کی ایک باڑ آئی اور فرش پر رکھے ہوئے کھانے پینے کے برتن بھنے ہوئے چنوں کی طرح اچھل اچھل کر چاروں طرف بکھر گئے......

ہمارا گھوڑا اندھا دھند بھاگتا ہوا برآمدے میں گھسا۔ پورے زور سے کمرے کی دیوار سے ٹکرایا اور پھر گر کر تڑپنے لگا۔ اسے گولی لگ چکی تھی۔

''لگتا ہے کہ وہ لوگ قریب آ رہے ہیں۔'' ہمیش نے کہا۔

انور خاں نے کھڑکی کے ساتھ لگ کر اسنائپر گن سے دو فائر کئے اور بولا۔ ''اب دیر نہیں کرنی چاہئے۔''

ہم سب جھک کر دوڑتے ہوئے چوکی کے عقبی حصے میں پہنچے۔ یہاں ایک چھپر سا تھا جسے گولیوں کی بوچھاڑ سے آگ لگ گئی تھی۔ بارش کے سبب یہ آگ زیادہ پھیل نہیں پائی تھی۔ ہم عقبی دروازے کے ساتھ لگ گئے۔ انور خاں سب سے آگے تھا۔ موت کو خوش آمدید کہنے کے لئے اس کا سینہ تنا ہوا تھا۔ اس کے عقب میں اسحاق تھا۔ پھر چوہان، پھر زخمی احمد، پھر میں اور آخر میں ہمیش۔ رہا ہونے والے قیدیوں میں سے فقط چار ہمارے ساتھ آ سکے تھے۔ وہ چاروں ہماری قطار کے دائیں جانب تھے۔ یہ سائیڈ قدرے محفوظ تھی۔ عبدالرحیم بھی ان چاروں میں شامل تھا۔

''بس دوڑنا ہے۔ رکنے کا مطلب موت کے سوا اور کچھ نہیں۔'' انور نے آخری ہدایت دی اور دروازے کی کنڈی پر ہاتھ رکھ دیا۔

گولیاں مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔ خصوصاً سامنے والے حصے کی طرف فائرنگ کا

زیادہ زور تھا۔ ہم نے الوداعی نظروں سے ایک دوجے کو دیکھا۔ انور خاں نے اپنے ہاتھ والے دستی بم کی پن دانتوں سے کھینچ کر نکالی اور ٹانگ مار کر دروازہ کھول دیا۔

''بھاگو۔'' انور خاں کی آخری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

ہم اندھا دھند نکلے۔ بارش کی بوچھاڑیں اور درختوں کی شاخیں ہمارے چہروں سے ٹکرائیں۔ ہم نے اپنی رائفلوں کے منہ کھول دیئے اور جھک کر بھاگتے چلے گئے۔ سب سے پہلے انور خاں کے پھینکے ہوئے دستی بم کا دھماکا ہی سنائی دیا تھا۔ چکاچوند پیدا کرنے والے اس زوردار دھماکے نے ہر طرف سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ پھر کئی اور دھماکے ہوئے۔ ہم ان دھماکوں کا نتیجہ دیکھنے کے لئے رکے نہیں، بس شاخوں سے ٹکراتے دوڑتے چلے گئے۔ احمد میرے آگے دوڑ رہا تھا۔ بائیں جانب سے ایک برسٹ آیا...... جو اسے چھلنی کر گیا۔ وہ اچھل کر کانٹے دار جھاڑیوں میں گرا اور ہمیشہ کے لئے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اتنی مہلت نہیں تھی کہ اسے مڑ کر دیکھا بھی جا سکتا۔ اس برستی موت کا دوسرا شکار ہمیش تھا۔ وہ میرے عین پیچھے تھا۔ مجھے تو یہی لگا کہ اس نے میری طرف آنے والی موت اپنے جسم پر روکی ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ جب گولی جسم سے ٹکراتی ہے اور گوشت میں گھستی ہے تو اس سے ایک خاص آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس رات پہلی بار میں نے اپنے عین عقب میں یہ آواز سنی۔ ایک کراہ کے ساتھ وہ اوندھے منہ گرا۔ غالباً گرنے سے پہلے وہ اپنے دستی بم کی سیفٹی پن ہٹا چکا تھا۔ اس کے گرنے کے تین چار سیکنڈ بعد ہی عین اس جگہ پر ساعت شکن دھماکا ہوا۔ اس دھماکے سے پیدا ہونے والا ایئر پریشر مجھے اپنے پورے جسم پر محسوس ہوا تھا۔ میری خوش بختی کہ بم کا کوئی ٹکڑا مجھے نہیں لگا اور میں بالکل محفوظ رہا۔ کئی گولیاں سنسناتی ہوئی میرے قریب سے گزریں۔ ایک جگہ میں اوندھے منہ گرا۔ ایک جگہ بری طرح ایک درخت سے ٹکرایا...... لیکن رکا نہیں، بھاگتا چلا گیا۔ میں نے دونوں ہاتھ مضبوطی سے ٹرپل ٹو رائفل پر جما رکھے تھے۔ بھاگتے بھاگتے ہی میں نے رائفل سے دوسرا میگزین اٹیچ کر لیا اور اطراف میں فائر کرتا رہا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ میرے پاس دستی بم بھی تھا لیکن بھاگ دوڑ میں وہ دستی بم کہیں گر گیا تھا۔ کہاں گرا تھا، یہ سوچنے کی مہلت نہیں تھی۔

بھاگتے ہوئے مجھے اپنے سامنے صرف چوہان نظر آ رہا تھا اور پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ چوہان اور انور خاں کے سوا کوئی زندہ نہیں بچا۔

فائرنگ کا زور اب ہماری بائیں جانب قریباً دو سو میٹر کی دوری پر تھا...... مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ ہم موت کی زد سے اگر نکلے نہیں...... تو کم از کم دور ضرور چلے گئے ہیں۔

''گھاٹی کے ساتھ ساتھ بھاگو۔'' انور خاں نے پکار کر کہا اور اس کے ساتھ ہی تیزی سے دائیں طرف مڑ گیا۔

اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اس کی یہ واقفیت ہمیں ایک یقینی موت کے چنگل سے نکال سکتی ہے۔

''تم ٹھیک ہو تابش!'' چوہان نے بھاگتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے بھی ہانپی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''اور ہمیش؟''

میں چپ رہا۔ چوہان سمجھ گیا کہ میرا جواب کیا ہے۔

پھر مجھے عبدالرحیم اور اس کا ایک ساتھی نظر آیا۔ وہ دونوں دائیں طرف تھے اور ہمارے متوازی ہی بھاگ رہے تھے۔

ہم قریباً بیس منٹ تک انور خاں کے پیچھے پیچھے بھاگے۔ ہماری ٹانگیں بے جان ہو چکی تھیں لیکن زندہ رہنے کی فطری خواہش ہمیں بھگائے چلی جا رہی تھی۔ یہ گھنا جنگل تھا، تاریکی تھی اور ہلکی بارش بھی...... اس لئے ہماری یہ میراتھن دوڑ عجیب طرح کی تھی۔ درختوں سے ٹکرانا، پھسل کر گرنا اور گر کر اُٹھنا...... یہ سب، کچھ ہماری دوڑ میں شامل تھا۔ ایک بڑی ٹارچ ہمارے پاس موجود تھی لیکن ہم اسے روشن نہیں کر سکتے تھے۔ قریباً بیس منٹ بعد ہم نے ایک آبی گزرگاہ کو پار کیا۔ پانی ہمارے سینے تک پہنچ رہا تھا۔ ہم نے اپنی گولیوں والی بیلٹس گردنوں سے لپیٹ لیں اور رائفلیں سروں سے بلند کر لیں۔ آبی گزرگاہ کو پار کرتے ہوئے مجھے پتا چلا کہ اسحاق بھی زخمی حالت میں ہمارے ساتھ ہے۔ چوکی سے نکلتے وقت ہم کل دس افراد تھے...... لیکن اب صرف چھ نظر آ رہے تھے۔ چار مزید ساتھی گھیرا توڑنے کی کوشش میں لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ ان میں سے احمد...... ہمیش اور عبدالرحیم کے ایک ساتھی کی موت تو یقینی تھی۔ عبدالرحیم کا ایک ساتھی بری طرح گھائل ہو کر گرا تھا اور شاید اسی حالت میں پکڑا گیا تھا۔ رہا ہونے والے قیدیوں میں سے ایک کی لاش تو ہم نے خود چوکی میں دیکھی تھی، دوسرے کے بارے میں بھی غالب امکان یہی تھا کہ وہ چوکی میں ہونے والی اندھا دھند فائرنگ کا شکار ہوا۔

آبی گزرگاہ کو پار کرنے کے بعد ہم نے قدرے ''ریلیف'' محسوس کیا۔ ہم اس قدر ہانپ گئے تھے کہ چند منٹ کے لئے ستانا ضروری ہو گیا تھا۔ ہم ایک جگہ، گیلی زمین پر درختوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ''ہمیش کا کیا بنا؟'' اسحاق نے پوچھا۔

"اسے گولی لگ گئی تھی۔" میں نے دل گرفتہ لہجے میں جواب دیا۔

عبدالرحیم روتے ہوئے بولا۔ "آپ لوگن نے ہمارے ساتھ کیا کیا...... اور ہم لوگن نے آپ کو کتنی بڑی مصیبت میں ڈال دیا۔ یہ سب کچھ اس بدبخت ریان کی وجہ سے ہوا۔ کاش! ہم اسے اپنے ہاتھ سے مار دیتے۔"

ورا اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے بولا۔ "جو ہو چکا اس کا ماتم کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اب اپنا سارا دھیان یہاں سے نکلنے کی طرف لگاؤ۔ ہم خطرے سے باہر نہیں۔ وہ لوگ بہت زیادہ تعداد میں ہیں۔ کسی بھی وقت ہم تک پہنچ سکتے ہیں۔"

ہم ایک بار پھر اُٹھ کھڑے ہوئے اور گرتے پڑتے آگے بڑھنے لگے۔ اپنے بچھڑ جانے والے ساتھیوں کا غم تازہ تازہ تھا اور دل میں ٹیسیں ابھار رہا تھا۔ جیسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ صرف بیس تیس منٹ پہلے ہمارے ساتھ چوکی سے نکلنے والے لوگ اب ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ کل رات تک ہم چوکی میں ماریا کے علاوہ کل تیرہ افراد تھے...... اب صرف چھ بچے تھے۔

ہم صبح سات آٹھ بجے تک مسلسل چلتے رہے۔ آخر تھک کر چُور ہو گئے۔ یوں لگا کہ اب چند قدم اُٹھانا بھی ممکن نہیں ہے۔ خاص طور سے زخمی چوہان سخت تکلیف میں تھا۔ اس کی رائفل انور خاں نے اور گولیوں والا تھیلا میں نے اُٹھا رکھا تھا۔ نہایت گھنے اور لمبے سرکنڈوں کے درمیان یہ عارضی طور پر چھپنے کے لئے ایک مناسب جگہ تھی۔ حشرات الارض بشمول سانپوں وغیرہ کا ڈر تو تھا مگر جو حالات ہمارا تعاقب کر رہے تھے، وہ ان سے زیادہ خطرناک تھے۔

یہ بالکل سنسان جگہ تھی۔ ایک طرف ایک بہت بڑا بارشی جوہڑ تھا جس پر کائی جمی ہوئی تھی۔ جوں جوں دھوپ تیز ہوتی گئی، اس جوہڑ سے اُٹھنے والی بو باس بڑھتی گئی۔ جونکیں...... کیچوے...... کیڑے مکوڑے بہت کچھ پودوں میں رینگ رہا تھا اور ہمارے جسموں پر بھی۔

دوپہر تک ہمیں محسوس ہونے لگا جیسے ہم اپنا تعاقب کرنے والوں کو جُل دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ہمیں اپنے اردگرد تک کوئی حرکت نظر نہیں آ رہی تھی۔

اسحاق نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ "یوں لگت ہے کہ وہ لوگن پانی کی دوجی طرف رہ گئے ہیں...... ناہیں تو اب تلک کوئی ہلچل ضرور نظر آتی۔"

"پھر بھی ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا...... اگلے ایک دو گھنٹے میں ہی کچھ اندازہ ہو سکے گا۔" انور خاں نے کہا۔

وقت گزرتا رہا اور شام تک ہم خود کو کافی مطمئن محسوس کرنے لگے لیکن جلد ہی یہ اطمینان ایک بار پھر تشویش میں ڈھل گیا۔ ہمیں کچھ فاصلے سے فائر کی آواز سنائی دی۔ اس فائر سے کم از کم اتنا ضرور ثابت ہو گیا کہ ہمارے آس پاس کوئی موجود ہے۔ "وہ لوگن اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے ناہیں آ۔" اسحاق نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا اور اپنی رائفل کے ساتھ نیا میگزین اٹیچ کرنے میں مصروف ہو گیا۔

چوہان نے بھی اپنی رائفل انور خاں سے لے لی اور ٹیلی اسکوپ گلے میں لٹکا لی۔ چند گھنٹے کے وقفے کے بعد ایک بار پھر تناؤ پیدا ہو گیا تھا اور بڑھتا جا رہا تھا۔ شام کے سائے طویل ہوتے ہوتے تاریکی میں بدل گئے اور سرکنڈوں میں لاتعداد جھینگروں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ مجھے دیر سے پیشاب کی حاجت محسوس ہو رہی تھی۔ تاریکی پھیلنے کے بعد میں جوہڑ کے کنارے کی طرف گیا۔ اچانک مدھم آوازوں نے میرے قدم پکڑ لئے۔ یہ اسحاق کی آواز تھی اور اس کے ساتھ ڈاکٹر چوہان تھا۔ اسحاق کہہ رہا تھا۔ "...... یہ بات ناہیں کہ اس کے ساتھ ہمدردی ناہیں ہے۔ وہ ہمارا ساتھی ہے...... لیکن اس کا ساتھ ہمارے لئے مصیبت کھڑی کرے گا...... اور بہت بڑی مصیبت کھڑی کرے گا......" آخری الفاظ کہتے کہتے اسحاق کی آواز قدرے بلند ہو گئی۔

"آہستہ بولو۔" چوہان نے اسے تنبیہ کی۔

اسحاق نے اپنی آواز تھوڑی سی مدھم کر لی لیکن لہجہ ویسا ہی تشویش ناک رہا۔ "چوہان بھائی! میں تم سے اس بحث میں ناہیں پڑتا کہ تابش پر کوئی جادو ٹونے کا معاملہ ہے یا اس کے شریر (جسم) میں کوئی پرزہ وغیرہ لگایا گیا ہے...... لیکن جو کچھ بھی ہے، ہمارے لئے ہے خطرناک۔ یہ جہاں بھی جائے گا، وہ لوگن اس کا پیچھا کریں گے...... اور اس کے ساتھ...... ہم بھی......" اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"تو کیا تم وشواس سے کہہ سکتے ہو کہ یہ ہمارے ساتھ نہیں ہو گا تو ہم بچ جائیں گے؟" چوہان کی سرگوشی اُبھری۔

"چلو ناہیں بچیں گے...... لیکن کچھ ہاتھ پاؤں چلانے کا موقع تو ملے گا نا۔"

میں بغیر آواز پیدا کئے آگے بڑھ گیا اور جوہڑ کی طرف چلا گیا۔ میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔

بے شک اسحاق جذباتی اور شعلہ مزاج تھا...... لیکن جو بات وہ کئی دن سے مسلسل کہہ رہا تھا، وہ ٹھیک تھی...... اور یقیناً یہ بات اسحاق کے علاوہ اور کئی ساتھیوں کے دل میں موجود ہو

گی۔ میں آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں تھا۔ ایک نادیدہ بندش نے مجھے جکڑا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ سمجھتے تھے کہ یہ بندش کسی جادو ٹونے کی شکل میں ہے لیکن اب یہ حقیقت سامنے آئی تھی کہ اسٹیٹ کے کچھ اہم قیدیوں کی طرح میرے جسم میں بھی کوئی ایسی چیز رکھی گئی ہے جو میری Where Abouts کے بارے میں میرے دشمنوں کو آگاہ رکھتی ہے۔

اسحاق کی یہ بات بالکل درست تھی کہ یہاں سے راہِ فرار اختیار کرنے کے معاملے میں، مَیں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ میری موجودگی میرے ساتھیوں کے لئے ہر راستہ بند کر سکتی تھی۔ تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟ مَیں نے بڑی تیزی سے سوچا۔

اب میرے دل سے اس بات کی گواہی آنا شروع ہو گئی تھی کہ شاید میں اس منحوس جنگل کے حصار سے کبھی نکل نہیں سکوں گا...... اور اگر...... مجھے یہیں پر مرنا تھا تو پھر میں اپنے ساتھ دوسروں کی زندگیوں کے لئے خطرہ کیوں بنوں؟

کیوں نا میں اپنا اخلاقی فرض ادا کروں۔ اپنے ساتھیوں کو کسی امتحان میں ڈالے بغیر خاموشی سے اکیلا ہی کسی طرف نکل جاؤں۔ جب مرنا ہی ٹھہرا تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ اکیلا مرا جائے یا باجماعت......!

میں مردار کی بو والے کائی زدہ جوہڑ کے کنارے کھڑا تھا۔ میری رائفل، ایک چھوٹی ٹارچ، گولیوں والا بیگ اور ایک شکاری چاقو میرے پاس موجود تھے۔ اس کے علاوہ اور کیا چیز مجھے درکار تھی...... اس کے علاوہ ہمارے پاس کچھ اور تھا ہی نہیں۔

میں نے چند لمحے تک سوچا، پھر وہیں سے گہری تاریکی میں آگے بڑھ گیا۔

مجھے کیا کرنا ہے؟ کہاں جانا ہے؟ کچھ بھی میرے ذہن میں نہیں تھا۔ بس ایک یہی سوچ تھی کہ میں یہاں سے آگے بڑھ جاؤں۔ اپنے ساتھیوں اور اپنے درمیان زیادہ سے زیادہ فاصلہ پیدا کرلوں۔ پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ موت ملی تو اسے گلے سے لگالوں گا...... زندگی ملی تو اس سے بھی نمٹ لوں گا۔ عمران نے یہی تو سکھایا تھا مجھے۔

میں گہری تاریکی اور جھاڑ جھنکاڑ میں آگے بڑھتا چلا گیا اور تقریباً ایک گھنٹے میں دو تین کلو میٹر آگے نکل گیا۔ قدرتی طور پر میرا رخ اس آواز کی مخالف سمت میں تھا جو کچھ دیر پہلے ہمارے کانوں میں پڑی تھی۔ میرا مطلب فائر کی آواز سے ہے۔

چلتے چلتے میں سوچ رہا تھا کہ میری اچانک گمشدگی کے حوالے سے میرے ساتھیوں کا ردِعمل کیا رہا ہوگا؟ انہوں نے مجھے اردگرد تلاش کیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ محتاط انداز میں آوازیں بھی دی ہوں۔ وہ ٹارچیں روشن کرنے کا رسک تو نہیں لے سکتے تھے، تاریکی میں ہی مجھے اور

میرے قدموں کے نشان ڈھونڈتے رہے ہوں گے۔ پھر ان کے ذہن میں یہ شدید خدشہ پیدا ہوگا کہ کہیں میں کسی جنگلی جانور کا نشانہ تو نہیں بن گیا...... یا پھر ایسا تو نہیں کہ حکم کے اہلکار گھات لگا کر جوہڑ کے بالکل قریب پہنچ چکے ہوں۔

انہی سوچوں میں غلطاں میں آگے بڑھتا رہا۔ ایک دو جگہ گھنی جھاڑیوں میں کسی جنگلی جانور کی موجودگی کا متحرک احساس بھی ہوا لیکن ایسا کوئی خطرہ عملی طور پر میرے سامنے نہیں آیا۔ میں چل رہا تھا لیکن حتمی طور پر نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں اسٹیٹ کی بیرونی حد کی طرف بڑھ رہا ہوں یا پھر بیرونی حد کے متوازی ہی چلتا جا رہا ہوں۔

رات کا آخری پہر تھا جب میں بے حد تھک گیا۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا لیکن خطرات سے بھرے ہوئے اس سیاہ جنگل میں آرام کیسے کرتا؟ سب سے پہلے یہی بات ذہن میں آئی کہ اگر میں کچھ دیر رکنا چاہتا ہوں تو مجھے زمین کے بجائے کسی درخت پر ہونا چاہئے۔ اس سے پہلے جب میں سلطانہ والی چوٹ کھا کر جارج کی رہائش گاہ سے بھاگا تھا تو دو روز جنگل میں بھٹکتا رہا تھا۔ تب بھی میں نے ایک شب ایک بلند درخت پر کاٹی تھی۔ آج کی شب میں نے پھر یہی کلیہ آزمایا۔ ٹارچ کی روشنی میں ایک ایسا درخت منتخب کرلیا جس پر چڑھا جا سکتا تھا۔ تھوڑی سی کوشش اور چند تازہ خراشوں کے بعد میں درخت کے ایک مضبوط دوشاخے پر نشست جمانے میں کامیاب ہو گیا۔ ٹارچ کی روشنی میں اردگرد کی شاخوں کا بغور جائزہ لیا۔ مجھے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ کچھ شکاری جانور درختوں پر بھی چڑھ جاتے ہیں جن میں خطرناک جنگلی بلے، تیندوے اور چیتے وغیرہ شامل ہیں۔

ان خطرات کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اونگھنے لگا۔

آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ قرب و جوار روشن ہو چکے تھے۔ سبزے پر سے شبنم آہستہ آہستہ اوجھل ہو رہی تھی۔ میری انتڑیوں میں بھوک کی وجہ سے کہرام مچا ہوا تھا لیکن اس کہرام کے مداوے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ ایک قریبی درخت پر خوبانی کے سائز کا ایک سبزی مائل پھل نظر آرہا تھا مگر مجھے انور خاں کی بتائی ہوئی باتیں یاد تھیں۔ اس نے کہا تھا...... جنگل سے خوراک صرف وہی بندہ حاصل کرسکتا ہے جو ''جنگل شناس'' ہو۔ دوسری صورت میں بندہ بھوک مٹانے کی کوشش میں خود بھی مٹ سکتا ہے۔ بہت سے پھل اور بیج وغیرہ زہریلے ہوتے ہیں اور ان کی ظاہری شکل یا ذائقے وغیرہ سے ان کے زہریلے ہونے کا بالکل پتا نہیں چلتا۔

میں درخت سے اُترا اور ایک بار پھر آگے بڑھنے لگا۔ ابھی بیس تیس قدم ہی چلا تھا کہ بری طرح چونک گیا۔ میں تیندوے کے پاؤں کے نشانات اب بڑی اچھی طرح پہچاننے لگا

تھا۔ اب پھر مجھے وہی نشان نظر آئے۔ گیلی زمین پر یہ بالکل واضح تھے۔ ان نشانات کو بغور دیکھنے سے پتا چلتا تھا کہ یہ زیادہ پرانے نہیں۔ غالباً رات کے وقت تیندوا میرے آس پاس موجود تھا۔ ٹرپل ٹو رائفل پر میری گرفت مضبوط ہوگئی۔ میں مزید احتیاط سے چلنے لگا۔ میں اردگرد کے درختوں پر بھی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ خطرناک جانور ''آسان درختوں'' پر چڑھ سکتا ہے اور پھر درخت کے اوپر سے ہی بے آواز، اپنے شکار پر چھلانگ لگا دیتا ہے...... اچانک مجھے اپنی رگوں میں لہو رکتا ہوا محسوس ہوا...... وہ میرے سامنے تھا۔ فقط پندرہ بیس فٹ کی دوری پر۔ زردی مائل جھاڑیوں میں چھپا ہوا وہ جھاڑیوں کا حصہ ہی نظر آتا تھا۔ اگر میں غفلت میں آٹھ دس قدم مزید اُٹھا لیتا تو سیدھا اس کی زد میں آجاتا۔ اس کی قاتل آنکھیں انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ شاخوں کی اوٹ میں تیزی سے حرکت کرتی ہوئی دُم دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دراز قد جوان جانور تھا۔ اُس کے جسم پر چیتے کی طرح داغ تھے۔ اس کا وزن اس کے پچھلے پاؤں پر تھا اور اس کی یہ کیفیت اشارہ دے رہی تھی کہ اگر میں نے دو قدم بھی اور بڑھائے تو وہ مجھ پر جست لگا سکتا ہے۔

میں پتھر کی طرح ساکت کھڑا ہوگیا۔ میں نے رائفل اس کی طرف سیدھی کی۔ رائفل کا بٹ میرے کندھے سے پیوست تھا اور میں نے انگلی ٹریگر پر رکھ لی تھی۔ مجھے اپنے نشانے پر بھروسا نہیں تھا لیکن میرے گولی نہ چلانے کی وجہ، اپنے نشانے پر ''میرا عدم اعتماد'' ہی نہیں تھا...... اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں گولی چلانا نہیں چاہتا تھا۔ گولی کی آواز میری نشان دہی کر سکتی تھی اور اگر دشمن آس پاس موجود تھا تو اس کے لئے بہت آسانی فراہم ہوسکتی تھی۔

قریباً نصف منٹ تک میں اور درندہ آمنے سامنے کھڑے رہے۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے۔ ایک دوسرے کے عمل اور ردِعمل کو دیکھتے ہوئے۔ کسی لمحے کچھ بھی ہوسکتا تھا اور حقیقت یہی ہے کہ میں اس جانور کے مزاج کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ میں کسی درندے کو اس طرح کھلی جگہ پر اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ ہمارے درمیان پندرہ بیس فٹ کے بے رکاوٹ فاصلے کے سوا اور کچھ نہیں تھا...... یہ ایک ناقابلِ بیان احساس تھا۔

وہ تیس چالیس سیکنڈ تیس چالیس گھنٹوں کی طرح لگے۔ پھر اس نے بڑی بے اعتنائی سے منہ موڑا۔ مجھے اور میری ''ٹرپل ٹو'' کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے وہ بے پروائی سے چلتا ہوا ایک طرف اوجھل ہوگیا۔ جیسے میرا اور اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو...... کوئی واسطہ کوئی بھی اچھا یا برا ناتا اور ان لمحوں میں مجھے لگا کہ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ انسان جنگلی درندوں سے بڑھ کر

خطرناک ہے...... درست ہی کہتے ہیں۔ درندے اس وقت تک نقصان نہیں پہنچاتے جب تک وہ بھوکے نہ ہوں یا پھر جب تک ان کی زندگی میں جارحانہ مداخلت نہ کی جائے...... لیکن حضرتِ انسان جب شر پر اُترتا ہے تو کل وقتی اور سرتاپا مہلک ہو جاتا ہے۔ اپنی ہلاکت آفرینی کو عملی شکل دینے کے لئے وہ ہزار ہا بہانے ڈھونڈ لیتا ہے۔

میں کچھ دیر وہیں ساکت و جامد کھڑا رہا۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے تیندوے سے اپنی رُوبرو ملاقات کا اثر اپنے دل و دماغ پر محسوس کرتا رہا...... تب ایک بار پھر آگے بڑھنے لگا۔ تیندوے کے پاؤں کے نشانات بدستور میرے ساتھ ساتھ چل رہے تھے مگر اب یہ کچھ مدھم محسوس ہو رہے تھے۔ کئی جگہ یہ نشان چھوٹے بڑے دیگر جانوروں کے نقوشِ پا میں گڈمڈ ہو جاتے تھے...... ایک جگہ میں بے طرح چونک گیا۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دھیان سے دیکھا اور پھر مجھے پاؤں کے بل بیٹھنا پڑا۔ بیٹھے بیٹھے ہی میں نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی اور رگوں میں لہو کی گردش تیز ہوگئی۔ مجھے کچی زمین پر انسانی پاؤں کے نشان دکھائی دیئے تھے۔ یہ ننگا پاؤں تھا اور کئی جگہ اس کا نقش بہت واضح تھا۔ یہ زیادہ اچنبھے کی بات نہیں تھی لیکن میرے لئے حد درجہ حیران ہونے کی وجہ کچھ اور تھی۔ یہ صرف ایک پاؤں کا نشان تھا۔ دوسرا پاؤں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ دوسرے پاؤں کی جگہ ایک چھوٹا سا سوراخ نظر آتا تھا۔ جگہ جگہ نظر آنے والا یہ چھوٹا سا سوراخ کسی بیساکھی نما لکڑی کا تھا۔

مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اس جگہ اس قسم کی زمینی شہادت دیکھوں گا۔ میری نگاہوں میں بارونداجیکی کا دق زدہ چہرہ گھوم گیا۔ میں نے بے تابی سے چاروں طرف دیکھا۔ وہ یہاں سے گزرا تھا...... یقیناً گزرا تھا۔ وہ زیادہ تیزی سے نہیں چل سکتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ یہیں کہیں آس پاس موجود ہے۔

میں تیزی سے ان نشانات کا تعاقب کرنے لگا۔ تیندوے اور دیگر جانوروں سے وابستہ خیالات ایک دم میرے ذہن سے محو ہوگئے تھے۔ میں ان نشانات کو ٹریس کرتا ہوا بے تابی سے آگے بڑھتا رہا۔ صرف دس پندرہ منٹ بعد مجھے گھنے درختوں میں چھپی ہوئی ایک چاردیواری کے آثار نظر آگئے۔ یہ ایک چھوٹا سا کھنڈر تھا۔ اس پر نباتات اور خودرو بیلوں کی یورش تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ جگہ گھاس پات کا ہی حصہ ہے۔ یہ دراصل ویسی ہی بے آباد چوکیوں میں سے ایک تھی جو اس ویرانے کہیں کہیں دکھائی پڑتی تھیں لیکن یہ چوکی تقریباً مسمار ہو چکی تھی۔ بس ایک کمرا اور برآمدے کا ایک حصہ موجود تھے۔ تاہم ان کی چوبی چھتیں بھی گری

ہوئی تھیں۔

ایک دم مجھے خیال آیا کہ باروندا جیکی اس کھنڈر میں ہی موجود ہے۔ یہ دوسرا سوال تھا کہ وہ زندہ حالت میں ہے یا مردہ...... اور اکیلا ہے یا اس کے ساتھ بھی کوئی موجود ہے؟ میں پاؤں اور بیساکھی کے نشان دیکھتا ہوا احتیاط سے آگے بڑھا۔ نشان کھنڈر کی تاریکی میں داخل ہو رہے تھے۔ میں کچھ دیر تک ایک دیوار کے ساتھ لگ کر سن گن لیتا رہا پھر میں نے محتاط انداز میں آواز دی۔ ''جیکی...... جیکی!''

جواب ندارد...... میں نے دو مرتبہ مزید پکارا پھر ٹارچ روشن کر کے اندر چلا گیا۔ کمرے کی چھت نے گر کر جھونپڑی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس جھونپڑی میں کثرت سے جھاڑ جھنکاڑ اُگا ہوا تھا۔ اس جھونپڑی کے سامنے ہی ایک چھوٹے چیتل کی کٹی پھٹی لاش پڑی تھی۔ غالباً چند گھنٹے پہلے یہ چیتل کسی تیندوے یا بھیڑیے وغیرہ کا شکار ہوا ہوگا۔ اس کے جسم پر بہت کم گوشت باقی بچا تھا۔ اندر داخل ہو کر میں نے ٹارچ کی روشنی کو حرکت دی۔ باروندا جیکی مجھے سامنے ہی بے حرکت پڑا نظر آ گیا۔ اس کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ ختم ہو چکا ہے لیکن پھر میری نگاہ اس کے سینے کے مدھم زیروبم پر پڑی۔ وہ زندہ تھا۔ تب مجھے ایک شے نظر آئی۔ یہ شراب کی بوتلیں تھیں۔ مٹی میں لتھڑی ہوئی۔ یہ پانچ عدد بوتلیں جیکی کے قریب ہی پڑی تھیں۔ یہ مقامی طور پر تیار کی گئی شراب لگتی تھی۔ ان بوتلوں میں سے دو خالی ہو چکی تھیں۔ ایک میں سے تھوڑی سی پی گئی تھی، باقی دو بھری ہوئی تھیں۔ بوتلوں کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کافی عرصہ مٹی میں دبی رہی ہیں۔ انہیں جیکی نے کھود کر نکالا تھا۔ اس کے سرہانے کی طرف کچی زمین میں ایک دو ڈھائی فٹ گہرا گڑھا موجود تھا۔ جیکی نشے کی حالت میں بے سدھ پڑا تھا۔ اس کے منہ سے شراب کے بلبلے اٹھ رہے تھے۔ میں نے دیکھا اس کے اکلوتے ہاتھ پر خون جم کر سوکھ گیا تھا۔ تاہم مجھے لگا کہ یہ جیکی کا اپنا خون نہیں ہے۔ اس کے اپنے جسم میں خون تھا ہی کہاں۔ اگر کوئی تھوڑی بہت چیز رگوں میں حرکت کر بھی رہی تھی تو وہ شراب ہی ہوگی...... یہ شاید چیتل ہی کا خون تھا۔

میں نے کچھ دیر تک اردگرد کا جائزہ لیا پھر جھنجوڑ جھنجوڑ کر جیکی کو جگا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور مجھے سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ تب شاید اس نے مجھے پہچان لیا مگر اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں ابھرا تھا۔ اس نے مسکرا کر گردن ڈھیلی چھوڑ دی اور ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔ بند آنکھوں کے ساتھ ہی بولا۔ ''میں سمجھا تھا کہ میں جب مر کر اٹھوں گا تو خود کو جنت میں پاؤں گا لیکن...... تمہیں دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ دوزخ ہی ہے...... اور

سناؤ...... تمہارے ساتھ اور کون کون ہے یہاں؟''

''خوش قسمتی سے آپ مرے نہیں، ابھی زندہ ہو۔''

اس نے پھر ایک مخمور انگڑائی لی۔ ''تم اسے خوش قسمتی کہتے ہو۔ تم سے بڑا بھانڈ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ کچی کلیجی کھانے سے میرے پیٹ میں ہلکا ہلکا درد ہے ورنہ میں تمہاری اس بات پر خوب ہنستا...... بلکہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتا۔''

''کچی کلیجی؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''تو اور کیا۔ یہاں میری نانی بیٹھی ہے جو پکا کر کھلاتی۔ بھوک کی وجہ سے میری آنتیں بریک ڈانس کر رہی تھیں...... اس لئے، چبا چبا کر ویسے ہی کھا لی۔''

''کس کی کلیجی تھی؟''

''حکم جی کی۔'' وہ مسکرایا۔ ''وہ دیکھو، وہ سامنے پڑا ہے۔'' جیکی نے کٹے پھٹے چیتل کی طرف اشارہ کیا۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ ہاتھ پر خشک خون کیوں لگا تھا۔ وہ چیتل کے سینے میں سے کلیجی نکال لایا تھا اور اسے شراب کے آتشیں گھونٹوں کے ساتھ گلے سے نیچے اُتارا تھا۔ سچ ہے کہ بھوک انسان سے سب کچھ کراتی ہے۔

''اس چیتل کو مارا کس نے؟''

''چیتل نہیں یار...... حکم جی...... اور حکم جی کو عوام کے سوا اور کون مارے گا؟ یہ عوام ہی ہیں جو بھوک سے بے بس ہو کر تیندوے کا روپ دھار لیتے ہیں اور حکم جی جیسے زورآور لوگ ان کے لئے چیتل اور ہرن بن جاتے ہیں۔ کل رات یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ ایک عوام نے ایک حکم جی پر حملہ کیا۔ بڑی محبت سے اس پر جھپٹا مارا اور بڑی عقیدت سے اس کا پیٹ پھاڑ کر رکھ دیا۔ حکم جی کی دردناک آواز بن کا تار رہا، اس کی ٹانگ پھڑکتی رہی اور وہ عوام کے پنجے سے نکلنے کے لئے زور لگاتا رہا لیکن عوام کی بھوک بہت زیادہ تھی، وہ نکل نہیں سکا۔ ہاں دوست، ہر حکم جی ایک دن چیتل ضرور بنتا ہے اور ہر مظلوم ایک دن تیندوے کا روپ ضرور دھارتا ہے۔''

میں نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ صورت حال واضح تھی۔ رات کسی وقت تیندوے نے چیتل مارا تھا اور اس کھنڈر کے سامنے بیٹھ کر اس کا گوشت کھایا تھا۔ اس کے جانے کے بعد بھوکا جیکی گھسٹتا ہوا وہاں پہنچا تھا اور اس نے بھی اس شکار میں سے اپنا حصہ حاصل کر لیا تھا۔ اس نے چھوٹی کلیجی کھائی تھی اور اس کا نرم گوشت چبایا تھا۔ یقیناً یہ وہی تیندوا تھا

جو اس علاقے میں گھوم رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میرا اس سے سامنا بھی ہوا تھا۔ وہ تازہ شکار کی وجہ سے بھرے ہوئے پیٹ کے ساتھ تھا لہٰذا اس نے مجھ سے بھی کوئی خاص تعرض نہیں کیا تھا۔

''یہ سب کیا ہے جیکی! آپ مجھے بتاؤ کہ آپ کس طرح یہاں پہنچے؟ کیا وہاں سرنگ سے نکلنے کا کوئی اور راستہ بھی تھا؟''

''بالکل تھا...... لیکن وہاں سے شاید میں ہی نکل سکتا تھا...... کوئی اور نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

جیکی نے ٹارچ میرے ہاتھ سے لے کر روشن کی اور اس کا رخ اپنے جسم کی طرف کیا۔

وہ ہمیشہ کی طرح ننگ دھڑنگ تھا۔ ایک تہ در تہ لنگوٹ کے سوا اس کے جسم پر اور کچھ نہیں تھا۔ اس نے مجھے اپنے جسم کی گہری خراشیں دکھائیں۔ یہ خراشیں اس کے کانوں، اس کے سینے اور کمر پر خاصی گہری تھیں اور سیاہ نشان سے بن چکے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی بہت سخت شے کے ساتھ بہت زیادہ رگڑ کھا کر گزرا ہے۔ ''یہ سب کیا ہے؟'' میں نے اس کی نہایت سخت جلد پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

''وہاں اس سرنگ میں آگے جا کر نکلنے کا ایک راستہ موجود تھا لیکن وہ اتنا تنگ تھا کہ مجھ جیسے پہلوان کو بھی بہت زور لگا کر اس میں سے گزرنا پڑا۔ بس اس وقت مجھے یہ کلیہ یاد رہا کہ جہاں سے بندے کا سر گزر سکتا ہے، وہاں سے پورا جسم بھی گزر سکتا ہے۔''

وہ جو کچھ بتا رہا تھا، وہ حیران کن تھا لیکن یقین کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا کیونکہ بارونڈا جیکی میرے سامنے موجود تھا...... اور وہ جس قسم کے ڈھیٹ جسم کا مالک تھا، وہ اس طرح کی مہم جوئی کر بھی سکتا تھا۔

''تم نے زنجیر کیسے کھولی؟''

''جیسے ہمیشہ سے کھولی جاتی ہے۔ زنجیر کھولنے، توڑنے اور پگھلانے کے لئے ہمیشہ سے حوصلے کی ضرورت رہی ہے۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

''جیکی! آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس طرح نکل جاؤ گے تو مجھ پر الزام آئے گا...... اسے میری غفلت سمجھا جائے گا۔''

وہ ہنسا۔ ''اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں بلکہ کسی کا بھی کوئی قصور نہیں۔ میں سرنگ کی جس دراڑ میں سے نکلا ہوں، وہاں سے...کوئی اور نکل کے دکھا دے تو میں مانوں۔ خیر، چھوڑو ان باتوں کو۔ تم یہاں کیسے نازل ہوئے ہو؟ مجھے تو اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا۔''

''مجھے بھی نہیں ہو رہا۔ مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ میں آپ کو اتنی جلدی دوبارہ دیکھ سکوں گا۔''

میں نے بارونڈا جیکی کو مختصراً وہ سارے واقعات بتا دیئے جو اس کے جانے کے بعد پیش آئے تھے۔ میں نے اسے ماریا فرگوسن کے بارے میں بھی بتا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ ہم نے اپنے تحفظ کے لئے اسے یرغمال بنا رکھا تھا۔ سرنگ سے نکلنے کے بعد ہمارے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا، وہ بھی میں نے جیکی کے گوش گزار کر دیا۔ جب میں روداد کے اس حصے پر پہنچا جہاں چالباز ماریا پارس ریان کو اپنا جسم رشوت کے طور پر پیش کر کے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوئی تھی...... جیکی کے چہرے پر عجب زہرناک تاثرات پھیل گئے۔ وہ اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں بولا۔ ''تم لوگوں کے چنگل سے رہائی تو ماریا کے لئے بہت بڑی بات تھی، اس طرح کی یورپین لڑکیاں تو کبھی کبھی ایک وقت کے کھانے کے لئے بھی خوشی خوشی کسی کے بستر پر لیٹ جاتی ہیں۔ ان کا جسم ان کے لئے ایک فائدہ بخش پراپرٹی کی طرح ہوتا ہے جسے یہ کسی بھی وقت رینٹ پر دے سکتی ہیں...... خیر، چھوڑو اس بات کو...... اس کے بعد کیا ہوا؟''

میں نے جیکی کو اس خونی ہنگامے کی پوری تفصیل بتائی جو چوکی کے آس پاس برپا ہوا تھا اور جس میں پارس ریان کے علاوہ ماریا کو بھی گولی لگی تھی۔

ماریا کو گولی لگنے کا سن کر جیکی کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک آ گئی۔ وہ بولا۔ ''زندہ ہے یا مر گئی؟''

میں نے کہا۔ ''یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہرحال، زخمی ضرور ہوئی ہے۔''

''چلو کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر ہے۔ اگر وہ صاف بچ جاتی تو یہ میرے لئے ایک بری خبر ہوتی...... اور اپنی زندگی کے ان آخری دنوں میں، مَیں بری خبریں سننا نہیں چاہتا۔''

''اس ماریا کے لئے آپ کے دل میں بہت رنج ہے؟''

''ہاں، اس نے صرف مجھے دکھ دیا ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے شکنتلا کو دکھ دیا۔ اس کی گہری سہیلی ہو کر بھی اس نے دغابازی کی اور ہماری ملاقاتوں کے بارے میں شکنتلا کے پتا کو بتایا۔ پتا نہیں کہ تم نے اچھا کیا ہے یا برا کہ مجھے سرنگ میں ماریا کی موجودگی کے بارے میں نہیں بتایا...... ورنہ اس کے لئے میری ''بے پایاں محبت'' نے جوش ضرور مارنا تھا۔ میں اس کی جتنی بھی عزت افزائی کر سکتا، ضرور کرنی تھی۔ اگر اس عزت افزائی سے اس

کی ایک دو ہڈیاں ٹوٹ جاتیں تو مجھے دلی راحت ہوتی...... بہر حال جو ہوا ٹھیک ہوا۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ اسے زندگی دے اور مصیبت والی زندگی دے۔ اسے کچھ تو دوسروں کے درد کا احساس ہو۔"

جیکی اپنے مخصوص انداز میں باتیں کرتا رہا اور اپنا نشہ بحال رکھنے کے لئے شراب کے چھوٹے گھونٹ بھرتا رہا۔

میں نے اس سے پوچھا کہ یہاں اس کھنڈر میں سے اس نے یہ سیال آگ کیسے ڈھونڈ نکالی ہے؟

وہ بولا۔ "شراب جہاں بھی ہوتی ہے، مجھے بلا لیتی ہے۔ کسی مستانی محبوبہ کی طرح مجھے دیکھ کر آنکھ مارتی ہے، سیٹی بجاتی ہے...... اور جب لڑکی خود سیٹی مارے تو پھر عاشق کا تو فرض بن جاتا ہے کہ وہ اس کو گود میں بھرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دے۔"

"آپ کو کیسے پتا چلا کہ یہاں شراب موجود ہے؟"

"شاید تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ اس کھنڈر میں گھستے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں کہیں شراب موجود ہے۔ یہ معرفت کی باتیں ہیں۔ تمہاری کھوپڑی میں نہیں آئیں گی۔ اس کے لئے ریاضت کی ضرورت ہے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ورنہ میں اس حوالے سے بھی تمہیں کئی گُر بتا جاتا۔"

"میں ایسے گُر نہ سیکھنے کے لئے پیشگی معذرت چاہتا ہوں......"

"دیکھو کچھ اور نہ کہنا میری دوسری محبوبہ (شراب) کے بارے میں۔ ورنہ یہ توہین محبت ہو جائے گی اور یہ توہین عدالت سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ میں تمہیں اپنی شاگردی سے عاق بھی کر سکتا ہوں......"

وہ گول مول باتیں کرتا رہا۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ بوتلیں شاید کسی جرائم پیشہ شخص یا اشخاص نے یہاں دبائی تھیں لیکن ان بوتلوں میں سے کچھ شراب رستی تھی۔ اس کی بدبودار نمی، مٹی میں جذب ہوتی رہتی تھی اور اسی مخصوص بدبو یا ہلکی سی باس نے جیکی کو اس شراب کا سراغ دیا تھا۔

شام ہونے کے بعد میری بھوک انتہا کو پہنچ گئی۔ شاید اس وقت مجھے بھی کوئی کلیجی قسم کی چیز ملتی تو میں بھی اسے کچا چبانے کے بارے میں سوچنے لگتا۔ کل رات کی تیز بارش کی وجہ سے ہوا میں خنکی کچھ بڑھ گئی تھی۔ پیٹ خالی ہو تو سردی زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ میرا بھی یہی حال تھا لیکن یہ مدقوق جسم والا جیکی تو جیسے لوہے کا بنا ہوا تھا۔ اسے سردی گرمی کی مطلق پروا نہیں تھی

لیکن کچھ بھی تھا، شراب نے اس بے مثال بندے کو اندر سے کھوکھلا کر ڈالا تھا۔ اس کا ایک ثبوت شام کے فوراً بعد اس وقت ملا جب جیکی کو شدید کھانسی شروع ہوئی اور اس کھانسی کے دوران میں ہی اس کے منہ سے خون رِسنے لگا...... اس نے کئی بار خون تھوکا اور اسے ڈھانپنے کے لئے اس پر مٹی ڈالی۔ وہ ایک دم گم صم نظر آنے لگا۔

وہ آرزدہ لہجے میں بولا۔ "میں نے کہا ہے نا کہ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ کتنا اچھا ہو کہ تم میری مدد کر سکو۔"

"دل چھوٹا مت کرو...... آپ ٹھیک ہو جاؤ گے...... اور مدد کی بات آپ کس حوالے سے کر رہے ہو؟"

"میری آخری خواہش پوری کر دو۔ مجھے کسی طرح میری کشتی پر لے جاؤ۔ ہم وہاں سے بہت دور نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دن کا سفر ہمیں واپس وہاں پہنچا دے گا۔ تمہارے پاس رائفل ہے...... دو ٹانگیں ہیں...... تم صحت مند ہو...... مجھے میری منزل تک پہنچا سکتے ہو۔"

اس کے لہجے میں چھپی ہوئی یاسیت نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔ میں نے اس کا گرم ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "مجھے لگتا ہے جیکی...... آپ اپنی یادوں میں گم ہو کر رہ گئے ہو۔ آپ آگے دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ حالانکہ راستہ یہاں ختم نہیں ہوا...... ابھی آگے بہت کچھ ہے۔"

"میرے لئے کچھ نہیں ہے...... میرے لئے سب کچھ وہیں ختم ہو گیا تھا جب اُس رات کشتی پر میرا ہاتھ شکنتلا کے ہاتھ سے چھوٹا تھا۔ حکم کے محافظوں نے ہمیں ایک دوسرے سے علیحدہ کیا تھا۔ تم نہیں سمجھ سکتے...... اس سے جدا ہونا میرے لئے کیسا تھا۔ تم نہیں سمجھ سکتے کیونکہ تم نے تو اسے دیکھا ہی نہیں ہے۔ وہ بے مثال ہے دوست...... میری جگہ کوئی بھی ہوتا، اس کی مسکراہٹ میں کھونے کے بعد دوبارہ اُبھر نہ سکتا...... اس کی زلفوں میں اُلجھنے کے بعد پھر رہائی نہ پا سکتا۔ کاش! میں شاعر ہوتا، میں کھل کر بتا سکتا کہ وہ کیا تھی اور......"

وہ بات کرتے کرتے ایک دم رک گیا جیسے کوئی نیا خیال اس کے ذہن سے ٹکرایا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس خیال کو مجھ پر ظاہر کرے یا نہیں۔

"کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ توقف سے بولا۔ "کہنا تو نہیں، کچھ دکھانا چاہ رہا ہوں تمہیں...... لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ غلط نہ ہو...... وہ اس پر ناراض نہ ہو جائے...... جب وہ ناراض ہو جاتی ہے تو کئی کئی

دن تک میرے تصور میں نہیں آتی۔ مجھے تڑپاتی ہے اور خود بھی تڑپتی رہتی ہے۔''

''کیا آپ مجھے اس کی کوئی چیز دکھانا چاہ رہے ہو؟''

''ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔'' اس نے کہا...... پھر ذرا سوچ کر بولا۔ ''لیکن تم وعدہ کرو کہ اس کو پاک صاف نظروں سے دیکھو گے۔ اس کے بارے میں اپنے دل میں کوئی ایسا ویسا خیال نہیں لاؤ گے۔ اگر ایسا ہوا تو مجھے فوراً پتا چل جائے گا...... اور میں خود کو بہت گناہ گار محسوس کروں گا۔''

''کیا آپ مجھے اس کی کوئی تصویر دکھانا چاہ رہے ہو؟'' میں نے پُرشوق لہجے میں پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی مخمور آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔

میں نے اس سے وعدہ کیا کہ ویسا ہی ہوگا جیسا وہ چاہتا ہے۔ ساتھ ساتھ میں حیران بھی ہو رہا تھا کہ یہ تصویر اگر واقعی موجود ہے تو اس نے کہاں رکھی ہوئی ہے۔ میں نے تو اسے اب تک اس میلے کچیلے لنگوٹ میں ہی دیکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے اپنے اس سوال کا جواب بھی مل گیا۔ جیکی نے اپنے تہ در تہ لنگوٹ کی گرہ کھولی اور اس کی ایک بالائی تہ میں بڑی احتیاط سے لپیٹی گئی کارڈ سائز کی تصویر نکال لی۔ اسے پہلے پولی تھین میں پھر ایک رومال میں لپیٹا گیا تھا۔ جیکی نے اسے اپنے اکلوتے ہاتھ سے رومال کی گرہ کھولی پھر پولی تھین کو ہٹایا۔ وہ تصویر کو یوں برآمد کر رہا تھا جیسے کسی عبادت گاہ میں ہو اور کسی مقدس شے کو منظرِ عام پر لا رہا ہو۔

یہ ایک نہیں تین تصویریں تھیں۔ مسلسل جیکی کے پاس رہنے سے ان پر تھوڑی بہت سلوٹیں بھی آ چکی تھیں۔ جیکی نے پہلی تصویر مجھے دکھائی۔ یہ راج بھون کے کسی عالی شان ہال کمرے میں اُتاری گئی تھی۔ اس میں سات لڑکیاں نظر آ رہی تھیں۔ ان ساتوں نے مختلف رنگ کے لباس پہن رکھے تھے۔ یہ سارے لباس گھاگرے چولی پر مشتمل تھے۔ لڑکیوں کے کندھوں پر خوبصورت آرائشی پَر لگے ہوئے تھے۔ یہ پَر بھی لباس کے رنگ کے ہی تھے۔ ایک لڑکی پر میری نظر جم کر رہ گئی۔ اس نے سبز لباس پہن رکھا تھا۔ مجھے فوراً اندازہ ہوا کہ یہی شکنتلا ہے۔ میں نے اس سے پہلے جیکی سے سنا تھا کہ شکنتلا جب ساتویں کے جشن کی پری بنی تو اس کو سبز رنگ ملا تھا۔ وہ واقعی حسین و جمیل تھی۔ اس کی صورت میں موجود ایک خاص قسم کی دلکشی، نگاہ کو کشش کرتی تھی۔

''پہچانا کہ وہ کون ہے؟'' جیکی نے مغموم لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

میں نے سبز لباس والی پر انگلی رکھی۔

جیکی کا چہرہ چمک اُٹھا۔ ''مجھے یقین تھا کہ تم پہچان لو گے...... ستاروں میں سے چاند کو پہچاننا کون سا مشکل ہوتا ہے۔''

میں نے تصویر کو بغور دیکھا۔ ساتوں لڑکیاں ایک کرسی کے پیچھے قطار میں کھڑی تھیں۔ زرنگار کرسی پر کوئی شخص تمکنت سے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ درمیانی عمر کا قدرے فربہ اندام شخص لگتا تھا۔ اس نے چوڑی دار پاجامے کے ساتھ نہایت قیمتی شیروانی پہن رکھی تھی۔ گلے میں موتیوں کی مالائیں تھیں مگر اس کا چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ چہرے پر کسی نے سیاہ روشنائی والے قلم سے اتنی لکیریں لگائی تھیں کہ چہرہ مکمل طور پر چھپ گیا تھا۔

''کیا کرسی پر حکم جی بیٹھا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، تم اسے حکم جی بھی کہہ سکتے ہو لیکن یہ زیادہ دیر حکم جی نہیں رہے گا۔ بہت جلد چیتل بن جائے گا۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''حکم جی'' کو دیکھنے کی آرزو میرے دل میں تھی لیکن یہ آرزو اس کی تصویر دیکھنے کے بعد بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔

جیکی نے دوسری تصویر دکھائی۔ اس میں سبز لباس والی شکنتلا پنجوں کے بل قالین پر بیٹھی تھی اور اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھایا ہوا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ کسی کے چرن چھو رہی ہے۔ یقیناً یہ حکم جی کے پاؤں ہی تھے لیکن یہاں بھی اس کے پاؤں اور پنڈلیوں پر بے تحاشا سیاہ لکیریں لگا دی گئی تھیں اور پاؤں نظر نہیں آتے تھے۔ شکنتلا کی زلفیں واقعی بہت دراز تھیں۔ اس کی بھاری چوٹی، جیسے قالین پر کنڈلی مارے بیٹھی تھی۔ اس کے جسم کی ساری غیر معمولی رعنائی اور کشش اس پوز میں نظر آ رہی تھی۔ یقیناً وہ ایک دل آویز جسم کی مالک تھی۔ اس تصویر میں ایک دیوار پر بدھا کے اس نادر روزگار مجسمے کی پینٹنگ بھی نظر آ رہی تھی جو مقامی لوگوں کے نزدیک ناقابلِ شکست تھا اور جسے چوری کرنے کی پاداش میں، مَیں اور میڈم صفورا وغیرہ اس راجواڑے میں موجود تھے۔

تیسری تصویر کلاسیکل رقص کی تھی۔ یہ بھی گروپ فوٹو تھا۔ اس میں ساتوں ''پریاں'' پاؤں میں گھنگھرو باندھے رقص کر رہی تھیں۔ ان کے پس منظر میں پگڑیوں والے سازندے نظر آ رہے تھے۔ یہاں بھی شکنتلا نمایاں تھی۔ اس کا سراپا ایک تصویر تھا اور اس تصویر نے جیکی کے ساتھ ایک کشتی میں کنول کے پھولوں سے بھری ہوئی جھیل کے اندر سات روز گزارے تھے۔ اگر باروندا جیکی اس حوالے سے خود کو خوش نصیب سمجھتا تھا تو شاید ٹھیک ہی سمجھتا تھا۔

"یہ تصویریں آپ کو کہاں سے ملیں؟" میں نے جیکی سے پوچھا۔

وہ کچھ دیر کھانستے رہنے کے بعد بولا۔ "بس، یہ میری خوش قسمتیوں میں سے ایک خوش قسمتی ہے۔ میں ان دنوں جیل سے بھاگ آیا تھا اور اپنی محسنہ ہوشن کے گھر میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے ہوشن سے درخواست کی کہ وہ کسی طرح مجھے ساتویں کے جشن کی کچھ تصویریں لا دے۔ ساتویں کے جشن کی تصویریں اُتاری جاتی ہیں اور یہ جشن کے میلے میں فروخت بھی ہوتی ہیں لیکن میلا چونکہ ختم ہو چکا تھا، اس لئے جشن کے پکچر کارڈز کا ملنا بڑا مشکل تھا۔ پھر بھی ہوشن نے کسی طرح جشن کے آٹھ دس پکچر کارڈز حاصل کر لئے۔ ان میں سے ان تین کارڈز میں شکنتلا نظر آ رہی تھی...... اور یہ تین کارڈز میرے لئے ایک بہت بڑے سرمائے کی طرح تھے۔"

"تصویروں پر یہ لکیریں...... آپ نے لگائی ہیں؟"

"ہاں...... حکم جی کے چہرے پر خوب صورتی اور نیکی کی چمک ہی اتنی ہے کہ برداشت سے باہر ہو جاتی ہے۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ پھر کچھ دیر تک چپ رہنے کے بعد کہنے لگا۔ "دیکھو، بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ میں تم سے التجا کر رہا تھا کہ تم مجھے کسی طرح میری کشتی تک پہنچا دو۔ تم مجھے استاد کہتے ہو۔ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر اپنے استاد پر تمہارا یہ ایک بہت عظیم احسان ہوگا۔"

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، مجھے ایک نامانوس آہٹ سنائی دی۔ پتا نہیں کیوں مجھے شک گزرا کہ یہ کسی 'پمپ ایکشن رائفل' کے کاک ہونے کی آواز ہے۔ میں نے ٹارچ فوراً بجھا دی اور رائفل پر اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی۔ لگتا تھا کہ جیکی نے بھی یہ آواز سنی ہے اور وہ تھوڑا سا چونکا ہے۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ تاہم میرے لئے یہ بات اطمینان کا باعث تھی کہ دھڑکن کی اس تیزی میں خوف کا عنصر شامل نہیں ہے۔ میں جھک کر چلتا ہوا محتاط قدموں سے دروازے کی طرف آیا۔ چیتل کے ڈھانچے کے قریب پہنچ کر میں نے آنکھیں سکیڑیں اور اردگرد نگاہ دوڑائی۔ میری رگوں میں خون اچھل کر رہ گیا۔

یہاں دشمن موجود تھا...... اور وہ ایک نہیں تھا۔ نہ ہی وہ تین یا چار کی تعداد میں تھا۔ وہ درجنوں میں تھا۔ شاید ہر جھاڑی کے پیچھے...... ہر درخت کی اوٹ میں۔ میری چھٹی حس نے گواہی دی کہ نہایت خاموشی...... نہایت ہوشیاری سے اس جگہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ میرے ذہن میں رنجیت پانڈے کا نام گونجا۔

تو کیا وہ وقت پہنچ گیا تھا جس کا انتظار تھا؟

کیا آج یہاں مجھے اپنا حوصلہ آزمانا تھا؟ آگے بڑھنا تھا، لڑنا تھا...... اور مرنا تھا؟

مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ صرف چند سیکنڈ میں ہی میں ذہنی طور پر ہر طرح کی صورت حال کے لئے تقریباً تیار ہو گیا۔ میں نے دائیں طرف دیکھا...... وہاں عمران کھڑا تھا۔ یہ اس کا تصور تھا لیکن حقیقت کی طرح واضح اور روشن لگا۔ اس نے میرے کندھے سے کندھا ملایا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر جادوئی مسکراہٹ تھی۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں اپنا پسندیدہ فقرہ دہرایا...... جگر! ڈرنا ہے تو مرنا ہے...... اور جو مرنا ہے تو پھر ڈرنا کیا۔ میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔ کاش! وہ جیتی جاگتی حالت میں میرے ساتھ ہوتا...... بہرحال...... اس کا تصور بھی کچھ کم حوصلہ افزا نہیں تھا۔

یکایک فائرنگ شروع ہو گئی۔ گولیاں سنسناتی ہوئی...... سیٹیاں بجاتی ہوئی چوکی کی دیواروں سے ٹکرانے لگیں۔ میں اوندھے منہ زمین پر گر گیا۔ میں نے اپنی رائفل سے چند جوابی فائر کئے۔ میرا نشانہ اتنا اچھا نہیں تھا، نہ ہی مجھے ایسی شوٹنگ کے داؤ پیچ آتے تھے...... میرے لئے اطمینان اور راحت کی بس ایک بات تھی۔ اس طرح درجنوں دشمنوں میں گھر کر اور موت کو اپنے رُو برو دیکھ کر بھی میرے جسم اور دل و دماغ کو لرزہ طاری نہیں ہوا تھا۔ آج میں اس شخص سے بہت...... بہت زیادہ مختلف تھا جس نے اپنے گھر کے سامنے چلڈرن پارک میں سیٹھ سراج کے غنڈوں سے مار کھائی تھی اور پھر اپنے ہر جاننے والے سے منہ چھپاتا پھرا تھا۔ آج میں اپنے اندر مرنے کا حوصلہ پا رہا تھا اور یہ حوصلہ بھی پا رہا تھا کہ مرنے سے پہلے اپنے دس بیس دشمنوں کو موت کا مزہ چکھا دوں۔

ایک بار پھر فائرنگ ہوئی۔ تڑتڑ کی زبردست آوازوں کے ساتھ چند برسٹ بھی چلے۔ گولیاں کھنڈر کی دیواروں سے ٹکرائیں اور ہر طرف چنگاریاں بکھر گئیں۔ کسی درخت پر گھونسلے میں دبکا ہوا کوئی پرندہ گولی کھا کر "دھپ" سے میرے سامنے تاریکی میں گرا اور پھڑ پھڑا کر ساکت ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی میگافون پر ایک جانی پہچانی آواز ابھری۔ اس آواز کو سن کر میرا یہ شک یقین میں بدل گیا کہ ہمیں گھیرنے والوں میں رنجیت پانڈے بھی شامل ہے۔ اس نے نسبتاً نرم لہجے میں پکار کر کہا۔ "تم لوگن کے بچنے کا کوئی چانس ناہیں ہے۔ بہتر ہے کہ باہر آ کر خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہم تمہیں وچن دیوت ہیں کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی ناہیں ہووے گی اور قانون کے مطابق سلوک ہووے گا۔"

میں خاموش رہا۔ قریباً ایک منٹ بعد میگافون پر پانڈے کی آواز دوبارہ ابھری۔ "تم

جواب کیوں ناہیں دیوت ہو؟ اگر تم جواب ناہیں دو گے تو ہم سمجھیں گے کہ تمہیں یہ آفر منظور ناہیں ہے۔ ہم حملہ کرنے پر مجبور ہو جاویں گے......''

پانڈے کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ چوکی کی اندرونی صورت حال سے باخبر نہیں ہے، صرف اندازے سے کام لے رہا ہے۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ اندر زیادہ تعداد میں افراد موجود ہیں۔ اگر میں خود اس سے مکالمہ کرتا تو وہ فوراً سمجھ جاتا کہ انور خاں اور چوہان وغیرہ میں سے کوئی یہاں نہیں ہے۔ اس صورت حال میں پانڈے اور اس کے درجنوں ساتھیوں کا حوصلہ مزید بڑھ جاتا۔

میری خاموشی طویل ہوئی تو درختوں میں یکے بعد دیگر کئی ٹارچیں روشن ہو گئیں۔ ان ٹارچوں کی روشنی نے یہ بات پوری طرح ثابت ہو گئی کہ پانڈے اور اس کے ساتھیوں نے اس کھنڈر چوکی کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے اور ان کی تعداد بھی کافی زیادہ ہے۔ ایک ساتھ درجنوں ٹارچیں روشن ہونے کی وجہ سے کھنڈر کی اطراف روشن ہو گئی تھیں۔ کوئی اس کھنڈر میں سے نکلنے کی کوشش کرتا تو فوراً نظر میں آ جاتا۔

شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ انسان حالات سے سبق سیکھتا ہے، اس سے پہلے ہونے والے معرکے میں ماریا کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ہم تاریکی کا فائدہ اُٹھا کر ہی اپنی پناہ گاہ سے بھاگ نکلے تھے۔ پانڈے جیسا شخص یہ غلطی دوسری بار نہیں کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اس کھنڈر کے قرب و جوار کو حتی المقدور روشن کر دیا تھا۔

میگا فون پر پانڈے کی آواز ایک بار پھر گونجی۔ ''ہم تمہیں دس منٹ کا وقت دیوت ہیں۔ اگر تم لوگن اس سمے کے اندر باہر ناہیں نکلے تو ہم فائر کھول دیویں گے۔ یاد رکھو، تم میں سے کوئی زندہ ناہیں بچے گا۔'' اس بار پانڈے کے لہجے میں مخصوص تپش موجود تھی۔ یہ تپش اس کے اندر کی بے پناہ سفاکی کو ظاہر کرتی تھی۔

میں بے آواز کھسکتا ہوا پیچھے آیا۔ جیکی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی واحد ٹانگ سامنے کی طرف پھیلا رکھی تھی۔ بوتل اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ اس میں سے مزید کافی ساری شراب اپنے اندر انڈیل چکا تھا۔ صورت حال اس کی سمجھ میں بھی بہت اچھی طرح آ چکی تھی۔ اس نے جان لیا تھا کہ حکم اور جارج کے لوگوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے اور اب بچنے کا کوئی امکان نہیں۔

میں نے دل گرفتہ انداز میں کہا۔ ''جیکی! میں آپ کے لئے مصیبتوں کی وجہ بنا ہوں۔ میں آپ کا کھوج لگاتا ہوا اس کھنڈر میں نہ آتا تو شاید آپ بچ جاتے۔''

وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ''یہ شاید بُری چیز ہے۔ اس لفظ کو اپنی باتوں میں آنے ہی نہیں دینا چاہئے۔ اگر اس لفظ کا ہی سہارا لینا ہے تو پھر تو اور بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ شاید تم میری وجہ سے پھنسے ہو۔ شاید میں جارج کی بہن کو مارشل آرٹ سکھانے اس اسٹیٹ میں نہ آتا تو اب تک بھلا چنگا ہوتا...... اور شاید میں اور شکنتلا ایک دوسرے کی نظر کا شکار نہ ہوتے اور جارج کی بہن ہماری مخبری نہ کرتی تو میں اس وقت اسٹیٹ کی فوج کا کمانڈر انچیف ہوتا وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح تو بہت کچھ سوچا جا سکتا ہے دوست...... لیکن تم یہ کیوں کہہ رہے ہو کہ تم میرے لئے مصیبتوں کی وجہ بنے ہو؟ کیا اس سے پہلے بھی تم نے میرے لئے کوئی مصیبت کھڑی کی ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''...... میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا جیکی...... آپ کو آپ کی کشتی سے نکال کر اس جنگل میں لانے کا ذمے دار کوئی اور نہیں صرف میں ہوں۔ یہ میں ہی ہوں جس کی وجہ سے آپ یہاں موجود ہو۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' وہ شستہ انگریزی میں بولا۔

''میرے ساتھی تو آپ کو اس کشتی میں چھوڑ کر آ گئے تھے لیکن میں آپ کو وہاں نہ چھوڑ سکا...... اس کی دو وجہ تھیں، ایک تو آپ بے ہوش تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں آپ اسی طرح دم نہ توڑ جاؤ...... لیکن زیادہ اہم وجہ دوسری تھی۔ مجھے آپ کی شکل و صورت میں اپنے بہت پیارے دوست کی تھوڑی سی جھلک نظر آئی تھی۔ یہ وہی دوست ہے جس کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔ اس کا نام عمران تھا۔ اس نے مجھے نئی زندگی دی اور تھوڑے ہی وقت میں مجھے اتنا عزیز ہو گیا کہ میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا اور اگر بیان کروں گا تو شاید حق ادا نہ کر پاؤں گا۔''

میں نے اس بارے میں اسے تھوڑی سی تفصیل مزید بتائی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ آخر گہری سانس لے کر بولا۔ ''جو بھی ہوا اسے اب دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں...... اور نہ ہی اسے دہرانے کے لئے ہمارے پاس وقت ہے۔ بہرحال، میں ایک بار پھر کہوں گا کہ اگر تم لوگ مجھے وہاں مرنے کے لئے چھوڑ دیتے تو یہ میرے حق میں بہت اچھا ہوتا۔''

''میں اس کے لئے شرمندہ ہوں جیکی!''

''چلو...... تم نے سچ تو بولا...... اور مجھے اس کی خوشی ہے۔ نیپالی میں ایک کہاوت ہے کہ سچ بولنے والے کی زندگی کا آخری مرحلہ آسان ہو جاتا ہے......''

میں نے دیکھا کھنڈر سے باہر ٹارچوں کے روشن دائرے اب پہلے سے بڑھ گئے تھے۔

موت کا گھیرا مکمل تھا۔ میں نے کہا۔ ''جیکی! ابھی میگافون پر ان لوگوں نے جو اعلان کیا ہے، آپ نے سنا ہے؟''

وہ زخمی انداز میں مسکرایا۔ ''شاید تم بھول رہے ہو کہ میں اردو اور ہندی نہیں سمجھتا۔''

''اوہ سوری۔'' میں نے کہا۔ ''یہ حکم اور جارج کا سب سے خطرناک ہرکارہ رنجیت پانڈے تھا۔ وہ ہمیں پیشکش کر رہا تھا کہ اگر ہم ہتھیار ڈال کر باہر آ جائیں تو ہمیں شوٹ نہیں کیا جائے گا اور ہمارے ساتھ قانون کے مطابق سلوک ہوگا۔''

جیکی نے بوتل میں سے دو بڑے گھونٹ لئے اور ایک بار پھر زخمی انداز میں مسکرایا۔

''اس پانڈے کو میں بھی تھوڑا بہت جانتا ہوں۔ کسی بہت نیک ماں کا بچہ ہے۔ وہ خدا کی بندی ایسے تین چار پانڈے اور پیدا کر دیتی تو پورا انڈیا شاید اس دنیا میں ہی سورگ بن جاتا۔ وہ میگافون پر جو کچھ کہہ رہا ہے، بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ لوگ ہمیں بالکل شوٹ نہیں کریں گے اور ہمارے ساتھ سلوک بھی قانون کے عین مطابق ہوگا...... لیکن یہاں کا قانون کیا ہے؟ یہ شاید تم نہیں جانتے۔''

''کیا قانون ہے؟''

''یہ تو طے ہے کہ میری اور تمہاری کم سے کم سزا موت ہوگی اور موت یہاں بڑے برے طریق سے دی جاتی ہے۔ تمہیں پھانسی چڑھنے...... اور سولی چڑھنے کا فرق معلوم ہے؟''

میں خاموش رہا۔

وہ خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''پھانسی میں گلے میں رسا ڈال کر لٹکایا جاتا ہے اور سولی میں مجرم کو لکڑی کے کراس پر کیل ٹھونک کر ٹانک دیا جاتا ہے...... یوں کر کے۔'' اس نے اپنا اکلوتا بازو پھیلا کر کراس کی شکل بنانے کی ادھوری کوشش کی۔ پھر شراب کا ایک طویل گھونٹ بھر کر بولا۔ ''میں نے جارج کی جیل میں لوگوں کو سولی چڑھتے دیکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں بھی وہیں پر سولی چڑھایا جائے گا۔ وہ مرنے کے لئے بہت بُری جگہ ہے اور وہ طریقہ بھی بہت برا ہے...... بہت ہی برا ہے۔''

اس نے ذرا توقف کیا پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''پرانے طریقے کے مطابق جلاد پہلے مجرم کے جسم کے جوڑ توڑتا ہے۔ یہاں سے...... یہاں سے...... اور یہاں سے......'' اس نے اپنے ٹخنے، گھٹنے، کولھے اور کہنی وغیرہ کے جوڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''پھر اس بدنصیب کی آنکھیں نکالی جاتی ہیں اور بعض اوقات کان بھی کاٹ لئے جاتے

ہیں۔ تب اسے لکڑی کے کراس پر رکھا جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور کندھوں میں چھ لمبی میخیں گاڑی جاتی ہیں...... اور اسے کھلی جگہ پر آخری سانسیں لینے کے لئے لٹکا دیا جاتا ہے۔''

جیکی جو کچھ کہہ رہا تھا، اس قسم کی بات میں نے دورانِ سفر حجام عبدالرحیم سے بھی سنی تھی۔ اس نے جارج کی جیل کا احوال سناتے ہوئے بتایا تھا کہ وہاں مجرموں کو بہت بُرے طریقے سے موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے۔ دوسرے قیدیوں کے لئے عبرت کا سامان مہیا کرنے کے لئے ایسی تمام سفاکانہ سزائیں سرِعام دی جاتی ہیں۔

''تو پھر آپ کی کیا رائے ہے؟'' میں نے بارونڈا جیکی سے پوچھا۔

اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''میری رائے تو وہی ہے جو میں تمہیں پہلے بھی کئی بار بتا چکا ہوں۔ میں اپنی کشتی میں مرنا چاہتا ہوں لیکن لگتا ہے کہ اب حالات ہمیں اس کی اجازت نہیں دیں گے...... اور جب موت کشتی میں نہیں آنی تو پھر کہیں بھی آ جائے، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''تو آپ گرفتاری دینا نہیں چاہتے؟''

''ہرگز نہیں، اگر تم ایسا کرنا چاہتے ہو تو کر لو لیکن اس سے پہلے اپنی یہ رائفل مجھے دے دینا...... تاکہ میں ان حرامیوں میں سے دو چار کو شوٹ کر کے خود کو گولی مار سکوں۔''

''میرے خیال میں، میں بھی لڑتے ہوئے جان دینا زیادہ پسند کروں گا۔'' میں نے پورے یقین سے کہا۔

اسی دوران میں میگافون پر منحوس آواز پھر سنائی دینے لگی۔ اس مرتبہ آواز میں جھلاہٹ نمایاں تھی۔ پانڈے نے کہا۔ ''دس منٹ پورے ہو چکے ہیں۔ ہم تمہیں آخری بار باہر آنے کے لئے کہہ رہے ہیں۔''

میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''پانڈے! تم سامنے آؤ۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میرا ارادہ تھا کہ پانڈے کے سامنے آتے ہی دو چار گولیاں اس کے سینے میں ٹھونک دوں پھر میرے ساتھ جو کچھ بھی ہونا ہے، ہو جائے۔

''تم کون ہو؟'' پانڈے نے پوچھا۔

''تم مجھے مہروز کے نام سے جانتے ہو۔ میں مختار راجپوت کا داماد ہوں۔''

چند لمحے سناٹا رہا۔ پھر ایک بڑی ٹارچ کا روشن دائرہ میری سمت حرکت کر آیا۔ پانڈے کی آواز گونجی۔ ''تم اپنی رائفل پھینک کر سامنے آ جاؤ۔ پھر تم سے بات ہو سکتی ہے۔''

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماےراحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

میں سمجھ گیا کہ پانڈے جیسا گھاگ شخص اتنی آسانی سے خود پر حملے کا موقع نہیں دے گا۔ عین ممکن تھا کہ میرے سامنے آتے ہی مجھے شوٹ کر دیا جاتا اور اس کے ساتھ ہی کھنڈر پر ہلا بول دیا جاتا۔

میں نے وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جو کر سکتا تھا۔ رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے آواز کے رخ پر گولی چلائی۔ میں نے یکے بعد دیگرے تین فائر کئے اور اس کے ساتھ ہی یہ امید کی کہ ایک آدھ گولی رنجیت پانڈے کو لگ گئی ہوگی۔

میری فائرنگ کے ساتھ ہی جیسے کسی طوفان کا بند ٹوٹ گیا۔ گولیاں مینہ کی طرح کھنڈر کے در و دیوار پر برسنے لگیں۔ میں ایک محفوظ آڑ میں تھا، جم کر جوابی فائرنگ کرنے لگا۔ سچ کہتے ہیں کہ لڑائی کا انتظار لڑائی سے زیادہ خوفناک ہوتا ہے۔ ایک بار جب لڑائی شروع ہو جاتی ہے تو پھر وہ اتنی خوفناک اور تکلیف دہ نہیں رہتی۔ میں نے اپنی فائرنگ کے جواب میں ایک کرب ناک آواز سنی۔ یہ میرے مدِمقابلوں میں سے کسی ایک کی آواز تھی، جسے گولی لگی تھی۔ اس آواز نے میرے اندر چنگاریاں بھر دیں۔ میرا دل چاہا کہ میں اس طرح کی مزید آوازیں سنوں۔

اگلے تین چار منٹ میں، میں نے بھرپور مزاحمت کی۔ میرے حریفوں نے جتنی بار پیش قدمی کرنی چاہی، میں نے انہیں روک دیا۔ میرا نشانہ، بہت اچھا نہیں تھا۔ اس کے باوجود دو تین افراد میری فائرنگ سے ''ہٹ'' ہوئے۔ اس دوران میں، میں نے تیزی سے پوزیشنیں بدلیں، رائفل کے میگزین تبدیل کئے اور جیکی سے گفتگو بھی جاری رکھی۔ وہ میرے لئے میگزین بھر رہا تھا۔ میگزین کو اپنے پاؤں کے نیچے دبا کر وہ اس میں اپنے اکلوتے ہاتھ سے گولیاں ٹھونس سکتا تھا۔ وہ خوف زدہ نہیں تھا اور اس کا اندازہ اس کی باتوں سے ہو رہا تھا۔ فائرنگ کے ساعت شکن شور میں وہ پکار کر بولا۔ ''شاباش...... لڑتے ہوئے مرنا ہے، ڈرتے ہوئے نہیں مرنا۔''

''آپ بے فکر رہو۔ آخری گولی تک لڑوں گا۔'' میں نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''نہیں...... نہیں۔ آخری گولی تک نہیں۔'' جیکی کی آواز ابھری۔

''کیا مطلب؟''

''آخری دو گولیاں بچا کر رکھنی ہیں۔ ایک میرے لئے...... اور ایک، چاہو تو اپنے لئے۔''

یکا یک ایک ساعت شکن دھماکا ہوا۔ مجھے جیسے کسی مست ہاتھی نے ٹکر دے ماری تھی۔

میں اچھل کر پیچھے کی طرف گیا۔ ٹرپل ٹو رائفل میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ میرا سر بڑے زور سے پتھریلی دیوار کے ساتھ ٹکرایا تھا۔ آنکھوں میں نیلے پیلے تارے ناچ گئے۔ میرے ذہن نے پکار کر کہا، مجھے دستی بم سے نشانہ بنایا گیا ہے۔ اضطراری عمل کے تحت میں نے اپنے جسم کو ٹٹول کر دیکھا۔ ہاتھ پاؤں سلامت تھے۔ صرف ایک ران میں سے خون رس رہا تھا۔ بارود کی تیز بو نتھنوں میں گھسی۔

''جیکی! آپ ٹھیک ہو؟'' میں نے پکار کر پوچھا۔

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی بُری طرح کھانسنے لگا۔ لگتا تھا کہ اس کی سانس رک رہی ہے۔

میں نے گہرے اندھیرے میں رائفل کے لئے دیوانہ وار ہاتھ چلائے۔ وہ مجھے چیتل کی لاش سے پانچ چھ فٹ کی دوری پر ملی۔ میں لیٹے لیٹے پیچھے کی طرف کھسک آیا۔ گولیاں سنسناتی ہوئی دیواروں اور درختوں میں پیوست ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ گولیاں میرا کچھ بگاڑ ہی نہیں سکتیں یا شاید کسی بھی شخص کی موت ان گولیوں سے واقع نہیں ہو سکتی۔ ان گولیوں کا خوف دل و دماغ سے بالکل نکل گیا تھا۔ ہاں...... اس کی جگہ دستی بم کے خوف نے لے لی تھی۔ مجھے پتا تھا، دستی بم ہوا میں قوس بناتا ہوا آئے گا اور کھنڈر کے اندر تک نقصان پہنچائے گا۔ میں اپنی رائفل کے ساتھ کچھ اور پیچھے ہٹ آیا اور تب مجھے دوسرا شدید ذہنی دھچکا لگا۔ میری ٹرپل ٹو رائفل استعمال کے قابل نہیں رہی تھی اور ایسا دستی بم کے زوردار دھماکے کے بعد ہوا تھا۔ دھماکے کے بعد رائفل کی لبلبی ٹیڑھی ہو گئی تھی اور اپنی جگہ سے ایک ''ملی'' بھی حرکت نہیں کر رہی تھی۔

''فائر کیوں نہیں کر رہے ہو؟'' جیکی نے چلا کر پوچھا اور ایک بھرا ہوا میگزین میری طرف اچھالا۔

میں اسے کیا جواب دیتا؟ میں سمجھ گیا تھا کہ اب یہ سارا کھیل ختم ہونے والا ہے۔ میں نے ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے اوپر سے جھانکا۔ ٹارچوں کی چند ایک روشنیاں کھنڈر کے عین سامنے پہنچ گئی تھیں۔ وہ لوگ گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ پانڈے کے کچھ کمانڈوز نے بلٹ پروف جیکٹس بھی پہن رکھی ہیں۔ یہ خطرناک کمانڈوز کسی بھی لمحے ''چارج'' کر کے اندر گھس سکتے تھے۔

کچھ دیر پہلے جیکی نے مجھ سے کہا تھا کہ دو گولیاں بچا کر رکھنا۔ گولیاں تو بہت سی بچی ہوئی تھیں لیکن انہیں چلانے والا ہتھیار بیکار ہو چکا تھا۔

تو پھر اب کیا کرنا ہوگا؟ میں نے دل ہی دل میں خود سے پوچھا۔

میرا دھیان اپنے شکاری چاقو کی طرف چلا گیا۔ تو کیا اس چاقو کو مضبوطی سے پکڑ کر دیوانہ وار اس کھنڈر سے نکلوں اور رائفل برداروں پر جا پڑوں۔ کسی کو مار تو شاید نہ سکوں لیکن اپنے مرنے کا حق تو ادا کر دوں؟ پھر ذہن جیکی کی طرف منتقل ہو گیا۔ اس کا کیا بنے گا؟ کیا وہ زندہ پانڈے کے ہتھے چڑھ جائے گا؟ کیا اسے اس انجام سے بچانے کے لئے میں اسے اپنے اس چاقو سے قتل کر سکتا ہوں؟ بے شک...... بے شک میں بہت تبدیل ہو چکا تھا لیکن ابھی اتنا تبدیل بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک ایسے شخص کو جان سے مار سکوں جس کی میں دل سے عزت کرنے لگا تھا...... اور جان سے مارنے کا کام مجھے کرنا بھی چاقو سے تھا۔

مجھے اپنی ہمت ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جیکی بھی بھانپ چکا تھا کہ میرے فائرنگ نہ کرنے کا سبب کوئی گڑبڑ ہے۔

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ”تم مجھے کچھ بتاتے کیوں نہیں ہو؟ وہ لوگ...... وہ لوگ اندر گھسنے والے ہیں۔“

جیکی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ لوگ اب بہت قریب آ گئے تھے۔ ان کی سفاک آوازیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ میں نے رائفل پھینک کر چاقو نکال لیا اور آخری لمحات کے لئے تیار ہو گیا۔ میری ران سے رستا ہوا خون میرے پاؤں تک پہنچ رہا تھا اور اس کی نمی مجھے اپنی جوتی میں بھی محسوس ہو رہی تھی۔

یکا یک فائرنگ دھیمی ہوئی اور پھر تھم گئی۔ مجھے کچھ دور افتادہ آوازیں سنائی دیں۔ یوں لگا کہ شیشم، سفیدے اور بلوط کے دیو قامت گھنے درختوں میں چند افراد چلا چلا کر باتیں کر رہے ہیں۔

تب ایک بار پھر اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ کھنڈر سے باہر ہر طرف شعلے رقص کرنے لگے۔ در و دیوار کی کرچیاں اڑنے لگیں اور شاخیں کٹ کٹ کر گرنے لگیں۔ مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ اب فائرنگ کا آہنگ اور ہے۔ اب فائرنگ کا سارا زور ہماری دائیں جانب تھا...... اور یوں لگ رہا تھا کہ دائیں جانب سے جوابی فائرنگ بھی ہو رہی ہے۔ چاروں طرف یک دم کہرام سا مچ گیا تھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ جیکی کی آواز سنائی دی۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”لگتا ہے کہ کچھ اور لوگ یہاں پہنچ گئے ہیں۔“ دھماکوں کے بے پناہ شور میں جیکی کی

لڑکھڑاتی ہوئی آواز دوبارہ ابھری۔ اس کی آواز میں ہلکا سا جوش تھا۔

میرے دل میں ایک دم نقارہ سا بجا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ ہمارے ساتھی یہاں موقع پر پہنچ گئے ہوں؟ مگر پھر فوراً میں نے اپنے خیال کو رد کر دیا۔ ہمارے ساتھی باقی ہی کتنے بچے تھے۔ انور خاں، چوہان، اسحاق اور جیل سے رہائی پانے والے دو بندے...... یعنی کُل پانچ افراد! مگر یہاں جس طرح کی فائرنگ ہو رہی تھی، لگتا تھا کہ کوئی ایک دو ڈھائی سو افراد پوری طاقت کے ساتھ ایک دوجے سے بھڑ گئے ہیں۔ ہر طرف للکارے گونج رہے تھے اور ہتھیاروں کی کھٹا کھٹ سنائی دیتی تھی۔ زخمیوں کی پکار، گھوڑوں کی ہنہناہٹ، گولیوں کے سرلائے اور دستی بموں کے دھماکے...... میدانِ جنگ کا سا منظر تھا۔ دستی بم کے ایک ساعت شکن دھماکے کے بعد ایک جسم اڑتا ہوا سا ہمارے جھونپڑے نما کمرے کے سامنے آن گرا۔

میں نے ٹارچ کی روشنی پھینکی اور ششدر رہ گیا۔ یہ شخص سبز وردی میں تھا۔ اس کا ایک بازو کندھے پر سے صاف اڑ گیا تھا اور گردن پر سے مٹھی بھر گوشت غائب تھا۔ غالباً وہ یہاں گرنے سے پہلے ہی دم توڑ چکا تھا۔

جیکی نے بھی سبز وردی کی جھلک دیکھ لی تھی۔ وہ پکار کر بولا۔ ”یہ تو نل پانی کے لوگ ہیں۔“

”اور کافی تعداد میں ہیں۔“ میں نے اس کے فقرے میں اضافہ کیا۔

میرے لئے سب سے خوش آئند چیز وہ رائفل تھی جو سبز وردی والے کے ساتھ ہی چیتل کی لاش کے پاس گری تھی۔ میں نے رائفل پکڑی اور سرکتا ہوا پیچھے آ گیا۔ یہ رائفل میرے لئے بالکل اجنبی تھی لیکن تیار حالت میں تھی۔ میں نے ٹریگر دبایا تو زبردست تڑتڑاہٹ سے ایک برسٹ، لکڑی کی بوسیدہ چھت میں جا لگا اور بہت سی مٹی ہمارے اوپر گری۔

میرے رگ و پے میں اعتماد اور جوش کی نئی لہر دوڑ گئی۔ میں نے رائفل پر گرفت مضبوط کر دی اور ایک دیوار کی اوٹ لے کر چوکس بیٹھ گیا۔

دو تین پکارتی ہوئی آوازیں میرے کانوں میں پڑیں۔ ان میں سے ایک منحوس آواز پانڈے کی بھی تھی۔ وہ سخت طیش کے عالم میں اپنے ساتھیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ غالباً میری فائرنگ اسے شدید نقصان پہنچانے سے قاصر رہی تھی۔

اگلے دس منٹ میں دو تین مختصر وقفوں کے سوا زبردست فائرنگ جاری رہی۔ اس فائرنگ میں چھوٹے پستول سے لے کر برسٹ مارنے والی بڑی رائفلوں تک ہر طرح کا

ہتھیار استعمال ہو رہا تھا۔ لگتا تھا کہ چوٹ برابر کی ہے بلکہ نل پانی سے آنے والوں کو کچھ برتری حاصل ہے...... مگر ایک جگہ ایسی تھی جہاں سے پانڈے کے دو تین ساتھی بڑی مؤثر فائرنگ کر رہے تھے اور مخالف فریق میں سے کسی کو آگے بڑھنے نہیں دے رہے تھے۔ یہ جگہ ایک چھوٹے سے ٹیلے پر تھی اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہاں تین افراد جی تھری گن کے ساتھ موجود تھے۔

جیکی کا خیال بھی یہی تھا کہ جب تک پانڈے کے بندے ٹیلے والی جگہ پر موجود ہیں، ان کا پلڑا بھاری رہے گا۔ پتا نہیں کیوں میرے دل میں آئی کہ میں یہاں اس کھنڈر کی پناہ گاہ کو چھوڑ کر نکلوں اور بھاگتا ہوا اس ٹیلے پر پہنچ جاؤں۔ اندھا دھند گولیاں برساؤں اور اپنے سامنے آنے والے ہر ذی روح کو چھلنی کر دوں۔ پھر نل پانی والوں کو میری لاش ٹیلے کی بلندی پر سے ملے۔ میرے جسم پر گولیوں کے اَن گنت زخم ہوں۔ وہ لوگ میری لاش کو نل پانی لے جائیں...... اور...... میرے کردار پر لگے ہوئے بزدلی و کم ہمتی کے سارے داغ میرے لہو سے دھل جائیں۔

سوچنے اور عمل کرنے میں فرق ہوتا ہے۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ لیکن عمل نہیں کر پا رہا تھا۔ میرے اندر انقلاب ضرور آیا تھا مگر ابھی یہ انقلاب اس درجے تک نہیں پہنچا تھا کہ میں ایسا بڑا اقدام اُٹھا سکتا۔

اچانک فائرنگ دھیمی پڑ گئی اور یوں لگا کہ فائرنگ کا آہنگ بھی تبدیل ہو رہا ہے۔ درختوں میں حرکت کرتی ہوئی روشنیاں تیزی سے بائیں طرف ہٹنے لگیں۔ جیکی نے پکار کر کہا۔

''میرا خیال ہے کہ پانڈے کے لوگ بھاگ رہے ہیں۔''

کچھ دیر بعد مجھے بھی لگا کہ جیکی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں نے دو گھوڑوں کو برق رفتاری کے ساتھ اپنے سامنے سے گزرتے دیکھا۔ ان پر سبز اور خاکی وردیوں کی جھلک نظر آئی۔ دائیں طرف سے ہونے والی فائرنگ ایک دم زور پکڑ گئی تھی۔ جو فائرنگ بائیں جانب سے ہو رہی تھی، وہ کم ہونے کے ساتھ ساتھ دور بھی چلی گئی تھی۔

یکایک کھنڈر کے بالکل سامنے سے ایک گرجتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''تابش...... تابش! تم کہاں ہو؟''

میری رگوں میں لہو اچھل کر رہ گیا۔ سر سے پاؤں تک جوش کی ایک لہر چلی اور پھیل گئی۔

یہ ہمارے یارِ غار...... شیر دل انور خاں کی آواز تھی۔

میں نے پکارا۔ ''میں یہاں ہوں انور بھائی۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے ٹارچ کے روشن دائرے کو حرکت دی۔

انور خاں اور اسحاق عقابوں کی طرح جھپٹتے ہوئے اندر آ گئے۔ ان کے ساتھ سبز وردیوں والے چار پانچ مسلح افراد بھی تھے۔ انور خاں کا چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا۔ وہ سر تا پا ایک جنگجو پٹھان نظر آتا تھا۔ ہم بغل گیر ہو گئے۔ وہ میرا ماتھا چوم کر بولا۔ ''یار! ایک دم کہاں چلے گئے تھے تم؟ بڑا پریشان کیا تم نے۔''

اسحاق بھی مجھ سے بغل گیر ہوا۔

تفصیلی بات کا وقت نہیں تھا۔ اِکا دُکا فائر ابھی تک ہو رہے تھے۔

دو مسلح افراد جیکی کے پاس رک گئے۔ ہم کھنڈر سے باہر نکل آئے۔ مجھے سامنے ہی درختوں کے نیچے پانچ چھ افراد کی لاشیں نظر آئیں۔ ان میں سے زیادہ تر زرگاں کے تھے۔ ایک بارشی گڑھے میں ایک گھوڑا بھی مردہ پڑا تھا۔ ٹیلے کے اردگرد بھی جانی نقصان ہوا تھا...... دو تین لاشیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ سبز وردیوں والے افراد زخمیوں کو اُٹھا رہے تھے اور یہاں وہاں بکھرے ہتھیار اور پگڑیاں وغیرہ اکٹھی کر رہے تھے۔ ایک شخص جھکا اور اس نے خودرو گھاس میں سے، دھات کی بنی ہوئی کوئی چیز اُٹھائی۔ انور خاں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھ۔ یہ ایک آہنی راڈ تھا۔ اس پر افقی رخ پر تین چار چھوٹے راڈ لگے ہوئے تھے۔ عقب میں ایک گول جالی سی تھی۔ دیکھنے میں یہ ٹی وی انٹینا جیسا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ بھاگنے والے دیگر کئی چیزوں کی طرح یہ آلہ بھی چھوڑ گئے ہیں۔

اسی دوران میں کسی نے عقب سے مجھے دبوچ لیا۔ یہ زبردست دوستانہ گرفت تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ ڈاکٹر چوہان تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں مجھے اس کی آنکھوں میں نمی دکھائی دی۔ اس کا زخمی کندھا پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ فائرنگ تھم چکی تھی لیکن ایک گرم ماؤزر ابھی تک چوہان کے ہاتھ میں تھا۔

''یہ سب کیا ہے چوہان؟ اتنے سارے لوگ تمہارے ساتھ؟ ہم تو صرف چھ بندے باقی بچے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''تم غلط کہہ رہے ہو۔ ہم چھ نہیں، صرف پانچ بچے تھے۔ تم تو جوہڑ کے کنارے پیشاب کرنے کے بہانے نکل گئے تھے اور جس وجہ سے نکلے تھے، وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں...... بہرحال...... یہ جو کچھ ہوا ہے، تم اسے اللہ کی مدد کہہ سکتے ہو۔ حالات ایک دم بہت تبدیل ہو گئے ہیں۔ ہم ابھی تمہیں تفصیل بتاتے ہیں۔'' چوہان نے کہا۔ اس کی آواز میں

ایک جوشیلی لرزش تھی۔

انور خاں اور دیگر افراد ٹیلے پر چڑھ گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ گیا۔ یہاں اب نل پانی کے مسلح سپاہیوں نے پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔ ٹیلے پر دو تناور درختوں کی اوٹ میں گولیوں کے بے شمار خول پڑے تھے اور ایک بڑی گن تھی۔ انور خاں نے بتایا کہ یہ جی تھری ہے۔ یہاں اس منظر میں موجود سب سے اہم چیز دو انسانی لاشیں تھیں۔ یہ دونوں پانڈے کے ساتھی تھے۔ ان کی سبز اور خاکی وردیاں لہو رنگ تھیں۔ تاہم غور سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ ان کے جسم پر گولیاں نہیں لگیں بلکہ کسی تیز دھار آلے سے وار کیے گئے ہیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ جی تھری گن چلانے والے ان دو افراد کی ہلاکت کے بعد ہی لڑائی ختم ہو سکی ہے۔ انور خاں نے یہ شاندار گن اور اس کا سارا فالتو ایمونیشن اپنے قبضے میں لے لیا۔ دونوں افراد کی خونچکاں لاشیں وہاں سے اُٹھوا دی گئیں۔

جلد ہی ہم بارونڈا جیکی کے پاس چوکی کے کھنڈر میں واپس آ گئے۔ یہاں اب بہت سے افراد جمع ہو چکے تھے۔ وہ سب نل پانی کے سپاہی تھے۔ ان کے چہروں پر فاتحانہ رنگ تھا۔ وہ جیکی میں بہت دلچسپی ظاہر کر رہے تھے۔ جیکی نشے میں اوٹ پٹانگ بولتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے چوہان سے سرگوشی میں پوچھا۔ ''یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ نل پانی کے سپاہی تو اس معاملے میں غیر جانب دار تھے۔ وہ اس لڑائی میں کیسے آ گئے؟''

''بس آ گئے ...... بلکہ کود پڑے ...... اور علی الاعلان کود پڑے۔'' چوہان کی آواز میں چھپا ہوا جوش نمایاں ہو گیا۔

''میں سمجھا نہیں۔''

اس نے میرا کندھا دبایا۔ گرفت میں جذباتی کیفیت تھی۔ وہ سرگوشی میں بولا۔ ''نل پانی والے میدان میں آ گئے ہیں۔ چھوٹے سرکار اور حکم جی میں پوری طرح ٹھن گئی ہے۔ پچھلے چوبیس گھنٹے میں تین جگہ زبردست ٹاکرا ہوا ہے۔''

اس دوران میں انور خاں نے میرا بازو پکڑا اور بولا۔ ''تابش! آؤ تمہیں اپنے اس ساتھی سے ملواؤں جس کی وجہ سے ہم حکم کے کتوں کو یہاں سے بھگانے میں کامیاب ہوئے۔''

''کون ہے یہ؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی جو اپنی جان سخت خطرے میں ڈال کر ٹیلے پر چڑھا۔ اس نے جی تھری چلانے والے دو سپاہیوں پر تلوار کے وار کیے اور ان کا قصہ پاک کیا۔''

انور خاں اور چوہان مجھے لے کر گھنے درختوں میں گھسے۔ یہاں ابھی تک دھواں اور بارود کی بو تھی۔ ایک جگہ خشک جھاڑیوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ یقیناً ایسا کسی دستی بم کے دھماکے کی وجہ سے ہوا تھا۔ جھاڑیوں کے قریب ہی زمین پر دو تین زخمی پڑے ہوئے تھے۔ انور خاں نے مجھے، چادر میں لپٹے ہوئے ایک زخمی کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیا۔ ایک نوجوان لڑکا اس زخمی کے پاؤں پر پٹی باندھ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ یہ زخمی کوئی عورت ہے۔ اچانک وہ عورت حرکت میں آئی ...... اور میرے قدموں میں گر پڑی۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اس کی آواز نے میرے چودہ طبق روشن کر دیئے۔ وہ کوئی اور نہیں سلطانہ تھی۔

میں بیٹھ گیا۔ میں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اُٹھانا چاہا لیکن وہ میرے پاؤں سے لپٹی رہی۔

''مجھے معاف کر دو مہر دج ...... مجھے معاف کر دو۔'' وہ بس یہی کہتی جا رہی تھی۔

اس نے اپنا منہ سر لپیٹ لیا تھا۔ وہ جیسے مجھے اپنی شکل بھی دکھانا نہیں چاہ رہی تھی۔ چوہان نے نوعمر لڑکے کے ساتھ مل کر اسے بمشکل میرے قدموں سے علیحدہ کیا۔ وہ پہلو کے بل ایک طرف جا پڑی۔ اس کا چہرہ بدستور چادر میں پوشیدہ تھا۔

انور خاں مجھے دلاسا دیتے ہوئے ایک طرف لے گیا۔ میں نے اپنی آنکھوں کی نمی پونچھتے ہوئے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا یہ سب کیا ہے؟''

O......❖......O

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
تیسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

سیما غزل کے بہترین ناول

- چاند کے قیدی — دو حصے
- کال بیل — دو حصے
- کمند — دو حصے
- کوری آنکھیں — دو حصے
- زرد پتوں کا بھنور — دو حصے
- اندھی رات کا بیٹا — دو حصے
- آدھا وجود

طاہر جاوید مغل کے بہترین ناول

- تاوان — 17 حصے
- دیوی — 7 حصے
- پرواز — دو حصے
- آندھی — دو حصے
- اباقہ — دو حصے
- نور کی یلغار — دو حصے
- تابان
- درندہ
- پرستش
- فیصلہ
- تاخیر پسند
- صدقے واری
- جستجو
- شہر محبت

9789695173190

علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار، لاہور
فون: 37247414
E-mail:alimian_publications@yahoo.com